ہر خاص و عام بالخصوص سکول و کالج،
دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کو قرآن کریم کے
معانی و مطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے سکھانے کا بہترین ذریعہ
اردو ترجمہ ہر پین 15 لائن 216 صفحات کے دو ایڈیشن میں مختصر اور عام فہم اور مدلل تفسیر

ذخیرۃ البرہان فی فہم القرآن

جلد 5

وَالْمُحْصَنٰتُ ۵

سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت
کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر عمل کا ایک باب سیکھ لے
تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

ترجمہ و تالیف: قاری محمد اکرام مدظلہ
مہتمم و مدرس فیض القرآن اوکاڑہ (پاکستان)

ہر خاص و عام بالخصوص سکول و کالج،
دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کو قرآن کریم کے
معانی و مطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے کیلئے، لفظ بہ لفظ،
اردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃ البرھان فی فھم القرآن

جلد 5

وَالْمُحْصَنٰتُ ⑤

سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر علم کا ایک باب سیکھ لے تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

مرتب و مؤلف: قاری محمد اکرام عفی عنہ
مدرسہ فیض القرآن اوڈھوال (ضلع چکوال)

تمام حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: ذخِیرَۃُ البُرْھَان فِی فَھْمِ القُرْآن
وَالْمُحْصَنٰتُ ⑤ (جلد 05)

صفحات: 484

ترتیب وتالیف: قاری محمد اکرام غفرلہٗ
مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)
0300-5902896

ٹائٹل وکمپوزنگ: ظفر محمود ملک
النور مینجمنٹ چکوال 0334-8706701

ناشر: مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

تاریخ اشاعت: 2 ربیع الثانی 1448 ہجری بمطابق 15 ستمبر 2026 عیسوی

ویب سائیٹ: www.umarlibrary.org

﴿ فہرست مضامین ﴾

عرضِ مرتب 11
شرائط حلت/ قیدی عورتوں اور لونڈیوں سے تمتع کی شرط 13
ابدی اور وقتی محرمات 13
محرمات ابدیہ کون کون سے ہیں؟ 14
مہر کی کم از کم مقدار 19
عورت سے نفع اٹھانے کی جائز صورتیں 19
لونڈی اور آزاد عورت میں تقابل/ بے حیائی کی سزا 21
احصان کا معنی اور زنا کے باب میں احصان کی شرائط 21
وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ کا مفہوم 23
اعلانیہ نکاح بمقابلہ خفیہ دوستی 25
نکاح منعقد ہونے کی بنیادی شرط 26
محصن اور غیر محصن میں کیا فرق ہے؟ 27
معاشرتی اصلاحات پر مخالفین کا شور وغوغا/ شرعی احکام میں انسانی کمزوریوں کا لحاظ 29
انبیائے سابقین سے بنیادی عقائد میں مطابقت 29
نفسانی خواہشات کا فتنہ 31
خواہشات میں راہِ اعتدال (میانہ روی) سے مراد 32
عقل اور جذبات میں میانہ روی 34
اکتسابِ مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق/ خودکشی فعل حرام ہے 36
مال میں ناجائز تصرف سے مراد 36
ربا النسیئہ اور ربا الفضل کا مفہوم 37
خودکشی کی حرمت اور خودکشی کی سزا 39
لفظ کَانَ کا مفہوم اور تشریح 41
عُدْوَانًا وَّظُلْمًا (سرکشی اور ظلم) کا مطلب 42
گناہوں پر توبہ واستغفار کرنے کا صحیح طریقہ/ صغیرہ اور کبیرہ گناہ میں فرق؟ 44
توبہ واستغفار سے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی معافی . 44
گناہوں کی دو قسمیں 46
گناہ اور اس کی دو قسمیں صغائر، کبائر 46
گناہ کبیرہ 47
کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے 49
توبہ واستغفار سے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی معافی کی تفصیل 50
لفظ تُحْبَرُوْنَ کا بنیادی معنی ومفہوم 51
حقوق وفرائض کے باب میں مرد وخواتین برابر ہیں 52
اسلام میں عورت اور مرد کے مساوی حقوق 52
اجر وثواب میں مرد وعورت برابر ہیں 56
ترکہ میں وصیت کے احکام 57
مرد بطور حاکم/ اچھی بیوی کی چار صفات/ مرد کے بالمقابل عورت کی حیثیت 61
مساوات مرد وزن کا اسلامی نظریہ 61
زوجین میں ثالثی فیصلہ/ میاں وبیوی کے اختلافات کے اَسباب اور اُن کا حل 70

میاں بیوی کے معاملات پیچیدہ ہوجانے پر کیا کرنا چاہیے؟ 70
اختلاف کے حل کا ایک قوی نسخہ 74
عبادت صرف اعمال نہیں، پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت میں ڈھال دینے کا نام ہے 77
صرف اللہ وحدہ عبادت کا مستحق ہے 77
عبادت کی اقسام 79
عبادت کا ناقص تصور 80
والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم 80
رشتہ داروں سے حسن سلوک 82
یتیم کس بچے کو کہتے ہیں؟ 82
شرعاً مسکین کسے کہتے ہیں؟ 83
پڑوسیوں اور دیگر مستحقین کے حقوق 83
غرور سے بیزاری 85
بخل! احسان سے روکنے والی عادتِ بد/ نام ونمود اور ریا کاری کی مذمت 86
بخل! دل کی ایک خطرناک بیماری 86
علم میں بخل 88
بخل کے بجائے سخاوت وفیاضی 90
قرض اور پریشانی سے نجات کے لیے نبی کریم ﷺ کی مسنون دعاء 91
ریا کاری ایک مذموم عمل ہے 91
ریا کاری کیا ہے؟ 92
شیطان کے پھندے 93
عقیدہ آخرت کی اہمیت/ قیامت کے دن اعضاء گواہی دیں گے 94
آخرت کے منکر خسارہ میں ہیں 94
عقیدہ آخرت اور فکر احتساب 96
یَظْلِمُ اور ذَرَّۃٍ کا معنی ومفہوم 97
حاضر وناظر عقیدہ رکھنے کی وضاحت 99
قیامت کے دن انسان کے اعمال کے متعلق اس کے اعضاء کی گواہی 101
حرمت شراب کے تدریجی مراحل/ طہارت شرط نماز ہے 103
نشے کی حالت میں کلمۂ کفر بولنے کا حکم 104
تیمم کا طریقہ، فرائض، شرائط اور سنن 106
طہارت ونظافت اسلام کا طرۂ امتیاز 108
اہل کتاب کی چند اہم علمی، فکری اور عملی خامیوں کا ذکر 112
اہل کتاب کی علمی خامیاں اور ان کے مکروہ عزائم 112
اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غلبہ کے اسباب 115
نصرتِ الٰہی کا حصول کیسے؟ 116
عقیدۂ توحید کے اثرات وثمرات 118
آسمانی کتب میں تحریف 119
یہود کی لفظی اور معنوی تحریف 119
یہود کی شرارتیں 121
دینی احکام واصطلاحات میں تحریف کا فتنہ 122
اصحابِ سبت کا واقعہ/ اصحاب السّبت پر عذاب کی نوعیت 128
دعوت دین اور احتساب عمل 128
حضرت عبداللہ بن سلام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا قبولِ اسلام 130
حضرت کعب احبار رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا قبولِ اسلام: 130
اصحابِ سبت کا واقعہ اور ہمارے لئے سبق 131
نہی عن المنکر کا فریضہ 133

شرک ناقابل معافی کیوں ہے؟ بنیادی حقیقت اور قرآن کا حکم 135
شرک ناقابل معافی جرم 135
مغفرت کی امید پر گناہ کرنا بہت خطرناک ہے .. 137
حضرت وحشی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا قبولِ اسلام: . 138
سیدزادہ کون اور وہ کیسا ہوتا ہے؟ 140
نسب بدلنے کی وعید 141
اللہ پر افترا کا مفہوم 142
جبت اور طاغوت کا مفہوم اور اس کے مصداق/ حسد اور بخل کی مذمت 143
اَلْجِبْتِ اور اَلطَّاغُوْت کا معنی ومفہوم 143
لعنت کا مفہوم اور حکم 146
اختیار کی نفی 148
بخل اور حسد دونوں انتہائی تباہ کن باطنی اور اخلاقی بیماریاں 149
یہود کی طرف سے مخالفت/ کفار کے لیے جہنم کی سزا اور مومنوں کے لیے انعامات 152
یہود ونصاریٰ کی اسلام کے خلاف سازشیں 152
عذاب کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے کھالوں کی تبدیلی 154
مومنوں کیلئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے انعامات 156
امانت ایک شرعی وانسانی فریضہ/ نظام حکومت کی ضروریات اور اسلامی مملکت کی خصوصیات! 159
امانت کا وسیع مفہوم 159
امانتیں اہل کے سپرد کرنے کا حکم 161
اسلامی تعلیمات کے شاہکار 163
قاضی شریح رحمہ اللہ کا عادلانہ فیصلہ 164
اسلامی حکومت کے چار اصول 166
اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت 166
اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کا تقاضا 168
"اُولِی الْاَمْرِ" کی اطاعت 168
دین کے فہم کے لیے علماء کی رہنمائی 170
منافقوں کا آپ کے پاس فیصلہ لانے سے گریز/ رسول اللہ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت 174
طاغوت کا وسیع تر مفہوم 174
سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور قتل منافق کا واقعہ 176
اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے پر راضی رہنا ایمان کا بنیادی تقاضا 177
شرائع الٰہیہ (اللہ کے احکام اور شریعتوں) کی پیروی مسلمانوں پر فرض 178
شرائع الٰہیہ کی پیروی کی بنیادی حیثیت 179
منافقین کی بے بسی 180
منافقین کی جھوٹی قسموں کی حقیقت 180
اطاعت رسول ﷺ! صحت ایمان کی اولین شرط/ روضۂ رسول پر استغفار 182
اطاعت رسول فرض ہے 182
معافی کیلئے اولین شرط 185
روضہ اقدس پر حاضر ہو کر شفاعت طلب کرنا 186
سماع موتی کے بارے میں جمہور علماء کرام کا مؤقف 187
رسول کی تحکیم واطاعت ایمان کے لیے لازم 188
مرافعہ کا معنی ومفہوم 189
اس آیت مبارکہ سے چند مسائل معلوم ہوئے 190

اسلام میں جزاوسزا کا تصور وفلسفہ/ انعام یافتہ چار جماعتیں! انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، صالحین 192
اللہ پر ایمان اور ثابت قدمی 192
اَنِ اقْتُلُوْٓا اور اَوِ اخْرُجُوْا سے مراد 194
جزاء اور وعدہ 195
قرآن میں عمل خیر اور عمل شر کا تصور 196
دنیا و آخرت کی کامیابی 197
صراط مستقیم کیا ہے؟ اور اللہ کے انعام یافتہ بندے کون ہیں؟ 197
اللہ سبحان وتعالی کا علم ہر شے پر محیط ہے 200
جنگ احد کے بعد مسلمانوں کی حالت اور احکام/ جہاد کی حقیقت 201
اسباب اختیار کے متعلق شرعاً حکم 201
منافقوں کے کردار کا تذکرہ 202
خود غرضی اور مفاد پرستی کی مذمت 203
مسلمان بحیثیت جماعت 204
"جہاد" اسلامی عظمت کا نشان دین کا بنیادی شعار 205
نظریہ حق و باطل/ جہاد کے فریضہ سے غافل ہونے کا انجام 209
جہاد فی سبیل اللہ کا مفہوم 209
ہجرت نہ کرسکنے والے 211
عہد نبوی میں یہودیوں کی چالبازیاں 212
حق و باطل کی معرکہ آرائی روز اول سے ہے 213
طاغوت کا قرآنی مفہوم اور اللہ اور طاغوت کے راستے 215
جہاد کی عدم اجازت/ مکی دور میں ہاتھ نہ اٹھانے یا عدم تشدد کے فوائد 217
مکی دور میں طاقت کا استعمال نہ کرنے کے فوائد 217
مکی دور میں طاقت کا استعمال نہ کرنے کے اہم فوائد 220
موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا 222
لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا کا مطلب 225
برائی اور بھلائی کا فلسفہ/ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے 226
بھلائی کا سرچشمہ 226
اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری 229
قول وعمل کا تضاد اور اسلام 231
تدبرِ قرآن کی اہمیت وفوائد/ استنباط مسائل/ استنباط شرعی حجت ہے 233
قرآن میں غور وفکر کی دعوت 233
تفکر (غور وفکر) سب سے بڑی عبادت ہے 235
افواہوں کی تحقیق کا حکم 236
قرآن وسنّت کے بعد اجماع واجتہاد (قیاس)، شریعت کے بنیادی مآخذ کیوں؟ 238
اہلسنت والجماعۃ کے نزدیک امام اور معصومیت" کا نظریہ 240
قیاس کی ضرورت کیوں ہے؟ 241
اچھی سفارش ثواب اور بُری سفارش گناہ ہے/ سلام کے احکام وآداب 243
جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب 243
سفارش کی حقیقت 245
سفارش کے احکام 247
سلام اور مصافحہ کا طریقہ اور آداب 248
سلام کرنے کے بعض احکام 250

اسلام کی سب سے بنیادی اور اہم حقیقت توحید ہے
..... 252
نفاق کی قسمیں/ نفاق کی بیماری سے نجات دلانے میں
کارگر نسخہ 254
دو گروہوں کی رائے 254
ہدایت زبردستی نہیں ملتی 255
اعتقادی منافق اور عملی منافق 256
نفاق اعتقادی کا حکم 256
نفاقِ عملی کا حکم 257
ہجرت کی اقسام 258
ہجرت کی اہم تین بنیادی قسمیں 259
اجتماعیت کے فقدان کا نتیجہ 262
معاہدے کی پاسداری/
اسلام کا قانونِ جنگ امن وعافیت کا ضامن! 264
اسلام کا نظامِ صلح (امن کا اصول) 264
اسلام ایک امن وسلامتی والا مذہب 267
اسلام کا نظریۂ جنگ 268
اسلام میں جہاد کا حقیقی مفہوم 269
اسلامی جنگ کا مقصود فتنہ وفساد کا خاتمہ 270
دورانِ جنگ بے قصور لوگوں سے تعرض کی ممانعت
..... 272
معاہدے کی پاسداری کی تاکید 273
اسیرانِ جنگ کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ 275
فتنوں کے زمانہ میں ایمان کی اہمیت
اور اُس کی حفاظت کے طریقے 277
فتنہ پرور لوگ 277
جزیرۃ العرب کی پاکیزگی 279
فتنوں کے متعلق کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تعلیم 280
نام نہاد اسلامک اسکالرز کا فتنہ اور نوجوانوں کی ذمہ
داریاں 281
اہلِ حق علماء اور صلحاء کی صحبت اور ان کی مجالس میں
شرکت 283
قتل کی اقسام اور ان کے احکام 284
اسلام میں قتل کی سنگینی اور سزا 284
دیت کے متعلق چند اہم مسائل 287
قتل ناحق کی مذمت قرآن وحدیث کی روشنی میں
..... 289
قتل گناہ کبیرہ اور قبیح ترین فعل ہے 292
ایک بے گناہ انسان کا قتل دراصل پوری انسانیت کے
قتل کے مترادف ہے 292
انسانی خون کی حرمت 293
مومن کو قتل کرنیوالے کی بخشش نہیں 294
مسلمانوں پر جہاد کب فرض ہوتا ہے؟
جہاد فرضِ عین کی تعریف واحکام 298
جنگ کے دوران قتل خطا 298
تحقیق کی اہمیت قرآن کی نظر میں 301
قاعدین (بیٹھنے والوں) اور مجاہدین (جہاد کرنے
والوں) کا تقابل 303
جہاد فرض کفایہ ہے 304
جنت میں سو درجے 306
جہاد ایک پُر اَمن تعمیری، سماجی، اَخلاقی اور روحانی جدو
جہد کا نام 307
ہجرت کے مقاصد اور ضرورت/ ہجرت، دینی ابتلا کے
شکار مسلمان پر فرض 309
دین کی خاطر ہجرت کا حکم 309
ہجرت نہ کرنے پر قرآن کی وعید 310

معذور افراد کا استثناء 312
حقیقی مجبوری اور عذر کی قبولیت 312
لفظ عَسٰی (قریب ہے/ امید ہے) کی حکمت ... 313
اسلام میں ہجرت کا مقام و مرتبہ اور برکات 313
ہجرت کے اہم مقاصد 315
قرآن کریم میں مہاجرین کا ثواب 316
وسیع معنوں میں ہجرت کے مختلف پہلو 317
سفر کے احکام و مسائل قرآن و سنت کی روشنی میں 318
سفر میں قصر صلوٰۃ کی مشروعیت 318
شریعت میں شرعی سفر کی مقدار/ معیار سفر اشکال اور اس کا جواب 319
سفر میں قصر مباح ہے یا واجب؟ 323
حالتِ جہاد یعنی نماز خوف سے متعلق احکام و مسائل 325
صلوۃ الخوف (جنگ کے وقت کی نماز) کا طریقہ. 325
دشمن کا منصوبہ/ وحی کا نزول اور دفاعی تدبیر 329
عذر میں رخصت 330
ناکامی کے اسباب 331
ذکر اللہ کی اہمیت!/ اللہ تعالیٰ کا نام کائنات کی روح ہے 333
ذِکر اللہ کی تعریف/ ذِکر اللہ کی مختلف اقسام 333
ذِکر اللہ کے فضائل و فوائد/ ہر سانس کے ساتھ ذکر 335
اوقاتِ صلاۃ کی ابتدا و انتہا کی علامات 337
نمازیں کب ادا ہوتی ہیں اور کب قضاء ہوتی ہیں؟ 338
نظام الاوقات کی عدم موجودگی میں نماز 341
دشمن کے تعاقب میں سستی نہ کرو 342
اِستغفار کرنے کے دینی اور دُنیوی فوائد/ خیانت ایک سنگین گناہ 344
صرف قبضے سے جرم ثابت نہیں ہوتا 344
استغفار کی تلقین اور بہترین خطا کار کون؟ 346
خیانت، اس کی اقسام اور خیانت کار 347
خیانت کی اقسام 348
تقویٰ و طہارت کی بنیاد 351
اَللّٰہُ مَعِیَ، اَللّٰہُ نَاظِرِی، اَللّٰہُ شَاھِدِی کے فوائد و برکات 352
اللہ کی گرفت اور مجرمین کی بے بسی و بے اختیاری 353
اپنے گناہ دوسروں کے ذمہ لگانا اور بہتان تراشی/ عصمت انبیاء علیہم السلام 355
گناہوں کی بخشش کیلئے استغفار کا طریقہ کار 355
توبہ کیا ہے؟ اور استغفار کس طرح کیا جائے؟ 356
انفرادی ذمہ داری کا اصول 357
بُہتان طرازی..... سنگین معاشرتی بُرائی 358
انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ رکھنا ضروریاتِ دین میں سے ہے 360
اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو منافقین کے شر سے محفوظ فرمانا/ مقصدِ حیات! رضائے الٰہی کی تلاش 362
انبیاء علیہم السلام حفاظت خداوندی میں 362
کلی اور جزوی علم میں بنیادی فرق 364
منافقین کے خفیہ مشوروں کے مقاصد 367
صدقے کا وسیع مفہوم 368
جائز اور ناجائز مشورے 370
رضائے الٰہی کا حصول کیوں ضروری ہے؟ 371
اجماعِ امت اور عدالتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ... 373
دلائل شرعیہ کی تعریف اور تعداد 373

سزا کے بنیادی مقاصد اور وجوہات 374
اتباع کے اہم درجات ومراتب 375
اسلافِ امت کا قرآن کریم کی تلاوت سے گہرا شغف اور کثرتِ تلاوت کا معمول 377
امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک 378
مسلکِ حنفی کی بنیاد اور اصول 379
شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا فقہی واجتہادی مسلک 379
دین اور معاشرے میں فرقہ بندی کی بنیادی اور اہم وجوہات 380
فرد اور اجتماعیت 382
گناہ ومعصیت کا ظاہری اثر/توبہ اور اس کی شرائط 384
کن گناہوں کی معافی نہیں ہے؟ 384
اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر چیز سے وسیع ہے 386
توبہ کے بنیادی طور پر تین اہم مراتب 387
عورتوں کے نام کی دیویاں قرآنی اور تاریخی تناظر 388
ابلیس کا انسانوں کو گمراہ کرنے کا دعویٰ 390
شیطان کی دشمنی اور بچاؤ کے سلیقے 391
خواہشات نفس کی پیروی/شیطانی ہتھکنڈے ...393
لمبی امید رکھنے کی مذمت 393
خدائی تخلیق میں تبدیلی، عذابِ الٰہی کا سبب! ...395
جائز یا مستحسن تبدیلیاں 397
شیطان کے ہتھکنڈے (وعدے اور امیدیں) .397
فرار کی کوئی راہ نہیں 398
بدعت سنت کو مٹا دیتی ہے/الٰہی قانونِ مکافاتِ عمل مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ 400
جماعتِ حقہ کیلئے آخرت کے انعامات 400
قانون جزاء وسزاء کی دفعات 402
شریعت کا تصورِ مساوات 405
اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السّلام 406
دین ابراہیم کی صفات 407
اللہ کا تصرف اور احاطہ کائنات کی ہر چیز پر مکمل اور دائمی 408
حق مہر کے احکامات اور شرعی حیثیت/سماج کے دَبے کچلے طبقات کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیسا ہو ناچاہئے 410
نکاح میں مہر کی حکمت ومصلحت 410
لفظ تَرْغَبُوْنَ کی وضاحت 413
اسلامی تعلیمات اور کمزور طبقات 414
اسلام کمزوروں کا محافظ 415
زوجین کے درمیان باہمی اختلافات کا حل اور باہمی محبت کے لیے وظیفہ 419
میاں بیوی میں صلح وخیر کا قرآنی اصول/نُشُوْزًا کا معنیٰ ومفہوم 419
زوج کا معنیٰ ومفہوم 421
صلح وسیع تر مفہوم میں 422
استحکام خاندان میں عورت کا کردار 425
مرد کا حق طلاق اور عورت کا حق خلع 429
کسی ایک بیوی کی طرف میلان طبع کی وجوہ 429
بیویوں کے درمیان عدل کی حقیقت 431
علیحدگی کی صورت 431
خلع اور طلاق کے اہم اسباب 433
طلاق دینے کا بہتر طریقہ 434
خلع لینے کا صحیح طریقہ 434
مقاصدِ شریعت اور انسانی مصلحتیں 436
اللہ کی بے نیازی 436

بے نیازی کا مفہوم 438
شرعی احکام انسانوں کی مصالح پر مبنی ہیں 438
کائنات کی تبدیلی اور نسلوں کو بدلنا 440
دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا مطالبہ 442
اسلام میں گواہی کی اہمیت 444
انصاف کی گواہی کا تاکیدی حکم 444
جھوٹی گواہی کا وبال 448
جن افراد کی گواہی شرعاً مقبول و معتبر نہیں 449
ضروریاتِ دین پر ایمان لانا ضروری ہے/ اٰمَنُوْا
اٰمِنُوْا کی تحقیق و تشریح 451
اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مفہوم اور اس کی حقیقت
..... 451
ایمان بالرسول کا مفہوم 454
ایمان بالکتب سے مراد 454
ایمان بالملائکہ کا مفہوم 455
ایمان بالآخرت کا مفہوم و مطلب 457
نفاق اعتقادی کے دو اسباب اور نفاق عملی کے تین
اسباب اور ان کا علاج 460
ایمان اور فکر کی بار بار تبدیلی 460
لفظ بشارت کا طنزیہ استعمال 462
نفاق اعتقادی کے دو اسباب اور ان کا علاج ... 463
غیر مسلموں کے ساتھ ظاہری اور دلی تعلق کا حکم ... 464
شعائرِ دین کا مذاق ایک سنگین جرم اور ہمارے
معاشرے میں اس کی مروّجہ صورتیں 467
شعائرِ دین کا مذاق اڑانا ایک سنگین جرم 467
منافقین کی نفسیات، ان کی دوغلی پالیسی اور موقع پرستی
..... 471
منافقین سے دوستی کی ممانعت/ منافقوں کی علامات/
شکر کی حقیقت، اہمیت اور ثمرات 474
خَادِعُھُمْ کا معنیٰ و مفہوم 474
نماز میں سستی کرنا منافقوں کی علامت ہے .. 476
منافقین کی مُّذَبْذَبِیْنَ والی کیفیت 477
کافروں سے دلی دوستی کی ممانعت 478
صریح حجت (سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا) 479
الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ (سب سے نچلا درجہ) 479
عمل صالح اختیار کرنے والے مومنین کیلئے بشارت
..... 480
اللہ کی صفت شاکر (قدر دان) اور علیم (سب کچھ جاننے
والا) 482
عذاب سے بچنے کے دو پکے راستے 483

☆☆☆☆

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ!

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے امت کی رہنمائی کے لیے دو چیزیں چھوڑی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید، اور دوسرا اپنا طریقہ زندگی، جس کو ہم سنت رسول ﷺ کہتے ہیں۔ یہ امت جب تک ان دونوں سے اپنے آپ کو وابستہ رکھے گی، ان شاء اللہ راہ راست پر رہے گی، اور گمراہی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے گی، اسی لیے علماء امت نے ہر دور میں اور ہر زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور حدیث پاک کی شروحات کی طرف توجہ کی ہے، جس سے امت کے افراد رہنمائی حاصل کر کے پاکیزہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ بفضلہ تعالیٰ ذخِیرَۃُ البُرْھَان فِی فَھْمِ القُرْآن کی پہلی جلد: اٰلٓمّٓ دوسری جلد: سَیَقُوْلُ تیسری جلد: تِلْکَ الرُّسُلُ چوتھی جلد لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ مقبول ہوئی، اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ اس کے بعد حوصلہ مزید بڑھا تو اب یہ اسی سلسلے کی پانچویں جلد: وَالْمُحْصَنٰتُ کا پارہ تیار ہو کر pdf کی صورت میں منظر عام پر ہے۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی اس عارضی حیات مستعار میں اس سلسلے کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں اور اس تفسیر کی طباعت کا انتظام و اسباب مہیا فرما دیں۔ اور طلبائے عظام، علمائے امت، خطبائے کرام، مدرسین کو اس کی قدر دانی کی توفیق دے کر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اسے دنیا کے گوشے گوشے میں عام کرنا چاہئے تا کہ قرآن کریم سے مسلمانوں کا رشتہ دوبارہ بحال ہو جائے۔

اہل علم سے مؤدبانہ التماس ہے کہ میری جنبش قلم میں لغزش کا امکان ہے لہٰذا کسی طرح کی بھی لغزش پر تنقید برائے تنقیص سے صرف نظر کرتے ہوئے بغرض تصحیح اس کی نشاندہی فرمائیں تا کہ اسے دور کیا جا سکے۔ لہٰذا قلم نے جو کچھ صحیح باتیں قرآن پاک کی تشریح کے ضمن میں لکھی ہوں وہ

محض اللہ تعالی کی نوازش وتوفیق اور والدین اساتذہ واہل خانہ کی دعاؤں نیز بزرگوں کی کاوشوں اوران کے علمی ذخیروں سے استفادہ کا ثمرہ ہے۔لیکن خدانخواستہ اگر کچھ غلطی ہوئی ہوتو وہ خود راقم الحروف کی تقصیر اور کوتاہی ہے،جس کے لیے عنداللہ عفوو درگذر اور عندالناس صحیح ومشورہ کا طالب ہے۔ یااللہ ہمیں اپنے دین کے کاموں میں لگالیجئے !نفس وشیطان اور ہر شر سے بچا کر تمام تالیفات وخدمات کو شرف قبولیت عطافرمادیجئے اورانہیں ہمارے لئے ہمارے والدین کیلئے،اولاد ازواج کیلئے اساتذہ ومشائخ کیلئے محسنین ومتعلقین اور مرحومین کیلئے دارین کی سرخ روئی کا ذریعہ بنادیجئے،اللہ رب العزت سے دعاہے کہ:ذخِیرَۃُ البُرْھَان فِی فَھْمِ القُرْآن کو تمام طلباء ومدرسین اور ہر خاص وعام کیلئے نفع بخش بنائے اللہ تعالیٰ میری اس خدمت کاوش کو شرف قبولیت عطافرماویں اورامت کے لیے اس کو نافع بنائیں اور آئندہ بھی اس طرح کی مفید خدمات کی توفیق عطافرماتے رہیں۔

قاری محمد اکرام غفرلہٗ
مدرس!مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)
2 ربیع الثانی 1448ھ بمطابق 15 ستمبر 2026

☆☆☆☆

شرائط حلت/ قیدی عورتوں اور لونڈیوں سے تمتع کی شرط

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۲۴

ابدی اور وقتی محرمات

وَّالْمُحْصَنٰتُ	اور (حرام ہیں) شادی شدہ	مِنَ النِّسَآءِ	عورتیں (بھی)
اِلَّا مَا	مگر جن کے	مَلَكَتْ	مالک ہوں
اَیْمَانُكُمْ	تمہارے دائیں ہاتھ	كِتٰبَ اللّٰہِ	(یہ) لکھ دیا ہے اللہ نے
عَلَیْكُمْ	تم پر	وَاُحِلَّ	اور حلال کر دی گئی ہیں
لَكُمْ	تمہارے لیے	مَّا وَرَآءَ	جو علاوہ ہیں
ذٰلِكُمْ	ان کے	اَنْ تَبْتَغُوْا	بشرطیکہ تم تلاش کرو
بِاَمْوَالِكُمْ	اپنے مالوں کے بدلے	مُّحْصِنِیْنَ	نکاح میں لانے والے ہو
غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ	نہ کہ بدکاری کرنے والے	فَمَا	پھر جو

اسْتَمْتَعْتُمْ	فائدہ اُٹھایا تم نے	بِهٖ	اس کے بدلے
مِنْهُنَّ	ان سے	فَاٰتُوْهُنَّ	تو تم دو انہیں
اُجُوْرَهُنَّ	ان کے مہر	فَرِيْضَةً ؕ	مقرر شدہ
وَلَا	اور نہیں	جُنَاحَ	کوئی گناہ
عَلَيْكُمْ	تم پر	فِيْمَا	اس (کمی بیشی) میں کہ
تَرٰضَيْتُمْ	تم باہم راضی ہو جاؤ	بِهٖ	اس کے ساتھ
مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ	مقرر کر لینے کے بعد	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
عَلِيْمًا	خوب جاننے والا	حَكِيْمًا ۲۴	بڑا حکمت والا

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی عدت کے بعد وہ تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں۔ وہ عورتیں (تم پر حرام ہیں) جو دوسرے شوہروں کے نکاح میں ہوں۔ محصنہ کا ایک معنی تو خاوند والی عورت ہے اور اس کا دوسرا معنی پاکدامنہ بھی ہوتا ہے۔ گویا محصنہ عفت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال یہاں پر محصنہ کا معنی منکوحہ یعنی خاوند والی عورت ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عورت بھی اپنے خاوند کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے حرام ہے۔ تاہم یہ قسم وقتی محرمات میں سے ہے، ابدی نہیں۔ کوئی منکوحہ عورت طلاق یا بیوگی کے بعد دوسرے شخص کے نکاح میں جا سکتی ہے۔

محرمات ابدیہ کون کون سے ہیں؟

اسلامی فقہ میں محرمات سے مراد وہ خواتین یا مرد ہیں جن سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام (نکاح ابدی طور پر ممنوع) ہوتا ہے۔ ان رشتوں کی بنیادی طور پر تین وجوہات ہیں: نسب (خون کا رشتہ)، رضاعت (دودھ پینا)، اور مصاہرت (سسرالی رشتہ) یعنی: تمام اصول (یعنی والدہ، دادی، نانی وغیرہ اوپر تک) اور فروع (یعنی بیٹی، پوتی، نواسی وغیرہ نیچے تک) محارم ہیں، اسی طرح بہن اور بہن کی اولاد (یعنی بہن کی بیٹی، پوتی، نواسی وغیرہ)، اسی طرح بھائی کی اولاد (بیٹی، پوتی، نواسی

وغیرہ)، پھوپھی اور خالہ بھی محارم میں شامل ہیں، اسی طرح بیوی کی ماں (خوش دامن) اور اس کی دادی، نانی وغیرہ، بیوی کی بیٹی (جو کسی اور شوہر سے ہو اور آپ کے زیرِ کفالت ہو) جب کہ بیوی سے صحبت کی ہو، والد کی منکوحہ (جس کو ہمارے عرف میں سوتیلی ماں کہا جاتا ہے) اور بیٹے کی منکوحہ (بہو) بھی محارم میں سے ہیں، یہی تمام رشتے اگر رضاعی ہوں تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ البتہ جو کنیزیں تمہاری ملکیت میں آجائیں (وہ مستثنیٰ ہیں) اس سے پہلی آیت میں حرام رشتوں کا ذکر تھا، وہ تو بہر صورت حرام ہیں، خواہ ان میں سے کوئی عورت کسی کی لونڈی بن کر آجائے۔ اس بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ دو بہنوں کو جمع کرنا صرف نکاح ہی میں نہیں بلکہ ایک مالک کی لونڈیاں ہوں تب بھی اسے دونوں سے صحبت حرام ہے۔ (ابن کثیر) اب یہاں فرمایا کہ جن عورتوں کے شوہر موجود ہوں ان سے نکاح بھی حرام ہے، ہاں جنگ کی صورت میں دارالحرب سے جو عورتیں قیدی بن کر آئیں تو اموال غنیمت کی تقسیم کے بعد جن کے حصہ میں آئیں گی ان کے لیے "استبراء" کے بعد ان سے صحبت جائز ہے، خواہ پیچھے ان کے خاوند موجود ہی کیوں نہ ہوں۔ "استبراء" یہ ہے کہ وہ عورت ایک حیض سے پاک ہو جائے، یا اگر حاملہ ہے تو وضع حمل ہو جائے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (8ھ میں) حنین کے دن اوطاس کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا، ان کا مقابلہ دشمن سے ہوا تو انھوں نے مقابلہ کیا اور فتح پائی، بہت سے قیدی ان کے ہاتھ آئے، (تقسیم کے بعد جو لونڈیاں حصے میں آئیں) صحابہ کرام علیہم الرضوان نے ان قیدی عورتوں سے صحبت کو گناہ سمجھا، اس لیے کہ ان کے مشرک شوہر موجود تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ الغرض! محرمات کی پہلی قسم نسبی اعتبار سے ہے جیسے ماں، بیٹی، بہن وغیرہ دوسری قسم رضاعی ہے اور اس میں وہ رشتے آتے ہیں جو دودھ میں شرکت کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں۔ تیسری قسم مصاہرت کی ہے یعنی وہ رشتے جو دامادی اور سسرالی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں، گزشتہ دروس میں تینوں قسم کے محرمات نکاح کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ آج کے درس میں محرمات کی چوتھی اور آخری قسم کا بیان ہے اور اس میں منکوحہ عورتیں آتی ہیں۔ ارشاد ہے وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اور خاوند والی یعنی منکوحہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو

عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نکاح نہیں کرسکتا۔نکاح ثانی کے لیے پہلے نکاح کا فسخ ہونا ضروری ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا اس منکوحہ عورت کا خاوند خود طلاق دے دے یا وہ فوت ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد وہ عورت کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے۔ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں جس کی رو سے کسی ایسی عورت سے نکاح کیا جاسکے جس کا نکاح پہلے کسی کے ساتھ ہو چکا ہے۔قرآن کریم میں "إِحْصَانٌ" چار معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔(1) شادی (2) آزادی (3) پاک دامنی (4) اور اسلام۔اس اعتبار سے محصنات کے چار مطلب ہیں (1) شادی شدہ عورتیں (2) آزاد عورتیں (3) پاک دامن عورتیں (4) اور مسلمان عورتیں۔ یہاں پہلا معنی مراد ہے۔ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اللہ نے یہ احکام تم پر فرض کر دیئے ہیں۔یعنی جن حرام رشتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے،ان سے نکاح نہ کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کا ماننا تم پر لازم ہے۔(ابن کثیر) وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ان عورتوں کو چھوڑ کر تمام عورتوں کے بارے میں یہ حلال کر دیا گیا ہے کہ تم اپنا مال (بطور مہر) خرچ کر کے انہیں (اپنے نکاح میں لانا) چاہو، بشرطیکہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کا رشتہ قائم کر کے عفت حاصل کرو، صرف شہوت نکالنا مقصود نہ ہو۔یعنی ان کے سوا دوسری عورتوں سے نکاح تمہارے لیے حلال ہے۔اور ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں، بشرطیکہ حدیث میں ان کی حرمت نہ آئی ہو، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے کسی عورت کے ساتھ اس کی خالہ یا پھوپھی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے سے منع فرمایا۔ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ نزول قرآن کے وقت غلام اور لونڈی کا سلسلہ عام تھا جسے قرآن نے بند نہیں کیا، البتہ ان کے بارے میں ایسی حکمت عملی اختیار کی گئی کہ جس سے غلاموں اور لونڈیوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل ہوں تاکہ غلامی کی حوصلہ شکنی ہو۔اس کے دو ذریعے تھے۔ایک تو بعض خاندان صدیوں سے ایسے چلے آرہے تھے کہ ان کے مرد اور عورت فروخت کر دیئے جاتے تھے۔یہی خریدے ہوئے مرد وعورت غلام اور لونڈی کہلاتے تھے۔مالک کو ان سے ہر طرح کے استمتاع (فائدہ اٹھانے) کا حق حاصل ہوتا تھا۔دوسرا ذریعہ جنگ میں قیدیوں والا تھا، کہ کافروں کی قیدی عورتوں کو مسلمانوں میں

تقسیم کر دیا جاتا تھا اور وہ ان کی لونڈیاں بن کر ان کے پاس رہتی تھیں۔ قیدیوں کے لئے یہ بہترین حل تھا۔ کیونکہ اگر انہیں معاشرے میں یوں ہی آزاد چھوڑ دیا جاتا تو معاشرے میں ان کے ذریعے سے فساد پیدا ہوتا۔ فی زمانہ جنگی قیدیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، ان پر جو ظلم وستم ڈھائے جاتے ہیں ان کا تصوّر رتک لَرز ا دینے والا ہوتا ہے۔ اسلام نے جنگی قیدیوں کے مسئلے میں ایسا بہترین حل پیش کیا کہ جس کی مثال کہیں نہیں ملتی، وہ یہ کہ جنگ میں قید ہونے والے مردوں کو غلام بنالیا جائے اور عورتوں کو لونڈیاں، پھر انہیں بھوکا پیاسا رکھنے، طرح طرح کی اذیتیں دینے یا دن رات ان سے جبری مزدوری لینے کی بجائے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی، بلکہ فدیہ لئے بغیر یا فدیہ لے کر ہی سہی انہیں چھوڑ دینے کی ترغیب بھی دی، آزاد کرنے پر ثواب کی بے شمار بشارتیں سنائیں، جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانا لازمی قرار نہیں دیا بلکہ مُکافاتِ عمل کے طور پر صرف اجازت دی کیونکہ اس دور میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا رواج تھا جس کو اسلام نے تدریجاً ختم کر دیا۔ لونڈی یا باندی کے لفظ سے غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے، اگر اسلامی مملکت اور دشمن ملک کے درمیان جنگ چھڑ جائے اور مرد وعورت گرفتار کئے جائیں تو تین صورتیں ہوسکتی ہیں: یا تو قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کرلیا جائے، یہ صورت سب سے بہتر ہے، اور اس صورت میں غلام و باندی بنانے کا کوئی سوال ہی نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں فریق اسیران جنگ کو تہہ تیغ کر دیں، ظاہر ہے کہ یہ بدترین بات ہوگی کہ پُر امن شہریوں کا قتل عام ہو، تیسری صورت یہ ہے کہ اگر دشمن قیدیوں کے تبادلہ پر آمادہ نہ ہوں تو ان قیدیوں کو قانونی طریقہ پر اپنے ملک میں جذب کرلیا جائے، اسی مقصد کے لئے اسلام نے غلام اور باندی بنانے کی اجازت دی، جو دوسرے مذاہب اور روم وایران کی حکومتوں میں پہلے سے مروج طریقہ تھا؛ البتہ دوسری قوموں میں غلاموں اور باندیوں کے کچھ حقوق نہیں ہوتے تھے، اسلام نے ان کے لئے حقوق متعین کئے، مالکان کے اختیارات کو محدود کیا، انھیں بنیادی انسانی حقوق عطا کئے اور حیثیت دی؛ چنانچہ اسلامی تاریخ میں غلام اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہے ہیں، علوم وفنون میں انھوں نے بڑا اونچا مقام حاصل کیا اور بعض اوقات حکومتیں تک کیں، جیسے ایجاب وقبول کے ذریعہ مرد وعورت

قانونی طور پر رشتۂ نکاح سے منسلک ہوتے ہیں، اسی طرح ایجاب وقبول کے ذریعہ باندیاں خرید کی جاتی تھیں، اور خرید وفروخت کے قانونی طریقۂ کار کے ذریعہ ایک عورت کسی کے حرم میں آتی تھی، اس کے بھی قریب قریب وہی حقوق ہوتے تھے، جو بیویوں کے ہیں، اور اس سے ہونے والی اولاد کے لئے بھی وہی حقوق واحکام ہیں، جو منکوحہ کے ذریعہ ہونے والی اولاد کے لئے ہوتے ہیں۔

موجودہ دور کے مہذب معاشرہ میں فاتح قوم قیدی عورتوں سے جس طرح کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتی ہے، اسلامی نقطہ نظر سے یہ صریح زنا ہے اور جس طرح آج کل قیدی عورتوں کو ایک کیمپ میں رکھا جاتا ہے اور فوجیوں کو عام اجازت دی جاتی ہے کہ جس عورت سے چاہیں زنا کرتے رہیں۔ یہ صرف زنا ہی نہیں رہتا بلکہ ایک وحشیانہ فعل بھی بن جاتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے ایسی عورتوں سے تمتع پر چند در چند پابندیاں لگائی ہیں۔ بہرصورت مسلمان شادی شدہ عورتیں تو ویسے ہی حرام ہیں تاہم کافر عورتیں بھی حرام ہی ہیں الاّ یہ کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت میں آجائیں۔ اس صورت میں استبرائے رحم کے بعد وہ ان کے لئے حلال ہیں۔ یعنی اس کے علاوہ دیگر عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ چار چیزیں اس میں ہوں، اول یہ کہ طلب کرو "اَنْ تَبْتَغُوا" یعنی دونوں طرف سے ایجاب وقبول ہو۔ دوسری یہ کہ مال یعنی مہر ادا کرنا قبول کرو، تیسری یہ کہ ان کو شادی کی قید (دائمی قبضے) میں لانا مقصود ہو۔ صرف شہوت رانی غرض نہ ہو (جیسے زنا میں یا اس متعہ میں ہوتا ہے جو شیعوں میں رائج ہے یعنی جنسی خواہش کی تسکین کے لئے چند روز یا چند گھنٹوں کا نکاح)۔ چوتھی یہ کہ چھپی یاری دوستی نہ ہو بلکہ گواہوں کی موجودگی میں نکاح ہو۔ یہ چاروں شرطیں اس آیت سے مستفاد ہیں۔ اس سے جہاں شیعوں کے متعہ کا بطلان ہوتا ہے وہیں مروجہ حلالہ کا بھی ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کا مقصد بھی عورت کو نکاح کی دائمی قید میں لانا نہیں ہوتا، بلکہ عرفاً یہ صرف ایک رات کے لئے مقرر اور معہود ذہنی ہے۔ (معہود: اس کا معنی طے شدہ، معروف، جانا پہچانا یا مقرر کیا ہوا ہے۔ ذہنی: ذہن یا عقل سے جڑی ہوئی بات۔ معہود ذہنی عربی اور اردو قواعد (گرامر) کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اسم جو بظاہر عام یا نکرہ ہو، لیکن بولنے والے (متکلم) اور سننے والے (مخاطب) کے ذہن میں کسی خاص اور متعین شخص یا شے کے لیے مخصوص ہو۔)

مہر کی کم از کم مقدار

فرمایا کہ عقد نکاح کے بعد فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ پس جو تم نے ان عورتوں سے فائدہ اٹھالیا فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ پس ان کا مقرر کیا ہوا مہر ان کو دے دو۔ میاں بیوی کے درمیان خلوت صحیحہ ہونے یا ہم بستری ہونے کے بعد مہر موکد ہو جاتا ہے اور پورا مہر ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے، چاندی میں اس کا وزن دو تولے ساڑھے سات ماشے ہے، اس کی جو قیمت بنتی ہو وہ مہر کی کم از کم مقدار ہے، زیادہ کی کوئی حد نہیں باہمی رضامندی سے جتنا چاہے مقرر کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خیال رکھیں کہ مہر اتنا مقرر کریں جتنا دے سکتے ہوں۔ مہر کا مال ہونا ضروری ہے اور جو چیز مال نہیں وہ مہر نہیں بن سکتی، مثلاً مہر یہ ٹھہرا کہ شوہر عورت کو قرآنِ مجید یا علمِ دین پڑھا دے گا تو اس صورت میں مہرِ مثل واجب ہوگا۔ نکاح میں مہر کا ذکر ہی نہ ہوا یا مہر کی نفی کر دی کہ مہر کے بغیر نکاح کیا تو نکاح ہو جائے گا اور اگر خلوتِ صحیحہ ہو گئی یا دونوں میں سے کوئی مر گیا اور نکاح کے بعد میاں بیوی میں کوئی مہر طے نہیں پایا تھا تو مہرِ مثل واجب ہے ورنہ جو طے پایا تھا وہ واجب ہے۔

عورت سے نفع اٹھانے کی جائز صورتیں

یاد رہے کہ اسلام میں عورت سے نفع اٹھانے کی صرف دو صورتیں جائز ہیں جو قرآنِ پاک میں بیان کی گئی ہیں: (1) شرعی نکاح کے ذریعے۔ (2) عورت جس صورت میں لونڈی بن جائے۔ لہٰذا اس کے علاوہ ہر صورت حرام ہے۔ شروعِ اسلام میں کچھ وقت کیلئے نکاح سے کچھ ملتا جلتا معاہدہ کر کے فائدہ اٹھانے کی اجازت تھی لیکن بعد میں تاجدارِ رسالت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اسے قیامت تک کے لئے حرام فرما دیا۔ جیسا کہ حضرت سَبُرَہ جُہَنِی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضور سیدُ المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے (متعہ کی صورت میں) نفع اٹھانے کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے تو جس کے پاس کوئی ایسی عورت ہو وہ اسے چھوڑ دے اور جو انہیں دے

چکے ہو اس میں سے کچھ نہ لو۔ (مسلم، کتاب النکاح، باب نکاح المتعۃ و بیان انہ ابیح ثم نسخ۔۔۔الخ، ص ۷۲۹، الحدیث: ۲۱(۱۴۰۶)) اور حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیم سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے متعہ سے منع فرمادیا۔ (ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی نکاح المتعۃ، ۲/ ۳۶۵، الحدیث: ۱۱۲۴)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ تم میاں بیوی آپس میں راضی ہو جاؤ مہر مقرر ہونے کے بعد۔ آپس کی رضامندی سے اگر عورت مہر کلی یا جزوی طور پر معاف کر دیتی ہے تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس کے مطابق عمل کر سکتے ہو۔ پھر پورا مہر ادا کرنا لازم نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر مرد رضامندی سے مقررہ مہر سے زیادہ ادا کر دے تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ نکاح کے وقت مالی حالت اچھی نہ تھی، بعد میں بہتر ہو گئی۔ اب اگر خاوند مقررہ مہر سے زیادہ ادا کرنا چاہیے تو اسے اجازت ہے اور اگر نکاح کے وقت مہر بالکل مقرر ہی نہ کیا گیا ہو تو مہر کی ادائیگی پھر بھی لازم ہے اور اس کی مقدار وہ ہو گی جو میاں بیوی بعد میں طے کر لیں۔ بہر حال فرمایا کہ جس عورت سے فائدہ اٹھایا ہے اس کا مقررہ مہر ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ نے جو بھی احکام نازل فرمائے ہیں ان میں ہر لحاظ سے بہتری ہے اور جن عورتوں سے نکاح حرام ٹھہرایا ہے اس میں بھی مصلحت ہے۔ جائز نکاح کے ساتھ جو شرائط اور پابندیاں عائد کی ہیں ان میں بھی حکمت پوشیدہ ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین پر صدق دل سے یقین رکھے اور ان پر عمل پیرا رہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز حتی کہ ہر ضعف، کمزوری حاجت اور پریشانی کو جانتا ہے اور اس کی ہر بات اور ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں حکمت پوشیدہ ہے لہٰذا انسان کے لیے لازم ہے کہ اس کی تعمیل کرے۔

☆☆☆

لونڈی اور آزاد عورت میں تقابل/ بے حیائی کی سزا

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ط وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ ط بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ج فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ط ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ ط وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ⑤

احصان کا معنیٰ اور زنا کے باب میں احصان کی شرائط

وَمَنْ	اور جو شخص	لَّمْ یَسْتَطِعْ	نہ رکھے
مِنْکُمْ	تم میں سے	طَوْلًا	طاقت
اَنْ یَّنْکِحَ	نکاح کرنے کی	الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ	آزاد مومن عورتوں سے
فَمِنْ	تو (نکاح کرلے) اس سے	مَّا مَلَکَتْ	جن کے مالک ہوئے
اَیْمَانُکُمْ	دائیں ہاتھ تمہارے	مِّنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ	تمہاری مومن لونڈیوں سے
وَاللّٰہُ	اور اللہ	اَعْلَمُ	خوب جانتا ہے

بِاِیْمَانِکُمْ ؕ	تمہارے ایمان کو	بَعْضُکُمْ	ایک تمہارا
مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ	دوسرے سے ہے	فَانْکِحُوْھُنَّ	چنانچہ تم ان سے نکاح کرلو
بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ	ان کے مالکوں کی اجازت سے	وَاٰتُوْھُنَّ	اور تم دو انہیں
اُجُوْرَھُنَّ	ان کے مہر	بِالْمَعْرُوْفِ	دستور کے موافق
مُحْصَنٰتٍ	جبکہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں		
غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ	اس حال میں کہ نہ ہوں بدکاری کرنے والیاں		
وَّلَا مُتَّخِذٰتِ	اور نہ بنانے والیاں ہوں	اَخْدَانٍ ۚ	چھپے یار
فَاِذَآ	پھر جب	اُحْصِنَّ	وہ نکاح میں لائی جا چکیں
فَاِنْ اَتَیْنَ	پھر اگر وہ کریں	بِفَاحِشَۃٍ	بے حیائی (کا کام)
فَعَلَیْھِنَّ	تو ان پر ہے	نِصْفُ	آدھی
مَا	اس سے جو	عَلَی الْمُحْصَنٰتِ	آزاد عورتوں پر ہے
مِنَ الْعَذَابِ ؕ	سزا سے	ذٰلِکَ	یہ (اجازت)
لِمَنْ	اس کے لیے ہے جو	خَشِیَ	ڈرے
الْعَنَتَ	تکلیف میں پڑنے سے	مِنْکُمْ ؕ	تم میں سے
وَاَنْ تَصْبِرُوْا	اور تمہارا صبر کرنا	خَیْرٌ	بہتر ہے
لَّکُمْ ؕ	تمہارے لیے	وَاللّٰہُ	اور اللہ
غَفُوْرٌ	بہت بخشنے والا	رَّحِیْمٌ ﴿۲۵﴾	نہایت رحم کرنے والا ہے

وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ۔ اور تم میں سے جو لوگ اس بات کی طاقت نہ رکھتے ہوں کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرسکیں، تو وہ ان مسلمان کنیزوں میں سے کسی سے نکاح کر سکتے ہیں جو تمہاری ملکیت میں ہوں،: یہاں "طول" سے مراد مالی وسعت، طاقت اور وہ استطاعت

ہے جس سے آزاد عورت کا مہر اور خرچ اٹھایا جاسکے۔ جب کوئی شخص آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھے تو اسے آسانی دی گئی ہے یعنی اگر کسی شخص کی مالی حالت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرے تو کسی دوسرے مسلمان کی لونڈی سے نکاح کرلے، بشرطیکہ وہ لونڈی مسلمان ہو۔ یہاں کسی شخص کو اپنی لونڈی سے نکاح کرنے کی اجازت کا بیان نہیں، کیونکہ اس کا لونڈی ہونا ہی مالک کے لیے اس سے صحبت کے جواز کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اس سے صحبت نہیں کرسکتا اور اس کی اولاد جائز اولاد سمجھی جائے گی، ہاں اگر نکاح ہی کرنا چاہتا ہے تو پھر اسے آزاد کردے اور آزاد کرکے نکاح کرلے۔ (فتح القدیر)

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ کا مفہوم

لونڈیوں سے نکاح کے حکم کے ساتھ اس فقرے کو لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ظاہری معاشرتی درجے یا غلامی و آزادی سے بڑھ کر اصل اہمیت ایمان کی ہے۔ بظاہر معاشرے میں لونڈیوں کا مقام کمتر سمجھا جاتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کے ظاہری مرتبے کو دیکھ کر حقارت نہ کرو؛ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں اور ایمان کی حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی کنیز ایمان وتقویٰ میں کسی آزاد عورت سے بڑھ کر ہو، اس لیے ایمان ہی اصل فضیلت کا معیار ہے۔ باندی سے نکاح کرنے کے متعلق شرعی مسئلہ جو شخص آزاد عورت سے نکاح کی قدرت رکھتا ہو اسے بھی مسلمان کنیز سے نکاح کرنا جائز ہے البتہ اگر آزاد عورت نکاح میں ہو تو اب باندی سے نکاح نہیں کرسکتا۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۲۵، ۱/ ۳۶۸)(2)..... احناف کے نزدیک کتابیہ لونڈی سے نکاح بھی کرسکتا ہے جبکہ مومنہ کنیز کے ساتھ مستحب ہے۔ (مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۲۵، ص ۲۲۲) وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ: اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ اہلِ عرب اپنے نسب پر فخر کرتے اور لونڈیوں سے نکاح کو باعث عار سمجھتے تھے، ان کے اس خیال کی تردید کی گئی کہ نسب میں تم سب برابر ہو کہ سبھی حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی اولاد ہو لہٰذا لونڈیوں سے نکاح کرنا باعثِ شرم نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ تم سب ایمان میں مُشْتَرَک ہو کہ تمہارا دین اسلام ہے اور ایمان والا

ہونا بڑی فضیلت کا حامل ہے بلکہ فضیلت کا دارومدار تو ایمان اور تقویٰ پر ہے اس لئے جب لونڈیوں سے نکاح کی حاجت ہو تو شرماؤ نہیں، ان کا ایمان والا ہونا کافی ہے۔ (تفسیر کبیر، النساء، تحت الآیۃ: ۴،۲۵ / ۴۹، جمل، النساء، تحت الآیۃ: ۲۵، ۲ / ۳۹، ملتقطاً)

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یعنی تم سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور تمہاری ملت بھی ایک ہے، پھر محض لونڈی ہونے کی وجہ سے اس سے نکاح میں تردد نہ کرو۔ (شوکانی) اس کا مطلب ہے کہ تم سب ایک ہی جنس اور ایک ہی دین (اسلام) سے تعلق رکھتے ہو۔ لہٰذا مومن لونڈیوں کو اپنے سے کمتر نہ سمجھو کیونکہ ایمان کے رشتے نے تم سب کو آپس میں برابر کر دیا ہے غرضیکہ بوقت ضرورت باندیوں سے نکاح میں عار نہ کرنی چاہئے؛ کیوں کہ تم سب ایک ہی آدم کی اولاد ہو، اصل وجہ فضیلت اور باعث عزت دولت اِیمان ہے، اور ایمان میں کس کا کیا مقام ہے؟ یہ خدا ہی کو معلوم ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ ایک آزاد مرد اگر آزاد عورت سے شادی کے اخراجات کا متحمل نہ ہو اور اسے یہ بھی خدشہ ہو کہ اگر نکاح نہ کرے تو جنسی آوارگی کا شکار ہو جائے گا تو اس صورت میں اسے مومنہ لونڈی سے نکاح کر لینے کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی فرمایا کہ پھر بھی اگر تم صبر کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اس بہتری کی صورت اور حکمت تو اللہ ہی جانتا ہے بظاہر تو یہی بہتری نظر آتی ہے کہ اولاد آزاد پیدا ہوگی اور اس صبر کا جو طریقہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ نوجوان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہا کرتے اور ہمیں شادی کرنے کا مقدور نہ تھا۔ تو آپ نے فرمایا اے نوجوانو! تم میں سے جو شخص خانہ داری کی استطاعت رکھتا ہے اسے چاہیے کہ شادی کر لے۔ کیونکہ نکاح سے نگاہ نیچی اور شرمگاہ بچی رہتی ہے۔ اور جو یہ طاقت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھا کرے جو اس کی شہوت کو توڑ دیں گے۔ (بخاری۔ کتاب النکاح) مرد کے لئے نکاح کا شرعی حکم یہ ہے کہ اعتدال کی حالت میں یعنی نہ شہوت کا زیادہ غلبہ ہو اور وہ نامرد بھی نہ ہو، نیز مہر اور نان نفقہ دینے پر قدرت رکھتا ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا سنتِ مؤکدہ ہے۔ لیکن اگر اسے زنا میں پڑنے کا اندیشہ ہے اور وہ زوجیت کے حقوق پورے کرنے پر قادر ہے تو اس کے لئے نکاح کرنا

واجب ہے اور اگر اسے زنا میں پڑنے کا یقین ہو تو اس پر نکاح کرنا فرض ہے۔ اگر اسے زوجیت کے حقوق پورے نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو اس کا نکاح کرنا مکروہ اور حقوق پورے نہ کر سکنے کا یقین ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا حرام ہے۔ عورت کے لئے نکاح کا شرعی حکم یہ ہے کہ جس عورت کو اپنے نفس سے اس بات کا خوف ہو کہ غالباً وہ شوہر کی اطاعت نہ کر سکے گی اور شوہر کے واجب حقوق اس سے ادا نہ ہو سکیں گے تو اسے نکاح کرنا ممنوع و ناجائز ہے، اگر کرے گی تو گناہگار ہو گی۔ اگر اسے ان چیزوں کا خوف یقینی ہو تو اسے نکاح کرنا حرام قطعی ہے۔ جس عورت کو اپنے نفس سے ایسا خوف نہ ہو اسے اگر نکاح کی شدید حاجت ہے کہ نکاح کے بغیر مَعَاذَ اللہ گناہ میں مبتلاء ہو جانے کا ظن غالب ہے تو ایسی عورت کو نکاح کرنا واجب ہے اور اگر نکاح کے بغیر گناہ میں پڑنے کا یقین کلی ہو تو اس پر نکاح کرنا فرض ہے۔ اگر حاجت کی حالت اعتدال پر ہو یعنی نہ نکاح سے بالکل بے پروائی ہو، نہ اس شدت کا شوق ہو کہ نکاح کے بغیر گناہ میں پڑنے کا ظن غالب ہو تو ایسی حالت میں اس کے لئے نکاح کرنا سنت ہے جبکہ وہ اپنے آپ پر اس بات کا کافی اطمینان رکھتی ہو کہ اس سے شوہر کی اطاعت ترک نہ ہو گی اور وہ شوہر کے حقوق اصلاً ضائع نہ کرے گی۔

اعلانیہ نکاح بمقابلہ خفیہ دوستی

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ : یعنی جیسے آزاد مسلمان عورت سے نکاح کے لیے ولی (سرپرست) کی اجازت ضروری ہے، اسی طرح لونڈی سے نکاح کے لیے بھی اس کے مالک کی اجازت ضروری ہے۔ اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کرسکتا۔ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ :ان الفاظ سے بعض نے سمجھا ہے کہ مہر لونڈی کا حق ہے، لیکن اکثر علمائے سلف کے نزدیک یہ مہر لونڈی کے مالک کا ہوگا، لونڈی کی طرف مہر کی اضافت مجازی ہے۔ (فتح القدیر) بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ اور ان کو قاعدے کے مطابق ان کے مہر ادا کرو، بشرطیکہ ان سے نکاح کا رشتہ قائم کر کے انہیں پاک دامن بنایا جائے، نہ وہ صرف شہوت پوری کرنے کے لیے کوئی (ناجائز) کام کریں، اور نہ خفیہ طور پر ناجائز

آشنائیاں پیدا کریں۔

نکاح منعقد ہونے کی بنیادی شرط

وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ: اخدان خدن کی جمع ہے "خفیہ آشنا" چھپی یاری سے منع فرمایا تو نکاح میں گواہ لازم ہوئے۔ یاد رہے کہ نکاح کے صحیح ہونے کی بنیادی شرائط یہ ہیں کہ مرد وعورت خود یا ان کے وکیل نکاح کی مجلس میں شرعی گواہوں کی موجودگی میں نکاح کا ایجاب وقبول کرلیں، مثلاعورت کہے کہ: "میں نے اپنے آپ کو تمہارے نکاح میں دے دیا" اور مرد کہے کہ: "میں نے تمہیں اپنے نکاح میں قبول کرلیا"، اور مرد اور عورت یا ان کے وکیل کے اس ایجاب وقبول کو دو مسلمان عاقل بالغ مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اسی مجلس میں سن لیں۔ حاصل یہ ہے کہ نکاح کی مجلس میں ایجاب قبول کا ہونا اور اس کو شرعی گواہوں کا اسی مجلس میں سننا نکاح کی بنیادی شرائط ہیں، نیز نکاح میں مہر کا ہونا بھی ضروری ہے، البتہ اگر مجلس نکاح میں مہر متعین نہ ہوا ہو تب بھی نکاح ہو جائے گا اور مہر ذمے میں لازم ہوگا۔ نیز یہ ملحوظ رہے کہ شریعتِ مطہرہ میں گواہوں کی موجودگی میں اعلانیہ نکاح کرنے کا حکم ہے، اسی وجہ سے مسجد میں نکاح کرنا اور ایسے وقت نکاح کرنا پسندیدہ ہے کہ جب مجمع زیادہ ہو، مثلاً جمعہ کے دن پسندیدہ ہے اور چھپ چھپا کر نکاح کرنا شرعاً پسندیدہ نہیں ہے، اگرچہ نکاح کی شرائط اور دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ط پھر جب وہ نکاح کی حفاظت میں آجائیں، اور اس کے بعد کسی بڑی بے حیائی (یعنی زنا) کا ارتکاب کریں تو ان پر اس سزا سے آدھی سزا واجب ہوگی جو (غیر شادی شدہ) آزاد عورتوں کے لیے مقرر ہے۔ قرآن میں "محصنٰت" کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے: منکوحہ عورتیں، آزاد عورتیں اور پاک دامن عورتیں، یہاں یہ تیسرا معنی مناسب حال ہے، بعض حضرات نے پہلا معنی مراد لیا ہے اور گنجائش اس کی بھی ہے۔ "المحصنات" میں الف لام عہد کا ہے اس سے مخصوص محصنات یعنی کنواری آزاد عورتیں مراد ہیں کیونکہ ان کی سزا سو کوڑے ہے جس کا نصف ہو سکتا ہے

شادی شدہ آزاد عورتوں کی سزا رجم ہے اس کا نہ نصف ہوسکتا ہے نہ یہاں "المحصنات" سے وہ مراد ہیں یعنی لونڈی اگر شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کریں تو انھیں کنواری آزاد عورتوں کی سزا سے نصف سزا دی جائے گی جو پچاس کوڑے ہے۔ جن لوگوں نے اس آیت کو رجم کے انکار کی دلیل بنایا ہے کہ چونکہ رجم کا نصف ہو نہیں سکتا ہے اس لیے رجم شریعت میں ہے ہی نہیں انھوں نے اپنی کم علمی سے الف لام کا مفہوم سمجھا ہی نہیں نہ المحصنات کی صحیح مراد سمجھی ہے۔ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ: تو اگر وہ کسی بے حیائی کا اِرتکاب کریں۔ نکاح کے بعد اگر لونڈی زنا کرے تو آزاد عورت کے مقابلے میں اس کی سزا آدھی ہے یعنی آزاد کنواری عورت زنا میں مُلَوَّث ہو تو اس کی سزا سو کوڑے ہے اور لونڈی کی سزا اس سے آدھی یعنی پچاس کوڑے ہے۔ لونڈی چاہے کنواری ہو یا شادی شدہ اس کی سزا پچاس کوڑے ہی ہے، شادی شدہ لونڈی کو آزاد عورت کی طرح رجم نہیں کیا جائے گا کیونکہ رجم میں تَنصِیف یعنی اس سزا کو آدھا کرنا ممکن نہیں۔ (قرطبی، النساء، تحت الآیۃ: ۲۵، ۳ / ۱۰۲، الجزء الخامس)۔ عبداللہ بن عیاش مخزومی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے اور قریش کے چند نوجوانوں کو حکم دیا تو ہم نے حکومتی لونڈیوں میں سے کچھ لونڈیوں کو زنا کرنے کی وجہ سے پچاس پچاس کوڑے لگائے۔ [المؤطا، الحدود، باب ماجاء فی حد الزنا: 16]

محصن اور غیر محصن میں کیا فرق ہے؟

احصان "حصن" سے ہے، جس کا اصل معنی ہے: مضبوط اور محفوظ ہونا، اور حَصَنَتِ الْمَرْأَۃُ اور أَحْصَنَتِ الْمَرْأَۃُ کے تین معنی ہیں: (1) شادی شدہ ہونا۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ اور خاوند والی عورتیں (2) پاک دامن ہونا۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (النور 23) جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں (پاک دامن) بے خبر ایمان والیوں کو، ان کو پھٹکار ہے دنیا میں اور آخرت میں اور ان کے لیے ہے بڑا عذاب ہے۔ (3) آزاد ہونا۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ

مِنَ الْعَذَابِ (باندیاں اگر بے حیائی کا کام کریں تو) ان پر آدھی سزا ہے آزاد عورت کی سزا سے ۔حدِ زنا کے باب میں محصن شخص کی سزا رجم ہے اور غیر محصن کی سزا کوڑے ہے، اور زنا کے باب میں جو "اِحصان" ہے، اس کی سات شرائط ہیں: آزاد ہونا۔ عاقل ہونا۔ بالغ ہونا۔ مسلمان ہونا۔ اس کا نکاح صحیح ہو چکا ہو۔ نکاح کے بعد بیوی سے ازدواجی تعلق قائل کیا ہو۔ میاں بیوی نکاح کے بعد ازدواجی تعلق کے وقت صفتِ احصان کے ساتھ متصف ہوں۔ الغرض! فرمایا ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ جو تم میں سے مشقت میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ مقصد یہ کہ جو شخص مجبور ہو گیا۔ مالی حالت آزاد عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت نہیں دیتی اور نفسانی خواہش برائی پر آمادہ کرتی ہے اسے خوف ہے کہ کہیں گناہ میں ملوث نہ ہو جائے۔ تو ایسی صورت میں لونڈی کے ساتھ نکاح کی اجازت ہے۔ فرمایا وَاَنْ تَصْبِرُوْا واگر تم سخت ضرورت کے باوجود صبر کرو خَيْرٌ لَّكُمْ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں کئی طرح کی پریشانیاں بھی لاحق ہونگی مثلاً: لونڈی سے نکاح کرنے میں یہ نقصان ہے کہ جو بچے پیدا ہوں گے، غلام ہوں گے، اور جو شخص اس لونڈی کا مالک ہوگا، وہی ان بچوں کا بھی مالک قرار پائے گا؛ اس لئے جہاں تک ممکن ہو بہتر ہے کہ لونڈی کو نکاح میں لانے سے بچا جائے۔ لہٰذا صبر بہتر ہے وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۵ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ اور انسان اس پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے وہ بڑا مہربان ہے۔

☆☆☆

معاشرتی اصلاحات پر مخالفین کا شور وغوغا/ شرعی احکام میں انسانی کمزوریوں کا لحاظ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَیَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَیَتُوْبَ عَلَیْکُمْ ط
وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۲۶ وَاللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ ق وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ
الشَّھَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا ۲۷ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ ج وَخُلِقَ
الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ۲۸

انبیائے سابقین سے بنیادی عقائد میں مطابقت

یُرِیْدُ اللّٰہُ	ارادہ کرتا ہے اللہ	لِیُبَیِّنَ	کہ بیان کرے
لَکُمْ	تمہارے لیے	وَیَھْدِیَکُمْ	اور تمہیں ہدایت کرے
سُنَنَ الَّذِیْنَ	ان لوگوں کے طریقوں کی جو	مِنْ قَبْلِکُمْ	تم سے پہلے ہوئے
وَیَتُوْبَ	اور وہ متوجہ ہو	عَلَیْکُمْ ط	تم پر
وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ	اور اللہ خوب جاننے والا	حَکِیْمٌ ۲۶	نہایت حکمت والا ہے

فرمایا: یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (احکام کی) وضاحت کردے، یعنی تمہارے لیے وہ چیزیں جو تمہارے لیے حلال ہیں اور جو حرام ہیں اللہ تعالیٰ تمہیں وہ

باتیں بھی بتانا چاہتا ہے جو تمہارے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں اور جن میں تمہارا فائدہ ہے۔ اور وہ باتیں بھی جن سے بچنا بھی تمہارے لیے ضروری ہے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان اور اس کی مہربانی ہے کہ وہ ہمارے فائدے کی باتیں بیان کرتا ہے تاکہ ہم انہیں اختیار کرلیں اور نقصان دہ امور سے بچ جائیں۔ مفسر قرآن امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ بیان دو قسم کا ہوتا ہے۔ بیان کی پہلی قسم نص ہے اور اس سے مراد وہ احکام و فرامین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بالکل صراحت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں ان میں حلال و حرام بالکل واضح الفاظ میں بتلا دیئے ہیں۔ یا دوسری صورت میں یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے صریح الفاظ میں وضاحت فرما دی گئی ہے، یہ بھی نص ہے۔ بیان کی دوسری قسم وہ ہے جو دلالت کے ساتھ اخذ ہو۔ یہ احکام صراحتاً تو بیان نہیں کیے گئے مگر ایسے اشارات پائے جاتے ہیں جن سے اہل علم، مفکر، مجتہدین اور علماء غور و فکر کرکے ایسے احکام کو اخذ کرتے ہیں۔ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ اور جو (نیک) لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں، تم کو ان کے طور طریقوں پر لے آئے، اور تم پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائے، معلوم ہوا کہ جو عائلی اور معاشرتی احکام اس سورہ کے آغاز سے بیان ہو رہے ہیں۔ مثلاً یتیموں کے حقوق کی نگہداشت، عورت سے مختلف قسم کی بے انصافیاں، میراث کے احکام، نکاح اور محرمات کا ذکر وغیرہ، اسی طرح کے یا اس سے ملتے جلتے احکام ہی پہلے انبیاء علیہم السلام کو بھی وحی کیے گئے تھے اور ہمیں ان طریقوں پر مطلع نہیں کیا جا رہا بلکہ ان کے طریقوں کو اپنانے کی بھی ہدایت دی جا رہی ہے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ وہ جاہلیت کے طریقہ سے نکال کر صالحین کے طریقہ زندگی کی طرف ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ یعنی نکاح سے متعلق حرام و حلال کے جو احکام بتائے گئے ہیں، ان کو بوجھ نہ سمجھنا چاہئے کہ تم سے پہلے بھی اللہ کے نیک اور صالح بندے ان ہی اُصولوں پر اپنی زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ تمام انبیائے سابقین (پہلے آنے والے پیغمبروں) کی بنیادی دعوت، عقیدہ توحید، اور اصولِ اخلاق ایک جیسے تھے۔ ان کی لائی ہوئی شریعتوں میں فروعی احکام (جیسے نماز، روزے یا حلال و حرام کی ظاہری شکل) میں کچھ فرق ہو سکتا ہے، لیکن ان کی اساس، مقصد اور بنیادی پیغام میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے اس آیت سے یہ

بھی معلوم ہوا کہ گزشتہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے جو شرعی احکام قرآن یا حدیث میں تردید کے بغیر منقول ہوئے وہ ہمارے لئے بھی لائق عمل ہیں اور جو ممانعت کے ساتھ نقل ہوئے ان پر عمل جائز نہیں۔ آگے فرمایا وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۶﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ اس نے حلال حرام نکاح، طلاق وغیرہ کے متعلق جو بھی احکام دیئے ہیں ان میں ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ہے اور اس کے تمام اوامر ونواہی ہماری ہی بہتری کے لیے ہیں، جن عورتوں سے نکاح کو حرام قرار دیا گیا اس میں لازماً ہماری مصلحت اور انسانیت کا بھلا ہے۔ انسان کا علم ناقص اور محدود ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام حکمتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی علیم یعنی ہر چیز کو جاننے والی ہے۔ اور وہ حکیم ہے کہ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔

نفسانی خواہشات کا فتنہ

وَاللّٰہُ یُرِیْدُ	اور اللہ ارادہ کرتا ہے	اَنْ یَّتُوْبَ	یہ کہ وہ توجہ کرے
عَلَیْکُمْ	تم پر	وَیُرِیْدُ	اور ارادہ کرتے ہیں
الَّذِیْنَ	وہ لوگ جو	یَتَّبِعُوْنَ	پیروی کرتے ہیں
الشَّھَوٰتِ	خواہشات کی	اَنْ تَمِیْلُوْا	یہ کہ تم (حق سے) پھر جاؤ
مَیْلًا	پھر جانا	عَظِیْمًا ﴿۲۷﴾	بہت زیادہ

اللہ تعالیٰ نے دوبارہ تاکید کے طور پر فرمایا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرنا چاہتا ہے اور اپنی بخشش اور مہربانی سے تم پر رجوع کرنا چاہتا ہے برخلاف اس کے وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّھَوٰتِ وہ لوگ جو خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا ﴿۲۷﴾ اَنْ تَمِیْلُوا حق سے باطل کی طرف جھک جاؤ۔ یعنی تم کو راہ راست سے ہٹا کر پھر گمراہی کی طرف پھیر دیں۔ مقصد یہ ہے کہ شہوت پرست اور بندگانِ ہوس اخلاق اور قانون کے دائرہ میں رہنا نہیں چاہتے؛ بلکہ چاہتے ہیں کہ انسان تمام حدوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے جب انسان ہوائے نفس کی پیروی شروع کر دیتا ہے تو انتہائی گہرائیوں میں گرتا چلا جاتا ہے اور آخر کار یہ راستہ اسے جہنم میں لے جاتا ہے۔ یاد رکھیں! انسان اپنے ظاہری دشمنوں سے بچنے کی تدابیر

بنالیتا ہے لیکن اس کا باطنی دشمن اس کو اتنا نقصان پہنچا جاتا ہے کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ظاہری دشمن تو صرف انسان کی جان کے دشمن ہوتے ہیں لیکن باطنی دشمن انسان کے ایمان تک کو برباد کر دیتا ہے جو جان سے بہت زیادہ قیمتی اور عزیز ہے۔بہرحال ان خواہشات نفس کی پیروی کرنے والوں سے مراد وہ ہر طرح کے لوگ ہیں جو اللہ کی ہدایات پر اپنے آباؤ اجداد کے رسم ورواج کو مقدم سمجھتے اور انہی چیزوں سے محبت رکھتے ہیں خواہ وہ یہود ونصاریٰ ہوں یا منافق یا دوسرے مشرکین ہوں۔اللہ تعالیٰ نے معاشرتی برائیوں کے خاتمہ کے لیے بیشمار ایسے احکامات نازل فرمائے جن پر عمل کرنا اکثر لوگوں کو ناگوار تھا۔مثلاً میراث میں لڑکیوں اور چھوٹے بچوں کا حصہ مقرر کرنا، بیوہ سے سسرال کی بندشوں کو ختم کرنا اور عدت کے بعد اسے نکاح کے لیے پوری آزادی دلانا، متبنّیٰ کی وراثت کا خاتمہ، عورت کو خاوند کی طرح طرح کی زیادتیوں سے نجات دلا کر معاشرہ میں اس کا مقام بلند کرنا وغیرہ وغیرہ خلاصہ یہ ہے کہ شہوت پرست اور بندگانِ ہوس اخلاق اور قانون کے دائرہ میں رہنا نہیں چاہتے؛ بلکہ چاہتے ہیں کہ انسان تمام حدوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔

خواہشات میں راہِ اعتدال (میانہ روی) سے مراد

یُرِیْدُ اللّٰہُ	ارادہ کرتا ہے اللہ	اَنْ یُّخَفِّفَ	یہ کہ آسانی فرمائے
عَنْکُمْ ۚ	تم سے	وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ	اور پیدا کیا گیا ہے انسان
ضَعِیْفًا ﴿۲۸﴾		بہت کمزور (۲۸)	

فرمایا اگرچہ خواہشات کے پیروکار تمہیں راہ راست سے دور ہٹانا چاہتے ہیں۔مگر یاد رکھو! یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ اللہ تعالیٰ تم سے تخفیف کرنا چاہتا ہے۔وہ تمہاری خواہشات کو مکمل طور پر دبانا نہیں چاہتا بلکہ انہیں جائز حد تک پورا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔جبکہ تفریط (فطری تقاضوں کا بالکل گلا گھونٹنا) شخصیت کا توازن بگاڑ دیتی ہے۔اعتدال ہی وہ واحد راستہ ہے جو سکونِ قلب اور باوقار زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔اگر خواہشات کو بالکل مٹا دیا جائے تو رہبانیت پیدا ہوگی۔جوگی پنا ہوگا جو فطرت انسانی کے خلاف ہے۔اللہ نے نکاح کی اجازت دے کر تم پر بعض پابندیاں عائد کر دیں کہ ان کے اندر رہ کر خواہشات کو پورا کرو۔اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ کار اختیار کرنے کی

ترغیب دی جس کے ذریعے بہیمیت کی اصلاح کی جاسکے (بہیمیت کا لغوی اور اصطلاحی معنی حیوانیت، درندگی، ظلم اور بربریت ہے۔ انسان جب اپنی عقل اور اخلاقی اقدار کو چھوڑ کر صرف خواہشاتِ نفس اور جبلت (Instincts) کے تحت جینے لگے، تو اسے بہیمیت کہتے ہیں۔) اور انسان میں اعتدال پیدا ہو۔ تو اللہ نے فرمایا کہ تم پر صرف تخفیف کی گئی ہے۔ خواہشات کو مکمل طور پر مٹانا مقصود نہیں۔ جائز طریقے سے انہیں بھی پورا کرو۔ حلال حرام کی پابندی کرو۔ فرمایا وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ۲۸ جسمانی طور پر انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی کمزوری کو ملحوظ رکھ کر اسے خواہشات سے مکمل دست برداری کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس کے لیے جائز صورتیں وضع کر دی گئی ہیں تاکہ وہ اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس دنیا میں بھی خوش وخرم زندگی بسر کرے اور آخرت میں بھی کامیاب ہو جائے۔ بہر حال اللہ نے نکاح کی حلت وحرمت کے بعد اس کی حکمت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے۔ فرمایا: یہ احکام دینے میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ انسان فطرتاً کمزور ہے لہٰذا ان احکام میں انسان کی سہولت اور بساط کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ انسان اپنی شہوت پر کنٹرول نہیں کر سکتا تو اسے ایک سے چار بیویوں تک نکاح کی اجازت دے دی گئی ہے اور اس میں سہولتوں کو مدنظر رکھ کر اسے آسان بنا دیا گیا ہے۔ نیز جو بھی احکام شریعت ہیں ان میں اعتدال کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور پھر معاشرہ کے کمزور افراد کے لیے رخصتیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔ گویا قانونِ شریعت بوجھ نہیں؛ بلکہ اس میں انسان کی فطری کمزوریوں کی بھرپور رعایت ہے، جب ہی تو نکاح کی نہ صرف اجازت دی گئی؛ بلکہ اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

خواہش طبیعت کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا ہے جو اس کی ہدایت کا باعث بنتی ہے۔ خواہش کو انسان کی ضرورتِ بقا کے پیش نظر پیدا کیا گیا ہے، اگر انسان میں کھانے، پینے اور نکاح کی طرف میلان نہ ہوتا تو وہ نہ کھاتا، نہ پیتا اور نہ ہی نکاح کرتا، لہٰذا خواہش آدمی کو اس کے ارادے کی تکمیل پر اُبھارتی ہے جیسے غضب اذیت میں مبتلا کرنے والی چیز سے روکتا ہے تو جس طرح غصہ کی نہ مطلقاً مذمت کی جاسکتی ہے اور نہ ہی مدح، اسی طرح خواہش کو بھی مطلقاً مذموم یا ممدوح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب انسان پر خواہش نفس، شہوت اور غضب کی پیروی غالب آجائے تو وہ نفع کی حد پر ہی نہیں

رکتا اسی لئے خواہش، شہوت اور غضب کو مذموم ٹھہرایا جاتا ہے کیونکہ عموماً اس میں نقصان کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بہت کم لوگ ان چیزوں میں عدل کرتے ہیں اور حدِ مُنتفع پر رکتے ہیں۔ (حد منتفع سے مراد وہ آخری حد یا دائرہ کار ہے جہاں تک کوئی شخص کسی شے، جائیداد یا حق سے فائدہ اٹھانے کا مجاز ہو) اسی طرح ایسی طبیعت سے متصف لوگ شاذ و نادِر ہوتے ہیں جن کے مزاج میں ہر طرح کا اعتدال ہوتا ہے۔ کسی ایک چیز کا غلبہ ضرور افراط و تفریط کی طرف لے جاتا ہے۔ ناصح یہی چاہتا ہے کہ شہوت اور غضب کی قوت کو ہر اعتبار سے معتدل بنایا جائے یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ جس کا وجود پوری دنیا میں ماسوائے چند افراد کے کہیں نہیں پایا جاتا۔ شریعت یہ نہیں بتاتی کہ زندگی میں بیک وقت دین رہے گا یا دنیا رہے گی، یہ نہیں کہ اگر میں عبادت میں مگن رہا تو کسی سے تعلق نہیں رکھوں گا، نہ یہ کہ میں مکمل بازار سے چمٹ جاؤں یا پھر مسجد سے، بلکہ شریعت بتاتی ہے کہ تم نے دین و دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہے۔ تم نے تجارت بھی کرنی ہے اور عبادت کے فرائض بھی انجام دینے ہیں، تم نے اللہ کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں اور اللہ کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تم اللہ کے حقوق ادا کرنے میں بندوں کے حقوق سے غافل ہو جاؤ، اور نہ ایسا کہ بندوں کی خدمت میں ایسے لگے رہو کہ خدا کی بندگی ہی بھول جاؤ۔ البتہ شریعت فرق سمجھا دیتی ہے کہ تم مال کے لیے محنت ضرور کرو، لیکن اسے اپنی ضرورت سمجھو، اپنا مقصد مت سمجھو، ورنہ تم ''حبِ مال'' کی بیماری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اسی طرح دنیاداری کرو لیکن دنیا کے لیے اتنی ہی کوشش کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے، اور آخرت کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا تمہیں وہاں رہنا ہے۔ اگر تم دنیا کی مختصر سی زندگی کے لیے آخرت والی محنت کرنا شروع کرو گے تو تم ''حبِ دنیا'' کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام خرابیوں کی جڑ والی بیماری قرار دیتے ہیں۔

عقل اور جذبات میں میانہ روی

اسی طریقے سے انسان میں عقل اور جذبات کے بڑے شدید مادے پائے جاتے ہیں جو کہ اکثر اوقات انسان کو اعتدال پر قائم رہنے نہیں دیتے، اسی آیت کی روشنی میں یہ اہم اصول سمجھنے کو

ملتا ہے کہ تم امتِ وسط ہو، تم دین کا مزاج اور دین کی جو اصل بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اپنے جذبات اور عقل کو بیچ میں مت لاؤ، چونکہ انسان ایسا ہے کہ کبھی وہ جذبات میں آ کر غلط فیصلہ کرتا ہے، اور کبھی اپنی عقل کے خود ساختہ پھندے میں پھنس کر ناقص فیصلہ کر سکتا ہے، نفسانی خواہشات کا شکار ہو سکتا ہے، اس لیے اس امت کو سمجھایا کہ تم فیصلے اپنی طبیعت کے مطابق مت کرو، بلکہ جیسے شریعت رہنمائی کرے ویسے فیصلے کرو، چاہے تمہاری عقل میں آئے یا نہ آئے، چاہے تمہارا دل مانے یا نہ مانے، چاہے تمہاری طبیعت کے مطابق ہو یا نہ ہو، عین ممکن ہے کہ تمہاری طبیعت میں افراط و تفریط پائی جاتی ہو یا تمہاری عقل اونچ نیچ کا شکار ہو اور اس طرح تمہاری خواہش کے چکر میں معاملہ بگڑ جائے، لیکن جب تم اپنے آپ کو عقلی اور نفسانی خواہشات سمیت شریعت کے حوالے کرو گے تو شریعت تمہیں نہ حد سے زیادہ آگے بڑھنے دے گی، نہ حد سے گرنے دے گی، کیونکہ شریعت میں اعتدال پایا جاتا ہے، بالآخر نتیجہ بھی اعتدال والا سامنے آئے گا۔

الغرض! اللہ ربّ العزت نے اُمتِ محمدیہ کی جو خصوصیت سورہ بقرہ میں بیان کی کہ: ’’وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا‘‘ ’’اور اسی طریقے سے ایک بہت بڑی نعمت ہم نے تمہیں یہ دی کہ ہم نے تمہیں ایک معتدل اُمت بنا دیا۔‘‘ لہٰذا ہمیں اپنے ہر عمل میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے، عقیدے میں بھی، عبادت میں بھی، حقوق کی ادائیگی میں بھی، خرچ میں بھی، سیاست میں بھی، نیکیوں میں بھی، آپس کے تعلقات میں بھی اور ہمارے مزاج اور اہم فیصلوں میں بھی اعتدال ہونا چاہیے، تاکہ ہم امتِ مسلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ کیونکہ انسان جب اپنی خواہشات، ضروریات اور زندگی کے دائرے کو حد میں رکھتا ہے تو اس کے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ بے جا وسعت، لالچ اور ہر چیز حاصل کرنے کی خواہش اکثر بے چینی اور پریشانی کا سبب بنتی ہے، جبکہ قناعت، اعتدال اور حدود کی پابندی انسان کو حقیقی سکون عطا کرتی ہے۔

☆☆☆

اکتساب مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق/ خودکشی فعل حرام ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً
عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ
یَّفْعَلْ ذٰلِکَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْہِ نَارًا ط وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا ﴿۳۰﴾

مال میں ناجائز تصرف سے مراد

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو!
لَا تَاْکُلُوْٓا	نہ تم کھاؤ	اَمْوَالَکُمْ	اپنے مال
بَیْنَکُمْ	آپس میں	بِالْبَاطِلِ	ناحق طریقے سے
اِلَّآ اَنْ	مگر یہ کہ	تَکُوْنَ تِجَارَۃً	ہو تجارت
عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ۣ	تمہاری باہمی رضامندی سے	وَلَا تَقْتُلُوْٓا	اور نہ تم قتل کرو
اَنْفُسَکُمْ ط	اپنے نفسوں کو	اِنَّ اللّٰہَ	بلاشبہ اللہ
کَانَ بِکُمْ	ہے تمہارے ساتھ	رَحِیْمًا ﴿۲۹﴾	نہایت رحم کرنے والا

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو دولت کمانے کا عام لائسنس نہیں دیتا بلکہ کمائی

کے طریقوں میں اجتماعی مفاد کے لحاظ سے جائز اور ناجائز کا امتیاز قائم کرتا ہے۔ یہ امتیاز اس قاعدہ کلیہ پر مبنی ہے کہ دولت حاصل کرنے کے تمام وہ طریقے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے شخص یا اشخاص کے نقصان پر ہو، اور ہر وہ طریقہ جائز ہے جس میں فوائد کا مبادلہ اشخاصِ متعلقہ کے درمیان منصفانہ طور پر ہو۔ ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! یہ خطاب خاص طور پر اہل ایمان کے لیے ہے، لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ نہ کھاؤ اپنے مالوں کو اپنے درمیان باطل طریق سے، اسلامی اور قانونی لحاظ سے مال میں ناجائز تصرف سے مراد کسی بھی ایسے طریقے سے مال کو استعمال کرنا، خرچ کرنا یا حاصل کرنا ہے جو شریعت یا قانون کی رو سے منع ہو۔ اس میں کسی دوسرے کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا، یا اپنا مال بھی ایسے کاموں میں خرچ کرنا جو گناہ یا فضول خرچی ہوں، شامل ہے اور اس سے مراد ناجائز اور حرام راستے ہیں۔ باطل طریقے کون کون سے ہیں؟ باطل طریقوں سے مراد ہر وہ ذریعہ آمدنی ہے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہو۔ اور اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً: ہر وہ کام جس سے دوسرے کا مالی نقصان ہو جیسے چوری، ڈاکہ، غصب، غبن وغیرہ۔ اور سود اور اس کی تمام شکلیں، خواہ یہ سود مفرد ہو، مرکب ہو، ڈسکاؤنٹ ہو، مارک اپ اور مارک ڈاؤن ہو یا خواہ یہ ذاتی قرضے کا سود ہو۔

ربا النسیئہ اور ربا الفضل کا مفہوم

شریعت میں اس کی دو بنیادی قسمیں ہیں: ربا النسیئہ (مدت کے عوض قرض یا ادھار کا سود) اور ربا الفضل (لین دین میں کمی بیشی کا سود)، جو کہ مالی معاملات میں استحصال کو روکنے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ اور ہر ایسا کام جس میں تھوڑی سی محنت سے کثیر مال ہاتھ آتا ہو۔ جیسے جوا، لاٹری اور سٹہ بازی وغیرہ اور بعض حالتوں میں بیمہ پالیسی۔ کسی حرام کاروبار کے لیے دکان یا مکان کرایہ پر دینا، کاہن کی کمائی، فاحشہ کی کمائی، کتے کی قیمت وغیرہ۔ اور حکومت کے ذریعہ دوسروں کے مال بٹورنا مثلاً لین دین کے جھوٹے مقدمات اور رشوت وغیرہ یا حکومت کا لوگوں کی زمین پر قبضہ کر کے ان کو اپنی مرضی کے مطابق لین دین پر مجبور کرنا۔ حرام مال جیسے آتا ہے ویسے ہی چلا بھی جاتا ہے، البتہ

اپنے ساتھ پریشانیوں کے عذاب کا ضرور اضافہ کرتا ہے۔ اللہ مہربان ہے اسی لیے تو بار بار خبردار کرتا ہے کہ بدلہ ضرور ملے گا اور وہ ہے دوزخ کا عذاب جس سے کوئی بھی بچا نہ سکے گا۔ ناحق اور باطل طریقہ ایک جامع لفظ ہے، جس میں کسبِ معاش اور حصولِ زر کی وہ تمام صورتیں آ گئیں، جن کو قرآن و حدیث میں منع کیا گیا ہے اور فقہاء اُمت نے جن کو تفصیل سے مرتب فرما دیا ہے۔ تجارت کے علاوہ لین دین کی اور بھی جائز صورتیں ہیں، جیسے: عاریت، ہبہ، صدقہ، میراث وغیرہ۔ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ الایہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ خرید و فروخت یا لین دین کا وہ حلال طریقہ درست ہے جس میں دونوں فریق اپنی مرضی اور رضامندی سے شامل ہوں) چوں کہ تبادلۂ مال کی سب سے بنیادی اور ہر وقت پیش آنے والی صورت تجارت اور خرید و فروخت کی ہے؛ اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد نے واضح کر دیا کہ خرید و فروخت میں دونوں فریق کی رضامندی ضروری ہے، کسی فریق کو مجبور کر کے معاملہ طے کرنا درست نہیں؛ چنانچہ فقہاء نے خرید و فروخت اور تمام مالی معاملات کے لئے ایجاب و قبول کو ضروری قرار دیا ہے، جس سے فریقین کی رضامندی کا اظہار ہوتا ہے اور جبر و اکراہ کے ساتھ ہونے والی خرید و فروخت کو نامعتبر قرار دیا ہے۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۴/ ۳۶۰) جن اشیاء کی تجارت مثلاً شراب، مردار، تصاویر، مجسمے وغیرہ کی ممانعت آئی ہے ان کے ذریعے مال کا حصول بھی باطل ہے اس کے علاوہ بعض ایسے ہیں جن کو اختیار کرنے سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے جیسے گانا بجانا آلات لہو و لعب جوا وغیرہ سب امور باطلہ کی فہرست میں آتے ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ایک دوسرے کا مال باطل ذرائع سے مت کھاؤ۔ بعض اوقات کسی کا وراثت کا حق غصب کیا جاتا ہے۔ شراکتی کاروبار بھی ایک دوسرے کے حق میں خیانت ہو جاتی ہے فرمایا فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔ اگر کسی طریقے سے دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف ہوگا، تو حرام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے صریح الفاظ میں منع فرما دیا ہے کہ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔ مفسر قرآن امام ابوبکر جصاص

رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح دوسرے کا مال ناجائز طور پر کھانا یا استعمال کرنا روا نہیں، اسی طرح اپنا مال بھی ناجائز اور باطل طریقے سے استعمال کرنا حرام ہے۔ اگر اپنا مال بھی کھیل تماشے میں لگا دیا یا رسومات باطلہ کی نذر کر دیا، اسراف وتبذیر میں اڑا دیا تو یہ بھی ناجائز ہے۔

خودکشی کی حرمت اور خودکشی کی سزا

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط: اس کے تین معانی ہو سکتے ہیں اور تینوں مراد ہیں، پہلا یہ کہ شریعت کی مخالفت کرتے ہوئے حقیقی باہمی رضامندی کے بغیر اگر لین دین کرو گے تو اس کا نتیجہ آپس میں قتل و غارت ہوگا، جیسا کہ جوئے کے نتیجے میں ہارنے والے کے ہاتھوں کئی جیتنے والے قتل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کام مت کرو۔ دوسرا یہ کہ ایک دوسرے کو قتل مت کرو، کیونکہ یہ اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے اور تیسرا یہ کہ خودکشی مت کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے چھری کے ساتھ اپنے آپ کو قتل کیا تو جہنم میں چھری اس کے ہاتھ میں ہوگی اور وہ اس کے ساتھ اپنے پیٹ کو پھاڑے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی میں رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو زہر سے قتل کیا تو جہنم میں اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا، جسے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پیے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی میں رہے گا اور جس نے پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو قتل کیا تو وہ جہنم کی آگ میں گرتا رہے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہے گا۔" (مسلم) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط الغرض! اس سے تین مطلب نکلے کہ اگر کسی کو قتل کیا تو قصاص میں خود بھی قتل کئے جاؤ گے، یعنی دوسرے کو قتل کر کے اپنے قتل کا راستہ بنا لیا۔ دوسرا مطلب خودکشی مراد ہو سکتی ہے تو یہ کیونکہ حرام موت ہے، اس لیے یہ بھی گناہ عظیم ہے۔ ہر انسان کی روح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس امانت ہوتی ہے جس میں خیانت کرنے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہوتا، اس وجہ سے خودکشی کرنا (یعنی اپنے آپ کو خود ہی مارنا) اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت کرنے کی وجہ سے اسلام میں حرام ہے اور یہ ایک گناہ کبیرہ (بڑا گناہ) ہے۔

زندگی بہت بڑی نعمت ہے، ایسی نعمت جس کا کوئی بدل نہیں، جو جانے کے بعد واپس نہیں

آتی، انسان یہ نعمت اپنی محنت اور کدو کاوش سے حاصل نہیں کرتا؛ بلکہ کائنات کے رب کا عطیہ ہے، ایسا عطیہ جو علم وتحقیق کی اتنی ترقی کے باوجود ایک سربستہ راز ہے، علم وسائنس کی ترقی اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ انسان اپنے ایک ایک عضو کے بارے میں جاننے لگا ہے کہ اس کا حجم کتنا ہے؟ سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک اس نے بدن کے ایک ایک انگ اور رگ وریشہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے؛ لیکن آج بھی عقل اس گرہ کو کھولنے سے عاجز ہے اور قدرت کے رازِ سربستہ سے پردہ اٹھانے میں ناکام ہے کہ آخر روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ جسم میں کیوں کر آتی ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ پھر کس طرح چپ چاپ جسم کو داغِ فراق دے کر چلی جاتی ہے کہ نہ کوئی ہاتھ ہے، جو اسے تھام سکے، نہ کوئی حساس سے حساس مشینی آلات ہیں، جو اس کو گرفتار کرسکیں، یا کم سے کم اس کی حقیقت کا ادراک ہی کرلیں، انسان کی یہ مجبوری اور علمی بے بسی خدا کا یقین دلاتی ہے اور ایمان میں تازگی پیدا کرتی ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روح (زندگی) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں کہ یہ میرے رب کے حکم اور فرمان سے عبارت ہے: ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ''۔ (بنی اسرائیل: ۸۵)

پس انسان اپنی ''زندگی'' کا خود مالک نہیں ہے؛ بلکہ امین ہے، زندگی اس نے حاصل نہیں کی ہے؛ بلکہ اسے عطا فرمائی گئی ہے، یہ اس کے پاس خالق کائنات کی امانت ہے اور ممکن حد تک اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کا علاج کرنے کی تاکید فرمائی، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا علاج کرایا اور اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ علاج کرانا توکل کے خلاف نہیں؛ کیوں کہ توکل اور قناعت کے اعلیٰ درجہ پر حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام فائز تھے، اور وہ علاج بھی کراتے تھے اور حفظانِ صحت کے اُصول کی رعایت بھی کرتے تھے۔ کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی صحت یا زندگی کے لئے مضرت رساں ہو اور انسانی زندگی کو خطرہ میں ڈال سکتا ہو، جائز نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایسی چیز کے کھانے سے منع فرمایا، جو نشہ آور یا جسم کو نقصان پہنچانے والی (مفتر) ہو ''مفتر'' یعنی جسم کے لئے مضرت رساں چیزوں کے

کھانے کی ممانعت تو ظاہر ہے کہ صحت اور زندگی کے تحفظ کے لئے ہے؛ لیکن نشہ آور چیزوں سے منع کرنے کی وجہ جہاں یہ ہے کہ اس سے انسان کی عقل وفہم پر زد پڑتی ہے اور بہت سے اخلاقی مفاسد اس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہیں یہ بھی ہے کہ یہ ایک میٹھا زہر ہے، جو موت کی طرف زندگی کے سفر کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے اسلام نے خودکشی (suicide) کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ اور اس طرح کی اسلامی تعلیمات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جیسے اسلام نے دوسروں کی جان بچانے کا حکم دیا ہے، اسی طرح انسان پر یہ بات بھی واجب ہے کہ وہ بحد امکان اپنی جان کی حفاظت کرے؛ کیوں کہ زندگی اس کے پاس خدا کی امانت ہے اور امانت کی حفاظت اسلامی، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے؛ اسی لئے اسلام کی نگاہ میں ''خودکشی'' بہت بڑا گناہ اور سنگین جرم ہے، ایسا گناہ جو اس کو دنیا سے بھی محروم کرتا ہے اور آخرت سے بھی، اسی لئے فقہاء نے نباتات میں ایسی چیزوں کے کھانے کو ناجائز قرار دیا ہے، جو زہر کے قبیل سے ہوں اور انسانی زندگی کے لئے خطرہ کا باعث ہوسکتی ہوں۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۳/ ۵۰۶) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ہیں جن میں نہایت سختی اور تاکید کے ساتھ خودکشی کو منع فرمایا گیا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر خودکشی کی، وہ جہنم کی آگ میں بھی اسی طرح ہمیشہ گرتا رہے گا، اور جس شخص نے لوہے کی ہتھیار سے خود کو ہلاک کیا، وہ دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے پیٹ میں ہتھیار گھونپتا رہے گا، (بخاری، حدیث نمبر: ۵۷۷۸) ایک اور روایت میں ہے کہ گلا گھونٹ کر خودکشی کرنے والا جہنم میں ہمیشہ گلا گھونٹتا رہے گا اور اپنے آپ کو نیزہ مار کر ہلاک کرنے والا دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۶۵، عن ابی ہریرۃؓ)

لفظ کَانَ کا مفہوم اور تشریح

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ﴿۲۹﴾ یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہمیشہ سے انتہائی مہربان، شفیق اور رحم فرمانے والا ہے، اور اس کی رحمت ہر

وقت بندوں شامل حال رہتی ہے۔لفظ" کان" (تھا) یہاں ماضی کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی دائمی صفت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی مہربانی عارضی نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ سے تم پر مہربان ہے اور ہمیشہ رہے گا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ یہ فقرہ اکثر ایسے احکام یا تنبیہات کے بعد آتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کسی مشکل سے بچایا ہو یا کوئی آسان شریعت دی ہو۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے جو احکام دیے ہیں یا جو فیصلے فرمائے ہیں، ان کے پیچھے اس کی شدید محبت اور مہربانی کارفرما ہوتی ہے۔یہ جملہ انسان کو مایوسی سے نکالتا ہے۔مشکل حالات میں یہ اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اللہ کی رحمت بندے کو اکیلا نہیں چھوڑے گی، اور ہر سختی کے پیچھے اس کی مہربانی چھپی ہوتی ہے۔

عُدْوَانًا وَّظُلْمًا (سرکشی اور ظلم) کا مطلب

وَمَنْ	اور جو کوئی	يَّفْعَلْ ذٰلِكَ	کرے گا یہ (کام)
عُدْوَانًا	زیادتی سے	وَّظُلْمًا	اور ظلم سے
فَسَوْفَ	تو عنقریب	نُصْلِيْهِ	ہم اسے داخل کریں گے
نَارًا ؕ	آگ میں	وَكَانَ ذٰلِكَ	اور ہے یہ
عَلَى اللّٰهِ	اللہ پر	يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾	نہایت آسان

اس آیت کریمہ میں ایسے کاموں سے مراد وہ تمام اوامر و نواہی ہیں جن کا ذکر اس سورہ کی ابتداء سے چلا آرہا ہے۔اور از راہ ظلم و زیادتی سے مراد یہ ہے کہ جو شخص از راہ معصیت و تکبر اللہ کے اوامر و نواہی کی پروانہ کرے اور گناہوں کا ارتکاب کرتا جائے اس کی سزا دوزخ ہی ہو سکتی ہے۔فرمایا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ جو شخص ایسا کام کرے گا مال و جان میں ناجائز تصرف کرے گا عُدْوَانًا تعدی کرتے ہوئے وَّظُلْمًا اور زیادتی کرتے ہوئے۔واضح رہے کہ قتل نفس عدوان میں آتا ہے۔یہ شرک کے ساتھ اکبر الکبائر میں شمار ہوتا ہے اور مال میں ناجائز تصرف ظلم کہلاتا ہے تو فرمایا کہ جو شخص تعدی اور ظلم سے ناحق مال کھائے گا یا کسی کی جان لے گا یعنی شریعت کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کرنا اور زیادتی کرنا۔فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ تو عنقریب ہم اس کو جہنم کی

آگ میں داخل کریں گے۔ اگر وہ اس دنیا میں کسی نہ کسی طرح سزا سے بچ بھی گیا، تو جہنم میں اس کے لیے ابدی سزا بہر حال اس کے انتظار میں ہے وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۳۰ اور دوزخ میں سزا دینا اللہ تعالیٰ کے لیے آسان ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم مسلمان ہیں اور سزا سے بچ جائیں گے بلکہ جرم کی سزا ضرور ملے گی۔ بلکہ اکثر کسی شخص سے غلطی سے بھی قتل ہو جائے تو اس کے لیے بھی کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ توبہ کرنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خون بہا کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا زیادتی کر کے پھر بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے تمہیں دین حق دیا۔ مغرور ہو کر اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیشہ اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔

☆☆☆

گناہوں پر توبہ واستغفار کرنے کا صحیح طریقہ/ صغیرہ اور کبیرہ گناہ میں فرق؟

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۳۱

توبہ واستغفار سے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی معافی

اِنْ تَجْتَنِبُوْا	اگر تم بچو گے	كَبَآىِٕرَ	بڑے گناہوں سے
مَا	وہ جو	تُنْهَوْنَ	تمہیں روکا جاتا ہے
عَنْهُ	ان سے	نُكَفِّرْ	(تو) ہم دور کر دیں گے
عَنْكُمْ	تم سے	سَيِّاٰتِكُمْ	تمہاری برائیاں
وَنُدْخِلْكُمْ	اور ہم تمہیں داخل کریں گے	مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۳۱	عزت کی جگہ میں

کبائر اور صغائر کی اصطلاح قرآن وسنت میں کثرت سے استعمال ہوئی ہے کبائر سے مراد وہ بڑے گناہ ہیں جو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ اور صغائر وہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ازخود ہی معاف فرما دیتے ہیں۔ بشرطیکہ انسان بڑے گناہوں سے بچتا رہے اور اعمال صالحہ انجام دیتا رہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ نے یہی قانون سمجھایا ہے ارشاد ہوتا ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا

كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ اگر تم ان کبائر سے اجتناب کرتے رہو گے جن سے منع کیا گیا ہے نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ہم معاف کر دیں گے تمہاری چھوٹی موٹی خطائیں۔ البتہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں سے باز نہ آئے تو پھر نہ صرف کبائر کی وجہ سے گنہگار ہوگا بلکہ چھوٹے گناہوں پر بھی مواخذہ ہوگا۔ چھوٹی موٹی خطائیں اور لغزشیں تو انسان سے ہر آن صادر ہوتی رہتی ہیں تاہم اگر کبیرہ گناہ سے بچ گیا تو انشاء اللہ اس کی کامیابی کی امید ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ اس نے چھوٹے گناہوں کو از خود معاف کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ بشرطیکہ انسان کبائر سے اجتناب کی شرط کو پورا کرے۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کی بہت سی حدیثیں منقول ہیں۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا اَلْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اگر انسان کبائر سے بچتا رہے تو دوسرے چھوٹے چھوٹے گناہ ان کی وجہ سے معاف ہوتے رہتے ہیں۔ نبی (علیہ السلام) نے ایسے ہی الفاظ ایک نماز سے دوسری نماز تک کے درمیانی عرصہ کے متعلق فرمائے کہ اللہ تعالیٰ دو نمازوں کے درمیان معمولی لغزشیں ان نمازوں کی برکت سے معاف فرما دیتا ہے سورہ ہود میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹاتی رہتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا تعالیٰ کو یاد کرنے والے ہیں۔

''گناہ'' اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کی خلاف ورزی، احکامات کی عدم تعمیل کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کبریائی کے سامنے تو انسان کی ہر غلطی ہی بہت بڑی غلطی اور سنگین جرم ہے، گویا ہر گناہ اپنی ذات کے لحاظ سے بڑا گناہ ہے، لیکن قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں گناہوں پر وعید اور ممانعت کے انداز میں تبدیلی کی بنا پر گناہوں کی دو قسمیں ذکر کی گئی ہیں، صغیرہ اور کبیرہ۔ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی کوئی قطعی تعداد نہیں، مختلف احادیث کو سامنے رکھتے علماء نے مختلف تعداد ذکر کی ہے۔ تعریف کی حد تک جس گناہ پر مجرم کے لیے رحمت سے دوری (لعنت) مذکور ہو، وعید سنائی گئی ہو یا جس پر عذاب و سزا یا حد کا ذکر ہو وہ کبائر ہیں۔ اسی طرح

جوگناہ جرأت و بے باکی کے ساتھ کیا جائے یا جس گناہ پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے، خواہ اس پر وعید، لعنت یا عذاب وسزا وارد نہ ہو۔

گناہوں کی دو قسمیں

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے تفسیر معارف القرآن میں مذکورہ مسئلہ پر تفصیلی کلام فرمایا ہے ذیل میں وہ نقل کیا جاتا ہے: فرماتے ہیں کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ کبیرہ، یعنی بڑے گناہ اور کچھ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے کبیرہ گناہوں سے بچ جائے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کے صغیرہ گناہوں کو وہ خود معاف فرما دیں گے۔ کبیرہ گناہوں سے بچنے میں یہ بھی داخل ہے کہ تمام فرائض و واجبات کو ادا کرے، کیوں کہ فرض و واجب کا ترک کرنا خود ایک کبیرہ گناہ ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ جو شخص اس کا اہتمام پورا کرے کہ تمام فرائض و واجبات ادا کرے اور تمام کبیرہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچالے، تو حق تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیں گے۔

گناہ اور اس کی دو قسمیں صغائر، کبائر

آیت میں کبائر کا لفظ آیا ہے، اس لیے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ گناہ کبیرہ کسے کہتے ہیں؟ اور وہ کل کتنے ہیں؟ اور صغیرہ گناہ کی کیا تعریف ہے؟ اور اس کی تعداد کیا ہے؟ علماء امت نے اس مسئلہ پر مختلف انداز میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم اور ان کی تعریفات سے پہلے یہ خوب سمجھ لیجیے کہ مطلق گناہ نام ہے ہر ایسے کام کا جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے خلاف ہو، اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اصطلاح میں جس گناہ کو صغیرہ یعنی چھوٹا کہا جاتا ہے، درحقیقت وہ بھی چھوٹا نہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت ہر حالت میں نہایت سخت و شدید جرم ہے اور اس کی مرضی کی مخالفت کبیرہ ہی ہے، کبیرہ اور صغیرہ کا فرق صرف گناہوں کے باہمی مقابلہ اور موازنہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اسی معنی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ: کُلُّ مَا نُھِیَ عَنْہُ فَھُوَ کَبِیرَۃٌ ہر وہ کام جس سے منع کیا گیا ہے، وہ کبیرہ گناہ ہے یعنی جس کام سے

شریعت اسلام میں منع کیا گیا ہے وہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

خلاصہ: یہ ہے کہ جس گناہ کو اصطلاح میں صغیرہ یا چھوٹا کہا جاتا ہے اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں ہیں کہ ایسے گناہوں کے ارتکاب میں غفلت یا سستی برتی جائے اور ان کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کیا جائے، بلکہ صغیرہ گناہ کو بیباکی اور بے پرواہی کے ساتھ کیا جائے، تو وہ صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔ البتہ گناہوں کے مفاسد اور نتائج بد اور مضر ثمرات کے اعتبار سے ان کے آپس میں فرق ضروری ہے اس فرق کی وجہ سے کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ کہا جاتا ہے۔

گناہ کبیرہ

گناہ کبیرہ کی تعریف قرآن وحدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت و بے باکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے کسی نے کبیرہ گناہوں کی تعداد سات بتلائی تو آپ نے فرمایا سات نہیں سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ امام ابن حجر مکی نے اپنی کتاب "الزواجر" میں ان تمام گناہوں کی فہرست اور ہر ایک کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے جو مذکور الصدر تعریف کی رو سے کبائر میں داخل ہیں، ان کی اس کتاب میں کبائر کی تعداد چار سو ستر تک پہنچی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بعض نے بڑے بڑے ابوابِ معصیت کو شمار کرنے پر اکتفا کیا ہے تو تعداد کم لکھی ہے بعض نے ان کی تفصیلات اور انواع واقسام کو پورا لکھا تو تعداد زیادہ ہوگئی، اس لیے یہ کوئی تعارض واختلاف نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین، کہیں چھ، کہیں سات، کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں، اسی سے علماء امت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں انحصار کرنا مقصود نہیں، بلکہ مواقع اور حالات کے مناسب جتنا

سمجھا گیا اتنا بیان کر دیا گیا۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے ہیں تمہیں ان سے باخبر کرتا ہوں، وہ تین ہیں، اللہ تعالی کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ساجھی ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔ اسی طرح بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا کہ: تم اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، حالاں کہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو فرمایا کہ تم اپنے بچہ کو اس خطرہ سے مار ڈالو کہ یہ تمہارے کھانے میں شریک ہوگا تمہیں اس کو کھلانا پڑے گا، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ: اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنا، بدکاری خود ہی بڑا جرم ہے اور پڑوسی کے اہل وعیال کی حفاظت بھی چوں کہ اپنے اہل وعیال کی طرح انسان کے ذمہ لازم ہے اس لیے یہ جرم دوگنا ہوگیا۔ اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک اور قتل ناحق اور یتیم کا مال ناجائز طریق پر کھانے اور سود کی آمدنی کھانے اور میدان جہاد سے بھاگنے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے اور بیت اللہ کی بے حرمتی کرنے کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔ بعض روایات حدیث میں اس کو بھی کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے کہ کوئی شخص دارالکفر سے ہجرت کرنے کے بعد پھر دارالہجرۃ کو چھوڑ کر دارالکفر میں دوبارہ چلا جائے۔

دوسری روایات حدیث میں ان صورتوں کو بھی گناہ کبیرہ کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے، مثلاً: جھوٹی قسم کھانا، اپنی ضرورت سے زائد پانی کو روک رکھنا دوسرے ضرورت والوں کو نہ دینا، جادو سیکھنا، جادو کا عمل کرنا اور فرمایا کہ شراب پینا اکبر الکبائر ہے، اور فرمایا کہ شراب پینا ام الفواحش ہے، کیوں کہ شراب میں مست ہو کر آدمی ہر برے سے برا کام کرسکتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی پر ایسے عیب لگائے جس سے اس کی آبروریزی ہوتی ہو۔ ایک حدیث میں ہے جس شخص نے بغیر کسی عذر شرعی کے دو نمازوں کو ایک

وقت میں جمع کر دیا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا، مطلب یہ ہے کہ کسی نماز کو اپنے وقت میں نہ پڑھا، بلکہ قضا کر کے دوسری نماز کے ساتھ پڑھا۔ بعض روایات حدیث میں ارشاد ہے کہ: اللہ تعالی کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس کے عذاب وسزا سے بے فکر و بے خوف ہو جانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ ایک روایات میں ہے کہ: وارث کو نقصان پہنچانے اور اس کا حصہ میراث کم کرنے کے لیے کوئی وصیت کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔ اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ: رسول کریم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ خائب وخاسر ہوئے اور تباہ ہو گئے اور تین دفعہ اس کلمہ کو دہرایا حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ محروم القسمتہ اور تباہ و برباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا: ایک وہ شخص جو تکبر کے ساتھ پاجامہ یا تہبند یا کرتہ اور عباء کو ٹخنے سے نیچے لٹکاتا ہے، دوسرے وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے احسان جتلائے، تیسرے وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو، چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا افسر ہونے کے باوجود جھوٹ بولے، پانچویں وہ آدمی جو عیال دار ہونے کے باوجود تکبر کرے، چھٹے وہ آدمی جو کسی امام کے ہاتھ پر محض دنیا کی خاطر بیعت کرے۔ اور صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ: چغلی کھانے والا جنت میں نہ جائے گا۔ اور نسائی و مسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ: چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے: شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رشتہ داروں سے بلا وجہ قطع تعلق کرنے والا، احسان جتلانے والا، جنات شیاطین یا دوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتانے والا، دیوث، یعنی اپنے اہل وعیال کو بے حیائی سے نہ روکنے والا۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ: اللہ تعالی کی لعنت ہے اس شخص پر جو کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی کے لیے قربان کرے۔" (معارف القرآن، سورہ نساء، آیت: 31)

کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے

گناہِ کبیرہ کی معافی کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا اصول و قانون یہ ہے کہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، توبہ کرنے سے معافی کی امید کی جاتی ہے، اگر کوئی بندہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے، اور پھر توبہ کیے بغیر ایمان کی حالت میں اس دارِ فانی کو خیر باد کہہ دے تو بقدرِ

گناہ اس کو سزا ملے گی، اس کے بعد وہ جنت میں جائے گا، اور توبہ کے لیے ضروری ہے کہ جو گناہ سرزد ہوا اس پر ندامت ہو، اس کو ترک کیا جائے، اور آئندہ کے لیے نہ کرنے کا پختہ عزم کیا جائے، پھر اگر اس کبیرہ گناہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے تو اگر ناجائز کا ارتکاب ہو تو توبہ کرنے سے ہی معافی کی امید ہے، اور اگر فرائض یا واجبات کو ترک کر لیا ہو تو توبہ کے ساتھ ساتھ قضا بھی ضروری ہے، اور اگر اس کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ ہو تو توبہ کے ساتھ ساتھ صاحب حق کو اس کا حق پہنچانا یا اس سے معافی تلافی کرنا ضروری ہے، محض توبہ سے معاف نہیں ہوتے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی قانون کی محتاج نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر توبہ کے اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ معاف فرمائے، لیکن بندہ شرعی قانون پر عمل کرنے کا مکلف ہے، اس لیے کبیرہ گناہ سے توبہ کرنا ضروری ہے، بہرکیف گناہ خواہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ اللہ کی ناراضگی کا باعث ہیں، اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ گناہ کا ارتکاب کسی صورت نہ کرے، ممکن ہے کہ کوئی گناہ صغیرہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی ابدی ناراضگی کا سبب بن جائے۔

توبہ واستغفار سے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی معافی کی تفصیل

واضح رہے کہ گناہوں پر توبہ واستغفار کرنے کا درست طریقہ یہ ہے کہ آدمی زبان سے اپنے گناہوں پر استغفار کرے، اور دل میں اس گناہ پر سخت نادم ہو، اور آئندہ اپنے آپ کو اس گناہ سے بچانے کا پختہ عزم کرے، لہٰذا اگر ان شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے سچی توبہ کی جائے، تو اس سے انسان کے صغیرہ اور کبیرہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ البتہ وہ فرائض وواجبات جو انسان کے ذمہ ہیں، مثلاً: نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ، محض توبہ واستغفار سے معاف نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی ادائیگی ذمہ میں باقی رہے گی۔ مزید یہ کہ حقوق العباد سے متعلق گناہ کی معافی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر کسی صاحب حق کا حق اس کے ذمہ ہو، تو اس پر لازم ہے کہ صاحب حق کو اس کا حق ادا کرے یا اس سے معاف کروالے، محض استغفار سے یہ گناہ معاف نہیں ہوتا ہے۔ تفسیر بیضاوی میں قاضی بیضاوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ایک مقولہ منسوب کیا ہے، جس میں توبہ واستغفار کی اس تفصیل کو جمع کیا گیا ہے، چنانچہ روایت ہے کہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ توبہ واستغفار کس چیز کا نام ہے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ توبہ واستغفار چھ چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: 1) اپنے گزشتہ برے اعمال پر ندامت وافسوس ہونا۔ 2) جو فرائض وواجبات چھوٹ گئے ہوں، ان کی قضا کرنا۔ 3) اگر کسی کا کوئی مالی حق ذمہ میں ہو، تو اس کی ادائیگی کرنا۔ 4) اگر کسی کو اپنی زبان یا ہاتھ سے تکلیف دی ہو، تو اس سے معافی مانگنا۔ 5) آئندہ اس گناہ سے دور رہنے کا پختہ عزم وارادہ کرنا۔ 6) خود کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول کر دینا۔ فرمایا وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ ہم تمہیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے یعنی پورے اعزاز کے ساتھ بڑے اعلیٰ مقام میں داخل کریں گے اور وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا بہشت ہی ہوسکتا ہے۔

لفظ تُحْبَرُوْنَ کا بنیادی معنیٰ ومفہوم

دوسرے مقام پر تُحْبَرُوْنَ کا لفظ آیا ہے یعنی تمہاری بڑی آؤ بھگت ہوگی، جو جنت میں پہنچ جائے گا اس کو ابدی فلاح حاصل ہو جائے گی عزت کے اس مقام میں جسمانی اور روحانی ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہونگی، لفظ تحبرون کا بنیادی معنیٰ "خوش ہونا، شادمانی اور سرور حاصل کرنا، اور عزت و آرام کے ساتھ نعمات سے لطف اندوز ہونا" ہے۔ قرآنی تناظر میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ جنتیوں کو جنت میں داخلے کے بعد ایسی بھرپور خوشی، راحت اور اکرام عطا کیا جائے گا جو چہروں سے عیاں ہو گی بہر حال اللہ تعالیٰ نے کبائر کا حکم بیان کر دیا ہے کہ یہ بڑے مضر ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کی سوسائٹی اور روحانیت خراب ہو جاتی ہے۔ خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر ان بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم چھوٹی چھوٹی خطائیں خود بخود معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

☆☆☆

حقوق وفرائض کے باب میں مرد وخواتین برابر ہیں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِکُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدًا ﴿۳۳﴾

اسلام میں عورت اور مرد کے مساوی حقوق

وَلَا تَتَمَنَّوْا	اور نہ تم تمنا کرو	مَا	اس کی جو
فَضَّلَ اللّٰہُ	فضیلت دی اللہ نے	بِہٖ	اس کے ساتھ
بَعْضَکُمْ	تمہارے بعض کو	عَلٰی بَعْضٍ ؕ	بعض پر
لِلرِّجَالِ	مردوں کے لیے	نَصِیْبٌ	حصہ ہے
مِّمَّا	اس سے جو	اکْتَسَبُوْا ؕ	انہوں نے کمایا
وَلِلنِّسَآءِ	اور عورتوں کے لیے	نَصِیْبٌ	حصہ ہے
مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ؕ	اس سے جو انہوں نے کمایا	وَسْئَلُوا اللّٰہَ	اور تم اللہ سے سوال کرو

مِنْ فَضْلِهٖ ؕ	اس کے فضل کا	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
بِكُلِّ شَیْءٍ	ہر چیز کو	عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾	خوب جاننے والا

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَتَمَنَّوْا اور نہ تمنا کرو، نہ خواہش کرو مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ اس چیز کی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مرد کو عورت پر جو فضیلت بخشی ہے، بعض خواتین کو رشک ہوا کہ مرد جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور ہم عورتیں اس فضیلت سے محروم ہیں، میراث میں بھی مردوں کا حصہ بہ مقابلہ عورتوں کے زیادہ ہے، اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، (ابن کثیرؒ: ۱/ ۵۹۷) مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب واقف ہیں کہ کس میں کیا صلاحیت ہے؟ کس سے کیا ذمہ داریاں متعلق ہونی چاہئیں؟ اور ذمہ داریوں کی نسبت سے کن کے کیا حقوق ہوں گے؟ اس لئے ایسی چیزوں پر حسد نہ ہونا چاہئے، آج پوری دنیا میں عورتوں کی آزادی کے نام پر جو تحریک چلائی جارہی ہے اور عورتوں اور مردوں کو ایک صف میں کھڑا کردینے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ اسی ناسمجھی کا نتیجہ ہے، جب انسان کی تخلیق اللہ نے کی ہے، تو یقیناً اللہ اس بات سے واقف ہیں کہ کس کے کیا فرائض ہونے چاہئیں؟ اس کی رعایت کئے بغیر غیر فطری مساوات پیدا کرنے کی کوشش سے مساوات تو پیدا نہ ہوسکے گا؛ لیکن فطرت سے بغاوت کی سزا انسان کو ضرور ملے گی، مغرب میں خاندانی نظام کا بکھراؤ، ازدواجی زندگی کی بے ثباتی اور قلبی سکون سے محرومی کی جو کیفیت ہے، وہ اسی بغاوت کی سزا ہے۔

اس آیت میں یہی بات بیان کی گئی ہے لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ مردوں کے لیے اس چیز میں حصہ ہے جو انہوں نے کمایا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جو انہوں نے کمایا۔ گویا اس معاملہ میں عورت اور مرد یکساں ہیں جو کوئی جتنی زیادہ نیکی کرے گا اسی کے مطابق اسے فضیلت اور اجر وثواب حاصل ہوگا۔ لہٰذا اعمال کا میدان مرد اور عورت ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔ جو اس میدان میں جتنا زیادہ عمل کرے گا اتنا ہی خدا تعالیٰ کے ہاں برگزیدہ ہوگا۔ موجودہ زمانے میں اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم کار کے برخلاف عورتوں اور

مردوں کو برابر کی سطح پر لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مردوں کے میدان عمل میں عورتوں کو گھسیٹا جارہا ہے اور یہ عام پراپیگنڈہ ہورہا ہے کہ مرد وزن ایک ہی گاڑی کے دو برابر پہیے ہیں لہٰذا انہیں ہر معاملہ میں برابری حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ آج عورت کو دفتروں، کارخانوں، ہسپتالوں اور فوج میں لایا جارہا ہے۔ یہی چیز عورت کی فطرت کے خلاف ہے عورتیں خود بھی مردوں کے شانہ بشانہ چلنے اور دوش بدوش کام کرنے کا مطالبہ کررہی ہیں۔ جس کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں۔ کبھی وہ زمانہ تھا جب عیسائیت اپنے غلط تاثر کی بنا پر عورت کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھی اور اب یہ حالت ہے کہ عورت کو مردوں سے بھی آگے بڑھادیا ہے مردوں کے تمام امور عورتوں کے سپرد کردیئے گئے ہیں۔ اس کے اثرات اخلاق نسل اور معاشرت پر پڑ رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر جگہ خرابیاں پیدا ہورہی ہیں۔ غیر معمولی (AB NORMAL) حالات میں تو ایسا ہوسکتا ہے۔ ناگزیر حالات میں حضور ﷺ عورتوں کو جنگ میں بھی ساتھ لے جاتے تھے مگر معمولی حالات میں عورتوں کے متعلق حکم یہی ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی کہ وہ اپنے گھروں میں رہ کر امور خانہ داری انجام دیں اور زمانہ جاہلیت کی طرح اظہار زینت نہ کریں۔ اگر مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کرینگی تو یہ خلاف فطرت ہوگا اور غیر فطری امور کو جنم دے گا۔

فرمایا وَسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ ط ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرتے رہنا چاہیے کہ وہ نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائے اور جو اچھے کام انجام دیئے ہیں ان کے ثمرات بڑھادے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص کرلیتا ہے۔ اس کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ اور اللہ تعالیٰ کا فضل بڑا عظیم ہے لہٰذا اس سے اس کا فضل طلب کرتے رہنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ مانگنے سے ناراض ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے مَنْ لَّمْ یَسْأَلِ اللّٰہَ یَغْضَبْ عَلَیْہِ انسان کو اپنی عاجزی پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیے اور اس کے عجز وانکسار کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے رب کے

فضل کا طلب گار رہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اس نے مرد کو مرد اور عورت کو عورت بنایا۔ وہ ان دونوں کی صلاحیتوں کو بھی جانتا ہے اور ان کی استعداد بھی اس کے علم میں ہے۔ اس مالک الملک نے مرد اور عورت کے لیے علیحدہ علیحدہ دائرہائے کار مقرر کر دیئے ہیں۔ انسانوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر زندگی بسر کریں اور اسی دائرہ میں محنت و لگن کے ساتھ کمال حاصل کریں۔ نیک اعمال میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کے دائرہ کار میں مداخلت سے باز رہیں جو کہ فطرت انسانی کے خلاف ہے۔

اس آیت میں حسد اور بغض کو برا کہا گیا ہے۔ کیونکہ حسن، مال، عزت، دولت، صحت اور شہرت کی تقسیم اللہ رب العزت کی مرضی اور اندازے کے مطابق ہی ہوتی ہے اور اس میں بیشمار حکمتیں ہیں جو شخص جس قابل ہوتا ہے اللہ اس کو وہی دیتا ہے اور پھر یہ سب غیر اختیاری (انسان کے اختیار سے باہر) معاملات ہیں۔ کسی کو زیادہ دے کر کسی کو کم دے کر کسی کو حسین بنا کر کسی کو بدصورت بنا کر غرض ہر صورت میں ہر حالت میں انسان کی آزمائش ہی ہوتی ہے کیونکہ یہ دنیا یہ زندگی امتحان کی جگہ ہے۔ دنیا میں اللہ نے کسی کو کوئی خوبی دے رکھی ہے کسی کو کوئی دوسری۔ کوئی مالدار ہے کوئی غریب ہے۔ کوئی حسین ہے کوئی بدصورت ہے، کوئی تنومند اور صحت مند اور کوئی کمزور اور مستقل بیمار۔ کوئی سالم الاعضاء ہے تو کوئی پیدائشی اندھا یا گونگا یا بہرہ ہے۔ کوئی بڑا عقلمند اور ذہین ہے اور کوئی کند ذہن ہے۔ کسی میں قوت کار کی استعداد بہت زیادہ ہے کسی میں کم ہے، کوئی چست اور پھرتیلا ہے تو کوئی پیدائشی طور پر سست اور ڈھیلا ڈھالا ہے اور اسی اختلاف ہی سے اس جہان کی رنگینیاں قائم اور اس دنیا میں ایک دوسرے کے کام چلتے چلاتے رہتے ہیں۔ اب اگر اس قدرتی اختلاف میں سے کسی بھی چیز کا اختلاف مٹانے کی کوشش کی جائے گی تو وہ اختلاف تو دور نہ ہو سکے گا البتہ معاشرہ میں بگاڑ ضرور پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے اگر اللہ نے کسی کو خوبی عطا کی ہے تو اس کے لیے حسد ہوس اور بغض نہ رکھنا چاہیے کیونکہ اس کے عوض اللہ نے تمہیں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ضرور دی ہوگی۔ البتہ اپنے لیے اللہ کے

فضل کی دعا کر سکتے ہو۔اور اگر سچے دل سے دعا کرو گے اور اس کام کے لیے اسباب بھی اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ یقینا اپنے بندوں پر بہت عنایات کرنے والا ہے۔

اجر وثواب میں مرد وعورت برابر ہیں

مرد ہو یا عورت جس کی نیت میں خلوص زیادہ ہوگا تو اس کو اس کے مطابق اجر ملے گا اور اگر عورت ہمت اور قوت کار کی استعداد میں کم ہونے کے باوجود وہی نیکی کا کام سرانجام دیتی ہے جو مرد نے دیا ہے تو یقینا عورت کو اس کا اجر زیادہ ملنا چاہیے۔گویا ثواب کے لحاظ سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔البتہ دوسرے عوامل ثواب کی کمی بیشی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔اب اگر کوئی عورت اس انداز سے سوچنا شروع کر دے کہ مرد کے تو اللہ نے میراث میں دو حصے رکھے ہیں اور عورت کا ایک۔یا یہ کہ مرد کو اللہ نے عورتوں پر حاکم بنا دیا ہے اور عورتیں محکوم ہیں یا کوئی مرد اس انداز سے سوچنا شروع کر دے کہ اخراجات کی سب ذمہ داریاں تو مرد پر ڈال دی گئی ہیں۔پھر عورت کا میراث میں مفت میں ہی حصہ مقرر کر دیا گیا ہے یا یہ کہ مرد اپنی بیوی اور بال بچوں کی خوراک، پوشاک، رہائش، تعلیمی ذمہ داریوں کے مکمل اخراجات کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے کہ وہ جیسے بھی بن پڑے کما کر لائے اور اہل خانہ کی خدمت میں پیش کر دے تو اس طرح تو مرد اپنے اہل خانہ کا خادم ہوا حاکم کیسے ہوا۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قسم کے غلط انداز فکر چھوڑ دو۔اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں اس حیثیت سے دیئے ہیں کہ وہ ہر ایک بات کو خوب جانتا ہے لہٰذا اگر تم میں سے کسی کو کچھ کسر معلوم ہوتی ہے تو اللہ سے اس کا فضل مانگا کرو۔وہ بڑا صاحب فضل ہے اور تمہاری سب کمزوریاں اور کوتاہیاں دور کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب واقف ہیں کہ کس میں کیا صلاحیت ہے؟ کس سے کیا ذمہ داریاں متعلق ہونی چاہئیں؟ اور ذمہ داریوں کی نسبت سے کن کے کیا حقوق ہوں گے؟ اس لئے ایسی چیزوں پر حسد نہ ہونا چاہئے، آج پوری دنیا میں عورتوں کی آزادی کے نام پر جو تحریک چلائی جا رہی ہے اور عورتوں اور مردوں کو ایک صف میں کھڑا کر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ اسی ناسمجھی کا نتیجہ ہے، جب انسان کی تخلیق اللہ نے کی

ہے، تو یقیناً اللہ اس بات سے واقف ہیں کہ کس کے کیا فرائض ہونے چاہئیں؟ اس کی رعایت کئے بغیر غیر فطری مساوات پیدا کرنے کی کوشش سے مساوات تو پیدا نہ ہو سکے گا؛ لیکن فطرت سے بغاوت کی سزا انسان کو ضرور ملے گی، مغرب میں خاندانی نظام کا بکھراؤ، ازدواجی زندگی کی بے ثباتی اور قلبی سکون سے محرومی کی جو کیفیت ہے، وہ اسی بغاوت کی سزا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ و معاملہ کے متعلق فیصلہ کرنے، کوئی رائے قائم کرنے یا کوئی حکم لگانے کی تین ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں. اول مذہب، دوم اخلاقیات اور سوم قوانین. مذاہب اخلاقیات اور قوانین میں جنس کی کوئی تفاوت نہیں ہوتی ہے. مرد اور عورت کے لیے نہ الگ الگ مذاہب ہیں نہ الگ الگ قوانین اور نہ ہی الگ الگ اخلاقی اصول ہوتے ہیں دین اسلام عورت اور مرد کے مابین جنس کی بنیاد پر کوئی تفاوت روا نہیں اللہ کے جتنے بھی احکام ہیں ان کی اطاعت اور انکا اطلاق مرد و عورت پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ حسنات و سیئات کے تمام معیارات اور گناہ و بدی کے تمام اعلانات مرد و عورت کے لیے ایک ہی ہیں. خدا کے ہاں ایک ہی میزان ہے جس پر مرد و عورت دونوں تولے جائیں اور اسی ایک میزانِ عدل و انصاف پر ایک ہی اصول کے تحت مرد و عورت دونوں کے لیے ایک ہی جنت و جہنم کی بشارت و وعید ہے۔

ترکہ میں وصیت کے احکام

وَلِكُلٍّ	اور ہر ایک کے لیے	جَعَلْنَا	ہم نے بنائے
مَوَالِيَ	وارث	مِمَّا	اس (مال) کے جو
تَرَكَ	چھوڑا	الْوَالِدٰنِ	ماں باپ نے
وَالْاَقْرَبُوْنَ ط	اور قریب تر رشتے داروں نے	وَالَّذِيْنَ	اور وہ لوگ جن سے
عَقَدَتْ	گرہ باندھی (عہد کیا)	اَيْمَانُكُمْ	تمہارے دائیں ہاتھوں نے
فَاٰتُوْهُمْ	تو تم انہیں دو	نَصِيْبَهُمْ ط	ان کا حصہ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بے شک اللہ ہے	عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز پر

گواہ	شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ اور ہم نے ہر اس مال کے کچھ وارث مقرر کیے ہیں عربی زبان میں 'مولیٰ' کا لفظ مختلف معنوں میں آتا ہے، یہاں وارث کا معنی مراد ہے۔ ابتداء اسلام میں ایک طریقہ موالات کا تھا، کہ دو شخص ایک دوسرے سے 'عقد موالات' کرتے، جو ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ایک دوسرے کے وارث بننے کا معاہدہ ہوتا، اسلام میں بھی ابتداءً اس حکم کو باقی رکھا گیا، مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ جو والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ کر جائیں۔ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اور جن لوگوں سے تم نے کوئی عہد باندھا ہوا ان کو ان کا حصہ دو۔ کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے جو حلف یا معاہدہ کسی کے ساتھ کیا ہوا ہے تو اس کا حصہ اسے دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب مہاجرین مدینہ آئے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کر دیا تھا، انصاری کا وارث اس کے رشتے داروں کی بجائے مہاجر ہوتا تھا، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی: (وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ) تو وہ (وراثت جو مہاجرین اور انصار کے درمیان قائم کی گئی تھی) منسوخ ہوگئی، پھر فرمایا: وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد یہ ہے کہ نصرت، اعانت اور نصیحت کی صورت میں انھیں ان کا حصہ دو، کیونکہ میراث سے ان کا تعلق ختم ہوگیا ہے، ہاں! البتہ ان کے لیے وصیت کی جاسکتی ہے۔ (بخاری) آیت میں "موالی" سے مراد عصبہ ہیں اور عصبہ کی وراثت میں "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ" کا اصول مقرر ہے، یعنی اول سب سے قریبی، پھر دوسرا اور ایک حدیث میں بھی فَلِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ کے الفاظ ہیں، یعنی اصحاب فروض سے جو کچھ بچ جائے گا وہ عصبہ میں سے اس شخص کو ملے گا جو میت کے مردوں میں سب سے زیادہ قریب ہوگا اور اس پر علماء کا اجماع بھی ہے۔ اور اسی اُصول پر آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان 'بھائی چارہ' (مواخات) کا رشتہ قائم فرما دیا، اسی سے متعلق یہ حکم ہے، پھر جب میراث کا پورا قانون نازل فرمایا گیا، اور یہ بات متعین کر دی گئی کہ میراث کا استحقاق قرابت داری سے متعلق ہوگا تو یہ حکم

منسوخ ہوگیا۔اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر دیا جائے۔رسم یہ تھی کہ دوستی میں ایک دوسرے سے یہ عہد کرلیا جاتا تھا کہ جب میں مرگیا تو میرے مال میں سے اتنا تمہارا ہوگا۔ حکم یہ ہوا کہ مسلمان کو عہد کی پابندی ضرور کرنی چاہیے،اس لیے اپنی زندگی میں ہی اس قسم کے عہد کو پورا کرتے ہوئے اپنے منہ بولے بیٹے یا دوست کو کچھ نہ کچھ دے دیا جائے،کیونکہ مرنے کے بعد وراثت صرف والدین یا رشتہ دار جو اللہ رب العزت نے حق دار مقرر کر دیئے ہیں وہی حق دار ہو سکتے ہیں۔دوست یا منہ بولے بیٹے یا دوستی میں بنائے گئے رشتہ دار ترکے میں ہرگز حصہ دار نہیں ہو سکتے۔وصیت کے مندرجہ ذیل احکام ہیں:1)ہر شخص کو اپنے مال کے ایک ثلث (تہائی) میں وارثوں کے علاوہ کے لیے جائز وصیت کرنے کا اختیار ہے،اور ورثا پر اس وصیت کے مطابق عمل واجب ہے۔2) البتہ اگر میت پر قرض ہو تو پہلے اس کی ادائیگی کی جائے گی،خواہ اس میں پورا ترکہ صرف ہو جائے،اس کی ادائیگی کے بعد اس وصیت پر عمل کیا جائے گا۔3) ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت میں تہائی میں عمل کرنا ضروری ہے اور باقی ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا،البتہ اگر ورثاء تہائی سے زیادہ میں بھی مرحوم کی وصیت کے مطابق عمل کرنا چاہیں تو بالغ ورثاء کو اپنے اپنے حصے کے بقدر اختیار ہے۔4)ورثاء کے لیے وصیت کرنے کی صورت میں وہ وصیت اصولاً غیر معتبر ہوگی اور مال ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق ہی تقسیم ہوگا،البتہ اگر بالغ ورثاء راضی ہوں کہ مرحوم کی وصیت پر مذکورہ وارث کے حق میں عمل کریں تو ان کو اختیار ہے۔5)ورثاء میں اگر نابالغ بھی ہوں اور وصیت ایک تہائی سے زائد ہو یا کسی وارث کے حق میں ہو،اور بالغ ورثاء اسے نافذ کرنے پر راضی ہوں تو ایک تہائی سے زائد وصیت صرف بالغ ورثاء کے حصے میں سے نافذ ہوگی،نابالغ ورثاء کو ان کا حصہ پورا دیا جائے گا۔اس میں بہت سی حکمتیں ہیں یہ حکمتیں تو اللہ رب العزت خوب اچھی طرح جانتے ہیں،کیونکہ نگران اعلیٰ یعنی سب سے بڑا نگرانی کرنے والا تو صرف اور صرف اللہ جل شانہ ہی ہے۔اس کے مقرر کئے ہوئے وارث ہی ترکہ کے حق دار ہو سکتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدًا ﴿۳۳﴾ بیشک اللہ ہر چیز کا گواہ ہے۔تمام چیزیں اس کے

سامنے ہیں اس لیے وہ سب پر گواہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس استعداد کا حامل ہے اور کس کو کس مقام پر رکھا ہے لہٰذا وہ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق ہر ایک کا دائرہ کار مقرر کرتا ہے۔ اس لیے اہل ایمان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کریں اور غیر فطری امور سے گریز کریں حتی الامکان نیکی کریں تا کہ انہیں فلاح حاصل ہو سکے۔

☆☆☆

مرد بطور حاکم/ اچھی بیوی کی چار صفات/ مرد کے بالمقابل عورت کی حیثیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا
مِنْ اَمْوَالِھِمْ ط فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ط وَالّٰتِیْ
تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ج فَاِنْ
اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا ۳۴

مساوات مرد وزن کا اسلامی نظریہ

اَلرِّجَالُ	مرد	قَوّٰمُوْنَ	حاکم ہیں
عَلَی النِّسَآءِ	عورتوں پر	بِمَا	بسبب اس کے جو
فَضَّلَ اللّٰہُ	اللہ نے فضیلت دی	بَعْضَھُمْ	اُن میں سے بعض کو
عَلٰی بَعْضٍ	بعض پر	وَّبِمَآ	اور بسبب اس کے جو
اَنْفَقُوْا	وہ خرچ کرتے ہیں	مِنْ اَمْوَالِھِمْ ط	اپنے مالوں سے
فَالصّٰلِحٰتُ	پس نیک عورتیں	قٰنِتٰتٌ	فرمانبردار ہوتی ہیں

حٰفِظٰتٌ	حفاظت کرنے والیاں	لِّلْغَیْبِ	پیٹھ پیچھے
بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ	بسبب اللہ کی حفاظت کے	وَالّٰتِیْ	اور وہ عورتیں کہ
تَخَافُوْنَ	تم ڈرتے ہو	نُشُوْزَھُنَّ	ان کی سرکشی سے
فَعِظُوْھُنَّ	تو تم انہیں نصیحت کرو	وَاھْجُرُوْھُنَّ	اور انہیں الگ کردو
فِی الْمَضَاجِعِ	خواب گاہوں میں	وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ	اور انہیں مارو
فَاِنْ	پھر اگر	اَطَعْنَکُمْ	وہ تمہاری اطاعت کریں
فَلَا تَبْغُوْا	تو نہ تم تلاش کرو	عَلَیْھِنَّ	ان پر
سَبِیْلًا ؕ	کوئی راہ (ستانے کی)	اِنَّ اللّٰہَ کَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
عَلِیًّا	نہایت بلند	کَبِیْرًا ۳۴	بہت بڑا

فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ ۔ مرد وعورتوں کے نگران ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور کیونکہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں ۔ ارشاد فرمایا: ’’اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ قوام، قیام، قیم عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا نظام کا ذمہ دار اور چلانے والا ہو، اسی لئے اس آیت میں قوام کا ترجمہ عموماً حاکم کیا گیا ہے، یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظام کے لئے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر اور حاکم ہوتا ہے کہ اختلاف کے وقت اس کے فیصلہ سے کام چل سکے، جس طرح ملک وسلطنت اور ریاست کے لئے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے، اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا سردار اور حاکم مانا گیا ہے، اسی طرح اسی عائلی نظام میں جس کو خانہ داری کہا جاتا ہے اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے، عورتوں اور بچوں کے مقابل اس کام کے لئے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علمی اور عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں، بچوں کے زیادہ ہیں اور یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی

سمجھدار عورت یا مرد اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ سورۃ البقرہ کی آیت میں "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (228:2) فرما کر اور سورہ نساء کی آیت متذکرہ میں "لِلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ" فرما کر یہ بتلا دیا گیا کہ اگرچہ عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم وواجب ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں اور دونوں کے حقوق باہم مماثل ہیں، لیکن ایک چیز میں مردوں کو امتیاز حاصل ہے کہ وہ حاکم ہیں اور قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ حکومت جو مردوں کی عورتوں پر ہے محض آمریت اور استبداد کی حکومت نہیں، بلکہ حاکم یعنی مرد بھی قانون شرع اور مشورہ کا پابند ہے، محض اپنی طبیعت کے تقاضہ سے کوئی کام نہیں کرسکتا، اس کو حکم دیا گیا ہے کہ "عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (91:5) یعنی عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ پر اچھا سلوک کرو۔

اسی طرح دوسری آیت میں "عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ" (332:2) کی تعلیم ہے جس میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ امور خانہ داری میں بیوی کے مشورہ سے کام کریں، اس تفصیل کے بعد مرد کی حاکمیت عورت کے لئے کسی رنج کا سبب نہیں ہوسکتی، تاہم چونکہ یہ احتمال تھا کہ مردوں کی اس فضیلت اور اپنی محکومیت سے عورتوں پر کوئی ناگوار اثر ہو، اس لیے حق تعالی نے اس جگہ صرف حکم بتلانے اور جاری کرنے پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ خود ہی اس کی حکمت اور وجہ بھی بتلادی، ایک وہبی (خدا کا دیا ہوا، عطیہ الٰہی یا خداداد یعنی وہ صفت، علم یا ہنر جو انسان کو بغیر کسی ظاہری محنت، کوشش یا تعلیم کے براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو۔ بعض افراد کی فطری ذہانت وحکمت جس میں کسی کے عمل کا دخل نہیں) دوسرے کسبی جو عمل کا اثر ہے۔ (کسبی کا معنی کمائی ہوئی محنت سے حاصل کردہ یا اکتسابی۔ یعنی وہ علم، ہنر یا صفت جو انسان اپنی ذاتی کوشش، ریاضت، مشق، مطالعہ اور محنت سے حاصل کرتا ہے۔ جیسے مدرسہ، اسکول یا یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا یا محنت سے کوئی ہنر سیکھنا)

پہلی وجہ یہ ارشاد فرمائی بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یعنی اللہ تعالی نے دنیا میں خاص حکمت و مصلحت کے تحت ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، کسی کو افضل کسی کو مفضول بنایا ہے، (افضل" اور "مفضول" دونوں میں ایک ہی قسم کی خوبی یا فضیلت موجود ہوتی ہے، لیکن افضل میں

وہ صفت زیادہ اور مفضول میں اس کی نسبت کم ہوتی ہے) جیسے ایک خاص گھر کو اللہ نے اپنا بیت اللہ اور قبلہ قرار دیدیا، بیت المقدس کو خاص فضیلت دیدی، اسی طرح مردوں کی حاکمیت بھی ایک خداداد فضیلت ہے جس میں مردوں کی سعی وعمل یا عورتوں کی کوتاہی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں۔ دوسری وجہ کسبی اور اختیاری ہے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، مہر ادا کرتے ہیں اور ان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں، ان دو وجہ سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا، مردوں کی افضلیت کے بیان کے لئے قرآن حکیم کا عجیب اسلوب: پہلی وجہ کے بیان میں مختصر طریقہ یہ تھا کہ رجال اور نساء کی طرف ضمیریں عائد کرکے فَضَّلَھُمْ عَلَیْھِنَّ فرمادیا جاتا، مگر قرآن کریم نے عنوان بدل کر بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ کے الفاظ اختیار کئے، اس میں یہ حکمت ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا بعض اور جزء قرار دے کر اس طرف اشارہ کردیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی فوقیت اور افضلیت ثابت بھی ہوجائے تو اس کی ایسی مثال جیسے انسان کا سر اس کے ہاتھ سے افضل یا انسان کا دل اس کے معدہ سے افضل ہے، تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا ہاتھ کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا، اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو نہیں گھٹاتا کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مثل اعضاء واجزاء کے ہیں، مرد سر ہے تو عورت بدن۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس عنوان سے اس طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے کہ یہ افضلیت جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے یہ جنس اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی عورت کمالات علمی وعملی میں کسی مرد سے بڑھ جائے اور صفت حاکمیت میں بھی مرد سے فائق ہوجائے۔

دوسری وجہ اختیاری جو بیان کی گئی ہے کہ مرد اپنے مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، اس میں بھی چند اہم امور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک تو اس شبہ کا ازالہ ہے جو آیات میراث میں مردوں کا حصہ دوہرا اور عورتوں کا اکہرا ہونے سے پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ اس آیت نے اس کی بھی ایک وجہ بتلادی کہ مالی ذمہ داریاں تمام تر مردوں پر ہیں، عورتوں کا حال تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے ان کے تمام مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہے اور شادی کے بعد شوہر پر اس لئے اگر غور کیا جائے تو

مرد کو دوہرا حصہ دینا اس کو کچھ زیادہ دینا نہیں ہے، وہ پھر لوٹ کر عورتوں ہی کو پہنچ جاتا ہے۔ دوسرا اشارہ ایک اہم اصول زندگی کے متعلق یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اس کے حالات اس کے لئے سازگار ہیں کہ وہ محنت، مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح دفتروں اور بازاروں میں پھرا کرے، اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی پوری ذمہ داری مردوں پر اس کے بالمقابل نسل بڑھانے کا ذریعہ عورت کو بنایا گیا ہے، بچوں کی اور امور خانہ داری کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی گئی ہے، جبکہ مرد ان امور کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ عورت کو اپنے نفقات میں مرد کا محتاج کر کے اس کا رتبہ کم کر دیا گیا ہے، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر ڈیوٹیاں تقسیم کر دی گئی ہیں، ہاں ڈیوٹیوں کے درمیان جو باہم تفاضل ہوا کرتا ہے وہ یہاں بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں وجہوں کے ذریعہ یہ بتلا دیا گیا کہ مردوں کی حاکمیت سے نہ عورتوں کا کوئی درجہ کم ہوتا ہے اور نہ ان کی اس میں کوئی منفعت ہے، بلکہ اس کا فائدہ بھی عورتوں ہی کی طرف عائد ہوتا ہے۔ شریعت نے گھر کے بندوبست اور انتظام کے لیے مرد کو گھر کا قوام (نگران، ذمہ دار) قرار دیا ہے اور عورت کو اس کے ماتحت رکھا ہے۔ قرآن نے اس کی دو وجہیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ مرد کو طبعی طور پر امتیاز حاصل ہے کہ وہ منتظم بنے اور دوسرے یہ کہ گھر کے سارے اخراجات بیوی کے نفقہ سمیت مرد کے ذمے ہیں۔ اس بنا پر گھر کا نگران بننے کا حق مرد کو ہے عورت کو نہیں۔ یہی حال حکومتی امور کا ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ یا امیر عورت نہیں ہوسکتی، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْ أَمْرَهُمُ امْرَأَةً) "وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حاکم عورت کو بنالیا" [بخاری، المغازی، باب کتاب النبی ﷺ إلی کسریٰ وقیصر: 4425] یعنی قوام کا معنیٰ سرپرست، سربراہ اور منتظم ہے۔ یعنی ایسا شخص جو کسی دوسرے کی تمام تر معاشی اور معاشرتی ذمہ داریاں پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ۔: اس آیت کی تشریح وہ حدیث کرتی ہے جس میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "بہترین بیوی وہ ہے جسے اگر تم دیکھو تو تمہیں خوش کرے، اگر تم اسے کسی بات کا

حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو تمہارے پیچھے وہ تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔" پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: (اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ)[مسند أبی داود الطیالسی: ابن جریر، 4/62، وصححہ صاحب ہدایۃ المستنیر]

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ: یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ نے خاوندوں کو عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دے کر ان کے حقوق محفوظ کر دیے ہیں، اس کے بدلے میں وہ خاوندوں کی غیر موجودگی میں ان کے مال اور عزت و آبرو کی حفاظت رکھتی ہیں۔ [دیکھیے نسائی، النکاح، باب أی النساء خیر: 3233] یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ان کے مال و عزت اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور خیانت سے کام نہیں لیتیں۔ (شوکانی)

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ۔۔ : نشوز کا لفظی معنیٰ "اونچا ہونا، چڑھائی کرنا ہے" اور عورت کے نشوز کا معنیٰ "خاوند سے بغض رکھنا اور اس کی اطاعت سے اپنے آپ کو اونچا سمجھنا ہے۔" (مفردات) عورت پر مرد کا بہت بڑا حق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" (ترمذی،) خصوصاً جب کسی چیز میں یہ اٹھان تحرک اور ہیجان کا نتیجہ ہو مثلاً عورت اپنے خاوند کو اپنا ہمسر یا اپنے سے کمتر سمجھتی ہو یا اس کی سربراہی کو اپنے لیے توہین سمجھ کر اسے تسلیم نہ کرتی ہو۔ اس کی اطاعت کے بجائے اس سے کج بحثی کرتی ہو۔ خندہ پیشانی سے پیش آنے کی بجائے بدخلقی سے پیش آتی ہو اور سرکشی پر اتر آتی ہو۔ بات بات پر ضد اور ہٹ دھرمی دکھاتی ہو یا مرد پر ناجائز قسم کے اتہامات لگاتی ہو۔ یہ باتیں نشوز کے معنیٰ میں داخل ہیں۔ ایسی عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو تین قسم کے ترتیب وار اقدام کرنے کی اجازت دی ہے فَعِظُوْهُنَّ پہلا قدم یہ ہے کہ اسے نرمی سے سمجھائے کہ اس کے اس رویہ کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کم از کم اپنی بہتری اور مفاد کی خاطر گھر کی فضا کو مکدر نہ بنائے۔ پھر اگر وہ خاوند کے سمجھانے بجھانے کا کچھ اثر قبول نہیں کرتی۔ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ اور ان کو تنہا چھوڑ دو خواب گاہوں میں تو خاوند اس سے الگ کسی دوسرے کمرہ میں

سونا شروع کر دے۔ اور اسے اپنے ساتھ نہ سلائے۔ اگر اس عورت میں کچھ بھی سمجھ بوجھ ہوگی اور اپنا برا بھلا سمجھنے سوچنے کی تمیز رکھتی ہوگی تو وہ اپنے خاوند کی اس ناراضی اور سرد جنگ کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ گر پھر بھی اسے ہوش نہیں آتا تو پھر تیسرے اور آخری حربہ کے طور پر مارنے کی بھی اجازت دی گئی ہے، مگر چند شرائط کے ساتھ جیسا کہ آپ نے فرمایا خبردار! عورتوں کے متعلق نیک سلوک کی وصیت قبول کرو۔ وہ تمہارے پاس صرف تمہارے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے سوا تم ان کے کچھ بھی مالک نہیں، بجز اس کے کہ وہ کھلی بے حیائی کریں اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں بستروں میں علیحدہ کر سکتے ہو اور اس طرح مار سکتے ہو کہ انہیں چوٹ نہ آئے (ترمذی، ابواب الرضاع، باب فی حق المرأۃ علی زوجھا) اور ایک حدیث کے مطابق کسی کو بھی یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی، یا ملازم یا بال بچوں کو منہ پر مارے۔ اور تیسری پابندی یہ ہے کہ ایسی مار نہ مارے جس سے اس کی بیوی کو کوئی زخم آجائے یا اس کی کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے۔ ان حدود و قیود کے ساتھ خاوند کو ایسی اضطراری حالت میں بیوی کو مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یعنی اگر وہ باز آجاتی ہیں تو محض ان پر اپنا رعب داب قائم کرنے کے لیے پچھلی باتیں یاد کر کے ان سے انتقام نہ لو اور اس اجازت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ اور اگر ایسا کرو گے تو اللہ جو بلند مرتبہ اور تم پر پوری قدرت رکھتا ہے تم سے تمہارے اس جرم کا بدلہ ضرور لے گا۔ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ یعنی اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو ان پر زیادتی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو، نہ ان کے لیے کوئی راستہ یا حیلہ بہانہ تلاش کرو۔ جب عورت نافرمانی سے باز آگئی، مقصد حاصل ہو گیا، تو اب کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ یاد رکھو! اللہ نے تمہیں برتری عطا کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہیں ان پر ہر جائز ناجائز کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کے اندر رہ کر معاملات کو طے کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ بیشک اللہ تعالیٰ بلند اور بڑا ہے۔ اس کے احکام کو مدنظر رکھو۔ اگر خلاف ورزی ہوئی تو پھر اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے مردوں کو بھی تنبیہ کر دی کہ وہ بھی حدود کے اندر رہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے میاں بیوی کے درجات کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ گھر کا نظام چلانا، اخراجات پورے کرنا اور اپنے بیوی بچوں کو بہترین آسائشیں دینے کا بندوبست کرنا مرد کا فرض ہے، اس فرض کو پورا کرنے کے لیے مضبوط جسم و جان کی ضرورت ہے جو کہ مرد کو عطا کی گئی ہے، اسی لیے اس کو حاکم یعنی سربراہ کہا گیا ہے۔ دوسری طرف عورت کا درجہ بھی کوئی کم تر نہیں۔ اس نے ہی تو ولیوں، پیغمبروں، فلسفیوں غرض تمام بہترین انسانوں کو جنم دیا پیدائش کا وسیلہ اللہ رب واحد نے عورت کو عطا کیا۔ صرف پیدائش کا فرض ہی نہیں دیا، بلکہ بچہ کی صحیح تعلیم و تربیت بھی اس کے ذمہ لگائی گئی۔ پیدائش اور تربیت اتنا بڑا، مشکل اور محنت کا کام ہے کہ اس کے لیے عورت کو کمانے کا وقت نہیں مل سکتا، کیونکہ کمانا خود ایک علیحدہ اور مشکل کام ہے جو مرد کے ذمہ ہے اسلام نے عورت کو کمانے کی ذمہ داری سے اس طرح آزاد کر دیا ہے کہ جب پیدا ہو تو باپ کفالت کرے، جب شادی ہو تو خاوند کفالت کرے، اگر وہ مر جائے تو بیٹا، اس کے بعد بھائی اس کے بعد قریب ترین رشتہ دار اگر کوئی بھی نہ ہو تو پھر اسلامی حکومت کا فرض ہے عورت کی کفالت کرے۔ یہ بہت بڑی سہولت ہے جو مسلمان عورت کو دی گئی ہے اگر عورت خود اپنی مرضی سے کچھ کام کرنا چاہے تو اس پر پابندی نہیں۔ یہ سہولت عورت کی نزاکت اور جسمانی کمزوری اور عزت و وقار کی وجہ سے دی گئی ہے اور سب سے بڑی وجہ بچہ کو پرورش کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ انسانی بچہ کی تمام تر تربیت اور اخلاق کی تشکیل ماں کی گود میں ہی ہوتی ہے۔ جدید نفسیات نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ 75 فیصد تربیت شخصیت و کردار کی تکمیل شروع کے تین سالوں میں ماں کی گود سے ہو جاتی ہے۔ باقی کردار سازی تعلیم و تربیت دوسرے ادارے مکمل کرتے ہیں۔ بچے کو خوش خلقی، محبت، ایثار باہمی میل جول اور تخلیقی صلاحیتیں ماں کی بہترین تربیت ہی سے ملتی ہیں۔ اسی لیے تو ماں کو صرف بچوں کی پرورش اور گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے جبکہ باہر کی ذمہ داریوں اور کمانے کی مشقت سے اسے آزاد کر دیا گیا ہے اور یہی نظام گھر، بچے اور میاں بیوی کی بہترین زندگی گزارنے کے لیے مناسب اور موزوں ہے اور اسی سے بہترین معاشرہ اور بہترین

ملک وجود میں آتے ہیں۔جب میاں بیوی کا نکاح ہوتا ہے تو میاں سربراہ کی حیثیت سے اور بیوی اس کو سربراہ مانتے ہوئے خوش گوار اطاعت گزاری کا معاہدہ کرتے ہیں۔دونوں کو اپنے فرائض پوری ایمانداری،خلوص اور محبت سے پورے کرنے چاہئیں۔قرآن وسنت کا مجموعی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان عدل کا رویہ اختیار کیا ہے۔روحانی ارتقا،اصلاحِ معاشرہ،دعوتِ دین،نیکی،تقویٰ اور اجر وثواب کے میدان میں دونوں کو برابر مواقع اور مساوی اجر کی بشارت دی گئی ہے۔البتہ جہاں ان کی جسمانی ساخت،نفسیاتی خصوصیات اور خاندانی ذمہ داریوں میں فطری فرق پایا جاتا ہے،وہاں اسلام نے ان کے دائرۂ کار اور بعض عملی ذمہ داریوں میں بھی فرق رکھا ہے۔یہ فرق کسی کی برتری یا کمتری کی بنیاد پر نہیں،بلکہ انسانی فطرت،معاشرتی استحکام اور خاندانی توازن کے تقاضوں کے مطابق ہے۔چنانچہ اسلام کا تصورِ مساوات محض حقوق کی برابری تک محدود نہیں،بلکہ عدل،ذمہ داری،روحانی فضیلت اور انسانی وقار کے جامع تصور پر قائم ہے،جہاں مرد اور عورت دونوں کو ان کی فطرت،صلاحیت اور ذمہ داریوں کے مطابق مقام عطا کیا گیا ہے،جبکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت وفضیلت کا اصل معیار ایمان،تقویٰ اور عمل صالح ہی ہے۔

☆☆☆

زوجین میں ثالثی فیصلہ/
میاں و بیوی کے اختلافات کے اَسباب اور اُن کا حل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِہِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا ۚ اِنْ
یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ۳۵

میاں بیوی کے معاملات پیچیدہ ہو جانے پر کیا کرنا چاہیے؟

وَاِنْ خِفْتُمْ	اور اگر تم ڈرو	شِقَاقَ	اختلاف سے
بَیْنِہِمَا	ان دونوں کے درمیان	فَابْعَثُوْا	تو تم مقرر کرو
حَکَمًا	ایک منصف	مِّنْ اَھْلِہٖ	اس (مرد) کے کنبے سے
وَحَکَمًا	اور ایک منصف	مِّنْ اَھْلِھَا ۚ	اس (عورت) کے کنبے سے
اِنْ یُّرِیْدَآ	اگر چاہیں گے یہ دونوں (منصف)	اِصْلَاحًا	صلح کروانا
یُّوَفِّقِ اللّٰہُ	(تو) موافقت پیدا کر دے گا اللہ	بَیْنَہُمَا ؕ	ان دونوں کے درمیان
اِنَّ اللّٰہَ کَانَ	بے شک اللہ ہے	عَلِیْمًا	خوب جاننے والا
خَبِیْرًا ۳۵	بڑا خبردار		

شریعت کی نظر میں میاں بیوی کے تعلقات بڑی اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ میاں بیوی میں

اختلاف اور ناچاقی پیدا ہونے سے صرف دو افراد کے درمیان رشتہ ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ دو خاندان اجڑ جاتے ہیں اور بسا اوقات کئی کئی خاندانوں کے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن کریم میں میاں بیوی کے تعلقات خراب ہونے کی صورت میں دونوں طرف سے ثالث مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ فریقین میں باہمی صلح کرانے کی کوشش کی جائے۔ زوجین میں ثالثی فیصلہ (تحکیم) سے مراد میاں بیوی کے درمیان شدید اختلاف یا ناچاقی کی صورت میں صلح یا جدائی کے لیے خاندان یا بااختیار افراد کی طرف سے فیصلہ کرنا ہے۔ فرمایا: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو تو (ان کے درمیان فیصلہ کرانے کے لیے) ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے بھیج دو۔ اور اگر میاں بیوی کے تعلقات سنورنے میں نہ آ رہے ہوں اور ان میں سے ہر کوئی دوسرے پر الزام تھوپ رہا ہو تو طلاق سے پہلے فریقین اپنے اپنے خاندان میں سے ثالث منتخب کریں جو پوری صورتحال کو سمجھ کر نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں۔ یہ ثالث طرفین کی طرف سے ایک ایک آدمی بھی ہو سکتا ہے دو دو بھی اور تین تین بھی۔ جو بات بھی میاں بیوی دونوں کو تسلیم ہو اختیار کی جا سکتی ہے۔ اگر ان تدبیروں سے کام نہ چلے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب معاملہ اس حد میں پہنچ چکا ہے کہ خود زوجین آپس میں اس کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا اگر وہ دونوں اصلاح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان اتفاق پیدا فرما دے گا۔ یعنی خاندان اور سماج کے بزرگوں کی مداخلت ضروری ہو گئی ہے؛ لہٰذا اس آیت میں دونوں خاندان کے بزرگوں کو خطاب ہے کہ اگر اختلاف شدید ہو جائے اور آپس میں نزاع کا حل ہونا دشوار ہو تو دونوں طرف سے ایک ایک سمجھ دار اور مخلص حَکَم متعین ہوں، جو حتی المقدور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں، اگر وہ نیک نیتی کے ساتھ ایسی کوشش کریں گے تو ضرور اللہ تعالیٰ دونوں میں ہم آہنگی کی صورت پیدا کر دیں گے اس آیت کریمہ میں میاں بیوی کے تعلقات خراب ہونے کی صورت میں دونوں طرف سے

ثالث مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ فریقین میں باہمی صلح کرانے کی کوشش کی جائے۔ دونوں طرف سے بااثر اور سمجھدار افراد کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں تاکہ طلاق کی نوبت نہ آئے۔لیکن اگر تمام تر کوششوں اور وسائل کے اختیار کرنے کے باوجود زوجین کے درمیان نکاح کے نباہ کی کوئی صورت ممکن نہ ہو اور شوہر کی طرف سے بیوی کے ساتھ واقعی بلاوجہ زیادتی یا تشدد کیا جاتا ہو، تو ایسی صورت میں شریعت نے عورت کو طلاق کے مطالبہ کا حق دیا ہے۔

البتہ بلاوجہ اور بغیر شرعی عذر کے عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کرنا ناجائز ہے اور حدیث شریف کے مطابق ایسی عورت پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے، جو بغیر وجہ کے طلاق کا مطالبہ کرے۔(سنن ابی داؤد: رقم الحدیث:2226)

آگے اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان کی گئی ہیں۔اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ﴿۳۵﴾ بیشک اللہ کو ہر بات کا علم اور ہر بات کی خبر ہے۔ان صفات کے تذکرے سے مصالحت کنندگان کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ دیکھو! تمہارا فیصلہ حق وانصاف پر مبنی ہونا چاہیے کسی کی بے جا طرفداری نہ کرنا، اگر تم نے اندرونِ خانہ کوئی گڑبڑ کی تو اللہ تعالیٰ علیم ہے۔وہ تمہاری نیتوں کو بھی جانتا ہے۔اس سے کوئی چیز مخفی نہیں اور وہ ذات خبیر بھی ہے تم جو کچھ جس نیت اور ارادے سے کر رہے ہو، اس کی ہر آن اسے خبر ہے۔اگر فیصلے میں کوتاہی کروگے، جان بوجھ کر انصاف کی خلاف ورزی کروگے تو اللہ کے ہاں مجرم ٹھہروگے اور اسکی گرفت میں آجاؤ گے۔یہ بالکل ویسی ہی تنبیہ ہے جیسی اس سے قبل خاوند کو کی گئی ہے کہ دیکھو! تمہیں اللہ نے عورت پر حاکم بنایا ہے تو اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی مت کرنا۔یہ نہ سمجھنا کہ مجھے عورت پر کلی اختیار حاصل ہو گئے ہیں جو چاہوں کرتا پھروں۔انہیں ایسا نہیں ہے۔ وہاں فرمایا وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیًّا کَبِیْرًا اللہ تعالیٰ بلند بھی اور عظمت و بڑائی کا مالک بھی ہے اگر تم عورت کے ساتھ کوئی زیادتی کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں تمہیں بہرحال پیش ہونا ہے اس عدالت سے بڑی نہ کوئی عدالت ہے اور نہ اس عدالت کے سامنے کسی کی چرب زبانی کام آسکتی ہے وہاں تمہیں اپنی زیادتی کا جواب دہ ہونا پڑیگا۔اگر مصالحتی کمیٹی بھی ناکام ہو جائے تو پھر آخری صورت

عدالتی چارہ جوئی ہے۔ اسلامی عدالت فیصلہ کریگی۔ اللہ تعالیٰ نے محرکات نکاح کے ساتھ ساتھ یہ معاشرتی مسائل بھی بیان فرمادیے ہیں۔

ہمارے معاشرتی وعائلی مسائل میں سے ایک بہت بڑا مسئلہ میاں بیوی کے اختلافات کا ہے کہیں شوہر کو بیوی سے شکایت ہے تو کہیں بیوی شوہر سے بیزار ہے۔ روز روز کی لڑائی کے سبب نہ صرف خود اِن کی اپنی زندگی تکلیف دہ ہوجاتی ہے، بلکہ اِس کے برے اثرات اِن کی اولاد پر بھی پڑنے لگتے ہیں، اولاد کے دل میں نہ باپ کا ادب رہتا ہے، نہ ماں کی عزت۔ ان اختلافات کا آغاز آپس کی تلخ کلامی، تو تو، میں میں اور گالی گلوچ ولعن طعن سے ہوتا ہے اور گالم گلوچ اور مار پیٹ کے رستے سے خلع اور طلاق تک جا پہنچتا ہے۔ جس کے نتیجے میں میاں و بیوی دونوں کا تعلق کسی دین دار، باحیا ومہذب خاندان سے ہو تو دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ بچوں کا مستقبل تباہ ہوجاتا ہے، عورت ماں باپ کے گھر میں جا کر اُن کے لیے یا اُن کی طرف سے اپنے لیے ایک مشقت بھرا پریشانیوں والا رستہ اختیار کر لیتی ہے، جس پر چلتے ہوئے اس کے میکے میں اس کے ماں و باپ کے درمیان یا بھائی بھابھیوں کے درمیان اختلافات ومسائل کا ایک نیا دور شروع ہوجاتا ہے۔ کسی بھی دارالافتاء میں جا کر معلوم کرلیا جائے کہ وہاں کس قسم کے مسائل سامنے آتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ پوچھے جانے والے سوالات طلاق وخلع اور فسخ نکاح سے متعلق ہوتے ہیں، ان اختلافات ومسائل کو حل کرنا ہے تو پہلے ان اختلافات کے اسباب پر غور کرنا ہوگا کہ کون سی ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے یہ حالات بنتے ہیں؟ اسباب ایک نہیں کئی ہوسکتے ہیں، مثلاً: ہم مزاج نہ ہونا، رہن وسہن اور اسٹیٹس کا مختلف ہونا، (جسے آپ معاشی فرق سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں) جوائنٹ فیملی سسٹم، کسی ایک یا دونوں کا اخلاق سیئہ والا ہونا، دینی برابری کا نہ ہونا وغیرہ۔ اِس نااتفاقی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ مرد وعورت ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت نہیں کر پاتے اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو اپنی نفسانی ضد کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ مرد چاہتا ہے کہ عورت میری نوکرانی کی طرح رہے اور عورت چاہتی ہے کہ مرد میرا غلام بن کر رہے، میرے اِشاروں پر چلے وغیرہ وغیرہ۔ ذرا سوچیے کہ جب میاں بیوی کے درمیان ایسے خیالات

پیدا ہوں گے تو پھر زندگی کیسے گزر پائے گی؟

اختلاف کے حل کا ایک قوی نسخہ

غور کرنے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ میاں و بیوی کے اختلاف کیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ چند لمحوں میں حل اور ختم کیے جاسکتے ہیں، وہ ایسے کہ اختلاف چاہے کسی بھی سبب سے پیدا ہوا ہو، اُسے باقی رکھنے والا عنصر ہمیشہ انسان کی اَنا ہوتا ہے، چاہے وہ مرد کی طرف سے ہو، چاہے عورت کی طرف سے، جانبین میں سے اگر کوئی ایک اپنی اَنانیت کو چند لمحوں کے لیے ختم کر دے اور جھک جائے، معافی مانگ لے، معذرت کر لے، خاموش ہو جائے تو دیکھ لیجیے گا کہ جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ لیکن جھگڑے کے موقع پر اَنانیت کے موجود ہوتے ہوئے اختلاف ختم ہو جائے، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ شیطان اس وقت آپ کے دل میں یہ خیال و وسوسہ پیدا کرے کہ اَنانیت ختم کرنے کا تو مطلب یہ ہے کہ تم بیوی کے نیچے لگ جاؤ، رن مرید بن جاؤ، اسے سر پر چڑھا لو، کمینے بن جاؤ، ذلیل ہو جاؤ، اپنی قدر گھٹا لو، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آپ نے اس کے اِن وسوسوں پر کان نہیں دھرنا، بالکل اہمیت نہیں دینی، ان کے مقتضا پر عمل نہیں کرنا، اگر اس وقت آپ نے ان وساوس سے بچتے ہوئے صلح کر لی، معذرت کر لی تو دیکھ لیجیے گا اس کے بعد جھگڑوں اور اختلافات کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ لڑائی کا ہو جانا ایک فطری امر ہے، جہاں برتن اکٹھے ہوں تو وہ آپس میں ٹکراتے ہیں، آپ اسے (یعنی لڑائی کو) روک نہیں سکتے، کیوں کہ ہم انسان ہیں اور انسانوں میں لڑائی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن لڑائی کا باقی رہنا، طول پکڑ جانا، سالہا سال تک چلتے رہنا، اس کی وجہ سے معاملہ مار پٹائی، قتل و غارت اور جدائی (یعنی طلاق و خلع) تک پہنچ جانا فطرت نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کے برے اعمال کی کمائی اور اس کے کرتوتوں کی سزا ہے، اگر اپنے اعمال کو درست کر لیا جائے تو یہاں تک کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور اعمال کی درستگی کی ابتدا اپنے اندر کی اَنانیت کے ختم کرنے سے ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ انسان میں کچھ کمزوریاں تو موجود ہیں اور وہ رہیں گی، اُنہیں ختم کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ ان کمزوریوں میں دو چیزیں مطلوب ہیں: ایک تو یہ کہ ہر فریق اپنی کمزوری کو دور کرنے کی

ممکن بھر کوشش کرے، اور دوسرا یہ کہ فریقین ایک دوسرے کی ایسی کمزوریوں کے بارے میں برداشت اور تحمل کا رویہ پیدا کریں، اُنہیں نظر انداز کریں، ان سے چشم پوشی کرلیں، ایسا بننے کی کوشش کی جائے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں، تب تو کام چل سکے گا، ورنہ نہیں۔ (ایسی سوچ اور اقدام اگرچہ بہت آسان نہیں ہے، لیکن ناممکن بھی نہیں ہے، اگر کوئی عزم کرلے تو یقیناً اللہ کی مدد و نصرت بھی اس کا مقدر بنے گی،) یہی وہ بات ہے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو عورت کے حوالے سے بیان کی ہے کہ نہ تو اِسے بالکل سیدھا کرنے کے چکر میں پڑو اور نہ ہی اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو، ورنہ دونوں میں ساتھ رہنا مشکل، بلکہ ناممکن ہو جائے گا اور نوبت علیحدگی تک جا پہنچے گی۔ مثلاً معمولات زندگی میں جھگڑے کی ایک وجہ مرد کا باہر کی کاروباری زندگی سے گھر میں دیر سے پہنچنا ہے، اس پر بیویاں سیخ پا ہوتی ہیں اور اسی طرح جب کبھی میاں و بیوی نے گھر سے باہر کہیں سفر پر یا کسی تقریب وغیرہ پر جانا ہو تو تیاری میں بیویاں بہت وقت لگا دیتی ہیں، حتیٰ کہ انہیں بروقت گھر سے باہر نکالنا ایک مشکل ترین کام بن جاتا ہے، ایسے موقع پر مرد کو بہت غصہ آتا ہے، نتیجہ اس خوشی کے وقت میں آپس کی چپقلش کی صورت میں نکلتا ہے، اب اس معاملے کو سلجھانا اپنے بس کی بات ہے، مقررہ وقت پر شوہر گھر آنے کی بھرپور کوشش کرے، اور اگر پھر بھی کسی وجہ سے کچھ تاخیر ہو جائے تو بیوی برداشت کرے اور نظر انداز کرے کہ باہر کی زندگی میں تاخیر کے اسباب بے شمار پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اسی طرح گھر سے باہر نکلنے کے لیے بیوی کو جو وقت بتایا گیا تھا وہ عین اسی وقت پر بالکلیہ تیار رہے، اپنی تیاری کی ابتدا کرے ہی اس طرح کہ بروقت نکلنا ممکن ہو سکے اور اگر اس میں کچھ تاخیر ہو بھی جائے تو پھر ایسی صورت میں شوہر تحمل کا مظاہرہ کرلے اور اپنے آپ کو سمجھالے کہ ایسا تو ہونا ہی ہوتا ہے، ہاں عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ مطلوبہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے کا وقت بیوی کو بتا دیا جاتا کہ اس وقت نکلنا ہوگا۔ یعنی فریقین کو ممکن حد تک اپنی اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہمارے معاشرے میں اختلافات اور جھگڑے کبھی تو بچوں کے درمیان ہوتے ہیں اور کبھی بچوں کی وجہ سے بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں، پھر بڑوں کے درمیان پیدا ہونے والی رنجشیں

اور جھگڑے کئی وجوہات کی بنا پر ہوتے ہیں، مثلا: مشترکہ خاندانی نظام، (جوائنٹ فیملی سسٹم)۔ایک دوسرے سے بہت زیادہ توقعات باندھ لینا، آپس کی سوچوں کا فرق، خاندانی ومعاشرتی رسوم ورواج کا فرق، آپس میں طے پانے والے معاملات کا درست طریقے سے پورا نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ نیز! گھریلو جھگڑوں میں کبھی یہ جھگڑے بہن بھائیوں کے درمیان ہوتے ہیں، کبھی ماں باپ اور اولاد کے درمیان ہوتے ہیں، کبھی ساس کی طرف سے جھگڑے اٹھتے ہیں، کبھی نندوں کی طرف سے، تو کبھی بہو کی طرف سے اور اسی طرح شوہر کی طرف سے اور کبھی بیوی کی طرف سے۔

اگر ہم شریعت کے احکامات پر عمل کریں گے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسنون زندگی کو حرز جان بنالیں گے، تو یہ تمام جھگڑے اور فسادات ان شاء اللہ ختم ہو جائیں۔

☆☆☆

عبادت صرف اعمال نہیں، پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت میں ڈھال دینے کا نام ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۳۶

صرف اللہ وحدہ عبادت کا مستحق ہے

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ	اور تم عبادت کرو اللہ کی	وَلَا تُشْرِکُوْا	اور نہ شریک ٹھہراؤ
بِہٖ	اس کے ساتھ	شَیْئًا	کسی چیز کو
وَّبِالْوَالِدَیْنِ	اور ماں باپ کے ساتھ	اِحْسَانًا	احسان (کرو)
وَّبِذِی الْقُرْبٰی	اور رشتہ داروں کے ساتھ	وَالْیَتٰمٰی	اور یتیموں (کے ساتھ)
وَالْمَسٰکِیْنِ	اور مسکینوں (کے ساتھ)	وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی	اور قرابت دار پڑوسی (کے ساتھ)
وَالْجَارِ الْجُنُبِ	اور اجنبی پڑوسی (کے ساتھ)	وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ	اور ہم نشین (کے ساتھ)
وَابْنِ السَّبِیْلِ	اور مسافر (کے ساتھ)	وَمَا	اور (ان کے ساتھ) جن کے
مَلَکَتْ	مالک ہوئے	اَیْمَانُکُمْ	تمہارے دائیں ہاتھ

اِنَّ اللّٰهَ	بلاشبہ اللہ	لَا یُحِبُّ	نہیں پسند کرتا
مَنْ كَانَ	اس کو جو ہے	مُخْتَالًا	اترانے والا
فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾		فخر کرنے والا	

ارشاد ہوتا ہے وَاعْبُدُوا اللّٰہَ اللہ کی عبادت کرو۔ یہ بنیاد ہے۔ اگر تمام لوگ صرف اللہ ہی کی عبادت کرنے لگیں تو باقی تمام حقوق خود بخود درست ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق، محسن اور مربی ہے۔ عبادت کا حق اور حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ وحدہ لاشریک کے لیے ہے۔ اگر اسی کے حقوق میں کوتاہی روا رکھی گئی تو پھر باقی مخلوق کا حق کیسے ادا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب بنیاد ہی کمزور ہوگی تو اس پر مضبوط عمارت کیسے تعمیر ہو سکتی ہے لہٰذا سب سے پہلے اس بنیادی عنصر کا ذکر کیا، لوگو اللہ کی عبادت کرو۔ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ یعنی کسی چیز کو کسی صورت میں اس کا شریک نہ بنانا۔ اس کا شریک نہ بنانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک و مختار تسلیم کیا جائے اور اس کی کسی صفت میں کسی زندہ یا مردہ مخلوق کو شریک قرار نہ دیا جائے، تمام مرادیں اور حاجات اسی سے مانگی جائیں کہ وہی عالم میں متصرف ہے، کوئی اور نہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے اور واجب الوجود ہونے میں تو کسی کو شک و شبہ نہیں اور نہ ہی ان دو صفات میں اللہ کے ساتھ کوئی شرک کرتا ہے۔ البتہ شرک ہوتا ہے عبادت میں اور تدبیر میں۔ پوری نوع انسانی میں سے دہریوں کی قلیل تعداد کے علاوہ تمام مذاہب کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ خالق صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں۔ کافر، مشرک، یہودی، نصرانی، ہندو، سکھ، چینی، بدھ مجوسی کسی سے پوچھ کر دیکھو لو کہ ہر چیز کا خالق کون ہے؟ سب کہیں گے۔ کہ خالق تو صرف اللہ ہے اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ انسان، حیوان چرند، پرند، کیڑے مکوڑے سب کو کس نے پیدا کیا؟ اللہ نے زمین، آسمان، سیارے، ستارے، چاند، سورج کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ سب کہیں گے اللہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کا تعلق ہے۔ اس میں بھی سب لوگ متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وجود خود بخود ہے۔ لفظ اللہ کا معنی ہی یہ ہے وہ واجب الوجود ہے اور تمام صفات کمال کا جامع ہے، وہ نقص اور زوال سے پاک ہے۔ جب

لفظ اللہ بولا جاتا ہے تو یہ ساری حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ فارسی میں اللہ کے لیے خدا کا لفظ ہے جس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ایسی ہستی جو خود بخود موجود اور قائم ہے، کسی کی محتاج نہیں، بلکہ سب اس کے محتاج ہیں۔ لہٰذا واجب الوجود بھی اللہ ہی کی ذات ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جو عبادت میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ غایت درجے کی تعظیم جو صرف خدا تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، وہ غیروں کے سامنے کرتے ہیں کوئی بت کے سامنے گڑگڑاتا ہے، کوئی قبر پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ کوئی ستاروں اور سیاروں کی پوجا کرتا ہے۔ انتہائی عجز وانکساری جو خالص اللہ کے لیے روا ہے، وہی نیازمندی، مافوق الاسباب ہستی تصور کرتے ہوئے جب غیر اللہ کے لیے پیش کر دی تو انسان مشرک بن گیا۔ اللہ کے علاوہ اگر کسی کو نافع اور ضار سمجھ لیا جائے اور پھر اس کی خوشنودی کے لیے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے نیاز کے طور پر خرچ کیا جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ اگر نیاز نہیں دیں گے تو نقصان ہو جائے گا، یا کم از کم برکت سے محروم ہو جائیں گے، تو یہ مال میں شرک ہوگا۔ مال بھی صرف اسی ذات کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جس نے اس مال کو اور اس خرچ کرنے والے کو بھی پیدا کیا پھر جب یہی چیز مخلوق کے لیے روا رکھی گئی، تو ایسا کرنے والا شرک کا مرتکب ہو گیا۔ شرک کے ارتکاب عمل کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کے سوا کسی مخلوق کو سجدہ کر دے۔ اسی طرح کسی کو مشکل کشا، حاجت روا، اور بگڑی بنانے والا سمجھنا یا کسی کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ صفات کمال کا حامل ہے۔ اسے ہر چیز کا علم ہے اور وہ محیط کل ہے، یہ سب شرکیہ عقیدے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات کے سوا نہ کوئی عالم الغیب ہے اور نہ محیط کل، اس معاملہ میں ملاء اعلیٰ کے مقربین، انبیاء کرام علیہم السلام شہداء عظام اور عام صالحین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم سب برابر ہیں۔ اللہ کی صفاتِ مختصہ میں کسی کا کچھ حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور باقی سب مخلوق۔ اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ کیا پیدا کرنے والے اور نہ پیدا کرنے والا برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں لہٰذا عبادت کے لائق صرف ذات الٰہی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ وہی عقیدہ رکھے گا جو خدا کے ساتھ روا ہے تو یہی شرک فی العبادت ہے۔

عبادت کی اقسام

عبادت بہت سی قسم کی ہے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بلکہ یوں سمجھو کہ جو جائز کام بھی رب کو راضی کرنے

کی نیت سے کیا جائے وہ عبادت ہے یہاں تک کہ آدمی رب کو راضی کرنے کیلئے اپنے بچوں کی پرورش کرے تو یہ بھی عبادت ہے اور ان میں ثواب ملتا ہے" عبادت و بندگی کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ کام جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) نے منع فرمایا ہے اس سے رک جانا اور بارگاہِ الٰہی و بارگاہِ محبوب مصطفےٰ (ﷺ) جو کام کرنے کا حکم ہو دل و جان سے اس پر عمل کرنا بالفاظِ دیگر "اَطِیْعُو اللّٰہَ وَ اَطِیْعُو الرَّسُوْل" کے عین مطابق خود کو عملاً ڈھال لینا عبادت ہے۔

عبادت کا ناقص تصور

آج ہمارے یہاں عبادت کا حلیہ بگڑا ہوا ہے، اس کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر یہ ہے کہ ہم نے عبادات کو صرف چند اعمال اور مراسم عبودیت کے ساتھ خاص کر لیا ہے اور یہ سمجھ لیا کہ بس ان کی ادائیگی پر عبادت منحصر ہے، بقیہ زندگی اس سے بالکل خالی ہے، نماز کو ہم عبادت سمجھتے ہیں اور صحیح سمجھتے ہیں، روزہ عبادت ہے، زکوٰۃ عبادت ہے، حج عبادت ہے۔ بلاشبہ یہ سب عبادات ہیں، لیکن جب دین کو ان میں منحصر کر لیا جائے اور یہ تصور قائم کر لیا جائے کہ بس ان کو بجالانے سے ہم حق عبودیت سے عہدہ برآ ہو گئے یہ بالکل غلط تصور ہوگا، "اگر ان عبادات کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو گیا، تو تصور دین محدود ہی نہیں؛ بلکہ مسخ ہو جائے گا" عبادت پوری زندگی میں خدا کے سامنے بچھ جانے کا نام ہے؛ زندگی کے ہر معاملے اور ہر گوشے کو اللہ کے حکم کا مطیع بنا دینا اور اپنی آزادی، اپنی خود مختاری، اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دینا اسی رویہ اور طرز عمل پر کاربند ہونا، زندگی کے تمام افعال و اعمال میں سر تسلیم خم کرنا ہی عبادت ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم

اللہ رب العزت نے انسانوں کو مختلف رشتوں میں پرویا ہے، ان میں کسی کو باپ بنایا ہے تو کسی کو ماں کا درجہ دیا ہے اور کسی کو بیٹا بنایا ہے تو کسی کو بیٹی کی نسبت عطا کی ہے، غرض رشتے بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق مقرر فرمائے ہیں، ان حقوق میں سے ہر ایک کا ادا کرنا ضروری ہے، لیکن والدین کے حق کو اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں اپنی بندگی اور اطاعت کے فوراً بعد ذکر فرمایا، یہ اس بات کی

طرف اشارہ ہے کہ رشتوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ارشاد ہوتا ہے وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔توحید کا حکم دینے کے بعد درجہ بدرجہ رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے حقوق بیان فرمائے۔شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:"اول حق اللہ تعالیٰ کا، پھر ماں باپ کا اور پھر ان سب کا درجہ بدرجہ۔" (موضح) انسان کے عدم سے وجود میں آنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بعد ماں باپ بنتے ہیں،اس لیے ان کا حق پہلے رکھا۔اولاد اور والدین کا سب سے قریبی تعلق ہوتا ہے والدین اولاد کے محسن ہوتے ہیں اور بغیر کسی معاوضہ کے احسان کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت میں اولاد کے لیے محبت ڈال دی ہے۔اس لیے وہ اولاد کے ساتھ مشفقانہ سلوک کرتے ہیں لہٰذا اولاد پر لازم ہے کہ وہ والدین کے ساتھ بہترین سلوک کریں اور انہیں قولی یا فعلی طور پر کسی قسم کی ایذا نہ پہنچائیں۔جائز امور میں ان کی اطاعت کریں،ضرورت کے وقت ان کی مالی مدد کریں، جسمانی طور پر انہیں راحت پہنچائیں،حتیٰ کہ والدین اگر کافر بھی ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ان کا عقیدہ تو اختیار نہ کریں البتہ وَ صَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا مگر دنیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ان کی جسمانی خدمت، دیکھ بھال اور مالی اخراجات میں کوئی کمی نہ کرو۔والدین کے حقوق اور احترام کو کفر کے باوجود دنیاوی معاملات میں مقدم رکھا گیا ہے۔

جن کے والدین دونوں یا ان میں سے کوئی ایک حیات ہے تو ان کو اللہ کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر ان کی فرمانبرداری کرے،ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرے،جتنا ہو سکے ان کی خدمت کرے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرے اور جن کے والدین دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اس دنیا سے گئے ہیں تو اُن کے ساتھ اب حسنِ سلوک یہ ہے کہ اُن کی وصیت کو نافذ کرے،ان کے ذمہ کوئی قرضہ ہو تو اُسے ادا کرے،شرعی حصص کے مطابق میراث کو تقسیم کرے،خود دینی تعلیم حاصل کرے اور اس پر عمل کرے،ان کے لیے دعا کرے،اللہ سے ان کے لیے رحمت و مغفرت طلب کرے،ان کی طرف سے صدقہ کرے،ان کی طرف سے نفلی حج و عمرہ کرے،کہیں کنواں کھدوائے یا لوگوں کے پینے کے پانی کا انتظام کرے،دینی کتابیں خرید کر وقف کرے،مسجد بنوائے،مدرسہ بنوائے یا دینی علم حاصل کرنے والے مہمانانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضروریات کو پورا کرنے میں تعاون

کرے، والدین کے قریبی رشتہ داروں اور تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، نفلی اعمال کر کے اُن کے لیے ایصالِ ثواب کرے، اپنے علاقہ، ملک اور دنیا بھر میں مظلوم مسلمانوں کی حالتِ زار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے مال کے ساتھ اُن کی خبر گیری کرے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی توفیق سے نوازے۔

رشتہ داروں سے حسن سلوک

وَّبِذِی الْقُرْبٰی: قرابتداروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ماں باپ کے بعد بہن، بھائی، چچا اور دیگر عزیز و اقارب ہیں ان کا بھی حق ہے۔ والدین کے واسطہ سے جس قدر کوئی قریبی ہے اسی قدر اس کا حق بھی مقدم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ، صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔" [ترمذی، الزکاۃ، باب ماجاء فی الصدقۃ۔۔:658] اور آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص پسند کرے کہ اس کے لیے اس کا رزق فراخ کیا جائے اور اس کے نشان قدم میں تاخیر کی جائے تو چاہیے کہ وہ اپنی رشتے داری کو ملائے۔" (مسلم) واضح رہے صلہ رحمی کا مطلب ہے رشتہ داروں سے تعلق جوڑنا یعنی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، اپنی ہمت کے بقدر ان کا مالی تعاون کرنا، ان کی خدمت کرنا، ان کی ملاقات کے لیے جاتے رہنا، وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ ان کے ساتھ بہتر تعلقات قائم رکھنا اور ان کی ہمدردی و خیر خواہی کے جذبات سے سرشار رہنا، اس میں "اصول" (جیسے والدہ اور والدہ کے آگے والدین، اسی طرح والد اور والد کے آگے والدین) اور "فروع" (جیسے بیٹی اور بیٹی کی آگے اولاد، نیز بیٹے اور بیٹے کی آگے اولاد) کے ساتھ ساتھ قریب و بعید کے باقی تمام رشتہ دار بھی داخل ہیں، البتہ جو زیادہ اقرب ہے اُس کا حق مقدم ہے۔

یتیم کس بچے کو کہتے ہیں؟

فرمایا وَالْیَتٰمٰی یتیموں کے حقوق ادا کرو۔ ان کے سر پر دستِ شفقت رکھو، ان کی ہر ممکن اعانت کرو۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح میں یتیم اس کمسن اور نابالغ بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہو چکا ہو۔ بچی ہو یا بچہ، وہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے تک شرعی طور پر یتیم شمار

ہوتے ہیں۔ بلوغت کا مرحلہ طے کرتے ہی (یعنی بالغ ہونے کے بعد) بچے کا یتیم پن ختم ہو جاتا ہے۔ جس بچے کی صرف ماں فوت ہو اور باپ زندہ ہو، اسے فقہی اصطلاح میں یتیم نہیں کہا جاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔" آپ نے اپنی دو انگلیوں شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو ملا کر بتایا۔ [بخاری، الأدب، باب فضل من یقول یتیمًا :6005، عن أبی ہریرۃؓ]

شرعاً مسکین کسے کہتے ہیں؟

وَالْمَسٰكِيْنِ مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ لفظ "مسکین" عربی زبان کے لفظ "سکون" سے نکلا ہے، جس کے معنی ٹھہراؤ، عاجزی اور حرکت کی کمی کے ہیں۔ لغت میں مسکین ایسے شخص کو کہتے ہیں جو تنگ دستی، کمزوری یا محتاجی کی وجہ سے بالکل بے قوت یا عاجز ہو گیا ہو۔ یعنی شرعی طور پر مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو یہاں تک کہ کھانے اور بدن چھپانے کیلئے اس کا محتاج ہے کہ لوگوں سے سوال کرے اور اسے سوال حلال ہے۔ فقیر (یعنی جس کے پاس کم از کم ایک دن کا کھانے کیلئے اور پہننے کیلئے موجود ہے اُس) کو بغیر ضرورت و مجبوری سوال حرام ہے۔ (عالمگیری ج ا ص ۱۸۷۔۱۸۸،) یعنی مسکین بھی تمہارے حسن سلوک کے مستحق ہیں ان کا بھی خیال رکھو۔ اللہ نے ان کا حق بھی تمہارے ذمہ رکھا ہے۔

پڑوسیوں اور دیگر مستحقین کے حقوق

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ قریب والے پڑوسی، دور والے پڑوسی، ساتھ بیٹھے (یا ساتھ کھڑے) ہوئے شخص اور راہ گیر کے ساتھ (اچھا برتاؤ رکھو) پڑوسی اور ہمسایہ کی قرآن نے دو قسمیں ذکر کی ہیں، ایک 'جارِ ذی القربیٰ' دوسرے 'جارِ جنب' "جارِ ذی القربیٰ" سے یا تو وہ پڑوسی مراد ہے جو مکان سے متصل ہو، اور اس کے مقابلہ "جارِ جنب" سے وہ پڑوسی، جو کچھ فاصلہ پر رہتا ہو، یا "جارِ ذی القربیٰ" سے ایسا پڑوسی مراد ہے جو رشتہ دار بھی ہو، اور "جارِ جنب" سے وہ پڑوسی جو رشتہ دار نہ ہو، بہر حال پڑوسی جس نوعیت کا بھی ہو، رشتہ دار یا اجنبی، قریب یا دور، مسلمان

یا غیر مسلم، حسن سلوک کا مستحق ہے وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ اس سے مراد رفیق سفر، شریک کار، بیوی اور وہ شخص جو فائدے کی امید پر کسی کی قربت و ہم نشینی اختیار کرے۔ بلکہ اس کی تعریف میں وہ لوگ بھی آسکتے ہیں جنہیں تحصیل علم، تعلم صناعت (کوئی کام سیکھنے) کے لئے یا کسی کاروبار کے سلسلے میں آپ کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے۔ (فتح القدیر) وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اور راہ گیر کے ساتھ اور اپنے غلام باندیوں کے ساتھ بھی (اچھا برتاؤ رکھو) اس میں گھر، دوکان اور کارخانوں، ملوں کے ملازم اور نوکر چاکر بھی آجاتے ہیں، غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید احادیث میں آئی ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کا وقتی طور پر ساتھ ہوگیا ہو، جیسے: دفاتر اور آفسوں میں، بسوں، ٹرینوں اور جہاز وغیرہ میں، یا کسی جلسہ یا اجتماع میں، ان کی رعایت بھی ضروری ہے۔

اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام متعلقین کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم دیا ہے۔ اگر اس ایک آیت پر ہی اہل اسلام عمل کرلیں تو دنیا سے شر و فساد ختم ہوجائے اور دین دنیا میں فلاح نصیب ہوجائے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ جس طرح لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا نہیں کیا، شرک کفر اور بدعات جاری کردی ہیں، اسی طرح حقوق العباد کے معاملہ میں بھی دور جا پڑے ہیں۔ نہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں اور نہ پڑوسیوں کا خیال کرتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی بجائے دل شکنی کی جاتی ہے۔ ان کے دروازے پر جا کر گالی گلوچ، اور شور و شر برپا کیا جاتا ہے۔ پتنگ بازی کے لیے چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں، آج کل ریکارڈنگ کی نئی مصیبت آگئی ہے پڑوس میں کوئی بیمار ہے۔ کوئی طالب علم مطالعہ میں مصروف ہے۔ کوئی عبادت گزار اللہ اللہ کرنا چاہتا ہے، مگر انہیں خدا کا خوف نہیں ہے، دوسرے کا احساس تک نہیں۔ اب مسجدیں بھی اس شور و غل میں شامل ہوگئی ہیں۔ وقت بے وقت سپیکر کھول کر غزلیں اور نعتیں شروع کردی جاتی ہیں اور پھر اسے کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے حالانکہ یہ مخلوق خدا کو ایذا پہنچائی جارہی ہے حضور ﷺ کا فرمان ہے لَا تُؤْذُوا الْمُؤْمِنِيْنَ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِيْنَ اس فرمانِ عالیہ میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں اور مومنوں کو تکلیف دینے پر سخت تنبیہ فرمائی ہے اہل اسلام کو ایذا دینا کونسی نیکی ہے۔ اگر کسی کو آرام

کے وقت آرام میسر نہیں، عبادت میں انہماک حاصل نہیں ہو رہا، بیمار کی نیند میں خلل آ رہا ہے، تو ایسی نیکی کا کیا فائدہ حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی رحمہ اللہ ہمارے بزرگوں میں سے ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ گھر میں آم کھائے ہیں تو ان کے چھلکے خود دور جا کر پھینک آتے تھے کہ کہیں پڑوسی کو تکلیف نہ ہو، نامعلوم انہیں یہ چیز میسر ہے یا نہیں۔ صاحب توفیق ہونے کے باوجود آپ کچے مکان میں رہتے تھے لوگ کہتے تھے کہ آپ اچھا مکان تعمیر کرلیں۔ فرمایا اللہ نے توفیق تو بیشک دی ہے مگر میرے پڑوسیوں کے مکان کچے ہیں اگر میں نے پختہ مکان بنالیا تو محلے والوں کو تکلیف ہوگی۔ پہلے دارالعلوم میں جا کر درس دیتے تھے جب زیادہ ضعیف ہو گئے تو طلبا کو گھر بلانے لگے۔ آپ طلبا کو ایک ایک چھتری بھی خرید کر دے دیتے تھے کہ انہیں آنے جانے میں تکلیف نہ ہو۔

غرور سے بیزاری

فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا اترانے والے اور بڑائی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کو عجز وانکساری محبوب ہے، وہ مغرور آدمی کو پسند نہیں فرماتا۔ جس شخص کے دل میں عاجزی ہوگی اسے خدا تعالیٰ کی عبادت کا صحیح تصور بھی ہوگا، وہ وحدانیت کا شیدائی اور شرک سے بیزار ہوگا۔ ایسا شخص اللہ کے حقوق بھی ادا کرے گا اور مخلوق کے حقوق سے بھی عہدہ برآمد ہوگا۔ جو شخص مال، دولت، جاہ اور اقتدار کی وجہ سے مغرور ہوگا وہ کسی کا حق ادا نہیں کریگا۔ ایسا مغرور اور شیخی بھگارنے والا شخص اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔ ایسے لوگ انسانیت کے دشمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بنیادی مسئلہ سمجھا دیا ہے کہ عاجزی والا شخص ہی حقوق کو ادا کرسکتا ہے اگر انسان میں عجز نہیں غرور وتکبر ہے تو کوئی کام درست نہیں ہوگا۔

☆☆☆

بخل! احسان سے روکنے والی عادتِ بد/ نام ونمود اور ریاکاری کی مذمت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۚ﴿۳۷﴾ وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَہٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾

بُخل! دل کی ایک خطرناک بیماری

الَّذِیْنَ	وہ لوگ جو	یَبْخَلُوْنَ	بخل کرتے ہیں
وَیَاْمُرُوْنَ	اور حکم دیتے ہیں	النَّاسَ	لوگوں کو
بِالْبُخْلِ	بخل کرنے کا	وَیَکْتُمُوْنَ	اور وہ چھپاتے ہیں
مَآ	اس کو جو	اٰتٰىھُمُ اللّٰہُ	اللہ نے انہیں دیا
مِنْ فَضْلِہٖ ؕ	اپنے فضل سے	وَاَعْتَدْنَا	اور ہم نے تیار کر رکھا ہے
لِلْکٰفِرِیْنَ	کافروں کے لیے	عَذَابًا مُّھِیْنًا ۚ﴿۳۷﴾	عذاب رسوا کرنے والا

بخل (کنجوسی) ایک اخلاقی اور باطنی بیماری ہے جس میں انسان مال و دولت جمع کرتا ہے اور اسے شرعی، اخلاقی یا ضرورت کے تحت خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ لغتِ عرب میں بخل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو مال دیا اس میں سے سائل کو نہ دینا اور بخل کی شرعی تعریف یہ ہے کہ جو چیز ذمہ میں واجب ہو اسے ادا نہ کرنا۔ (بغوی، النساء، تحت الآیۃ: ۳۷، ۱ / ۳۳۹) یہاں بخل سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے توریت میں مذکور اوصاف بیان کرنے میں بخل کرنا اور اس کا حکم دینا۔ شانِ نزول: یہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو توریت میں مذکور سیدُ المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے اوصاف بیان کرنے میں بخل کرتے اور چھپاتے تھے۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۳۷، ۱ / ۳۷۹) ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت کو دوسروں تک نہیں پہنچاتے، حالانکہ اللہ نے ان پر یہ حق عاید کیا ہے کہ اپنی جائز ضرورت سے زاید مال میں ضرورت مندوں اور محتاجوں کو شریک کرلیں۔ ایسے لوگ نہ صرف خود بخیل ہوتے ہیں وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں کہ تم بھی غربا و مساکین کے حقوق ادا نہ کرو۔ مدینے کے یہودیوں میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی تھیں۔ وہ خود بھی پرلے درجے کے کنجوس تھے اور اہل اسلام کو بھی مختلف حیلوں بہانوں سے خرچ کرنے سے روکتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ اگر تم نے گاڑھے پسینے کی کمائی بغیر سوچے سمجھے ضائع کردی، جہاد میں لگادی صدقہ خیرات کردیا، غریب مسکین یا کسی مسافر اور مہمان کی خاطر مدارات میں لگادیا تو تم قلاش ہوجاؤ گے، پھر بُرے وقت کے لیے تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا اور تم خود کوڑی کوڑی کے محتاج ہوجاؤ گے۔ اس طرح وہ بخل کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بخل ایک قبیح بیماری ہے جس قوم میں بخل پیدا ہوجاتا ہے وہ بددل ہوجاتی ہے اور آخر کار غیروں کی مغلوب ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اللہ کے دیے مال کو معاشرے کے کمزور طبقے تک پہنچنا چاہیے تاکہ وہ لوگ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں اور مسلمان من حیث القوم (ایک قوم کی حیثیت سے) ایک طاقتور معاشرہ قائم کرسکیں۔

بخل کی ترغیب دینا دراصل شیطانی فعل ہے۔ سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے اَلشَّیْطٰنُ

يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ شیطان فقر سے ڈراتا ہے کہ خرچ کروگے تو محتاج ہو جات گے اور اسی طرح بے حیائی کے کاموں کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ کھیل تماشے لہو ولعب، رسومات اور بدعات میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس طرح انسان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف لے جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بخل (کنجوسی) سے بچو، کیونکہ بخل نے تم سے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا۔" (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2578) اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بخل کی خطرناکی اور اس کے تباہ کن نتائج سے آگاہ فرمایا ہے، یعنی کنجوسی صرف مال روکنے کا نام نہیں بلکہ یہ دل کی بیماری ہے جو انسان کو ظلم، قطع رحمی اور دوسروں کے حقوق مارنے تک لے جاتی ہے، اسی بخل کی وجہ سے پچھلی امتیں ہلاک ہوئیں کیونکہ انہوں نے ایک دوسرے پر ظلم کیا، حق تلفی کی اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے انکار کیا، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کو سخاوت اختیار کرنی چاہیے اور اپنے مال کو اللہ کی نعمت سمجھ کر ضرورت مندوں کی مدد کرنی چاہیے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے گھر کے خرچ، رشتہ داروں کی مدد یا صدقہ دینے میں کنجوسی کرے تو یہ اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان کا سبب بن سکتا ہے، جبکہ جو شخص اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں برکت عطا فرماتا ہے، یہ حدیث ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ سخاوت ایمان کی علامت ہے اور بخل انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے، لہٰذا ہمیں بخل سے بچ کر اور خیر خواہی کو اپنانا چاہیے

علم میں بخل

آگے فرمایا بخیل کی حالت یہ ہے وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ ایسے بڑ مارنے والوں کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کر رکھا ہے، اسے چھپاتے ہیں۔ اس عطیہ الٰہی سے مراد علم بھی ہوسکتا ہے اور دولت بھی۔ یہ آیت اگرچہ یہود کے حق میں نازل ہوئی ہے جو ہر اس آیت کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے جو ان کی اپنی وضع کردہ شریعت یا ان کے مذہب کے

خلاف ہوتی تھی۔اور سود خوری اور حرام خوری کی وجہ سے بخل بھی ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔تاہم اس آیت کا حکم عام ہے اور مسلمانوں پر بھی لاگو ہے۔مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں اللہ نے بہت کچھ مال و دولت دے رکھا ہے۔لیکن وہ اپنی حیثیت کے مطابق نہ اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں نہ اہل وعیال پر نہ اللہ کی راہ میں اس کے حکم کے مطابق خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی اقرباء کی امداد کرتے ہیں۔اور اپنی حیثیت سے گر کر خستہ حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔یہ انتہا درجہ کا بخل دراصل اللہ کی نعمتوں کی ناشکری ہے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ جب کسی بندے کو نعمت عطا کرتا ہے تو وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو۔یعنی اس کی طرز بود و باش،لباس،خوراک اور صدقہ وخیرات غرض ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہوتا رہے اسی لیے ان ہر دو قسم کے بخل کو ناشکری یا کفر سے تعبیر کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ انہیں ذلت کا عذاب ہوگا۔مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے مال و دولت بھی ہے اور علم بھی۔انسان خود محنت کرتا ہے،تجارت یا ملازمت یا کھیتی باڑی کے ذریعے مال کماتا ہے۔بعض اوقات اسے کچھ مال وراثت اور وصیت کے ذریعے بھی مل جاتا ہے اور یہ سب کچھ مِنْ فَضْلِہٖ ہے اس کے علاوہ جسے اللہ نے علم کی دولت عطا کی ہے وہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔بخل مال میں بھی برا ہے اور علم میں بھی۔یہودیوں میں ہر دو طرح کا بخل موجود تھا۔مال کو خرچ کرنے سے ہچکچاتے تھے اور اہل کتاب ہونے کے حیثیت سے انہیں جو علم حاصل تھا اسے بھی چھپا جاتے تھے اور لوگوں پر سچی بات ظاہر نہیں کرتے تھے۔سنن بیہقی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ بخل فی العلم،بخل فی المال سے زیادہ قبیح ہے۔اس آیت میں بخل کی مذمت کی گئی ہے اور بخیل کے لیے کافر کا لفظ استعمال کیا ہے،کیونکہ کافر کا معنی چھپانے والا ہے اور بخیل بھی اللہ کی نعمت کو چھپانے والا ہوتا ہے۔بعض سلف نے اس آیت میں بخل کے لفظ کو یہودیوں کے بخل پر محمول کیا ہے،جو رسول اللہ ﷺ کی صفات اور علامات کو لوگوں سے چھپاتے تھے۔غرض بخل مال کا ہو یا علم کا شدید مذموم ہے۔(ابن کثیر) جو شخص علم کے باب میں بخل سے کام لیتا ہے،وہ تین میں سے کسی ایک صورت میں مبتلا ہو

گا۔ یا تو اپنا علم بھول جائے گا۔ یا مر جائے گا اور اس کے علم سے کوئی فائدہ نہ اٹھا پائے گا اور یا پھر اس کی کتابیں ہی ضایع ہو جائیں گی، محدث امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں میرا مشاہدہ ہے کہ جو اپنے سے کم تر سے تکبّر کا رویہ اپناتا ہے، خدا اسے برتر کے سامنے ذلت میں مبتلا کر دیتا ہے فرمایا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ ہم نے کفر کرنے والوں کے لیے ذلت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ وجوہ ظاہر ہے کہ نہ خود اچھے کام کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ اس دنیا میں تو کسی نہ کسی طرح بچ جائیں مگر آخرت میں ذلت ناک عذاب ان کا مقدر بن چکا ہے۔

بخل کے بجائے سخاوت وفیاضی

دین اسلام نے نرمی اور محبت، سخاوت اور فیاضی کا مزاج دیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللهِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ "انسانوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو" (الصحیح الالبانی: ۹۰۶)۔ دوسری حدیث میں آپ ؐ کا ارشاد ہے: "دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے" (بخاری)۔ دین اسلام نے انسانوں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان کے کام آنے کی تعلیم دی ہے۔ حدیث میں انسانوں کی پریشانیوں کو دور کرنے اور انھیں خوش کرنے کو صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹا دینا، بہرے کو بات سمجھا دینا، اندھے کو راہ دکھا دینا، کمزوروں کو سواری پر چڑھا دینا، اچھی اور پیاری باتیں بولنا، یہاں تک کہ اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے" (بخاری، مسلم، ابن حبان)۔

بخل رزائل اخلاق میں سے ہے۔ یہ کم عقلی اور بد تدبیری کی علامت ہے۔ بخیل انسانوں کے ہاں مبغوض اور اللہ کے ہاں ناپسندیدہ شخص ہے۔ یہ ایک ایسی خصلتِ بد ہے جو انسان کی ایک عادت یا زندگی کے ایک پہلو ہی پر اثر نہیں ڈالتی بلکہ اسکی سوچ اور عمل دونوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ بخل انسان کو اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ وہ تمام عمر بلکہ موت کی سرحد تک اس کے اثر سے نکل نہیں پاتا۔ بخیل کی بخیلی صرف مال تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ایسا شخص اپنے تمام تصرفات میں بخل

ہی برتتا ہے، محبت اور شفقت کے اظہار میں، مسکراہٹ بکھیرنے میں، تسلی و تشفی دینے میں، گویا بخیل دینے کے ہر عمل سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھ انسان کے بہت سے عیوب چھٹ جاتے ہیں لیکن بخل پہلے سے بڑھ کر جوان ہوتا ہے۔

قرض اور پریشانی سے نجات کے لیے نبی کریم ﷺ کی مسنون دعاء

بخل کے بارے میں اسلام کی اتنی واضح ہدایات کا نتیجہ ہے کہ مسلمان امت بحیثیت قوم سب سے بڑھ کر فیاض اور فراخ دل ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بخل دیگر بیماریوں سے بچنے کیلئے دعا سکھلائی: "اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحَزَنِ، وَأَعُوذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَأَعُوذُبِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ، وَأَعُوذُبِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ، وَقَھْرِ الرِّجَالِ" یااللہ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں فکر اور غم سے، اور میں تیری پناہ پکڑتا ہوں کم ہمتی اور سستی سے، اور میں تیری پناہ پکڑتا ہوں بزدلی اور بخل سے، اور میں تیری پناہ پکڑتا ہوں قرض کے غلبہ اور لوگوں کے ظلم وستم سے۔"

ریاکاری ایک مذموم عمل ہے

وَالَّذِيْنَ	اور وہ لوگ جو	يُنْفِقُوْنَ	خرچ کرتے ہیں
اَمْوَالَھُمْ	اپنے مال	رِئَآءَ النَّاسِ	لوگوں کو دکھانے کے لیے
وَلَا يُؤْمِنُوْنَ	اور نہیں وہ ایمان لاتے	بِاللّٰهِ	اللہ کے ساتھ
وَلَا	اور نہ	بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ	آخرت کے دن کیساتھ
وَمَنْ	اور جو شخص کہ	يَّكُنِ	ہو
الشَّيْطٰنُ لَهٗ	شیطان اس کا	قَرِيْنًا	ہم نشین
فَسَآءَ	تو برا ہے (وہ)	قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾	ہم نشین

بخیلوں کی مذمت کے بعد اب ریاکاری سے خرچ کرنے والوں کی مذمت کی جارہی ہے اور انھیں شیطان کا ساتھی قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین آدمیوں کو سب سے پہلے آگ میں جھونکا جائے گا اور وہ ہیں: 1 ریاکار عالم 2 ریاکار مجاہد 3 اور ریاکار سخی۔" (مسلم) فرمایا وَالَّذِيْنَ

یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ اور وہ لوگ جو لوگوں کے دکھلاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ انہیں خوفِ خدا نہیں اور نہ ہی مخلوق کے حقوق کی پاسداری ہے بلکہ وہ تو اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگ انہیں بڑے مخیر سمجھنے لگیں اور ان کی عزت میں اضافہ ہو یہ خود پسند اور متکبر لوگ ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر بخیل مگر ریاکاری کے کاموں میں خوب خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی قبیح بیماری ہے۔ تنگ دل لوگوں میں نفسیاتی طور پر دو کمزوریاں خصوصیت سے پائی جاتی ہیں: ایک یہ کہ بخل خرچ کرنے میں مانع ہو جاتا ہے، دوسرے: اگر کبھی خرچ کرے تو اللہ کو راضی کرنے اور اپنے غریب بھائی کی مدد کرنے کی بجائے نمائش اور دکھاوے کے جذبہ سے خرچ کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے ریاکاری کو شرک خفی فرمایا۔ فرمایا جو لوگ دکھلاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان کی حقیقت یہ ہے کہ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر۔ اگر وہ صحیح معنوں میں ایماندار ہوتے نہ بخل کرتے اور نہ ریاکاری

ریاکاری کیا ہے؟

ریاکاری کی تعریف مختلف الفاظ میں کی جاسکتی ہے: 1 غیر اللہ کی رعایت رکھتے ہوئے اخلاص کے بغیر کسی عمل کو کرنا ریاکاری ہے۔ 2 نیکی کا کام غیر اللہ کو دکھانے کے لیے کرنا ریاکاری ہے۔ 3 امام غزالی نے ریاکاری کی تعریف یوں کی ہے: "لوگوں کے دلوں میں اپنی قدر اور منزلت پیدا کرنے کے لیے نیکی کے کام کرنا"۔ 4 اپنی عبادت سے اللہ کی رضا کے علاوہ کسی اور چیز (مال، جاہ یا تعریف وغیرہ) کو طلب کرنا ریاکاری ہے۔ 4 دنیاوی اغراض کے لیے کسی عمل کو کرنا ریاکاری ہے۔ ریاکاری عمل کے شروع میں بھی ہوتی ہے، درمیان میں بھی اور عمل کرنے کے بعد بھی ریاکاری کا جذبہ دل میں پیدا ہوسکتا ہے، اگر کوئی عمل ابتداءً اللہ کی رضا کے لیے کیا لیکن درمیان میں یا اخیر میں غیر اللہ کو دکھانے یا تعریف سننے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ بھی ریاکاری کہلائے گی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ ریاکاری کی تین علامات ہیں: جب تنہا ہو تو عمل میں سستی کرے گا، جب لوگوں میں ہوگا تو عمل میں چستی دکھائے گا اور تعریف کرنے پر عمل میں زیادتی

کرے گا اور مذمت کرنے پر عمل میں کمی کرے گا۔

شیطان کے پھندے

فرمایا ریا کار لوگ دراصل شیطان کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا جس کا ساتھی شیطان بن گیا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۳۸ تو وہ بڑا برا ساتھ ہے۔ یہ شیطان ہی ہے جو انسانوں کے دل میں وسوسہ ڈال کر برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کا جہاں تک بس چلے گا، وہ انسانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریگا۔ اس نے تو اعلان کر رکھا ہے کہ میں ہر راستے سے گھیر کر انسان کو جہنم میں پہنچاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ میں نے بھی لوگوں سے وعدہ لے رکھا ہے کہ شیطان کی پوجا نہ کرنا۔ سورہ یٰسین میں ہے "اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۶۰ اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں لیا تھا کہ شیطان کے پیچھے نہ چلنا۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور تمہیں ہر حیلے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ تو فرمایا جس نے شیطان کو اپنا ساتھی بنالیا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے عرب کہتے ہیں: کسی شخص کی اچھائی برائی معلوم کرنا مقصود ہو تو اس کے ساتھی کو دیکھ لو۔ کیونکہ ساتھی دوسرے ساتھی کی اقتدا کرتا ہے انگریزی کا مقولہ بھی ہے کہ آدمی اپنی سوسائٹی سے ہی پہچانا جاتا ہے جس کردار کے مالک کسی شخص کے ہم نشین ہوں گے، وہ خود بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔ جس نے اپنا ساتھی شیطان کو بنالیا، وہ اسے جہنم میں ہی لے کے جائیگا۔ لہٰذا (اے لوگو!) تم خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ، شیطان کے حیلوں سے ہوشیار رہو، ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہو اور شیطان مردود سے اسی کی پناہ مانگتے رہو کیونکہ تمام معاملات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہی توفیق عطا فرمانے والا ہے، گناہوں سے بچنے اور طاعت و عبادت کرنے کی طاقت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ملتی ہے۔

☆☆☆

عقیدہ آخرت کی اہمیت/ قیامت کے دن اعضاء گواہی دیں گے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَمَاذَا عَلَیْھِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَھُمُ اللّٰہُ ؕ وَکَانَ
اللّٰہُ بِھِمْ عَلِیْمًا ۳۹ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ ۚ وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْھَا
وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا ۴۰ فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا
بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا ۴۱ یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ
تُسَوّٰی بِھِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا ۴۲

آخرت کے منکر خسارہ میں ہیں

وَمَاذَا	اور کیا	عَلَیْھِمْ	نقصان ہوتا ان کا
لَوْ اٰمَنُوْا	اگر وہ ایمان لے آتے	بِاللّٰہِ	اللہ کیساتھ
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	اور یوم آخرت کے (ساتھ)	وَاَنْفَقُوْا	اور وہ خرچ کرتے
مِمَّا	اس (مال) سے جو	رَزَقَھُمُ اللّٰہُ ؕ	اللہ نے ان کو دیا
وَکَانَ اللّٰہُ	اور ہے اللہ	بِھِمْ عَلِیْمًا ۳۹	ان کو خوب جاننے والا

بخل اور ریاکاری کی مذمت کے بعد ایمان وطاعت اور صدقہ وخیرات کی ترغیب دلائی، پھر مزید ترغیب کے لیے فرمایا کہ جب ذرا ذرا سی چیز کا اللہ تعالیٰ کئی گنا اجر دیتے ہیں، پھر لوگ کیوں

نیک کاموں میں سستی کرتے اور ریاکاری سے کام لے کر اپنے اجر کو ضائع کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَاذَا عَلَيْهِمْ ان کا کیا نقصان ہوتا۔ ان لوگوں کا کیا جاتا لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اگر وہ ایمان لے آتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ اور دوسرے کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے۔ تبلیغ کے سلسلے میں یہ بھی ایک طرز بیان ہے جب بات عام طرز گفتگو سے دوسرے کی سمجھ میں نہ آئے تو بعض اوقات تاسف کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کو کیا ہوگیا ہے؟ بات کو کیوں نہیں سمجھتے؟ اگر مان جاتے تو ان کا کیا نقصان ہوتا؟ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ان لوگوں کا کیا بگڑتا تھا اگر یہ اللہ پر اور قیامت پر ایمان لے آتے اور اللہ ہی کے عطا کردہ مال میں سے اپنے ہی بھائی بندوں پر خرچ کرتے ایسا کرنے سے اللہ کے حکم کی تعمیل بھی ہوجاتی، اس کی وحدانیت پر اور قیامت کے دن پر ایمان پختہ ہوتا بلکہ ان کی اپنی سوسائٹی کا معیار بھی بلند ہوجاتا۔ انہیں انسانیت میں کمال حاصل ہوتا، رذائل سے بچ جاتے۔ کفر شرک، نفاق، بدعقیدگی دور ہو کر ان میں اعلیٰ اوصاف پیدا ہوجاتے۔ ایمانیات کی دعوت کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کی بری خصلتیں دور ہوجائیں۔ اور اعلیٰ اخلاق پیدا ہوجائے۔ یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے ہوئے اللہ ہی کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے تو ان کا نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی تھا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی احسان شناسی بھی ہے اور آخرت میں سینکڑوں گنا اجر بھی۔ نقصان تو اس صورت میں ہے کہ مال بھی ہاتھ سے نکل گیا اور اس کا کچھ ثواب ملنا تو درکنار الٹا عذاب ہوگا اور ریاکار کا یہی انجام ہوگا۔ فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹ اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے یعنی ان کے ارادے اور خلاص تک سے باخبر ہے کہ وہ جو کچھ خرچ کررہے ہیں، کس نیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ کیا ان کا مقصود واقعی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور تقرب ہے یا محض دکھاوا ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ کوئی شخص اپنا مال خرچ کرکے اللہ کی عطا کردہ نعمت کا شکر ادا کررہا ہے، نوع انسانی سے ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے یا محض ریاکاری کے طور پر رسومات کو ادا کررہا ہے۔ کیا اس کے پیش نظر آخرت کا اجر وثواب ہے یا دنیا کی نمود ونمائش۔ جس نیت اور ارادے کے ساتھ کوئی شخص نیکی کررہا

ہے، اس کے نتائج بھی ویسے ہی ظاہر ہوں گے۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں یہ حقیقت پوری طرح واضح فرمائی ہے کہ دنیا میں اس کے احکامات کی پاسداری کا نتیجہ ابدی سعادت ہے۔ اس کے برعکس، ہدایات الٰہی سے روگردانی انسان کی زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔

عقیدہ آخرت اور فکر احتساب

عقیدہ آخرت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے۔ عقیدہ آخرت سے مراد اس بات پر ایمان لانا ہے کہ یہ زندگی عارضی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو ایک دن ختم کر دے گا۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی۔ موت کے بعد تمام انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دیں گے۔ اس وقت ہر ایک کے ساتھ انصاف ہوگا۔ جن کے اعمال اچھے ہوں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جن کے اعمال برے ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔ قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی دنیاوی زندگی اس کی آخرت کی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ دنیا کی زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی دائمی ہے۔ انسان کے تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مرتب نہیں ہوتے بلکہ اس عارضی زندگی میں جن اعمال کا بیج بویا جاتا ہے۔ ان کے حقیقی نتائج آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ اس لیے انسان کو فکر احتساب کرنی لازمی ہے تاکہ وہ یہ جائزہ لیتا رہے کہ اس نے آخرت کے لیے کوئی زاد راہ تیار کیا ہے یا نہیں۔ نیکیاں گناہوں سے زیادہ ہیں یا نہیں۔ ذمہ داریاں اور فرائض احسن طریقے سے ادا کیے ہیں یا نہیں کیونکہ جب دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ایک دوسرا نظام قائم ہوگا تو انسان کو پھر جسمانی زندگی ملے گی۔ اس روز ایک زبردست عدالت لگے گی جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اس کو نیک اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا ملے گی۔ اگر انسان آخرت پر ایمان نہ رکھے تو وہ خود غرضی اور نفس پرستی میں ڈوب کر تہذیب و شرافت اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو یکسر بھول جائے۔ فکر احتساب معاشرے کو انسانیت افروز بناتی ہے کیونکہ اس سے انسان کے دل میں

نیکی پر جزا اور بدی پر سزا کا احساس پیدا ہوتا ہے جو اعمال میں صالحیت پیدا کرتا ہے۔

یَظْلِمُ اور ذَرَّۃٍ کا معنی ومفہوم

اِنَّ اللّٰہَ	بلاشبہ اللہ	لَا یَظْلِمُ	نہیں ظلم کرتا
مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ	ایک ذرے کے برابر	وَاِنْ تَكُ	اور اگر ہو
حَسَنَۃً	کوئی نیکی	یُّضٰعِفْھَا	(تو) وہ اسے دگنا کر دے گا
وَیُؤْتِ	اور دے گا	مِنْ لَّدُنْهُ	اپنی طرف سے
اَجْرًا عَظِیْمًا ۴۰		اجر بہت بڑا	

فرمایا یاد رکھو! اللہ کا قانون یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ بیشک اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ ظلم'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی لغت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے: اَلظُّلْمُ، وَضْعُ الشَّیْءِ عَلٰی غَیْرِ مَوْضِعِهٖ یعنی ظلم کا مطلب ہے کسی بھی چیز کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا کر رکھنا۔ ظلم کے اصطلاحی معنی یہ ہے کہ کسی بات یا معاملات میں کمی بیشی جو حق وانصاف کے خلاف ہو، زبردستی کسی کی کوئی چیز لے لینا، کسی بھی معاملے میں حد سے تجاوز کرنا، گمراہی غلط کاری۔ پوری امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ظلم حرام ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث قدسی میں فرماتے ہیں کہ اللہ نے ارشاد فرمایا اے میرے بندو، میں نے ظلم کو اپنے اوپر بھی حرام کیا ہے اور تم پر بھی حرام کیا ہے، لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو (صحیح مسلم، باب تحریم الظلم)

علماء کرام نے ظلم کی تین قسمیں بیان کی ہیں: 1. شرک یعنی اللہ کے ساتھ اس کی عبادت وصفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ یہ ظلم کی سب سے سنگین قسم ہے۔ اللہ کا فرمان ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (سورہ لقمان: 13) ایسا سنگین جرم کہ اگر انسان شرک سے توبہ کیے بغیر مر جائے تو قیامت کے دن اس جرم عظیم کے لیے معافی نہیں۔ اللہ کا فرمان ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا۔ (بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا جو اس کا شریک ٹھہرائے اور شرک کے علاوہ دوسرے گناہ

جسے چاہے بخشتا ہے اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا، اس نے بڑا ہی گناہ کیا۔) (سورہ نساء:48)

2.حقوق اللہ میں کوتاہی کرنا۔گناہ کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کرنا۔ یہ ظلم کی وہ قسم ہے جس کی بخشش ہوسکتی ہے ۔ 3.تیسری قسم کا ظلم حقوق العباد کی حق تلفی ہے۔اس ظلم کی معافی نہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن ظالموں سے مظلوموں کے حق دلوائے جائیں گے، یہاں تک کہ سینگ والی بکری سے بغیر سینگ والی بکری کو بدلہ دلوایا جائے گا، اگر اس نے بغیر سینگ والی بکری کو دنیا میں مارا ہوگا۔ (صحیح مسلم:2582) ظلم کی پہلی دو قسموں کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، اور تیسری قسم کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کے متعلق اپنا اصول بیان کیا ہے کہ اگر ان میں کوتاہی ہو جائے اور اگر بندہ ان کو ادا نہ کر سکے تو صرف توبہ و استغفار سے معاف نہیں ہوتے، جب تک کہ ان حقوق کو ادا نہ کرے یا جس بندے کے حقوق میں کوتاہی کی ہے، وہ معاف نہ کر دے لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ کسی بھی انسان پر کسی بھی حال میں ظلم نہ کرے۔اگر ظلم ہو گیا ہے تو دنیا میں اس کی تلافی کی کوشش کرے۔ظلم نہ کرنا اور ظالم کو ظلم کرنے سے حکمت کے ساتھ روکنا بھی ہماری شاندار روایات کا حصہ ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا یا رسول اللہ، ہم مظلوم کی مدد تو کر سکتے ہیں، لیکن ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑ لو (یعنی اسے ظلم کرنے سے روک دو) (صحیح بخاری)

ظلم یا زیادتی اس لحاظ سے کہ انسان نے کسی جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو اور اللہ اس کو سزا سے دے دے یا کسی کا جرم کسی دوسرے کے سر ڈال دے یا کسی کی معمولی سے معمولی نیکی کو بھی ضائع کر دے یہ نہیں ہوسکتا۔عربی زبان میں ذَرَّۃٍ کے کئی معنے آتے ہیں۔ذرہ کا لفظ چھوٹی سی سرخ رنگ کی چیونٹی پر بھی بولا جاتا ہے اس کے علاوہ ی ہ لفظ رائی کے دانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جب کسی روشندان یا کھڑی سے سورج کی شعائیں اندر آئیں تو ان شعاؤں میں جو چھوٹے چھوٹے ذرات نظر آتے ہیں اور پکڑے نہیں جاسکتے، وہ یہی ذرہ ہے۔الغرض! ذرہ کا لفظ چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بولا جاتا ہے اور یہاں مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ معمولی سے معمولی درجے کی زیادتی بھی نہیں

کرے گا۔ یہ اللہ کے قانون کے خلاف ہے۔ وہ مالک الملک اور علی الاطلاق شہنشاہ ہے وہ کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا اور نہ کسی کے پرخلوص عمل کی جزاء میں کمی کریگا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ زیادتی تو کریگا نہیں۔ البتہ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا اگر کسی کی کوئی نیکی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسے دگنا کردے گا۔ دگنے کا قانون سورہ انعام کے آخری رکوع میں موجود ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا جو کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی بھی کریگا اس کا کم از کم اجر دس گنا ملے گا اور زیادہ سے زیادہ جتنا اللہ چاہے۔ سات سو گنا، سات لاکھ گنا، سات کروڑ گنا یا سات ارب گنا اس کے ہاں کوئی کمی نہیں۔ نیکی کا بدلہ جتنا چاہے عطا کردے۔ البتہ جہاں تک جرم اور برائی کا تعلق ہے فرمایا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ایک قصور کا بدلہ اسی قصور کے برابر ہوگا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور کوئی زیادتی نہیں کی جائیگی یہ اللہ تعالیٰ کی کس قدر مہربانی ہے کہ نیکی کا بدلہ تو ہزاروں لاکھوں گنا عطا کرتا ہے مگر برائی کی سزا اس برائی سے زیادہ نہیں دیتا۔ بہرحال فرمایا کہ ایک ذرے کے برابر بھی اگر نیکی ہوگی تو اس کو دگنا کردیا جائے گا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ یہ اجر کتنا بڑا ہوگا، اس کا تصور انسان اس دنیا میں نہیں کرسکتا۔ جب نتائج سامنے آئیں گے، اجر تقسیم ہونے لگے تو پھر پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کتنی وسیع ہے۔ وہاں پر رائی کا دانہ پہاڑ بن چکا ہوگا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کھجور کا دانہ احد پہاڑ جتنا بڑا ہوجائیگا۔ مگر شرط یہ ہے کہ جو بھی نیکی کی جائے اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کیا جائے وہ ایمان اور خلوص نیت کے ساتھ کیا گیا ہو تو اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔

حاضر و ناظر عقیدہ رکھنے کی وضاحت

فَكَيْفَ	پھر کیا حال ہوگا	اِذَا جِئْنَا	جب ہم لائیں گے
مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ	ہر امت سے	بِشَهِيْدٍ	ایک گواہ
وَّجِئْنَا	اور ہم لائیں گے	بِكَ	آپ کو (اے رسول!)
عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ	ان پر	شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾	گواہ

نیکی کی ترغیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے منکرین کا تذکرہ فرمایا ہے فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ پس کیا حال ہوگا۔ ان لوگوں کا جب ہم ہر امت سے گواہ لائیں گے۔ جب مجرمین اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے اور ان کو فرد جرم پڑھ کر سنائی جائے گی تو اس کے ثبوت کے لیے گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ چناچہ مشہور تفسیر کے مطابق ہر امت کی گواہی اس امت کا نبی دیگا۔ اللہ تعالیٰ مجرمین سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس میرا پیغام نہیں آیا تھا۔ وہ انکار کریں گے تو اس امت کا نبی بطور گواہ پیش ہو کر عرض کرے گا، مولا کریم! میں نے تیرے سارے احکام ان تک پہنچا دیے تھے وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ اور اے نبی (علیہ السلام)! آپ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لایا جائیگا جن کا واسطہ آپ سے پڑ رہا ہے گویا جس طرح باقی انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں پر گواہ ہوں گے اسی طرح آپ ﷺ بھی اپنی امت پر گواہ ہوں گے۔ یعنی ہر اُمت پر ان کے نبی بہ طور گواہ پیش ہوں گے، اور ان پیغمبروں پر رسول اللہ ﷺ گواہ بنائے جائیں گے، پھر مجرمین کی بابت سزا کا فیصلہ ہوگا، گویا آپ ﷺ کو آخری گواہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا، اس میں آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے، اگر آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی اور اس اُمت کے بعد کوئی اور اُمت کا وجود متوقع ہوتا تو ضروری تھا کہ قرآن نے اس کا بھی ذکر کیا ہوتا، آپ ﷺ کا اُمت کے اعمال پر گواہی دینا اس بنیاد پر ہوگا کہ اُمت کے اعمال آپ ﷺ پر پیش کئے جائیں گے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، کہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا صرف اللہ کی صفت ہے، فقہاء نے بھی اس صفت میں اللہ کے ساتھ رسول کے شریک کرنے کو شرک قرار دیا ہے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ: ۴/ ۱۵) اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ہر جگہ موجود، حاضر ناظر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے مانند ہر جگہ موجود، حاضر ناظر سمجھتے ہیں ان کا یہ عقیدہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ حاضر کے معنی ہیں موجود اور ناظر کے معنی ہیں دیکھنے والا، جب دونوں کو ملا کر استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے

"ایسی ہستی جو پوری کائنات کو بایں طور دیکھ رہی ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں"، تمام اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حاضر و ناظر کا مذکورہ بالا مفہوم صرف اللہ جل جلالہ کی ذات پاک پر صادق آتا ہے دوسری کسی ہستی کے لیے ثابت کرنا شرک ہے، اور اگر اس میں تاویل کرتے ہیں تو گمراہ ہے، اور جو لوگ اس شرکیہ یا گمراہ عقیدہ کا قائل نہیں اس کو گستاخ کہنا درست نہیں بلکہ بے بنیاد الزام ہے۔

قیامت کے دن انسان کے اعمال کے متعلق اس کے اعضاء کی گواہی

يَوْمَئِذٍ	اس دن	يَّوَدُّ	چاہیں گے
الَّذِيْنَ	وہ لوگ جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا
وَعَصَوُا	اور انہوں نے نافرمانی کی	الرَّسُوْلَ	رسول کی
لَوْ تُسَوّٰى	کاش کہ برابر کر دی جائے	بِهِمُ	ان کے ساتھ
الْاَرْضُ	زمین	وَلَا	اور نہ
يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ	وہ اللہ سے چھپا سکیں گے	حَدِيْثًا ۴۲	کوئی (بھی) بات

ارشاد ہے يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا یہاں پر کفر سے مراد مطلق کفر ہے کہ کوئی شخص اللہ کی وحدانیت، اس کے رسولوں، فرشتوں، کتابوں، تقدیر اور قیامت کے دن کا انکار کر دے اور کفر کا اطلاق محض نافرمانی پر بھی ہوتا ہے اور عام گناہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کفر کا اطلاق ناشکری پر بھی ہوتا ہے جیسے وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ اور رسول کے ساتھ نافرمانی کا رویہ اختیار کیا ہے، اس دن وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش انہیں زمین (میں دھنسا کر اس) کے برابر کر دیا جائے۔ قیامت کے دن جب کافر اپنے اعمال کا انجام اور عذاب دیکھیں گے، تو وہ اس قدر عاجز، شرمندہ اور خوف زدہ ہوں گے کہ وہ چاہیں گے کہ زمین پھٹ جائے، وہ اس میں سما جائیں اور زمین ان پر ہموار کر دی جائے تاکہ وہ مٹی بن کر ہمیشہ کے لیے عدم (ناپیدگی) میں چلے جائیں اور

اس رسوائی سے بچ جائیں۔اس آیت میں ان لوگوں کے عبرت ناک انجام کا ذکر ہے جنہوں نے دنیا میں اللہ اور اس کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی دعوت کو جھٹلایا اور نافرمانی کا راستہ اپنایا۔آخرت میں یہ ندامت کسی کام نہیں آئے گی۔قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی اسے یوں بیان کیا گیا ہے: وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا اور کافر کہے گا: کاش میں مٹی ہوتا فرمایا ایسے لوگ خواہش کے باوجود وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ﴿۴۲﴾ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو چھپا نہیں سکیں گے مطلب یہ ہے کہ اس روز وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔دنیا میں تو وہ جھوٹ بول کر یا قسمیں کھا کر اپنی حقیقت چھپانے کی کوشش کریں گے (جیسا کہ مشرک کہیں گے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے، مگر آخر کار ان کے منہ پر مہر لگ جائے گی اور ان کے اعضاء (ہاتھ، پاؤں اور چمڑے) ان کے اعمال کی گواہی دیں گے، تب کوئی بات اللہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکے گی۔سورہ طارق میں آتا ہے "يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ" قیامت کے دن تمام اندرونی راز ظاہر کر دیے جائیں گے، دنیا میں انسان ہزاروں بھید چھپا جاتا ہے۔يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (الحاقہ) اس دن تم حاضر کیے جاؤ گے اور تم سے کوئی چیز چھپ نہیں سکے گی۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ اور مجرمین کے ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے کہ مولا کریم اس نے فلاں فلاں جرم کا ارتکاب کیا تھا۔غرضیکہ اس دن کوئی چیز چھپا نہیں سکیں گے اور اپنے انجام کو پہنچ جائینگے۔حق تعالیٰ شانہٗ نے انسان کی سعادت وشقاوت کو اس کے اعمال سے وابستہ فرمایا ہے، ہر عمل پر اس کے مناسب ردِّ عمل کا ظہور ہوتا ہے۔بندوں کے جس قسم کے اعمال آسمان پر جائیں گے، اُنہی کے مناسب اُن کے حق میں آسمان سے فیصلے صادر ہوں گے۔اعمالِ خیر پر خیر کے فیصلے آئیں گے اور اعمالِ شر پر دوسری نوعیت کے فیصلے ہوں گے۔ انفرادی اعمال پر افراد کے بارے میں شخصی فیصلے ہوں گے اور اجتماعی اعمال پر مجموعی طور پر قوم یا طبقہ کے بارے میں فیصلے ہوں گے۔اللہ کریم ہمیں خوب نیکیاں کرنے اور اپنے اعضاء کو گناہوں سے بچانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین بجاہِ خاتم النبیین صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم

حرمت شراب کے تدریجی مراحل/طہارت شرط نماز ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ
اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا
صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۴۳

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو!
لَا تَقْرَبُوا	نہ تم قریب جاؤ	الصَّلٰوۃَ	نماز کے
وَاَنْتُمْ	جبکہ تم	سُکٰرٰی	نشے میں ہو
حَتّٰی	یہاں تک کہ	تَعْلَمُوْا	تمہیں علم ہو
مَا تَقُوْلُوْنَ	جو تم کہتے ہو	وَلَا جُنُبًا	اور نہ حالت جنابت میں
اِلَّا عَابِرِیْ	مگر عبور کرنے والے ہو	سَبِیْلٍ	راستے کو
حَتّٰی	یہاں تک کہ	تَغْتَسِلُوْا	تم غسل کرلو
وَاِنْ کُنْتُمْ	اور اگر ہو تم	مَّرْضٰٓی	بیمار
اَوْ عَلٰی سَفَرٍ	یا سفر پر	اَوْ جَآءَ اَحَدٌ	یا آئے کوئی

مِّنْكُمْ	تم میں سے	مِّنَ الْغَآىِٕطِ	قضائے حاجت سے
اَوْ لٰمَسْتُمُ	یا تم نے صحبت کی ہو	النِّسَآءَ	عورتوں سے
فَلَمْ تَجِدُوْا	پھر نہ پاؤ تم	مَآءً	پانی
فَتَيَمَّمُوْا	تو تیمم کرلو	صَعِيْدًا طَيِّبًا	پاک مٹی سے
فَامْسَحُوْا	پھر تم مسح کرو	بِوُجُوْهِكُمْ	اپنے چہروں کا
وَاَيْدِيْكُمْ ؕ	اور اپنے ہاتھوں کا	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
عَفُوًّا	بہت معاف کرنے والا	غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾	بڑا بخشنے والا

فرمایا جارہا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت تک نماز کے قریب بھی نہ جانا جب تک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھنے نہ لگو۔ شانِ نزول: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے کچھ صحابۂ کرام رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کی دعوت کی، جس میں کھانے کے بعد شراب پیش کی گئی، بعض حضرات نے شراب پی لی کیونکہ اس وقت تک شراب حرام نہ ہوئی تھی پھر مغرب کی نماز پڑھی، امام نے نشے کی حالت میں سورۂ کافرون کی تلاوت کی اور کلمہ ''لَا'' چھوڑ گئے جس سے ''نہ'' کی جگہ ''ہاں'' کا معنی بن گیا۔ اس سے معنی غلط ہوگئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمادیا گیا۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۴۳، ۱ / ۳۸۲) چنانچہ مسلمانوں نے نماز کے اوقات میں شراب ترک کردی، اس کے بعد سورۂ مائدہ میں شراب کو بالکل حرام کردیا گیا۔

نشے کی حالت میں کلمۂ کفر بولنے کا حکم

مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوا کہ اگر نشے کی حالت میں کوئی شخص کفریہ کلمہ بول دے تو وہ کافر نہیں ہوتا کیونکہ ''قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ'' میں دونوں جگہ لَا کا ترک کفر ہے کیونکہ اس سے معنیٰ بنے گا کہ اے کافرو! جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو ان کی میں بھی عبادت کرتا ہوں۔ اور یہ کلمہ یقیناً کفریہ

ہے لیکن چونکہ یہاں نشے کی حالت تھی اس لئے تاجدارِ رسالت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اس پر کفر کا حکم نہ فرمایا بلکہ قرآنِ پاک میں اُن کو "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے خطاب فرمایا گیا۔ یعنی نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے، جب نشہ اتر جائے اور انسان خود اپنی گفتگو کا معنی و مقصود سمجھنے لگے، تب نماز میں شریک ہو، دراصل یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک صرف نماز کے وقت شراب کی ممانعت تھی، پہلی دفعہ سورۂ بقرہ کی آیت 219 میں گزر چکا ہے جس میں شراب کو صرف برا کہا گیا تھا۔ جس پر کچھ مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا مگر اکثر نے نہ چھوڑی بلکہ نشے کی حالت میں ہی نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تقریباً 4ھ میں نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا، پھر کچھ عرصہ بعد شراب کو پوری طرح چھوڑ دینے کا حکم دے دیا گیا۔ سورۂ مائدہ کی آیت 90 اور 91 میں شراب کے حرام ہونے کا حکم دیا گیا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی اور وجہ سے مثلاً نیند وغیرہ کے سبب ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ آدمی کو اپنی زبان پر قابو نہ رہے، تو اس حالت میں بھی نماز پڑھنے سے گریز کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جب نیند کا غلبہ اس قدر زیادہ ہو کہ نماز کے الفاظ ادا کرنے میں دقت ہو رہی ہو تو نماز کو نیند کے پورے ہونے کے بعد ادا کیا جائے تاکہ جو پڑھو سمجھ کر پڑھو۔ یعنی نماز کے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ایک یہ کہ نشہ کی حالت میں نہ ہو تاکہ نماز کا مطلب سمجھ سکو۔ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ط اور جنابت کی حالت میں بھی جب تک غسل نہ کرلو، (نماز جائز نہیں) نماز کے لیے طہارت فرض ہے لہٰذا عام حالت میں تو وضو کرنے سے یہ طہارت حاصل ہو جاتی ہے لیکن جنبی آدمی کے لیے نماز سے پہلے غسل فرض ہے۔ خواہ یہ جنابت احتلام کی وجہ سے ہو یا صحبت کی وجہ سے یعنی دوسرا حکم یہ کہ نماز کے لیے طہارت، یعنی جسم کی پاکیزگی ضروری ہے۔ اور ضروری حکم نماز کی ادائیگی کے لیے یہ دیا گیا ہے کہ ناپاکی کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ نماز اسلام کا دوسرا اہم رکن ہے، اس کی ادائیگی کے لیے بھی جسم، کپڑے اور جگہ کی طہارت کو شرط قرار دیا گیا ہے، پھر وضو پر وضو کی ترغیب، ریح خارج ہو تو وضو کا حکم، جسم کے کسی حصہ سے خون نکلے تو وضو کا حکم، ہر عضو کو تین مرتبہ دھونے کا حکم،

وضو کے وقت مسواک کی ترغیب، کلی کرتے وقت غرغرہ کی ترغیب، ناک کی آلائش کو صاف کرنے کا حکم، جنابت لاحق ہونے کے بعد غسل کرنے کی تاکید، غسل میں ممکنہ حد تک پورے جسم پر پانی بہانے کا حکم، زائد مونچھوں کو تراشنے کا حکم، مونڈھے کے بالوں کو اُکھاڑنے کا حکم، زیرِ ناف بالوں کی صفائی کا حکم، ہر ہفتہ ناخن کاٹنے کا حکم، استنجاء میں ڈھیلے اور پانی دونوں کو جمع کرنے کی ترغیب، بیت الخلاء میں جوتے پہن کر داخل ہونے کا حکم، پیشاب کے چھینٹوں سے بچنے کے لیے بیٹھ کر پیشاب کرنے کا حکم، قضائے حاجت کے بعد ہاتھ کو مٹی سے رگڑ کر دھونے کا حکم، نیند سے بیدار ہونے کے بعد پانی استعمال کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔

تیمم کا طریقہ، فرائض، شرائط اور سنن

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ الا یہ کہ تم مسافر ہو (اور پانی نہ ملے تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتے ہو) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کی جگہ سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو، اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا (اس مٹی سے) مسح کر لو۔ اس آیت میں بتایا یہ جا رہا ہے کہ اگر کسی کو وضو کے لیے یا جنبی کو غسل کے لیے پانی میسر نہ آئے یا کوئی ایسا بیمار ہو جسے پانی کے استعمال سے نقصان پہنچتا ہو تو ان صورتوں میں وہ تیمم کر سکتا ہے۔ تفصیل یہ بیان کی گئی ہے سو کر اٹھو یا رفع حاجت کر کے آئے ہو یا پھر عورت سے ملاپ کر کے آئے ہو اور غسل کی ضرورت ہو۔ اگر پانی میسر ہے تو غسل کر کے پھر نماز قائم کرو۔ لیکن اگر پانی میسر نہ ہو یا پانی استعمال کرنا طبی لحاظ سے منع ہو یا پھر سفر میں ہو اور غسل کرنا یا وضو کرنا ممکن نہ ہو تو ان صورتوں میں اللہ رب العزت نے پانی کا بدل مٹی کو بنانے کی اجازت دی ہے۔ جس کو تیمم کہا جاتا ہے۔ تیمم کا طریقہ ہے کہ پاک مٹی پر دونوں ہاتھ مار کر ان کو جھاڑ کر منہ پر پھیر لیے جائیں، پھر دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت یک دوسرے پر پھیر لیے جائیں اور یہ عمل وضو اور غسل کا متبادل بتایا گیا ہے اور یہ صرف بندوں کو سہولت دینے کا

ایک طریقہ ہے کیونکہ اللہ رب العزت تو ہمیشہ اپنے بندوں کو معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یہ تیمم کی سہولت بھی صرف اسی لیے دی گئی ہے کہ انسان میں پاکی کا احساس ضرور باقی رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب ہم پانی نہ پائیں تو زمین کی مٹی ہمارے لیے پاک کرنے والی بنائی گئی ہے۔ (صحیح مسلم) دوسرے یہ کہ نماز کسی حالت میں بھی چھوڑی نہیں جاسکتی

اگر پانی موجود نہ ہو یا کسی شرعی عذر کی بنا پر پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو شریعتِ مطہرہ نے پاکی کے لیے تیمم کا طریقہ تجویز فرمایا ہے۔ تیمم کا طریقہ: اولاً نیت کرلیں، پھر پاک مٹی پر دونوں ہاتھ مار کر جھاڑ لیں، پھر پورے چہرے پر ایک مرتبہ اس طرح پھیریں کہ کوئی جگہ باقی نہ رہے، پھر دوسری مرتبہ اسی طرح زمین پر ہاتھ ماریں اور دونوں ہاتھوں پر کہنیوں سمیت اس طرح ہاتھ پھیریں کہ کوئی جگہ باقی نہ رہے اور انگلیوں کے درمیان بھی خلال کریں۔

تیمم کے فرائض: 1۔ ایک مرتبہ پاک مٹی پر ہاتھ مار کر سارے چہرہ پر ہاتھ پھیرنا۔ 2۔ دوسری مرتبہ پھر ہاتھ مار کر دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک ہاتھ پھیرنا۔

تیمم کی شرائط: 1 نیت کرنا۔ 2 ہاتھوں کا پھیرنا۔ 3 تین یا زائد انگلیوں کا ستعمال۔ 4 مٹی یا زمین کی جنس سے تعلق رکھنے والی کسی چیز سے تیمم کرنا۔ جس چیز (مٹی وغیرہ) سے تیمم کیا جارہا ہو اس کا پاک ہونا۔ 5 پانی کا نہ ہونا۔

تیمم کی سنتیں: 1 شروع میں بسم اللہ پڑھنا۔ 2 ہاتھوں کو ہتھیلیوں کی طرف سے مٹی (یا اس کی جنس پر) مارنا۔ 3 دونوں ہاتھ مٹی پر رکھنے کے بعد آگے کھینچنا۔ 4 پھر دونوں ہاتھوں کو مٹی پر رکھتے ہوئے پیچھے کو کھینچنا۔ 5 پھر دونوں ہاتھوں کو جھاڑنا۔ ہاتھ مارتے وقت انگلیوں کو کشادہ کرنا۔ 6 ترتیب کا خیال رکھنا۔ 7 پے در پے کرنا۔

تیمم کے نواقض: تیمم کو ہر وہ چیز توڑ دیتی ہے جو وضو کو توڑ دیتی ہے، اس کے علاوہ پانی کے استعمال پر قادر ہونا بھی تیمم کے لیے ناقض ہے۔

سیدنا حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

پاک مٹی مسلمان کا سامان طہارت ہے اگر چہ دس سال تک پانی نہ ملے۔ پس جب پانی پاوے تو چاہئے کہ اس کو بدن پر ڈالے یعنی اس سے وضو یا غسل کرلے، کیوں کہ یہ بہت اچھا ہے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر برسہا برس تک ایک آدمی وضو یا غسل کے لئے پانی نہ پائے تو تیمم اس کے لئے برابر کافی ہوتا رہے گا۔ البتہ جب پانی میسر ہو جائے گا، تو غسل یا وضو اس کے لئے ضروری ہو جائے گا۔ قریب قریب سارے ائمہ امت اس پر متفق ہیں کہ جس شخص پر غسل واجب ہو اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے یا بیماری کی مجبوری سے اس نے بجائے غسل کے تیمم کیا ہو، تو اس کو جب پانی مل جائے گا یا بیماری کا عذر ختم ہو جائے گا تو غسل کرنا اس پر واجب ہو گا۔ تیمم بسا اوقات آدمی ایسی حالت اور کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ غسل یا وضو کرنا اس کے لئے مضر ہوتا ہے، اسی طرح کبھی آدمی ایسی جگہ ہوتا ہے کہ غسل یا وضو کے لیے وہاں پانی ہی میسر نہیں ہوتا۔ ان حالات میں اگر بلا غسل اور بلا وضو یوں ہی نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جاتی، تو اس کا ایک نقصان تو یہ ہوتا کہ ان اتفاقات سے طبیعتیں ترک طہارت کی عادی بنتیں اور دوسرا اس سے بڑا ضرر یہ ہوتا کہ غسل اور وضو کی پابندی سے اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضری کا جو اہتمام محسوس ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اس حاضری کی عظمت اور اس کے تقدس کا جو تصور ذہم پر چھایا ہوا رہتا ہے وہ مجروح ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت نے مجبوری کے ایسے حالات میں تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام بنا دیا ہے، اب غسل اور وضو سے مجبور ہونے کے حالات میں جب آدمی نماز کے لئے تیمم کا اہتمام کرے گا تو اس کی عادت اور اس کے ذہن پر ان شاء اللہ اس طرح کا کوئی غلط اثر نہیں پڑے گا۔

طہارت و نظافت اسلام کا طرۂ امتیاز

بعض ذہنوں میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ پانی کے ذریعے تو طہارت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ پانی میل کچیل اور گندگی کو بہالے جاتا ہے مگر مٹی سے کیونکر پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اس اشکال کے ازالہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات کا تذکرہ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾ بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ یعنی اے مخاطب! اگر تمہیں طہارت میں کوئی خامی محسوس ہوتی

ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ طہارت بہر حال ہو جائیگی اور اگر کوئی کوتاہی رہ گئی ہے تو اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے۔ وہ بخشش کرنے والا ہے، لہٰذا اس معاملہ میں فکر نہ کرو۔ بعض حالات میں انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ غسل کی ضرورت ہے مگر پانی میسر نہیں۔ اُدھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش بھی ہونا ہے مسجد میں جانا ہے، قرآن پاک کی تلاوت کرنی ہے کوئی اور ایسا کام کرنا ہے جس کے لیے طہارت ضروری ہے تو فرمایا بغیر کسی وہم کے تیمم کرلو اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ طہارت و نظافت ایک مہتم بالشان عمل ہے، آدمی کے لیے باعثِ زیب و زینت ہے، ایک سلیم الطبع انسان کے لیے سرمایۂ عز و افتخار ہے، متمدن اور مہذب لوگوں کا شعار ہے، ترقی یافتہ اور زندہ دل قوموں کی پہچان ہے، اسلام اور مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ نفاست و پاکیزگی دل کو آسودگی و فرحت عطا کرتی ہے، ذہن کو تازگی و بالیدگی بخشتی ہے، قلب و دماغ کو معطر کرتی ہے۔ صفائی و ستھرائی کا اہتمام کرنے سے انسان کو اُنس و سرور حاصل ہوتا ہے، دل جمعی و یکسوئی حاصل ہوتی ہے، ذہنی تشویش و پراگندگی دور ہوتی ہے، حفظانِ صحت میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسلام کا آفتاب طلوع ہونے سے پہلے پوری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر سُو اندھیرے کی حکمرانی تھی، طہارت و نظافت سے بے اعتنائی و لاپرواہی تھی، بدن اور کپڑے کی صفائی کو معیوب خیال کیا جاتا تھا، غسل کرنے کو جرم سمجھا جاتا تھا۔ بوسیدہ، بدبودار اور میلے گندے کپڑوں میں رہنے کو لازم اور ضروری قرار دیا جاتا تھا، بغل اور ناف کے بالوں کو تراشنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ تمام باتیں ایک انسان کو طہارت و صفائی کے حوالہ سے حساس بناتے ہیں، اور انسان کو نفاست پسند، پاک باز، خوش منظر اور خوش جمال بناتے ہیں۔ احادیثِ شریفہ میں طہارت و صفائی کے بڑے فوائد بیان کیے گئے ہیں، ایک روایت میں ہے کہ: ''جو شخص پاکی کی حالت میں سوتا ہے فرشتے اس کے لیے مغفرت کی دعاء کرتے ہیں۔'' (مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حدیث نمبر: ۱۱۴۴) ایک روایت میں ہے کہ: ''جو شخص اپنے گھر، آنگن اور استعمال کی چیزوں کی صفائی ستھرائی کا اہتمام کرتا ہے تو اس سے فقر و تنگ دستی دور ہوتی ہے، اور غنا و مال داری نصیب ہوتی ہے۔'' (کنز العمال، حدیث نمبر: ۲۵۹۹۹) ایک

روایت میں آتا ہے کہ: ''جو شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد میں جانے کا اہتمام کرے تو وہ نماز کی حالت میں شمار کیا جاتا ہے، جب تک کہ اس کا وضو نہ ٹوٹ جائے۔'' ایک حدیث میں آتا ہے کہ: ''قیامت کے دن وضو کی وجہ سے اُمتِ محمدیہ کے اعضاء خوب چمکدار اور روشن ہوں گے اور اسی سے آپ ﷺ اپنی اُمت کو پہچانیں گے۔'' (بخاری شریف، حدیث نمبر: ۱۳۶) طہارت ونظافت کا اہتمام نہ کرنے پر احادیث شریفہ میں بڑی وعیدیں آئی ہیں۔ ایک حدیث شریف میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''عام طور پر عذابِ قبر پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۴۸) ایک روایت میں آتا ہے کہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے، اور فرمایا کہ: ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے؛ کیوں کہ ان میں سے ایک پیشاب کے چھینٹوں سے احتیاط نہیں کرتا تھا، اور دوسرا چغلی کرتا تھا۔'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۱۶) ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''جس گھر میں جنبی ناپاک شخص ہو، اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔'' (ابو داود، حدیث نمبر: ۲۲۷) جو انسان طہارت وصفائی کا اہتمام کرتا ہے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں، خوش اخلاقی اور ملنساری سے پیش آتے ہیں مجلس میں آگے جگہ ملتی ہے، اس کے برعکس جو انسان گندہ رہتا ہے، میلے کچیلے لباس پہنتا ہے، اپنی وضع اور ہیئت کو خوش منظر نہیں بناتا ہے تو لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں، اس کو دیکھ کر لوگوں کو انقباض اور تکدر ہوتا ہے، مجلس میں پیچھے جگہ ملتی ہے، معاشرہ کے اندر ایسے انسان کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ موجودہ دور میں مسلمانوں میں دین بیزاری اور احکامِ شریعت سے غفلت ولاپرواہی عام ہے، اسلام کی ساری تعلیمات وہدایات کو وہ فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں انگریزی تہذیب وکلچر کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں۔ مسلم معاشرہ سے اسلامی اطوار وعادات ناپید اور عنقاء ہو گئے ہیں۔ طہارت ونظافت جو کبھی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا، سرمایۂ عز وافتخار تھا، افسوس! آج مسلمان اس سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ ہمارے بہت سے مسلمان بھائی طہارت ونظافت کے احکام سے ناآشنا اور نابلد ہیں، وضو اور غسل کے فرائض تک کا ان کو پتہ نہیں۔ نجاست وناپاکی کے ازالہ کا طریقہ کیا ہے، کن چیزوں سے وضو ٹوٹ

جاتا ہے، استنجاء کے آداب کیا ہیں، جنابت کے احکام کیا ہیں، حیض ونفاس کے احکام کیا ہیں، اس جیسے روزمرہ پیش آنے والے عام مسائل کی نئی نسل کو خبر نہیں۔ یہ صورت حال کافی افسوسناک اور غم انگیز ہے۔ موجودہ زمانہ میں ضرورت ہے اس بات کی کہ نئی نسل کے سامنے طہارت وصفائی کی اہمیت اور عظمت کو اُجاگر کیا جائے۔ طہارت کے بنیادی احکام سے انہیں روشناس کرایا جائے۔ اسلامی تہذیب وثقافت سے محبت کا نقش ان کے دلوں میں بٹھایا جائے۔

اہل کتاب کی چند اہم علمی، فکری اور عملی خامیوں کا ذکر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَۃَ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ
تَضِلُّوا السَّبِیْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِکُمْ ط وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا ۙ وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ
نَصِیْرًا ﴿۴۵﴾

اہل کتاب کی علمی خامیاں اور ان کے مکروہ عزائم

اَلَمْ تَرَ	کیا نہیں آپ نے دیکھا	اِلَی الَّذِیْنَ	ان لوگوں کی طرف جو
اُوْتُوْا	دیے گئے	نَصِیْبًا	کچھ حصہ
مِّنَ الْکِتٰبِ	کتاب کا؟	یَشْتَرُوْنَ	وہ خریدتے ہیں
الضَّلٰلَۃَ	گمراہی کو	وَیُرِیْدُوْنَ	اور وہ چاہتے ہیں
اَنْ تَضِلُّوا	یہ کہ تم گمراہ ہو جاؤ	السَّبِیْلَ ﴿۴۴﴾	راستے سے

ارشاد باری تعالیٰ ہے اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ کیا آپ نے نہیں دیکھا۔ کہ وہ لوگ جنہیں دیا گیا کتاب کا کچھ حصہ نَصِیْبًا کا لفظ نکرہ ہے اور اس کا معنی کچھ حصہ ہے اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے کچھ حصے سے ایک تو یہ مراد ہو سکتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کے کتاب الٰہی کے صرف الفاظ ہی باقی ہیں اور یہ لوگ ان الفاظ کے معانی تک رسائی حاصل نہیں

کرتے۔یعنی زبان سے کتاب کے الفاظ ادا کرتے ہیں مگر نہ تو دل سے ان احکام کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ان پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ کسی چیز پر بظاہر ایمان ہو مگر عملی طور پر اس کی مخالفت کی جائے۔ یہ بیماری اب اہل کتاب سے نکل کر مسلمانوں میں بھی پھیل چکی ہے۔ مسلمانوں کی حالت بھی اب یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ تو تلاوت کرتے ہیں، مگر نہ تو ان الفاظ کے معانی جانتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی قانون کا مطلب ہی نہیں سمجھتا تو اس پر عمل کیا کرے گا۔اللہ تعالیٰ نے اشارتاً اہل اسلام کو بھی سمجھایا کہ اگر تم بھی یہودیوں کی طرح محض الفاظ ہی کو دہراتے رہے تو پھر ان کی طرح تمہیں بھی فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اہل کتاب کے پاس ان کی کتاب کی کچھ یعنی چند ایک باتیں ہی سلامت ہیں باقی سب کچھ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں بگاڑ دیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو تبدیل کر دیا ہے، اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔تاہم کچھ نہ کچھ باتیں ضرور ان کے پاس موجود ہیں جو تحریف کی دست برد سے محفوظ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ہیں۔عیسائیوں کے بڑے بڑے پادری آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انجیل مقدس میں تین ہزار سے زیادہ اغلاط موجود ہیں۔ یہ انہی پادریوں کی تحریف کا نتیجہ ہے۔ بہرحال تحریف سے محفوظ کچھ حصہ کے متعلق حضور ﷺ کا ارشاد مبارک بھی موجود ہے کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے کی سزا آج بھی موجود ہے۔تورات میں یہ بھی موجود ہے کہ جو شخص اپنی پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے وہ جان سے مارا جائے گا۔اس قسم کے احکام اب بھی موجود ہیں مگر یہ لوگ معنوی تحریف کی بناء پر ان پر عمل سے قاصر ہیں بہرحال نَصِیْبًا کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کی کتب میں سے کچھ نہ کچھ حصہ اب بھی ان کے پاس موجود ہے۔فرمایا ان لوگوں کی حالت یہ ہے یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَۃَ ایمان اور توحید قبول کرنے کی بجائے گمراہی خریدتے ہیں۔گویا احکام الٰہی میں تحریف کر کے خود بھی گمراہ ہوئے ہیں وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ ﴿۴۴﴾ اور تمہیں بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ اہل کتاب کے مکروہ عزائم سے ہوشیار رہیں تاکہ وہ تمہیں بھی گمراہ نہ کر دیں۔وہ تمہیں

صراط مستقیم پر گامزن نہیں دیکھنا چاہتے۔ اہل ایمان کو گمراہ کرنے کے لیے یعنی ان کو ان کے دین سے بیزار کرنے کے لیے اہل کتاب اربوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو قرآن پاک کی تعلیمات سے ہٹانے اور نبی آخر الزماں ﷺ سے ان کا تعلق منقطع کرنے کے لیے ان کی پوری مشینری حرکت میں ہے۔ اس معاملہ میں اہل ہنود بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ہیں تاہم اس معاملہ میں یہودی سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خصوصی مذمت بیان فرمائی ہے ہر ملک میں اہل کتاب کی مشنریاں موجود ہیں رفاعی ادارے قائم کرتے ہیں اور پھر جذبہ خدمت کا اظہار کر کے اہل ایمان کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مذموم عزائم کا تذکرہ مختلف انداز میں مختلف سورتوں میں موجود ہے۔

قرآن کریم اور اسلامی روایات میں اہل کتاب (یہودی اور مسیحی علما و عوام) کی چند اہم علمی، فکری اور عملی خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے: 1. کلام اللہ میں تحریف (ترمیم و تبدیلی) اہل کتاب کے علما پر سب سے بڑا علمی جرم یہ عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے دنیاوی فائدے یا اپنے مفادات کے لیے اللہ کی نازل کردہ کتابوں (تورات اور انجیل) کے الفاظ اور معانی میں ردوبدل کیا۔ قرآن مجید میں ہے کہ وہ اللہ کے کلام کو سننے اور سمجھنے کے باوجود اسے اس کے اصل مقام سے بدل دیتے تھے۔ 2. حق کو چھپانا اہل کتاب کے علما کے پاس تورات اور انجیل کے ذریعے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی آمد اور صفات کا واضح علمی علم موجود تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے جان بوجھ کر اس سچائی کو عام لوگوں سے چھپایا، جبکہ وہ اس کی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔ 3. حسد اور ضد کی بنیاد پر انکار ان کا انکار جہالت کی وجہ سے نہیں بلکہ حسد اور تکبر پر مبنی تھا۔ جب آخری نبی ان ہی کی نسل یا علاقے سے مبعوث ہوئے جو ان کی توقع کے مطابق نہیں تھا، تو انہوں نے حسد کی آگ میں آ کر حق جانتے ہوئے بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ 4. دین میں بے بنیاد تاویلیں اور گمراہ کن نظریات انہوں نے دین کے بنیادی احکامات کو چھوڑ کر اپنی طرف سے من گھڑت فلسفے اور تاویلیں گھڑ لیں۔ مسیحیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو سے کام لیتے ہوئے انہیں خدا کا بیٹا یا خدا کا حصہ قرار دیا، جو توحید کے سراسر خلاف تھا۔ 5. علما اور فقہا کی اندھی تقلید عوام نے اپنے علما اور درباری پیشواؤں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ جسے چاہیں حلال

اور جسے چاہیں حرام قرار دے دیں۔انہوں نے اللہ کے احکامات کے مقابلے میں اپنے مذہبی بزرگوں کی آراء کو فوقیت دی اور انہیں خدا کی طرح شریعت ساز مان لیا۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غلبہ کے اسباب

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ	اور اللہ خوب جانتا ہے	بِاَعْدَآئِکُمْ	تمہارے دشمنوں کو
وَ کَفٰی بِاللّٰہِ	اور کافی ہے اللہ	وَلِیًّا	دوست
وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ	اور کافی ہے اللہ	نَصِیْرًا ۴۵	مددگار (۴۵)

فرمایا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِکُمْ اللہ تعالیٰ تمہارے ان دشمنوں کو خوب جانتا ہے۔اگر تمہارا یقین اللہ مالک الملک پر مضبوط رہا اور تم حق بات پر جمے رہے تو پھر تمہیں کوئی خطرہ نہیں وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا اور اللہ کافی ہے کارسازی کرنے والا۔تم اسی کو کارساز سمجھتے ہوئے صراط مستقیم پر چلتے رہو اسی پر بھروسہ رکھو وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا ۴۵ اور کافی ہے اللہ مددگار۔اگر خدا کی مدد پر بھروسہ رکھو گے،اپنے دین پر قائم رہو گے تو کوئی دشمن تمہیں زک نہیں پہنچا سکتا۔یہ اصول کی بات ہے کہ دشمن کا وار اسی وقت کارگر ہوگا جب تم اپنے دین سے پھسل جاؤ گے،خدا تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کمزور پڑ جائے گا،اعتقاد بگڑ جائے گا،اور گناہ کا ارتکاب کرنے لگو گے۔ہاں وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا جو اللہ سے ڈرنے والا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی راستہ بنا دیتا ہے۔لہٰذا اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے دین پر قائم رہتے ہوئے دشمنانِ دین کا مقابلہ کرو۔دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں کہاں کہاں کامیابی عطا کی۔بدر و حنین میں کیسے اسباب پیدا کیے،تبوک،یرموک اور قادسیہ کی جنگوں میں مسلمانوں کی کس طرح مدد فرمائی،یہ ایک تاریخی اور دینی حقیقت ہے۔جب تک مسلمانوں نے اللہ کے احکام اور دین اسلام پر مضبوطی سے عمل کیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں غلبہ،عزت اور فتح عطا کی۔مگر جب ان میں بگاڑ پیدا ہوگیا تو بڑی بڑی سلطنتیں ختم ہوگئیں،خلافت اڑ گئی اور مسلمان برطانیہ،امریکہ اور روس سے مغلوب ہو کر رہ گئے۔ہر جگہ ذلت وخواری کا منہ دیکھنا پڑا۔آج ہماری حالت بھی یہودیوں سے کسی طرح کم نہیں۔عقائد بگڑ چکے

ہیں۔اللہ کی عظیم کتاب کے الفاظ کا احترام ضرور ہے مگر نہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ کوئی عمل ہے۔

نصرتِ الٰہی کا حصول کیسے؟

دنیاوی زندگی کے حوالہ سے قانون قدرت ہے کہ اسی قوم یا ملت کو عروج وکمال سے سرفراز کیا جاتا ہے جو کہ ثابت قدمی سے خود کو اس لائق ثابت کرے۔اس حوالہ سے کچھ خاص اسباب وعوامل ہیں کہ جن کا اختیار کرنا کسی بھی قوم وملت کے لئے ضروی ہے اور ان میں کلمہ طیبہ کی صورت میں کئے جانے والے عہد سے وفا یعنی توحید الٰہی اور حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت سے محبت اور اس کا عملی اظہار سرفہرست ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ پاک کی مدد ونصرت صرف اسی صورت میں میسر آتی ہے کہ افراد امت توحید پر کاربند ہو جائیں،تعلیمات محمدی ﷺ کو شعار بنالیں اور شرک ومعاصی سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرلیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالی صرف انہی کا حامی ومددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کوئی شخص،قوم یا ملت توحید پر کاربند ہوئی تو نصرت خداوندی اس کی ہم رکاب رہی اور جب اللہ پاک کی نصرت ومدد میسر ہو تو پھر دنیا کی ساری قوتیں بھی ایک جانب ہو جائیں تب بھی کوئی آپ کا بال تک بیکا نہیں کرسکتا اور نہ ہی آپ کو کسی چیز کی کمی کا احساس ہوگا۔قانون فطرت کے مطابق جب کوئی توحید کو اپنا اوڑھنا،بچھونا بنالے تو قرآنی وعدوں کے مظاہر بھی بچشم خود دیکھے جاسکتے ہیں۔پھر نہ تو دشمن کے ہتھکنڈے کسی کام کے رہتے ہیں اور نہ ہی اغیار کی شان وشوکت اور رعب ودبدبہ مسلمانوں پر غلبہ پاسکتا ہے۔نصرت خداوندی کے حوالہ سے قرآن کریم میں فرمایا جارہا ہے کہ مدد تو اللہ کی طرف سے ہے جو غالب وحکمت والا ہے۔(آل عمران)

یعنی اللہ پاک کے سوا کسی کی مدد کوئی معنی نہیں رکھتی اور مدد تو صرف اللہ رب العزت کی طرف سے ہی ہے۔قرآن مجید میں دنیاوی قوتوں کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کفار کے حوالہ سے بڑی وضاحت کے ساتھ فرمایا جارہا ہے کہ(کافر تمہارے خیر خواہ نہیں)بلکہ تمہارا خیر خواہ تو اللہ ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔اسی طرح قرآن کریم میں ایک اور مقام پر مزید واضح کردیا گیا کہ اللہ کے

سوا کوئی مدد کرنے والا ہے کہ نہیں؟ اور جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری مدد کیا کریں گے وہ تو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے۔ (الاعراف) اس معاملہ کی حقیقت سے پردہ کشائی کرتے ہوئے اللہ پاک خود ارشاد فرما ہیں کہ اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں بے سہارا چھوڑ دے تو پھر کون ایسا ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے؟ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا جا رہا ہے کہ بے شک اللہ ان کے ساتھ ہے جو پرہیز گار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں۔ (النحل) غور فرمائیے کہ ان آیات قرآنی میں ایک آفاقی سچائی اور قانون قدرت کو کس قدر وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا گیا کہ کہیں بھی کسی شخص کے لئے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں اللہ رب العزت نے عہد وفا نبھانے والوں کو ہمیشہ اپنی مدد و نصرت سے سیراب کیا اور دونوں جہانوں میں کامیابی و کامرانی ان کا مقدر بن گئی جب کہ اس عہد سے روگردانی کرنے والوں کو دنیا نے اپنے قدموں تلے روند ڈالا اور ان میں سے بیشتر کا تو نام بھی داستانوں میں باقی نہیں اور جن کا ذکر تاریخ میں موجود ہے انہیں آنے والوں کے لئے نشان عبرت بنا دیا گیا۔ اللہ پاک سے عہد وفا نبھانے اور دین پر کاربند رہنے والوں کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں جو بھلے کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں، وہ نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا بلاشبہ اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ (التوبۃ) ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے کہ اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔ (سورہ محمد) اس آیت مبارکہ میں اس ازلی قانون فطرت کی وضاحت کر دی گئی کہ اگر دین کے راستے پر ثابت قدمی سے کاربند رہا جائے گا تو نصرت خداوندی کچھ دور نہیں۔ اس حوالہ سے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔ (الحج) اللہ پاک نے اپنی نصرت کے حوالہ سے اہل ایمان اور دیگر اقوام و افراد کی تفریق واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ بلاشبہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور پرہیز گاروں کا دوست اللہ ہے۔ (الجاثیۃ)

ان آیات مبارکہ میں دنیا و آخرت میں اللہ پاک کی نصرت بارے تفصیلی بیان کر دیا گیا تا کہ اس سے راہنمائی لے کر انسان اپنی دنیا و آخرت کو سنوار سکے۔ ان آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا کہ اللہ پاک کی مدد شامل حال نہ ہو تو دنیا و آخرت میں کامیابی کا کوئی تصور نہیں اور مسلمانوں کا توحید الٰہی کو اپنا کر شریعت محمدی ﷺ کو اپنے تمام معاملات میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کی طرح اپنانا ہی دونوں جہانوں میں کامیابی کا ضامن ہے۔

عقیدۂ توحید کے اثرات وثمرات

توحید کی بہ دولت موحد انسان جنت میں داخل ہوگا اور جہنم سے نجات پائے گا جیسا کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ بندوں کا خدا پر یہ حق ہے کہ اگر وہ صرف خدا کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں تو وہ انھیں دوزخ سے بچا کر جنت کا داخلہ عطا فرمائے۔ کچھ لوگ خدا کی بعض صفات میں خود اپنے آپ ہی کو اس کا ساجھی سمجھتے ہیں حالاں کہ نہ تو یہ خدا کے ساتھ خلق وتخلیق میں شریک تھے اور نہ کائنات کی ملکیت ورزق اور تدبیر وانتظام ہی میں ان کا کوئی حصہ ہے؛ عقیدۂ توحید سے ان کے تصوراتِ باطلہ بھی یک سر منہدم ہو جاتے ہیں۔ عقیدۂ توحید سے حریتِ فکر ونظر نصیب ہوتی ہے اور انسان مخلوق کی غلامی و بندگی سے نجات پاتا ہے۔ توحید کے نتیجے میں انسان دنیا و آخرت میں شجاعت و استقامت کی نعمت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ ایک شخص جو مختلف الاغراض آقاؤں کی بندگی کرتا اور انھیں پکارتا ہے، کسی سے ڈرتا اور کسی سے امیدیں وابستہ کرتا ہے، یہ کسی طور اس شخص کی مانند نہیں ہو سکتا جو اپنے رب کو تنہا و یکتا گردانتا ہے، اسی کا خوف رکھتا اور اسی سے امیدیں باندھتا ہے؛ وہ خداوند عالم ہی کو اپنے قصد وارادہ کا مرکز ومحور قرار دیتا اور اسی کی عبادت بجالاتا ہے۔ اے اللہ! اے اسلام اور مسلمانوں کے آقا! ہمیں اپنی توحید پر ثابت قدم رکھنا تا آں کہ ہم تجھ سے ملاقات کی سعادت حاصل کر لیں! دعا ہے کہ اللہ پاک ہمیں اپنے دین حق پر کاربند رہتے ہوئے صرط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور کبھی بھی اپنی مدد سے محروم نہ رکھے۔ آمین!

☆☆☆

آسمانی کتب میں تحریف

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

مِنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِھِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ ط وَلَوْ اَنَّھُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ وَاَقْوَمَ لا وَلٰکِنْ لَّعَنَھُمُ اللّٰہُ بِکُفْرِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ۴۶

یہود کی لفظی اور معنوی تحریف

مِنَ الَّذِیْنَ	کچھ ان لوگوں میں سے جو	ھَادُوْا	یہودی ہوئے
یُحَرِّفُوْنَ	بدل ڈالتے ہیں	الْکَلِمَ	باتوں کو
عَنْ مَّوَاضِعِہٖ	ان کی جگہوں سے	وَیَقُوْلُوْنَ	اور کہتے ہیں
سَمِعْنَا	ہم نے سنا	وَعَصَیْنَا	اور ہم نے نافرمانی کی
وَاسْمَعْ	اور سن تو	غَیْرَ مُسْمَعٍ	نہ سنایا جائے
وَّرَاعِنَا	اور (کہتے ہیں) راعنا	لَیًّا	موڑتے ہوئے
بِاَلْسِنَتِھِمْ	اپنی زبانیں	وَطَعْنًا	اور طعن کرتے ہوئے
فِی الدِّیْنِ ط	دین میں	وَلَوْ	اور اگر

اَنَّهُمْ	بلاشبہ وہ	قَالُوْا سَمِعْنَا	کہتے ہم نے سنا
وَاَطَعْنَا	اور ہم نے اطاعت کی	وَاسْمَعْ	اور سنیے
وَانْظُرْنَا	اور ہمیں دیکھیے	لَكَانَ	تو یقینا ہوتا
خَيْرًا	بہت بہتر	لَّهُمْ	ان کے لیے
وَاَقْوَمَ	اور درست تر	وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ	لیکن اللہ نے ان پر لعنت کی
بِكُفْرِهِمْ	بسبب ان کے کفر کے	فَلَا	لہٰذا نہیں
يُؤْمِنُوْنَ	وہ ایمان لاتے	اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٤٦﴾	مگر تھوڑے ہی

فرمایا مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ یہودیوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کلمات کو ان کے مواقع سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہودیوں نے اپنے حسد، بغض، عناد کی بناء پر اور چوہدراہٹ کے تحفظ کی خاطر کتاب میں تحریف کی، عیسائیوں نے بھی اپنی کتاب کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ مکہ کے مشرکین نے بھی اسی لیے رسول آخر الزمان ﷺ کا انکار کیا کہ ایمان لے آنے سے ان کی برتری ختم ہو جاتی تھی، انہیں اطاعت کرنا پڑتی تھی یہود و نصاریٰ آج بھی اپنی اسی پرانی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ یعنی اس آیت میں چند امور کے ساتھ اس گمراہی کی تشریح فرمائی۔ یعنی وہ تورات کے احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں "عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کے علاوہ "مِنْۢ مَوَاضِعِهٖ بھی ہے، جس کا معنی تحریف لفظی ہے، یہاں "عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ہے، اس سے مراد تحریف معنوی ہے، (یعنی کسی عبارت یا کتاب کے اصل الفاظ میں کمی، زیادتی یا تبدیلی کرنا ہے، جبکہ تحریف معنوی سے مراد الفاظ کو اپنی جگہ پر برقرار رکھتے ہوئے ان کا غلط، مرضی کا یا اصل مقصد کے خلاف معنی اور مطلب بیان کرنا ہے۔) یعنی تاویلات فاسدہ سے کام لیتے ہیں، مثلاً قصۂ ذبیح کا تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بجائے حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ جوڑنا۔ (رازی۔ شوکانی) تورات عبرانی زبان میں نازل ہوئی تھی لیکن اصل تورات تو دو دفعہ گم ہوئی۔ پھر مختلف زبانوں میں اس کے تراجم پر انحصار کیا گیا۔ آج کل تورات اور انجیل کے مجموعہ کو بائیبل مقدس کا نام دیا گیا ہے۔ تورات

کے حصہ کو عہد نامہ عتیق اور انجیل کے حصہ کو عہد نامہ جدید کہتے ہیں۔ اور اہل کتاب نہ صرف خود قبول اسلام سے انکاری ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنے دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال انہوں نے اپنی کتاب میں ہر اس مقام پر تحریف کی جس میں اسلام کی حقانیت اور نبی آخر الزمان کی آمد کی پیشگوئیاں موجود تھیں۔ عیسائیوں نے انجیل مقدس سے فارقلیط کا لفظ ہی حذف کر دیا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ ڈال دیا۔ سریانی زبان کا فارقلیط اور عربی کا احمد ہم معنی الفاظ ہیں۔ چونکہ حضور ﷺ کی آمد کی پیش گوئیاں انجیل میں موجود تھیں، اس لیے انہوں نے یہ لفظ ہی اڑا دیا عیسیٰ (علیہ السلام) تو اپنے ہر وعظ میں فرماتے تھے اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ میں اللہ کا رسول ہوں مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىۃِ میں اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جن کا نام نامی اور اسم گرامی احمد ہوگا، بہر حال عیسائیوں نے یہ لفظ ہی اڑا دیا تاکہ نہ یہ نام ہوگا اور نہ انہیں آخری نبی پر ایمان لانا پڑے گا، یہ تحریف کی بدترین مثال ہے۔ ان میں تحریف کے علاوہ بہت سے الحاقی مضامین بھی شامل ہو چکے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت الہامی نہیں ہو سکتی۔ ان کتابوں کی بیشمار آیات ایسی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتیں، اور نہ وہ انبیاء علیہم السلام کا کلام ہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بہت مدت بعد کسی سوانح نگار نے یہ حالات قلمبند کیے۔ پھر انہیں بھی کتاب مقدس میں شامل کر دیا گیا تھا۔

یہود کی شرارتیں

وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّۢا بِاَلْسِنَتِہِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ جو یہود رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آیا کرتے تھے ان کی تین طرح کی حرکتوں کا ان آیات میں ذکر ہوا ہے۔ ایک یہ کہ جب وہ کوئی حکم الٰہی سنتے تو بلند آواز سے تو سَمِعْنَا کہتے مگر آہستہ آواز سے یا دل میں عَصَیْنَا (یعنی ہم مانیں گے نہیں) کہہ دیتے۔ یا اَطَعْنَا کے لفظ کو ہی زبان کو موڑ دے کر یوں ادا کرتے کہ وہ اَطَعْنَا کی بجائے عَصَیْنَا ہی سمجھ میں آتا۔ اِسْمَعْ (ہماری

بات سنیے) یعنی جب کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی اور کچھ پوچھنا درکار ہوتا تو اِسْمَعْ کہتے اور ساتھ ہی غَیْرَ مُسْمَعٍ بھی دل میں کہہ دیتے (یعنی تم سن ہی نہ سکو یا بہرے ہو جاؤ) اور کبھی اِسْمَعْ کی بجائے رَاعِنَا کہتے اور زبان کو موڑ دے کر رَاعِیْنَا (ہمارے چرواہے) کہہ دیتے۔ جو تو ہین کا کلمہ ہے۔ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ: یعنی یہ سب حرکتیں کر رہے ہیں اور پھر دین میں طعن کی غرض سے کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب معلوم کر لیتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے خبث باطن کو ظاہر فرما دیا اور وہی طعن الٹا رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کی پختہ دلیل بن گیا۔ (رازی) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی ایسی شرارتوں اور خباثتوں سے مطلع کر دیا اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ جو لوگ اپنی ضلالت میں اس درجہ پختہ ہو چکے اور ہٹ دھرم بن چکے ہیں ان سے ایمان لانے کی توقع عبث ہے۔ الا ماشاء اللہ

دینی احکام و اصطلاحات میں تحریف کا فتنہ

اسی طرح قرآن کریم کے الفاظ و معانی کو اپنی مسلمہ شکل سے پھیر دینے کو "تحریف" کہا جاتا ہے، یوں ہی احادیثِ مبارکہ اور شرعی و دینی اصطلاحات کے اپنے مسلمہ مفاہیم و معانی میں ہیر پھیر بھی تحریف ہی کی ایک شاخ ہے۔ الفاظ کی تحریف تو واضح ہے کہ ایک لفظ یا جملہ کی بجائے دوسرا لفظ و جملہ رکھا جائے یا مختلف مقامات سے کچھ کچھ عبارات لے کر ایک نئی ترکیب بنائی جائے، تحریف کی اس قسم کی حرمت و ممانعت پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے اور کوئی مسلمان اس کی جسارت نہیں کر سکتا، کوئی بہت ہی بدنصیب ہو اور وہ ایسی جرأت کرے تو بھی چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی حفاظت کا وعدہ خود فرمایا ہے، اس لیے اس اقدام کی وجہ سے کلامِ الٰہی میں کوئی خلل واقع نہیں ہو سکتا، پھر تلفظ و ادائیگی میں تو ایسی تحریف حرام ہی ہے، اس سے بڑھ کر خود رسم الخط میں بھی مصحفِ عثمانی کی اتباع لازم ہے، اگر کہیں کسی قوم و معاشرہ میں رسم الخط تبدیل بھی ہو جائے تو بھی کم از کم قرآن کریم کو اسی رسم الخط میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔

دوسری قسم تحریفِ معنوی ہے کہ الفاظ کو اپنی اصلی جگہ پر برقرار رکھا جائے، لیکن ان کے معانی

ومفاہیم میں قطع و برید کی جائے اور اپنی چاہت کے مطابق معانی کا جامہ پہنایا جائے، مثلاً کوئی کہے کہ زکوٰۃ بالکل برحق اور فریضۂ خداوندی ہے، مگر اس کا جو مفہوم مسلمانوں نے لے رکھا ہے وہ غلط ہے، یہ تو مسلمانوں کے نظامِ مملکت چلانے کے لیے افرادِ خانہ پر ٹیکس کا سا نظام ہے۔ حج بھی برحق ہے، مگر اس کا اصل مقصود مسلمانوں کی سیاسی و اجتماعی قوت کا مظاہرہ ہے۔ سود کے حرام ہونے سے کوئی انکار نہیں ہے، مگر اس سے غریب لوگوں کے استحصال کو ختم کرنا مقصود ہے، بینک و تجارتی قرضوں پر پرافٹ کا لین دین اس کے خلاف نہیں۔ یہ اور اس قسم کی تحریفات و تاویلات کی نہ ختم ہونے والی ایک طویل اور صبر آزما داستان ہے جس کو سننے اور پڑھنے کے لیے کلیجہ چاہیے۔

اسی تحریفِ معنوی کی ایک قابل افسوس اور مذموم شکل مختلف دینی شعبوں کی اصطلاحات میں تحریف ہے، کسی عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا و آخرت میں کیا کچھ وعدے ہیں؟ مختلف قسم کی نیکیوں پر کیا کچھ اجر و ثواب اور درجات و فضائل مرتب ہیں؟ کس گناہ کے کرنے پر آخرت میں کیا کچھ سزائیں دی جائیں گی؟ یہ سب ''امورِ توقیفیہ'' ہیں جو قرآن و سنت کے سرچشمۂ حیات سے ہی معلوم ہو سکتے ہیں اور بس، یہاں عقل و قیاس کی دخل اندازی کی ضرورت ہے نہ گنجائش، قرآن و سنت میں اس کے متعلق جتنی بات اور جس حد تک بیان ہوئی ہے اس پر اسی درجہ میں ایمان و یقین رکھا جائے اور اسی حد بندی پر رہا جائے، اپنی قیاس آرائیوں کے ذریعے ان حدود کو پار کرنا غلو و افراط بھی ہے اور تحریفِ معنوی کا مظاہرہ بھی، مثلاً قرآن و سنت میں ''ذکر'' کی فضیلت اور اس کی ترغیب اور حکم وارد ہے، اس کا حقیقی مفہوم تسبیح، تہلیل و تکبیر وغیرہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے، اس کے عموم میں اللہ تعالیٰ کی ہر اطاعت بھی داخل ہے۔ دین کے اصول و ضوابط کے مطابق دنیا داری بھی درحقیقت دینداری اور ذکر و عبادت میں شامل ہے، لیکن نصوص میں ''ذکر'' اور اس کے ثابت شدہ فضائل و احکام کا اولین اور بالذات مصداق یہی حقیقی مفہوم ہے، دیگر امور کہیں کہیں تبعاً اور ضمناً داخل ہوتے ہیں، اب ہر جگہ ان ضمنی اُمور کو مقصود ٹھہرانا اور ذکر کے حقیقی مفہوم کی اہمیت ختم کرنا بالکل غلط اور ایک گونہ تحریف ہے۔ اگر ہر جگہ ذکر کا یہی عمومی معنی میں استعمال ہوتا تو اس کے بعد نماز و زکوٰۃ وغیرہ

اعمال واشغال ذکر کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی، جبکہ کئی نصوص میں ایسا وارد ہے۔

''عبادت'' کا ذکر قرآن وسنت میں کثرت سے موجود ہے، اس کا حقیقی مفہوم نماز روزہ وغیرہ وہ عبادات ہیں جو شریعت نے مقرر کر رکھے ہیں، البتہ اس کے عموم میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم بجالانا بھی داخل ہے جو پوری انسانی اجتماعی وانفرادی زندگی کو شامل ہے، لیکن عبادات کے فضائل وترغیبات کا اصل موردِ یہی اصطلاحی عبادات ہی ہیں، دیگر ضمنی اُمور کو مقصودِ اصلی ٹھہرا کر ان مقاصد کی طرف التفات نہ کرنا یا خود ان مقاصد کو ذرائع وتوابع گردانا بالکل غلط اور بے راہ روی ہے۔ یہی حال لفظ ''جہاد'' کا بھی ہے، نصوص میں بکثرت اس کا ذکر ہے، بہت سی جگہوں میں سیاق وسباق اور موقع ومحل کے لحاظ سے اس کا عام لغوی معنی بھی مراد ہے، یعنی دین کی خاطر کی جانے والی کوشش، لیکن بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے جو ایک خاص مفہوم یعنی اعلاء کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کی خاطر دشمنانِ اسلام سے لڑنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اب نصوص میں جہاں جہاں اس کا حکم دیا گیا یا اس پر اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا، وہاں اس سے زبانی دعوت وتبلیغ یا سیاسی وجمہوری جدوجہد کے ذریعے نفاذِ اسلام مراد لینا، یا ان ضمنی امور کو غیر معمولی اہمیت دے کر لفظ کے اصل حقیقی اصطلاحی مفہوم سے مکمل صرف نظر کر لینا کھلی غلطی اور غیر دانشمندانہ اِقدام ہے۔ ''علم'' اور ''علماء'' کا لفظ بھی اس کھینچ وتان سے نہ بچ سکا، لغوی معنی کے لحاظ سے تو اس میں بہت کچھ وسعت ہے، کسی بھی چیز کی جان وپہچان کو علم اور جاننے والے کو عالم کہہ سکتے ہیں، لیکن نصوص میں جہاں علم کی اجر وفضیلت کا ذکر ہے، وہاں اس سے شریعتِ اسلامیہ کا علم مراد ہے، یہی وہ علم ہے جس کا بقدرِ ضرورت حصہ فرض قرار دیا گیا اور اس پر اَن گنت فضائل وثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے، دنیوی علوم وفنون کا جاننا مطلقاً کوئی ناجائز یا معیوب نہیں ہے، اس کی اہمیت وافادیت بلکہ ایک حد تک اس کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر بایں ہمہ وہ ان نصوص کا مصداق نہیں ہیں، لہٰذا ''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ'' اور ''وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ'' جیسی نصوص کو ان دنیوی فنون پر منطبق کرنا بالکل غلط اور مذموم ہے۔ اسی کا تماشہ ہمارے ہاں خاندانی منصوبہ بندی

والے بھی کر رہے ہیں کہ ''کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ'' جیسی نصوص کو اپنے خود ساختہ نظریہ ومقصود کے لیے جگہ جگہ لکھتے ہیں، حالانکہ آیت کے مفہوم ومصداق سے قطع نظر کر کے خود خاندانی منصوبہ کا یہ نظریہ ہی شریعتِ اسلام کی مجموعی تعلیمات سے متصادم ہے، کتنی جسارت اور جرأت کا مقام ہے کہ خلاف اِسلام نظریہ کی نشر واشاعت کے لیے قرآنی آیات کے پیوند لگا کر بے موقع استعمال کیا جاتا ہے۔

میوزک وموسیقی کے آلات ومحفلوں کے لیے 'رَوِّحُوا الْقُلُوبَ سَاعَةً'' (دلوں کو گھڑی بھر (کچھ دیر) کے لیے راحت اور سکون دیا کرو۔) جیسی عبارتیں پیش کرنا بھی ایسا ہی غلط اور ناجائز حرکت ہے، اگر اس کو حدیث یا کوئی مسلّم شرعی ضابطہ کے طور پر تسلیم بھی کیا جائے تو راحت سے صرف وہی راستہ مراد ہوسکتا ہے جو خود دین اسلام میں مرخّص (جائز) ہو، ناجائز وسائل کی رخصت یا افادیت پر استدلال کرنا تحریف ہے۔ ان جیسی دانستہ یا نادانستہ طور پر تحریفات کرنے والوں میں سے بعض تو وہ لوگ ہیں جن کے جذبات واہداف ہی شاید یہی التباس واختلاط کی فضا پیدا کرنا ہیں، ان کے ساتھ بات کرنا تو ضیاعِ وقت ہی ہے، لیکن بہت سے بلکہ شاید غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اخلاص ودیانت کے باوجود کم فہمی یا بدفہمی کی وجہ سے ان جیسی غلطیوں کے شکار ہوجاتے ہیں، ان کی خدمت میں یہی گزارش ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن وسنت کی نصوص میں ہر ہر لفظ اپنے لغوی معنی پر محمول نہیں، بلکہ بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں کہ شریعت نے اس کے لیے ایک الگ مفہوم مقرر فرمایا ہے، اب نصوص میں اس کے کچھ فضائل وفوائد ذکر ہوئے ہیں، وہ اسی معین کردہ مفہوم کے پیش نظر بیان ہوئے ہیں، نہ کہ محض لغوی معنی پر۔ لہٰذا اگر نص میں کسی چیز کا حکم یا اس کی ترغیب دی جاتی ہے تو اولاً یہ تحقیق کر لینی چاہیے کہ لغوی معنیٰ مراد ہے یا مصطلح مفہوم؟ پھر اسی کے مطابق عمل درآمد کر لینا چاہیے، کیونکہ کوئی چیز شرعاً لازم ہے یا نہیں؟ اس پر ثواب وعقاب مرتب ہوگا یا نہیں؟ یہ ساری باتیں نص ہی سے معلوم کی جاسکتی ہیں، یہاں عقل وقیاس کے پہیّے جام ہوجاتے ہیں، جذبات وخواہشات اور طبیعت ومزاج کی نکیل نصوص کے ہاتھ ہی میں دے دینی چاہیے، ورنہ تو یہی بے راہ روی سابقہ ادیان ومذاہب کے اضمحلال اور ان کے کھوکھلے پن کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے، اس لیے

لفظی تحریف کی طرح معنوی اور اصطلاحی تحریف سے بچنا بھی دین کی حفاظت کا اہم تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطا فرمائے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ : یعنی یہ اگر اس قسم کی حرکات اور طعن کے بجائے ایسے کلمات استعمال کرتے جن میں شرارت کی آمیزش نہیں ہوسکتی اور اخلاص سے پیش آتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی ترک کرکے دین اسلام کو قبول کرلیتے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا اور اگر وہ یوں کہتے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ہم نے سن لیا اور ہم اسے مانیں گے وَاسْمَعْ آپ ہماری بات سنیں وَانْظُرْنَا اور ہماری طرف دیکھیں لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ تو ایسا کہنا ان کے لیے بہتر ہوتا وَاَقْوَمَ اور زیادہ درست ہوتا مگر افسوس کہ انہوں نے ایسا نہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی۔ لعنت کا معنی بُعْدٌ مِنَ الرَّحْمَۃِ یعنی اللہ کی رحمت سے دوری ہے۔ ایمان لانے سے انکار کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و بخشش سے دور ہوگئے۔ انہوں نے کلام الٰہی کو حق نہ مانا۔ رسول کی تکذیب کی۔ ان کے اخلاق بگڑ گئے تھے۔ عقل الٹ گئی تھی، اس لیے تمام کام خلاف عقل و فہم انجام دیتے تھے کلام الٰہی کو تبدیل کیا فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ⑯ پس وہ نہیں ایمان لاتے مگر بہت تھوڑے۔ حضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں مدینے کے گرد و نواح میں یہودیوں کے دس بڑے عالم تھے۔ جن میں سے صرف ایک اسلام قبول کرسکے حضور نے فرمایا اگر یہ سارے کے سارے ایمان لے آتے تو روئے زمین پر موجود تمام یہودی حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے۔ مگر جیسا کہ یہاں فرمایا بہت قلیل لوگ ایمان لائے۔ یہ لوگ اس وقت بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور آج بھی دنیا میں اسی پالیسی پر گامزن ہیں اور یہ مسلمانوں سے صرف اسی صورت میں راضی ہوسکتے ہیں کہ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر ان کے دین میں مدغم ہوجائیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو متوجہ فرمایا گیا کہ ایسے مشکوک اور دو معنی رکھنے والے الفاظ استعمال نہ کرنا چاہئے؛ بلکہ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کی جگہ "سمعنا و اطعنا" (ہم نے سنا اور مانا) اِسْمَعْ

غَیْرَ مُسْمَعٍ کی جگہ صرف اِسْمَعْ (سنئے) اور رَاعِنَا کی بجائے اُنْظُرْنَا (ہماری رعایت فرمائیے) کہنا بہتر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دوسری قومیں اگر ایسے الفاظ استعمال کریں، جن کے گو درست معنی بھی ہوں؛ لیکن وہ اسے کسی غیر اسلامی فکر کی ترجمانی کے لئے بھی کہا کرتے ہوں، تو ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے۔

☆☆☆

اصحابِ سبت کا واقعہ/ اصحاب السّبت پر عذاب کی نوعیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا فَنَرُدَّھَا عَلٰٓی اَدْبَارِھَآ اَوْ نَلْعَنَھُمْ کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا ۴۷

دعوت دین اور احتساب عمل

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اُوْتُوا الْکِتٰبَ	دیے گئے ہو کتاب!
اٰمِنُوْا	تم ایمان لاؤ	بِمَا	اس کے ساتھ جو
نَزَّلْنَا	ہم نے نازل کیا	مُصَدِّقًا	وہ تصدیق کرنے والا ہے
لِّمَا	اس کی جو	مَعَکُمْ	تمہارے پاس ہے
مِّنْ قَبْلِ	اس سے پہلے	اَنْ نَّطْمِسَ	کہ ہم مٹا دیں
وُجُوْھًا	چہروں کو	فَنَرُدَّھَا	پھر ہم انہیں لوٹا دیں
عَلٰٓی اَدْبَارِھَآ	ان کی پیٹھوں پر	اَوْ نَلْعَنَھُمْ	یا ہم ان پر لعنت کریں
کَمَا	جس طرح	لَعَنَّآ	ہم نے لعنت کی
اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ	سبت (ہفتے کے دن) والوں پر	وَکَانَ	اور ہے

اَمْرُ اللّٰہِ	اللہ کا حکم	مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾	کیا ہوا (یعنی اٹل)

یہود کی شرارتوں کو بیان کرنے کے بعد اب اس آیت میں انھیں ایمان کی دعوت دی اور ہٹ دھرمی سے احکام خداوندی بجانہ لانے پر وعید سنائی، کیونکہ یہود عالم تھے اور علم و معرفت کے باوجود ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے، ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی ہو، یہودی اور عیسائی اپنے آپ کو اہل کتاب کہلاتے تھے۔ عیسائی انجیل کے حامل ہونے کے دعویدار تھے، جب کہ یہودی تورات کے۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں بھی انہیں اہل کتاب کہا گیا ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ درس میں اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ کے الفاظ تھے یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا یعنی جن کے پاس محض الفاظ ہیں اور روح نہیں۔ تاہم اس آیت میں مطلقاً اہل کتاب کو خطاب ہے کہ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا اس چیز پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل کیا ہے یعنی قرآن پاک۔ اور وہ ایسی کتاب ہے مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ جو تصدیق کرتی ہے اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے یعنی تورات اور انجیل۔ ظاہر ہے کہ ہر بعد میں آنے والی کتاب پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور بعد میں آنے والا نبی پہلے انبیاء (علیہم السلام) کا مصدق ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک نے تورات، انجیل اور زبور کی منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ تمام انبیاء علیہم السلام کے برحق ہونے کی تصدیق کی البتہ سابقہ امتوں نے خود اپنی کتابوں میں خرابی ڈالی اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس بات کا اظہار قرآن پاک نے کر دیا ہے۔ سورہ مائدہ میں موجود ہے یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو تمہاری بہت سی (مسخ شدہ) باتوں کو ظاہر کرتا ہے اور بعض چیزوں سے درگزر کرتا ہے یعنی تمہاری بعض خصلتیں ایسی بھی ہیں جنہیں ظاہر نہیں کیا گیا۔ لہٰذا تم قرآن پاک پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتا ہے مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا اس سے پیشتر کہ تمہارے چہرے مٹا دیے جائیں یا مسخ کر دیے جائیں، بگاڑ دیے جائیں فَنَرُدَّھَا عَلٰٓی اَدْبَارِھَآ پس چہروں

کو پشت کی جانب پھیر دیں۔ایسا وقت آنے سے پہلے پہلے ایمان لے آؤ۔جب اللہ کا غضب جوش میں آتا ہے تو پھر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں ہی لوگوں کی شکلیں مسخ کر دی جاتی ہیں۔قرآن پاک میں کتنی نافرمان قوموں کا ذکر ہے جن کی شکلیں بگاڑ دی گئیں اور انہیں جانوروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آخری زمانہ میں بھی ایسا ہوگا،قربِ قیامت میں بھی بعض لوگوں کی شکلیں مسخ کر دی جائیں گی۔جب کسی کا قلب و ذہن باطنی گمراہی سے بھرا ہو تو ظاہر ہے کہ باطنی طور پر تو اس کی شکل بگڑ چکی ہے اور یہ شرکا دوسرا درجہ ہے۔اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ ظاہری شکلیں بھی بگڑ جائیں۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا،تاہم کہیں اکا دکا واقعہ پیش آجانا عین ممکن ہے۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا قبولِ اسلام

حضرت عبد اللہ بن سلام رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ جو بہت بڑے یہودی عالم تھے،اُنہوں نے ملکِ شام سے واپس آتے ہوئے راستے میں یہ آیت سنی اور اپنے گھر پہنچنے سے پہلے اسلام لا کر نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسولَ اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہیں خیال کرتا تھا کہ میں اپنا منہ پیٹھ کی طرف پھر جانے سے پہلے اور چہرے کا نقشہ مٹ جانے سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوسکوں گا یعنی اس خوف سے اُنہوں نے ایمان لانے میں جلدی کی کیونکہ توریت شریف سے اُنہیں آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے رسولِ برحق ہونے کا یقینی علم تھا۔ (خازن،النساء،تحت الآیۃ: ۴۷، ۱/ ۳۹۰-۳۹۱)

حضرت کعب احبار رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا قبولِ اسلام:

حضرت کعب احبار رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ جو علماءِ یہود میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے انہوں نے ایک رات کسی شخص سے یہی آیت سنی تو خوفزدہ ہوئے اور حضرت عمر فاروق رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ (فتوح الشام)

اصحابِ سبت کا واقعہ اور ہمارے لئے سبق

فرمایا ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ تمہاری شکلیں مسخ کر دی جائیں اَوْ نَلْعَنَهُمْ یا ہم ان پر لعنت بھیجیں، رحمت سے دور کر دیں كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ جس طرح کہ ہم نے ان لوگوں پر لعنت بھیجی جو ہفتے کے دن زیادتی کرتے تھے۔ اصحابِ سبت (ہفتہ کے دن تجاوز کرنے والے لوگ) کا ذکر سورۃ البقرۃ آیت نمبر پینسٹھ میں آیا ہے، جو درجہ ذیل ہے: "وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ." ﴿البقرۃ: ۶۵﴾ اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (شرع سے) تجاوز کیا تھا (اس حکم کے جو) یوم ہفتہ کے (متعلق تھا) سو ہم نے ان کو کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ۔ "بیان القرآن للتھانوی) یہ واقعہ بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا بنی اسرائیل کے لیے ہفتہ کا دن معظم اور عبادت کے لیے مقرر تھا اور مچھلی کا شکار بھی اس روز ممنوع تھا یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے اور مچھلی کے شوقین تھے اس حکم کو نہ مانا اور شکار کیا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسخ صورت کا عذاب نازل ہوا تین دن کے بعد وہ سب مر گئے، اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے فرمان بردار و نافرمان تو نافرمانوں کے لیے تو یہ واقعہ نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا اس لیے اس کو نَكَالًا فرمایا اور فرمان برداروں کو یہ واقعہ فرمان برداری پر قائم رکھنے والا تھا اس کو مَوْعِظَةً فرمایا۔ اس سرکشی اور نافرمانی پر اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کے طور پر مسخ کر کے ذلیل بندر بنا دیا تھا۔ دوسرے مقام پر فرمایا وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ بعض کی شکلیں بندروں کی اور بعض کی خنزیروں کی بن گئیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان کے نوجوان بندروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے اور بوڑھے خنزیر بن گئے۔ فرمایا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اور اللہ کا حکم تو ہو کر رہتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو وعید سنائی ہے کہ خدا کا خوف کرو، ایمان لے آؤ۔ اللہ کا نبی تو پہلی کتابوں کا مصدق ہے۔ لہٰذا تمہارے انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں۔ تم کیوں۔ کفر پر اصرار کر رہے ہو۔

ہمارے لئے اسباق اللہ کے احکام میں حیلہ بازی سے پرہیز: اللہ تعالیٰ نیتوں اور دلوں کے حال سے واقف ہے۔ احکامِ شریعت میں ظاہری حیلے تراش کر اللہ کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت: نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا معاشرے کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ برائی کو دیکھ کر خاموش تماشائی بن جانا یا لاتعلق ہو جانا بھی انسان کو عذاب کا مستحق بنا سکتا ہے۔ نافرمانی کا انجام: خدا کی نافرمانی اور احکامِ الٰہی سے سرکشی انسان کو دنیا اور آخرت میں تباہی اور رسوائی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس واقعہ کے تناظر میں اپنے معاشرے کے حال پر نظر کی جائے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے معاشرے کی ہی بات ہو رہی ہو۔ اگر ایک نظر عام اپنے معاشرے پر ڈالیں تو ہمارے معاشرے میں بیچ کے لوگوں کی بھرمار نظر آئے گی۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو کسی بڑے پیمانے پر کرپشن یا غلط نہیں کر رہے ہوں گے مگر کسی کرنے والوں کو کبھی کچھ کہتے بھی نہ ہوں گے بلکہ اگر کوئی حق بات کہہ بھی رہا ہوگا تو اس کو بھی سمجھاتے نظر آئیں گے کہ بس اپنے کام سے کام رکھو اور کسی مسئلے میں نہ پڑو۔ تمہیں کیا پڑی ہے جو کرے گا خود بھگتے گا۔ خیر یہ واقعہ اس بات کا تو جواب دیتا ہے کہ جو لوگ سرِ عام کہتے نظر آتے ہیں کہ یہ دَور ہی نہیں کہ صحیح غلط میں پڑو، بس اپنے کام سے کام رکھو۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان لوگوں کے بارے میں گویا کچھ یوں لکھا ہے کہ یہ بیچ کے لوگ دونوں طرف اپنے تعلقات بنا کر رکھتے یعنی نہ حق پرست لوگوں سے بات بگاڑ نا نہ ظالموں سے۔ نجانے کتنی صدیوں پرانا واقعہ بھی اسی بات کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے تو یہ دور کی بات نہیں بلکہ سوچ کی بات ہے۔ تب بھی حق بات کہنے والوں کا لوگ ساتھ دینے کے بجائے روکنے کا کام کرتے تھے اور آج بھی۔ اب تک ایک نظر عام کی بات تھی تو صورت حال میں مماثلت تھی مگر اگر نظر دقیق کی بات کریں تو ہمارے معاشرے کی صورت حال مختلف نہیں۔ واقعہ سبت میں جو بیچ کے لوگ تھے وہ خود برائی نہیں کرتے تھے نہ ان کے برائی کی طرف عملی طور پر راغب ہونے کی بات آئی مگر ہمارے معاشرے میں معاملات مختلف ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہاں شریف وہ ہے جس کو موقع نہیں ملا۔ یہ بات پوری طرح درست نہ بھی صحیح مگر کافی حد تک درست ہے۔ ہمارے یہاں لوگ رشوت

لینے دینے والے کو جہنمی تو کہیں گے مگر اپنا کام کرنے پر رشوت دینے میں سوچیں گے بھی نہیں۔ اگر تب کوئی سمجھائے بھی تو کہیں گے کہ بھائی یہ تو سارا سسٹم ایسا ہے کیا کریں مجبوری ہے۔ خیر پھر لوگ خاص کر نوکری کے لیے لوگ رشوت دے کر آتے ہیں اور بعد میں مجبوری کا رونا روتے نظر آتے ہیں جب کہ سمجھ نہیں آتا یہ کیا دنیا کی واحد نوکری تھی یا کوئی اور کام کرنے کے قابل ہی نہیں ہو؟ اور پھر جب رشوت دے کر آتے ہیں تو اکثر لوگ بعد میں رشوت لینے میں بھی آڑ نہیں رکھتے۔

اگر اپنے حالات پر انصاف کے ساتھ غور کریں تو واقع سبت کے بیچ کے لوگوں کو ہمارے معاشرے کہ بیچ کے لوگوں سے بہتر پائیں گے کیوں کہ وہ برائی کو برائی تو جانتے تھے مگر ہمارے والے تو اس کو صحیح تک قرار دے دیتے ہیں۔ اور وہاں برائی سے نہ روکنے والوں کا اپنا کوئی ارادہ اس میں شامل ہونے کا اشارہ نظر نہیں آتا جب کہ ہمارے معاشرے میں شاید بیچ والے حق بات کرنے والوں کو بھی اس لیے روکتے ہوں کہ پتا نہیں کبھی ان کو موقع ملے اور وہ بھی یہی کام کرتے نہ پائے جائیں۔ اب ہم خود اندازہ لگائیں کہ ہم کس سطح پر کھڑے ہیں اور اپنے معاشرے کو کس طرح تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ آخر میں ایک بات اور کرنا چاہوں گا کہ اکثر لوگ اپنے بیچ میں ہونے یعنی نہ کرنے نہ روکنے کو بہتر بلکہ حکم الٰہی قرار دیتے نظر آتے ہیں اور اس پر دلیل بھی دیتے پائے جاتے ہیں کہ متوسط راہ اختیار کرنے کا حکم ہے۔

نہی عن المنکر کا فریضہ

ایک حدیث میں بیان ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کی حدود کی خلاف ورزی کرنے والوں اور خلاف ورزی دیکھ کر خاموش رہنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ان لوگوں کی جنہوں نے کسی جہاز میں بیٹھنے کے لیے قرعہ اندازی کی۔ کچھ لوگوں کے حصے میں نچلی منزل آئی اور دوسروں کے حصہ میں اوپر کی منزل۔ اب نچلی منزل والے جب پانی لے کر بالائی منزل والوں کے پاس سے گزرتے تو انہیں اس سے تکلیف پہنچتی۔ یہ دیکھ کر نچلی منزل والوں میں سے ایک نے کلہاڑی لی اور جہاز کے پیندے میں سوراخ کرنے لگا۔ بالائی منزل والے اس کے

پاس آئے اور کہا تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے۔اس نے جواب دیا تمہیں ہماری وجہ سے تکلیف پہنچی اور ہمارا پانی کے بغیر گزارا نہیں۔اب اگر اوپر والوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اسے بھی بچالیا اور خود بھی بچ گئے اور اگر اسے چھوڑ دیا تو اسے بھی ہلاک کیا اور اپنے آپ کو بھی ہلاک کیا۔" (بخاری) ایک اور روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص تم میں سے کوئی (اپنے دائرہ اختیار میں) برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ (قوت) سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کرسکے تو زبان سے روکے یہ بھی نہ کرسکے تو دل میں ہی برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" (مسلم، کتاب الایمان باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن میں ان تینوں گروہوں میں سے ایک کے متعلق فرمایا کہ ہم نے برائی سے منع کرنے والوں کو بچالیا اور جو نافرمانی کرنے والے تھے انہیں عذاب میں پکڑ لیا۔رہا درمیان میں تیسرا گروہ جو خود نافرمانی نہیں کرتا تھا اور منع بھی نہ کرتا تھا اس کے لئے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے تو ہمیں بھی سکوت اختیار کرنا چاہیے۔ایک تیسرا قول یہ ہے کہ عذاب دو طرح کے آئے تھے۔ایک بڑا عذاب جس میں دونوں گروہ ماخوذ ہوئے نافرمانی کرنے والے بھی اور برائی سے منع نہ کرنے والے بھی اور دوسرا عذاب بندر بنادینے کا تھا اور وہ حد سے گزرنے والوں کے لیے تھا اس عذاب میں صرف وہی لوگ ماخوذ ہوئے جو نافرمان تھے۔الغرض! اس آیت میں ہم مسلمانوں کیلئے بھی تنبیہ ہے فرمایا کچھ یہودیوں نے 'ہفتہ' کے دن کے احترام سے متعلق حکم الٰہی کی نافرمانی کی اور حیلہ بہانہ سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی صورتیں مسخ کردیں اور وہ بندر بنادیئے گئے، اسی طرح اگر تم قرآن پر ایمان نہ لاؤ تو ہوسکتا ہے کہ ہم تمہاری بھی صورتیں مسخ کردیں کہ تمہارے چہرے سے آنکھ ناک وغیرہ مٹادیئے جائیں اور سر کے پچھلے حصہ کی طرح سپاٹ بنادیا جائے، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ چہرہ کو پیچھے کی طرف کردیا جائے اور پیچھے کا حصہ آگے کی طرف۔

☆☆☆

شرک ناقابل معافی کیوں ہے؟ بنیادی حقیقت اور قرآن کا حکم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِكْ
بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ؕ بَلِ اللّٰہُ
یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْكَذِبَ ؕ
وَكَفٰی بِہٖٓ اِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۵۰﴾

شرک ناقابل معافی جرم

اِنَّ اللّٰہَ	بلاشبہ اللہ	لَا یَغْفِرُ	نہیں بخشے گا
اَنْ یُّشْرَكَ	یہ کہ شرک کیا جائے	بِہٖ	اس کے ساتھ
وَیَغْفِرُ	اور وہ بخش دے گا	مَا دُوْنَ	جو علاوہ ہے
ذٰلِكَ	اس کے	لِمَنْ	جس کے لیے
یَّشَآءُ	چاہے گا	وَمَنْ	اور جو کوئی
یُّشْرِكْ	شریک ٹھہرائے	بِاللّٰہِ	اللہ کے ساتھ
فَقَدِ	تو تحقیق	افْتَرٰٓی	اس نے گھڑا
اِثْمًا	گناہ	عَظِیْمًا ﴿۴۸﴾	بہت بڑا

ان تمام تر خرابیوں کے باوجود یہودی اس دعوے پر مصر تھے کہ وہی صحیح دین پر قائم ہیں۔ وہ اپنے کفر اور شرک کا انکار کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے بطور قانون ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ شرک ایسی قبیح بیماری ہے کہ اس کے لیے بقائمی ہوش وحواس توبہ ضروری ہے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کی تو ایسا شخص ہمیشہ کے لیے عذاب کا مستحق بن گیا۔ البتہ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ شرک کے علاوہ دیگر جس گناہ کو اللہ چاہے اپنی رحمت سے معاف فرمادے، اللہ تعالیٰ نے یہ قانون کے طور پر بتلادیا کہ شرک کے علاوہ جو بھی گناہ کریگا، اس کی معافی کی گنجائش موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو سزا دینے کے بعد معاف کردے یا اپنی رحمت کے ساتھ بغیر سزا دیے بھی معاف کردے مگر جہاں تک شرک جیسے عظیم گناہ کا تعلق اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ انسان موت طاری ہونے سے پہلے پہلے سچے دل سے تائب ہوجائے۔ فرمایا وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اس نے بہت بڑے گناہ کا افتراء کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے قرآن پاک میں شرک کی جگہ جگہ مذمت بیان کی گئی ہے۔

یہاں شرک کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ یہود ونصاریٰ دونوں ہی مشرک تھے۔ اگرچہ دعویٰ توحید کا کرتے تھے اور شرک ہی سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حتمی طور پر وعید سنادی ہے کہ یہ ناقابل معافی جرم ہے۔ شرک اتنا شدید گناہ ہے کہ اس کو ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا۔ شرک کا مطلب ہے اللہ رب العالمین کو معبود مانتے ہوئے کسی اور کو بھی معبود ماننا۔ شرک کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ -1 فرضی دیوی، دیوتا، خیالی تصاویر یا بت کو پوجنا۔ -2 کائنات کی قوتوں کو پوجنا، مثلاً: چاند، سورج، ستارے، ہوا، آگ اور بجلی وغیرہ۔ -3 اللہ کے نیک بندوں، انبیاء اور رسولوں کی پرستش کرنا یا ان کی کسی قبر یا مزار کو پوجنا۔ مثلاً: حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم نے نیک لوگوں کے بت بنائے اور پوجنے لگے جیسا کہ ود، سواع کے نام مشہور ہیں۔ حضرت مسیح (علیہ

السلام) کو اللہ کا بیٹا بنا دیا۔ یہود و نصاریٰ نے اپنے علمائے دین اور مشائخ کو اللہ بنا لیا تھا اور وہ اس طرح کہ ان کی باتوں کو اللہ کی باتوں کا درجہ دیتے تھے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق بعض اپنی خواہشات کے ہی پجاری بن جاتے ہیں، کیونکہ اپنی خواہشات کے سامنے وہ یوں جھک جاتے ہیں کہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اللہ کی گرفت میں ہے علم اور سائنس کی ترقی نے اس بات کو مضبوط ترین کر دیا ہے کہ کائنات کے انتظام کے پیچھے کوئی زبردست طاقت کام کر رہی ہے اور وہ ہے "اللہ" اور جو انسانی عقل سے بعید انسانی نظر سے پوشیدہ اور انسانی پہنچ سے باہر ہے۔ جب ہم انسانی تخلیق اور دنیا کی تمام مخلوقات اور ان کی روزی کے انتظامات پر غور کرتے ہیں تو اللہ کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، پھر بھی جو لوگ زبردستی اپنے آپ کو شرک کی غلاظتوں میں ڈالنا چاہتے ہیں تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اوپر خود بہت بڑا ظلم کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو ان میں نہ یقین ہوتا ہے، نہ مکمل بھروسہ ہوتا ہے اور نہ ہی اعتماد ہوتا ہے۔ توجہ بھی بٹی ہوئی ہوتی ہے اور یقین بھی منتشر ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مشرک انسان خود اپنے آپ کو بے یقینی کے سپرد کر دیتا ہے اور اللہ کے غصہ کا شکار بھی ہوتا ہے کیونکہ اللہ رب العزت نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ شرک ہرگز معاف نہ ہوگا۔ باقی گناہ کسی کسی صورت سے معاف ہو سکتے ہیں۔ لیکن شرک ناقابل معافی گناہ ہے۔ اس آیت میں دراصل دو اعلان ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث سے بھی واضح ہے۔ اور دوسرا اعلان یہ ہے کہ شرک کے علاوہ باقی جتنے بھی گناہ ہیں وہ سب قابل معافی ہیں لہٰذا اے اہل کتاب! اگر اب بھی تم شرک سے باز آجاؤ اور ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر اسلام قبول کر لو تو اللہ تمہارے سب گناہ معاف فرما دے گا۔

مغفرت کی امید پر گناہ کرنا بہت خطرناک ہے

یہ یاد رہے کہ کفر کے علاوہ قیامت کے دن ہر گناہ کے بخشے جانے کا امکان ضرور ہے مگر اس امکان کی امید پر گناہوں میں پڑنا بہت خطرناک ہے بلکہ بعض صورتوں میں گناہ کو ہلکا سمجھنے کی

صورت میں خود کفر ہو جائے گا۔ کتنا کریم ہے وہ خدا عَزَّ وَجَلَّ جو لاکھوں گناہ کرنے والے بندے کو معافی کی امید دلا رہا ہے اور کتنا گھٹیا ہے وہ بندہ جو ایسے کریم کے کرم و رحمت پر دل و جان سے قربان ہو کر اس کی بندگی میں لگنے کی بجائے اس کی نافرمانیوں پر کمر بستہ ہے۔

حضرت وحشی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا قبولِ اسلام:

حضرت عبداللہ بن عباس رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مروی ہے کہ وحشی جس نے حضرت حمزہ رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو شہید کیا تھا وہ سلطانِ دو جہاں صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی: مجھے امان دیجئے تا کہ میں آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے خدا کا کلام سنوں کہ اس میں میری مغفرت اور نجات ہے۔ ارشاد فرمایا: مجھے یہ پسند تھا کہ میری نظر تم پر اس طرح پڑتی کہ تو امان طلب نہ کر رہا ہوتا لیکن اب تو نے امان مانگی ہے تو میں تمہیں امان دیتا ہوں تا کہ تو خدا عَزَّ وَجَلَّ کا کلام سن سکے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ (الفرقان) اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پوجتے۔

وحشی نے کہا: میں شرک میں مبتلا رہا ہوں اور میں نے ناحق خون بھی کیا ہے اور زنا کا بھی مرتکب ہوا ہوں کیا ان گناہوں کے ہوتے حق تعالیٰ مجھے بخش دے گا؟ اس پر سرکارِ رسالت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے خاموشی اختیار فرمائی اور کوئی کلام نہ فرمایا، پھر یہ آیت نازل ہوئی: اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (الفرقان) مگر جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھا کام کرے۔

وحشی نے کہا: اس آیت میں شرط کی گئی ہے کہ گناہوں سے مغفرت اسے حاصل ہوگی جو توبہ کر لے اور نیک عمل کرے، جبکہ میں نیک عمل نہ کر سکا تو میرا کیا ہوگا؟ تب یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء: ۴۸) بیشک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔

اب وحشی نے کہا: اس آیت میں مغفرت مَشِیَّتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، ممکن ہے میں ان لوگوں

میں سے ہوں جن کے ساتھ حق تعالیٰ کی مشیت مغفرت وابستہ نہ ہو، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی :قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (الزمر:۵۳) تم فرماؤ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

یہ آیت سن کر وحشی نے کہا: اب میں کوئی قید اور شرط نہیں دیکھتا اور اسی وقت مسلمان ہو گیا (مدارج النبوہ، قسم سوم، باب ہفتم: ذکر سال ہفتم و فتح مکہ، ۲ / ۳۰۲) مدارج کے علاوہ بقیہ کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ یہ عرض معروض نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی بارگاہ میں نہ ہوئی بلکہ دوسرے ذریعے سے ہوئی۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق شرک (اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا) وہ عظیم اور ناقابل معافی جرم ہے جس کی توبہ کے بغیر موت کی صورت میں آخرت میں کوئی معافی نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل اس آیت میں ارشاد فرماتا ہے کہ وہ اس بات کو ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے، البتہ اس کے علاوہ جو گناہ چاہے، جس کے لیے چاہے معاف کر دیتا ہے۔ شرک کا مطلب اللہ کی ذات، صفات، حاکمیت یا عبادت میں کسی اور کو برابر کا یا اس کا حصار دار ماننا ہے۔ شرک ناقابل معافی کیوں ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، رزق دیا اور بے شمار نعمتیں عطا کیں۔ سب سے بڑا حق یہ تھا کہ اسی کی عبادت کی جائے۔ اس سب سے بڑے حق (حق توحید) کا انکار اور مخلوق کو اس مقام پر فائز کرنا سب سے بڑا ظلم ہے شرک دراصل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے خلاف بغاوت ہے، جو انسان کی عقل اور فطرت کے بھی سراسر خلاف ہے۔ اگر کوئی آدمی کسی گناہ کا ارتکاب کرے چاہے وہ گناہ بڑا ہو یا چھوٹا اور چاہے جان بوجھ کر ہو یا اَن جانے میں، اگر وہ نزع کی حالت سے پہلے پہلے صدقِ دل سے اپنے اس گناہ پر نادم ہو کر توبہ و استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرما دیتے ہیں۔ اگر وہ گناہ بندوں کے حقوق سے متعلق ہو مثلاً کسی کا مال ناجائز طریقہ پر دبایا ہو تو اِس کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ صاحب حق کو اُس کا حق دے دیا جائے، وہ موجود نہیں ہے تو اس کے ورثاء کو دے دیا جائے اور ساتھ میں توبہ بھی کی جائے، یا صاحب حق سے

معافی تلافی کرلی جائے۔اوراگرکوئی شخص کفریاشرک کی حالت میں توبہ کیے بغیر مرجائے تو اس کے لیے معافی نہیں ہے۔زندگی میں اگرکوئی شخص شرک سے سچی توبہ کرلے اور خالص توحید کو اپنالے،تواللہ تمام پچھلے گناہ معاف کردیتاہے۔لیکن جوشخص حالتِ شرک میں ہی دنیاسے گزرجائے، اس کے لیے آخرت میں مغفرت کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

سیدزادہ کون اوروہ کیسا ہوتاہے؟

اَلَمْ تَرَ	کیانہیں آپ نے دیکھا	اِلَی الَّذِیْنَ	ان لوگوں کی طرف جو
یُزَکُّوْنَ	پاک کہتے ہیں	اَنْفُسَھُمْ	اپنے آپ کو؟
بَلِ اللّٰہُ	بلکہ اللہ ہی	یُزَکِّیْ	پاک کرتاہے
مَنْ یَّشَآءُ	جس کو چاہتاہے	وَلَا	اورنہیں
یُظْلَمُوْنَ	وہ ظلم کیے جائیں گے	فَتِیْلًا ﴿۴۹﴾	دھاگے برابر(بھی)

فرمایااَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ط کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جواپنے آپ کو پاک صاف بتاتے ہیں حالانکہ ان میں کفر،شرک اورمعاصی جیسی قبیح بیماریاں موجود ہیں۔یہود ونصاریٰ اپنے آپ کو پیغمبرزادے کہتے تھےاورمحض اس بات پر ہی فخر کرتے تھے۔ان کاعقیدہ تھاکہ ان کےعلاوہ کوئی دوسراشخص جنت میں نہیں جائیگا۔یہ بیماری آج کل کے مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے،وہ پیرزادےاورسیدزادے کہلاتے ہیں بعض نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ اپنے آپ کواعلیٰ خاندان سے منسوب کرناحالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑائی کامعیارنیکی،ایمان اور تقویٰ ہے۔محض ذات پاک کی وجہ سے کسی کو برتری حاصل نہیں ہے۔ابتدائی عہد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ،حضرت عباس رضی اللہ عنہ،حضرت جعفررضی اللہ عنہ،حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کی اولاد اور ان کی نسل کو"سید" کہاجاتاتھا، ان سب پرصدقہ حرام ہے۔لیکن بعدمیں یہ اصطلاح خاص ہوگئی، چناں چہ ہمارے عرف میں"سید" صرف وہ گھرانے ہیں جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہاکے صاحب زادگان حضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہما کی اولاد سے ہوں،ان ہی کالقب"سید" ہے،اوریہ ان

کی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی نسبت کی علامت ہے؛ لہٰذا موجودہ دور میں صرف حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی نسل سے آنے والے گھرانوں کو ''سید'' کہنا چاہیے۔

نسب بدلنے کی وعید

نبی کریم ﷺ کے خاندان یا نسب کی طرف جھوٹی نسبت کرنا اور خود کو بلاتحقیق یا دھوکے سے سید کہلوانا شریعتِ اسلامیہ میں ایک شدید گناہ، حرام اور سخت ترین وعید کا باعث ہے۔ جو شخص جان بوجھ کر اپنے والد یا اصل خاندان کے علاوہ کسی اور کی طرف نسبت کرے (یا خود کو سید ظاہر کرے جو وہ درحقیقت نہیں ہے)، اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی طرف جھوٹی نسبت کرنا عام جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اس سے دین میں بگاڑ اور دھوکہ پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگ معاشرتی رعب، احترام یا کسی دنیوی فائدے کے لیے جھوٹا نسب اختیار کرتے ہیں۔ ایسے جھوٹے اور جعلی افراد کے برے اخلاق یا اعمال کی وجہ سے لوگ نادانستہ طور پر اصل سادات کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہوتے ہیں، سید ہونے کا دارومدار پدری (باپ کی طرف سے) نسب پر ہے جو مستند تاریخ، خاندانی تواتر یا شجرہ نسب سے ثابت ہو۔ صرف ماں کی طرف سے نسبت یا محض دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے۔ جب تک نسب کا ثبوت یا خاندان میں متواتر شہرت نہ ہو، اپنے نام کے ساتھ سید لکھنا جائز نہیں ہے۔ الغرض! فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اپنی تعریف آپ کرتے ہیں اور اس میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ پاک تو اللہ کرتا ہے، جسے چاہے پاک کر دے دوسری جگہ فرمایا فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى اپنی پاکیزگی خود نہ کرنے لگ جاؤ، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ متقی ہے اور کون زیادہ پاک ہے۔ ہر شخص کی بغیر سوچے سمجھے تعریف کرنا درست نہیں ہے تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے یا انبیاء علیہم السلام جیسی معصوم جماعت کی، جن کے متعلق خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے۔ یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے پاک اور برگزیدہ بندے ہیں۔ اللہ نے ان کی تعریف خود وحی الٰہی میں کی ہے مگر کسی چھوٹے بڑے آدمی کی قطعی تعریف بغیر علم کے جائز نہیں

ہے۔فرمایا اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس کے ہاں انصاف ہوگا وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ ایک دھاگے کے برابر بھی کسی پر زیادتی نہیں ہوگی۔فتیل اس چھوٹے سے دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے اسے قطمیر بھی کہتے ہیں۔بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو جتنا عمل کریگا، اس کے مطابق بھگتان کرنا ہوگا،مگر زیادتی کسی کے ساتھ نہیں ہوگی۔

اللہ پر افترا کا مفہوم

اُنْظُرْ	دیکھیے!	كَيْفَ	کیسے
يَفْتَرُوْنَ	وہ گھڑتے ہیں	عَلَى اللّٰهِ	اللہ پر
الْكَذِبَ	جھوٹ	وَكَفٰى بِهٖٓ	اور کافی ہے یہ (افتراء باندھنا)
اِثْمًا	گناہ	مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾	ظاہر

فرمایا اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ فرمایا دیکھو! یہ یہود و نصاریٰ کس طرح اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ان میں ہر برائی موجود ہے مگر پھر بھی کہتے ہیں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ہم نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، ہم اسے (العیاذ باللہ) سچا نبی نہیں سمجھتے۔اللہ نے فرمایا وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہوسکتا ہے۔ان لوگوں میں ہر قسم کی برائی موجود ہے مگر اپنا تقدس ظاہر کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔اس سے بڑھ کر ان کی کیا بدبختی ہو سکتی ہے۔اللہ پر افترا (جھوٹا الزام یا بہتان باندھنا) سب سے بڑا گناہ اور ظلم ہے،جس کا مطلب اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا ہے جو اس نے نہ کہی ہو۔اللہ پر افترا باندھنے والوں کے لیے قرآن میں سخت ترین عذاب اور ناکامی کی وعید سنائی گئی ہے اور انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے میں مانا گیا ہے۔

☆☆☆

جبت اور طاغوت کا مفہوم اور اس کے مصداق/ حسد اور بخل کی مذمت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ
وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۵۱ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۵۲ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ
الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۵۳ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا
عَظِيْمًا ۵۴

اَلْجِبْتِ اور اَلطَّاغُوْت کا معنیٰ و مفہوم

اَلَمْ تَرَ	کیا نہیں آپ نے دیکھا	اِلَى الَّذِيْنَ	ان لوگوں کی طرف جو
اُوْتُوْا	دیے گئے ہیں	نَصِيْبًا	کچھ حصہ
مِّنَ الْكِتٰبِ	کتاب سے	يُؤْمِنُوْنَ	وہ ایمان لاتے ہیں
بِالْجِبْتِ	ساتھ بتوں کے	وَالطَّاغُوْتِ	اور شیطان کے

وَيَقُوْلُوْنَ	اور وہ کہتے ہیں	لِلَّذِيْنَ	ان لوگوں کے لیے جنہوں نے
كَفَرُوْا	کفر کیا	هٰٓؤُلَآءِ	یہی لوگ
اَهْدٰى	زیادہ ہدایت والے ہیں	مِنَ الَّذِيْنَ	ان لوگوں سے جو
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	سَبِيْلًا ۵۱	راستے کے لحاظ سے

فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا۔ظاہر ہے کہ مکمل تورات تو ان کے پاس نہیں ہے۔ ، ان یہودیوں کا حال یہ ہے کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ یہ لوگ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔جبت کا لفظ پورے قرآن پاک میں صرف ایک اسی جگہ استعمال ہوا ہے،البتہ طاغوت کا لفظ مختلف سورتوں میں سات مرتبہ آیا ہے۔الجبت اس کا لغوی معنی ہر وہ چیز ہے جس میں کوئی خیر یا بھلائی نہ ہو۔اس سے مراد جادو، جادوگر، کاہن، بت اور شیطان لیے گئے ہیں۔يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ " کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ (جن کا ذکر آیت میں ہے،یعنی یہود کے بعض علماء یا مشرکین) اللہ کے احکام اور دین حق کو چھوڑ کر باطل طریقوں، جادو، کاہنوں کی باتوں اور بت پرستی کی تصدیق کرتے ہیں اور ان پر بھروسہ کرتے ہیں۔عام مفسرین جبت کا معنی بت اور طاغوت کا معنی شیطان کرتے ہیں لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ یہودی بتوں اور شیطان کے پجاری ہیں۔کعب بن اشرف اور اس کے ساتھ مزید ستر یہودی مشرکین مکہ کے پاس پہنچے اور انہیں حضورِ اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔قریش بولے کہ ہمیں خطرہ ہے کہ تم بھی کتابی ہو اور ان سے قریب تر ہو۔اگر ہم نے ان سے جنگ کی اور تم ان سے مل گئے تو ہم کیا کریں گے؟ اگر ہمیں اطمینان دلانا ہو تو ہمارے بتوں کو سجدہ کرو،ان بدنصیبوں نے سجدہ کرلیا۔ابوسفیان نے کہا کہ بتاؤ ہم ٹھیک راستہ پر ہیں یا محمد (صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم)؟ کعب بن اشرف نے کہا کہ تم ٹھیک راہ پر ہو۔اس پر یہ آیت اتری۔(تفسیر کبیر،النساء،تحت الآیۃ:۵۱، ۴/ ۱۰۱،خازن، النساء،تحت الآیۃ:۵۱، ۱/ ۳۹۲،ملتقطاً) اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی کہ انہوں نے حضور تاجدارِ رسالت صَلَّی اللہُ

تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی عداوت میں مشرکین کے بتوں تک کو پوجا۔طاغوت یہ ''طَغٰی'' سے بنا ہے جس کا معنیٰ ہے ''سرکشی''۔جو رب عَزَّ وَجَلَّ سے سرکش ہو اور دوسروں کو سرکش بنائے وہ طاغوت ہے خواہ شیطان ہو یا انسان۔قرآنِ کریم نے سرداران کفر کو بھی طاغوت کہا ہے۔چونکہ طاغوت کے لفظ میں سرکشی کا مادہ موجود ہے اس لئے مُقرَّبین بارگاہِ الٰہی کیلئے یہ لفظ ہرگز استعمال نہیں ہوسکتا بلکہ جو اُن کیلئے یہ لفظ استعمال کرے وہ خود ''طاغوت'' ہے۔طاغوت کا لغوی معنیٰ حد سے بڑھ جانا اور سرکشی کرنا ہے، جبکہ اصطلاحِ شریعت میں ہر وہ شخص یا چیز طاغوت ہے جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے اور اللہ کے سوا کسی اور کی پوجا، پیروی یا اطاعت کی جائے۔اسلام کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لایا جائے اور ہر قسم کے طاغوت کا انکار (کفر) کیا جائے۔جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی کی باتوں سے واضح ہو چکی ہے، جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط سہارا پکڑ لیا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا، دیکھو! یہ اہل علم کا حال ہے کہ طاغوت اور جبت پر یقین رکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے سچے نبی کی مخالفت کر رہے ہیں۔مشرکین کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رکھا ہے وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا اور کافروں کے حق میں کہتے ہیں ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ﴿۵۱﴾ کہ اہل ایمان کی نسبت یہ زیادہ راہ راست پر ہیں، یعنی مکہ کے کافروں اور مشرکوں کا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے۔یہ کعب بن اشرف والے واقعہ کی طرف ہی اشارہ ہے کہ اس نے مشرکین کے استفسار پر بتایا تھا کہ تمہارا دین محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے طریقے سے اچھا ہے۔حالانکہ حقیقت ان یہودیوں کو بھی پوری طرح معلوم تھی کہ شرک اللہ کے ہاں ناقابل معافی جرم ہے اور مسلمان موحد ہونے کی بنا پر مشرکوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔الغرض! طاغوت لغت کے اعتبار سے لفظ طغیان سے نکلا ہوا کلمہ ہے اس کا معنیٰ حد سے بڑھ جانا اور سرکشی کرنا ہے، آئمہ اہل سنت والجماعت کی تفسیروں کے مطابق طاغوت کا اطلاق ہر جھوٹے معبود اور شیاطین پر ہوتا ہے یعنی طاغوت اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس بت یا شیطان کو کہا جاتا ہے جس کی معبود برحق کے علاوہ عبادت اور پیروی کی جائے، بایں معنیٰ ایمان کیلئے طاغوت پر رد اور اس کا انکار لازم

اور شرط ہے۔ یہ مفہوم کلمہ طیبہ لاالہ اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے ہوئے ادا ہو جاتا ہے۔ جس انسان کو کلمہ اسلام یا کلمہ شہادت پڑھوایا جائے اس کو اس کا مفہوم بھی سمجھایا جائے اور اگر کسی غیر مسلم کو مشرف با اسلام کیا جا رہا ہو تو اس کی اپنی زبان میں اس کے سابقہ معبودان باطلہ سے برأت کا اظہار کرایا جائے ان معبودوں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر بھی واضح کیا جائے کہ وہ معبود اللہ کی مخلوق ہے، اللہ کے کاموں اور تصرفات میں شریک و ساجھی یا عبادت کے لائق نہیں ہے۔ غیر اللہ کا قانون نافذ کرنے والے حکمران اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور باغی ضرور ہیں مگر طاغوت کے اصطلاحی مفہوم کا ان پر اطلاق مشکل ہے البتہ لغوی مفہوم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی عدولی کرنے والے سارے لوگ خواہ وہ حکمران ہو یا رعایا سب کے سب طاغوت کا مصداق بن سکتے ہیں گو کہ اس درجہ میں بھی حکمران، عام رعایا سے زیادہ ذمہ دار ہونے کی وجہ سے اعلیٰ درجے پر فائز شمار ہوں گے۔

لعنت کا مفہوم اور حکم

اُولٰٓئِكَ	یہ لوگ	الَّذِيْنَ	وہ ہیں کہ
لَعَنَهُمُ اللّٰهُ	لعنت کی ان پر اللہ نے	وَمَنْ	اور جس پر
يَّلْعَنِ اللّٰهُ	لعنت کرے اللہ	فَلَنْ تَجِدَ	تو ہرگز نہیں پائیں گے آپ
لَهٗ	اس کے لیے	نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾	کوئی مددگار

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے، اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ لعنت کا لفظی معنی بُعد ہوتا ہے اور اصطلاحاً اسے اللہ کی رحمت سے دوری پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ جب کافر کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا شخص اللہ کی رحمت سے ابدی طور پر دور یعنی محروم ہو گیا اور سزا کا مستحق ٹھہرا جیسے سورہ بقرہ میں کفار کے متعلق آیا ہے اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ ایسے لوگوں پر اللہ کی اس کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ البتہ جب لعنت کا لفظ گنہگار مومن کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سزا کا مستحق ٹھہرا اگرچہ

ابدی طور پر نہیں مگر گناہ کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخلہ مل جائیگا بہر حال ایسے شخص کا درجہ کم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سے بُرے کاموں پر لعنت کا لفظ استعمال کیا ہے جیسے "اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ" یعنی ظلم کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہو۔ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ کسی شخص معین پر اس وقت تک لعنت کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ اس کے متعلق صریحاً علم نہ ہو کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے۔ لعنت ایک بد دعا ہے لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دور ہونے اور محروم ہونے کے ہیں جب کوئی کسی پر لعنت کرتا ہے تو گویا وہ اس کے حق میں بدعا کرتا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاؤ رسول کریم ﷺ نے کسی پر لعنت کرنے کو بڑی سختی سے منع کیا فرمایا ہے یہاں تک کہ بے جان چیزوں پر بھی لعنت کرنے سے منع کیا فرمایا ہے لعنت اور ناشکری جہنم میں جانے کا باعث بن سکتے ہیں جیسے کہ نبی ﷺ نے فرمایا اے عورتو! صدقہ کیا کرو میں نے جہنم میں دیکھا کہ عورتوں کی تعداد زیادہ ہے عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور اپنے شوہر کی ناشکری کرتی ہو احادیث مبارک میں لعن طعن کرنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے، حضرت سمرہ بن جندب رضی عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آپس میں ایک دوسرے پر اللہ کی لعنت، غضب اور دوزخ کی پھٹکار نہ بھیجو" اسی طرح حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "طعن کرنے والا، کسی پر لعنت بھیجنے والا، فحش گوئی کرنے والا اور بدتمیزی کرنے والا مومن نہیں ہے۔ (یعنی مسلمان کی یہ صفت نہیں ہے)۔" چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کو عام کر دیا ہے دنیا میں تو کافر مسلمان، دوست اور دشمن سب کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت عام ہے، پس مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ لعنت سے بد دعا دینے کی عادت بنالے اور متعینہ افراد کو لعنت سے بدعا دینے لگے اور یہ ممنوعیت خاص اور معین اشخاص کے اعتبار سے ہے، پس عام اوصافِ مذمومہ سے لعنت بھیجنا جائز ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ یا جس کافر کے بارے میں یقین ہو کہ کفر پر اس کو موت آئی ہے، اس پر نام لے کر متعینہ طور پر بھی لعنت بھیجنا جائز ہے، جیسے فرعون اور ابو جہل

وغیرہ۔ایک شخص واقعی کافر ہے، مگر کیا معلوم کہ مرنے سے پہلے وہ ایمان اختیار کرلے،لہٰذا اس پر بھی لعنت درست نہیں جب تک کہ اس کا خاتمہ علی الکفر نہ ہوجائے۔البتہ بعض افعال پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے جیسے حضور ﷺ نے فرمایا لَعَنَ اللّٰہُ السَّارِقَ اللہ چور پر لعنت کرے۔ لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ، جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔بہرحال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر ان کے افعال قبیحہ کی وجہ سے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کردے، وہ ذلیل وخوار ہوکر رہے گا اور اس کا کوئی حامی وناصر نہیں ہوگا۔یہودی ایسے خبیث لوگ ہیں جو اپنی نفسانی اغراض، ضد اور عناد کی وجہ سے اسلام کو باطل اور کفر کو حق قرار دیتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ذلیل وخوار کرے گا اور وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔

اختیار کی نفی

اَمْ لَھُمْ	کیا ان کے لیے	نَصِیْبٌ	کچھ حصہ ہے
مِّنَ الْمُلْکِ	بادشاہی سے	فَاِذًا	تب تو
لَّا یُؤْتُوْنَ	نہیں وہ دیں گے	النَّاسَ	لوگوں کو
نَقِیْرًا ﴿۵۳﴾		تل برابر (بھی)	

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے متعلق فرمایا اَمْ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّنَ الْمُلْکِ کیا ان کا خدائی خدائی میں کچھ حصہ ہے، کیا انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دے دیں۔ ہرگز نہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہت میں کوئی حصہ عطا نہیں کیا اور نہ انہیں کوئی اختیار دیا ہے البتہ اگر ان کے پاس کوئی اختیار بھی ہوتا فَاِذًا لَّا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا ﴿۵۳﴾ اگر کوئی چیز ان کے پاس ہوتی بھی تو یہ اس قدر بخیل واقع ہوئے ہیں کہ کسی کو ایک تل بھی نہ دیتے۔کھجور کی گٹھلی میں جو شگاف ہوتا ہے، عربی زبان میں اس کو 'نقیر' کہتے ہیں، عربی زبان میں یہ لفظ معمولی اور حقیر مقدار کو بتانے کے لئے بولا جاتا ہے، اُردو زبان میں چوں کہ معمولی مقدار کے لئے 'تل' اور 'رائی' وغیرہ کا لفظ بولا جاتا ہے، اس لئے شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے تل برابر سے ترجمہ فرمایا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کے بخل کا ذکر فرمایا ہے قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اے پیغمبر (علیہ السلام)! آپ ان سے فرمادیں کہ اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانے بھی ہوتے اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ تو تم انہیں خرچ ہونے کے خوف سے روک رکھتے وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا کیونکہ انسان تنگ دل واقع ہوا ہے یہاں پر بھی فرمایا کہ اگر خدا کی بادشاہ میں بہت کچھ حصہ ہوتا تو تم کسی کو ایک تل کے برابر یعنی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی دینے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

بخل اور حسد دونوں انتہائی تباہ کن باطنی اور اخلاقی بیماریاں

اَمْ يَحْسُدُوْنَ	کیا وہ حسد کرتے ہیں	النَّاسَ	لوگوں سے
عَلٰى مَآ	اس پر جو	اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ	اللہ نے ان کو دیا
مِنْ فَضْلِهٖ	اپنے فضل سے	فَقَدْ اٰتَيْنَآ	پس تحقیق ہم نے دی
اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ	آل ابراہیم کو	الْكِتٰبَ	کتاب
وَالْحِكْمَةَ	اور حکمت	وَاٰتَيْنٰهُمْ	اور ہم نے دی ان کو
مُّلْكًا	بادشاہی	عَظِيْمًا ⑤④	بہت بڑی

ارشاد فرمایا: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ یہ لوگوں سے اس بنا پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنا فضل (کیوں) عطا فرمایا ہے؟ أم" (یا) "بل" کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے یعنی بلکہ یہ اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر دوسروں میں نبی (یعنی آخری نبی) کیوں بنایا؟ نبوت اللہ کا سب سے بڑا فضل ہے۔ اس آیت میں ان کے بخل اور حسد کو بیان فرمایا۔ بخل تو یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے کسی کو دی ہو دوسروں سے اسے روک لینا اور حسد یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو دی ہے اس پر جلے بھنے اور آرزو کرے کہ اس سے چھن جائے، پھر خواہ مجھے ملے یا نہ ملے۔ پس حسد اور بخل دونوں میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ دوسروں سے نعمت کو روکنا اور یہ گوارا نہ کرنا کہ اپنی ذات کے سوا دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ (رازی۔ قرطبی) فرمایا: فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ⑤④ سو ہم نے تو ابراہیم کے خاندان کو کتاب اور حکمت عطا کی تھی اور انہیں بڑی سلطنت

دی تھی؟ اس آیت میں یہودیوں کے اصل مرض کو بیان فرمایا کہ حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو جو نبوت عطا فرمائی اور ان کے ساتھ ان کے غلاموں کو جو نصرت، غلبہ، عزت وغیرہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان پر یہ لوگ نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اور اہلِ ایمان سے حسد کرتے ہیں حالانکہ یہودیوں کا یہ فعل سراسر جہالت وحماقت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی اولاد پر فضل فرمایا تھا کہ کسی کو کتاب عطا فرمائی، کسی کو نبوت اور کسی کو حکومت اور کسی کو کئی کئی چیزیں جیسے حضرت یوسف، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو نوازا تو پھر اگر اللہ عَزَّوَجَلَّ اپنے حبیب، امام الانبیاء، سیدُ المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو اپنے کرم سے کتاب اور نبوت ورسالت عطا فرماتا ہے تو اے یہودیو! تم اس سے کیوں جلتے اور حسد کرتے ہو؟ یہودیوں کو جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی ہونے کا پورا پورا یقین تھا؛ لیکن عرب جو بنو اسماعیل تھے، ان کے بارے میں وہ حسد میں مبتلا تھے کہ نبوت اس خاندان میں کیوں چلی گئی؟ قرآن مجید نے اسی کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور حکومت کا وعدہ ابراہیم کی اولاد کے لئے فرمایا تھا اور اولاد ابراہیم میں بنو اسحاق بھی ہیں اور بنو اسماعیل بھی؛ اس لئے اس میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں، آیت میں 'فضل' سے شرفِ نبوت ہی مراد ہے، (تفسیر طبری: ۲/ ۴۸۴) قرآن مجید نے دوسرے موقع پر بھی نبوت کو اللہ تعالیٰ کا فضل خاص قرار دیا ہے۔ (آلِ عمران: ۷۳)

بخل اور حسد دونوں انتہائی تباہ کن باطنی اور اخلاقی بیماریاں ہیں جو انسان کے معاشرتی سکون اور آخرت کو برباد کر دیتی ہیں۔ بخل (کنجوسی) بخل کا مطلب ہے انسان کے پاس جو مال و دولت یا نعمتیں ہوں، انہیں اپنے پاس روک کر رکھنا، اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا، اور یہاں تک کہ اپنے اہل وعیال پر بھی حق کے مطابق خرچ کرنے سے گریز کرنا۔ اسلام میں بخل کو ایک مذموم صفت قرار دیا گیا ہے۔ احادیث کے مطابق بخل انسان کو اللہ کی رحمت سے دور اور جہنم کے قریب کرتا ہے۔ بخیل شخص معاشرے کا ایک غیر مفید اور ناپسندیدہ فرد بن جاتا ہے۔ بخل کی وجہ سے رشتہ داروں، غریبوں اور محتاجوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور معاشرے میں دولت چند ہاتھوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

حسد سے مراد کسی دوسرے شخص کے پاس اللہ کی دی ہوئی کوئی نعمت یا کامیابی دیکھ کر دل میں جلن محسوس کرنا اور یہ تمنا کرنا کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے۔ کسی کی اچھی حالت دیکھ کر خود ویسا

بننے کی آرزو کرنا (بغیر اس کی نعمت کے زوال کی خواہش کے) رشک کہلاتا ہے جو جائز ہے، جبکہ حسد سراسر منفی اور گناہ کا جذبہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے"۔ حسد کرنے والا دراصل اللہ کی تقسیم پر اعتراض کرتا ہے اور اندرونی بے سکونی کا شکار رہتا ہے حسد کی وجہ سے انسان کے دل میں اپنوں اور دوستوں کے لیے کینہ، بغض اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، جو معاشرتی اتحاد اور بھائی چارے کو ختم کر دیتا ہے، اللہ ہمیں ان تباہ کن بیماریوں سے بچائے آمین

☆☆☆

یہود کی طرف سے مخالفت/کفار کے لیے جہنم کی سزا اور مومنوں کے لیے انعامات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝۵۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۵۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝۵۷

یہود و نصاریٰ کی اسلام کے خلاف سازشیں

فَمِنْهُمْ	چنانچہ بعض ان میں سے	مَّنْ	وہ ہیں جو
اٰمَنَ	ایمان لائے	بِهٖ	اس کیساتھ
وَمِنْهُمْ	اور بعض ان میں سے	مَّنْ	وہ ہیں جو۔
صَدَّ عَنْهُ	رکے رہے اس سے	وَ كَفٰى	اور کافی ہے
بِجَهَنَّمَ	جہنم	سَعِيْرًا ۝۵۵	دہکتی ہوئی

فرمایا یہودی سارے کے سارے ایک جیسے نہیں بلکہ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ ان میں سے بعض

ایمان لا چکے ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ مدینہ کے دس بڑے بڑے یہودی علما میں سے آپ واحد شخص ہیں جنہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ باقی سب مخالفت پر اڑے رہے حضور ﷺ نے فرمایا اگر یہ دس آدمی ایمان لے آتے، تو روئے زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا سب ایمان لے آتے۔ یعنی بنو اسرائیل کو، جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ذریت اور آل میں سے ہیں، ہم نے نبوت بھی دی اور بڑی سلطنت و بادشاہی بھی۔ پھر بھی یہود کے یہ سارے لوگ ان پر ایمان نہیں لائے۔ کچھ ایمان لائے اور کچھ نے اعراض کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اے محمد! (ﷺ) اگر یہ آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ان کی تو تاریخ ہی نبیوں کی تکذیب سے بھری ہوئی ہے حتیٰ کہ اپنی نسل کے نبیوں پر بھی یہ ایمان نہیں لائے۔ بعض نے "اٰمَنَ بِہٖ" میں "ھا" کا مرجع نبی (ﷺ) کو بتلایا ہے یعنی ان یہود میں سے کچھ نبی (ﷺ) پر ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا۔ ان منکرین نبوت کا انجام جہنم ہے۔ بہر حال ان میں سے بعض ایمان لائے وَمِنْھُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْہُ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ایمان لانے سے روکتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اَکْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ حاسد، باغی، ضدی اور الٹے دماغ والے ہیں۔ دین سے روکنے میں یہود و نصاریٰ سب سے آگے ہیں۔ یہ ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمان کو انکے دین سے برگشتہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی تمام تر توانائیاں اور مال و دولت خرچ کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے متعلق شک میں پڑ جائیں۔ یہود و نصاریٰ پہلے دن ہی سے دین اسلام سے حسد کرتے چلے آرہے ہیں۔ دونوں قوموں کو شروع سے "اہلِ کتاب" ہونے کا زعم تھا۔ یہود بنی اسرائیل میں آخری نبی کی آرزو لیے بیٹھے تھے۔ لیکن بنی اسماعیل میں آخری نبی کے ظہور نے انہیں اسلام کا بدترین دشمن بنا دیا۔ مدینہ میں انہوں نے غزوہ خندق میں معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں مدینہ سے نکال دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی سازشوں کی وجہ سے انہیں آخر جزیرۃ العرب سے ہی نکال باہر کیا۔

آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنے محبوب ﷺ کا جملہ اچھی طرح یاد ہے ”یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔(ابو داود:2635)ان دونوں قوموں نے مسلسل اپنی سازشیں جاری رکھیں اور مسلمانوں کو بڑا نقصان پہچانے کی کوششوں میں رہے اور مسلمانوں کو ان سے بعد میں بہت سی جنگیں لڑنی پڑیں۔ان کے ان سب تخریبی کاموں کے باوجود مسلم اقوام میں کبھی تذبذب،اضطراب اور جذبہ شکستگی کا احساس تک نہ پیدا ہوا،بلکہ انہوں نے ہر میدان میں ثابت قدمی کا ثبوت پیش کیا،اور ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا آج عالم اسلام ہر طرح کے وسائل ہونے کے باوجود کس طرح تنزلی اور محکومی کی زندگی گزار رہا ہے۔ہم مسلمانوں کے دلوں میں پہلے جیسا جذبہ ایمان باقی نہیں رہا۔ قرون اولیٰ میں اگر کوئی مسلمان دین سے پھر جاتا تھا تو تمام اہل اسلام پر قیامت ٹوٹ پڑتی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ایک آدمی کے مرتد ہونے سے ان کی ساری دنیا تباہ ہوگئی ہے۔مگر آج لوگ کس تعداد میں عیسائی اور مرزائی ہو رہے ہیں مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے دین حق سے روکنے والوں کے متعلق فرمایا وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ انکے لیے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے وہ لوگ بچ نہیں سکتے،آخر پکڑے جائیں گے۔

عذاب کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے کھالوں کی تبدیلی

اِنَّ الَّذِیْنَ	بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا
بِاٰیٰتِنَا	ہماری آیات کا	سَوْفَ	عنقریب
نُصْلِیْهِمْ	ہم انہیں داخل کریں گے	نَارًا	آگ میں
كُلَّمَا	جب بھی	نَضِجَتْ	جل جائیں گی

جُلُوْدُهُمْ	ان کی کھالیں	بَدَّلْنٰهُمْ	(تو) ہم بدل دیں گے ان کی

جُلُوْدًا	کھالیں	غَيْرَهَا	انکے علاوہ
لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ	تاکہ وہ چکھیں عذاب	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	یقیناً اللہ ہے
عَزِيْزًا	نہایت غالب	حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾	خوب حکمت والا

فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کا شیوہ اختیار کیا سَوْفَ نُصْلِیْھِمْ نَارًا عنقریب ہم انہیں جہنم کی آگ میں داخل کریں گے۔ کفار میں یہودی، نصرانی اور مشرکین سب شامل ہیں فرمایا انہیں ایسی مسلسل سزا دی جائے گی کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ آگ میں جا کر جب انکے جسموں کی کھالیں جل جائیں گی بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا ہم ان کی کھالیں تبدیل کر دیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک دفعہ جل جانے سے ان کا کام ختم نہیں ہو جائیگا بلکہ ایک کھال جلنے کے بعد دوسری کھال پہنا دی جائیگی، وہ بھی جل جائیگی تو اور دے دی جائیگی اور یہ سزا ہمیشہ جاری رہیگی۔ کھال جل جانے کے بعد درد کا احساس کم ہو جاتا ہے کیونکہ حسی اعصاب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے نئی کھال عطا کی جاتی ہے تا کہ عذاب کی شدت اور تسلسل ہمیشہ برقرار رہے۔۔ جدید میڈیکل تحقیق یہ ہے کہ انسان کے جسم کو جو تکلیف پہنچتی ہے، اس کو محسوس کرنے کی صلاحیت اصل میں جسم کے چمڑوں میں ہوتی ہے نہ کہ گوشت میں، اس پس منظر میں قرآن کریم کی یہ آیت ایمان کو تازہ کرتی ہے کہ یہاں عذاب کو چکھنے اور تکلیف کو محسوس کرنے کی نسبت چمڑوں ہی کی طرف کی گئی ہے اگرچہ قرآن کا اصل موضوع انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی ہے لیکن جہاں کہیں اس نے کائنات کی کسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، حیرت انگیز طور پر وہ اس کے مطابق ہے، جہاں سائنسداں علم و تحقیق کا طویل سفر کر کے پہنچے ہیں۔ اس آیت میں خاص حکمت کی بات یہ بیان کی گئی ہے جو کہ فرانس کے مشہور سائنسدان اور سرجن ڈاکٹر مورس بوکائے نے اپنی کتاب "بائبل قرآن اور سائنس" میں وضاحت سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: جب میں نے یہ آیت پڑھی تو میں پھڑک اٹھا کہ قرآن مجید نے ڈیڑھ ہزار سال قبل ہی ایک ایسی بات کہی ہے جس کا ہمیں آج پتہ چل رہا ہے۔ میں ایک سرجن ہوں جانتا ہوں کہ جسم میں جب سوئی چبھوئی جاتی ہے تو درد صرف جلد تک رہتا ہے، جلد سے آگے نہیں جاتا یعنی جسم کی کھال پورے کا پورا ایک دفاعی نظام ہے یعنی اگر ہمارے جسم میں کوئی اجنبی چیز باہر سے داخل ہونا چاہے تو جسم درد کے ذریعے ہمیں فوراً اطلاع کر دیتا ہے۔ قرآن مجید یہ بات ڈیڑھ ہزار سال پہلے کہہ چکا ہے کہ درد اور تکلیف صرف جلد میں ہوتا ہے۔ یہاں

اللہ جل شانہ نے بڑی وضاحت سے کہہ دیا ہے کہ جس قدر بڑا جرم ہوگا اسی قدر بڑی سزا دی جائے گی ابتداء میں تو ہر جہنمی کی شکل وصورت آدمی کی ہوگی مگر جہنم میں جا کر جسم بہت بڑا ہو جائیگا۔ اور جسم جتنا بڑا ہوگا اسے گرمی، سردی وغیرہ کا اتنا ہی زیادہ احساس ہوگا۔ فرمایا ہم آگ کی یہ سزا دیں گے لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ تا کہ وہ عذاب چکھیں۔ اس وقت وہ حسرت و یاس کا اظہار کریں گے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا کیوں انکار کیا اور کیوں لوگوں کو گمراہ کرتے رہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۵۶ بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے اور وہ مجوزہ سزا دینے پر قادر ہے۔ وہ حکیم بھی ہے کہ اپنی حکمت کے ساتھ کافروں کو مقررہ وقت پر ضرور سزا دیگا۔

مومنوں کیلئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے انعامات

وَالَّذِيْنَ	اور وہ لوگ جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے
وَعَمِلُوا	اور انہوں نے عمل کیے	الصّٰلِحٰتِ	نیک
سَنُدْخِلُهُمْ	عنقریب ہم انہیں داخل کریں گے	جَنّٰتٍ	ایسے باغات میں
تَجْرِيْ	(کہ) بہتی ہیں	مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے سے
الْاَنْهٰرُ	نہریں	خٰلِدِيْنَ	وہ ہمیشہ رہیں گے
فِيْهَآ اَبَدًا	ان میں ابد تک	لَهُمْ	ان کے لیے
فِيْهَآ	ان میں	اَزْوَاجٌ	بیویاں ہیں
مُّطَهَّرَةٌ	پاک صاف	وَّنُدْخِلُهُمْ	اور ہم انہیں داخل کریں گے
ظِلًّا	سائے	ظَلِيْلًا ۵۷	بہت گھنے

فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور روز جزا پر ایمان لائے۔ نبیوں کی تصدیق کی اور آیات الٰہی کو سچا تسلیم کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نیک اعمال بھی انجام دیے شیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر اعمال صالحہ چار ہیں یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ جو شخص ان کو انجام دیگا وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہو جائیگا۔ باقی اعمال انہی چار اعمال کے

تابع ہیں۔فرمایا جو نیک اعمال انجام دیں گے سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ عنقریب ہم انہیں باغوں میں داخل کریں گے ایسے باغات تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ مومنین کا وہاں قیام کسی خاص مدت کے لیے نہیں ہوگا بلکہ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔انہیں وہاں ہر طرح کی رہائشی سہولت حاصل ہوگی اور تمام نعمتیں میسر ہوں گی۔فرمایا جنت میں مومن تنہائی بھی محسوس نہیں کریں گے کیونکہ لَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وہاں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔جو ان کی طبعی خواہش کو پورا کریں گی اور پاکیزہ بھی ایسی کہ نہ بول و براز کی حاجت نہ حیض کی نجاست اور نہ ہی کوئی اور الائش۔معنوی طور پر بھی پاکیزہ ہوں گی کہ خوش شکل وصورت ،خوش اطوار اور خوش اخلاق ہوں گی،تمام اخلاقِ حسنہ مُطَهَّرَةٌ میں شامل ہیں۔اچھی بیوی تو اس دنیا میں سعادت سمجھی جاتی ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو اچھا مکان،اچھی سواری اور اچھی بیوی میسر آگئی تو یہ دنیاوی اعتبار سے سعادت کی نشانی ہے۔اور اگر بیوی دین کے معاملات میں تعاون کرنے والی ہو تو یہ مزید باعث راحت ہے۔بہر حال اللہ نے فرمایا کہ جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے جنت میں مومنوں کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔جو ہر قسم کی آلائش سے پاک اور خوش کرنیوالی ہوں گی۔مکان،لباس،خوراک،بیوی،نیک لوگوں کی رفاقت وغیرہ مادی نعمتوں کا عروج ہے مگر پھر بھی دنیا میں ایسی نعمت کوئی نہیں جو کدورت سے خالی ہو۔اگر ہر قسم کی نعمتیں میسر ہوں،پھر بھی بقول شیخ سعدی رحمہ اللہ یہ کھٹکا تو لگا رہتا ہے ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور یہ سب کچھ ختم ہونا ہے مگر جنت کے متعلق فرمایا کہ وہاں کی نعمتیں ابدی ہوں گی جو کبھی ختم نہ ہوں گی اور پھر فرمایا وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا ۵۷ ہم داخل کریں گے مومنوں کو گھنے سایہ میں۔اور یہ سایہ مومن کے لیے باعث راحت ہوگا۔ اگرچہ سایہ کا احساس دھوپ کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔مگر بعض اوقات محض سایہ بھی باعث تسکین ہوتا ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انعام کے طور پر گھنے سائے کا تذکرہ فرمایا۔مختصر یہ کہ مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام جنت اور اس کی لامتناہی نعمتیں ہیں۔قرآن واحادیث کے مطابق ایمان اور نیک اعمال کرنے والوں کے لیے درج ذیل انعامات ہیں:مومنین کے لیے ایسے باغات ہیں جن

کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا اور مومنوں کو اپنا دیدار نصیب کرنا سب سے عظیم انعام ہے۔ گناہوں کی بخشش اور نیک اعمال کا بہترین بدلہ۔ سکون اور اطمینان: دنیا اور آخرت میں قلبی سکون اور فرشتوں کی بشارت۔ غرض وہاں کوئی پریشانی اور دقت پیش نہ آئے گی اور یہ آرام دہ زندگی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہوگی اللہ ہم سب کو نصیب کرے۔ آمین۔

☆☆☆

امانت ایک شرعی وانسانی فریضہ/ نظام حکومت کی ضروریات اور اسلامی مملکت کی خصوصیات!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۵۸

امانت کا وسیع مفہوم

اِنَّ اللّٰہَ	بلاشبہ اللہ	یَاْمُرُکُمْ	تمہیں حکم دیتا ہے
اَنْ تُؤَدُّوا	یہ کہ تم ادا کرو	الْاَمٰنٰتِ	امانتیں
اِلٰٓی اَھْلِھَا	ان کے اہل کو	وَاِذَا حَکَمْتُمْ	اور جب تم فیصلہ کرو
بَیْنَ النَّاسِ	لوگوں کے درمیان	اَنْ تَحْکُمُوْا	یہ کہ تم فیصلہ کرو
بِالْعَدْلِ	انصاف کے ساتھ	اِنَّ اللّٰہَ	بلاشبہ اللہ
نِعِمَّا	بہت ہی اچھی بات ہے وہ	یَعِظُکُمْ	(کہ) نصیحت کرتا ہے تمہیں
بِہٖ	اس کیساتھ	اِنَّ اللّٰہَ کَانَ	بیشک اللہ ہے
سَمِیْعًۢا	خوب سننے والا	بَصِیْرًا ۵۸	خوب دیکھنے والا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے اَنْ تُؤَدُّوا

الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا کہ امانت اس شخص کے سپرد کرو، جو اس کا اہل ہے۔ یہ عمومی حکم ہے اور اس میں کسی فرد یا جماعت کو خصوصیت حاصل نہیں یہ آیت افراد اور حکومت دونوں کے لیے واجب التعمیل ہے۔ صاحب تفسیر خازن فرماتے ہیں کہ اس آیت کا اطلاق حکومت اور عوام دونوں طبقوں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس گاؤں، قصبے یا شہر میں لوگ اکٹھے رہتے ہوں اور ان کے مفادات مشترکہ ہوں وہاں ان کے درمیان تنازعات کا پیدا ہو جانا بھی عین ممکن ہے اگر دو افراد کے درمیان لین دین کا معاملہ ہو تو انہیں بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے اپنے حقوق فرائض کی پابندی کریں اور جو فرد جس چیز کا اہل ہے، اسے اس کی امانت ادا کی جائے۔ اور ایک دوسرے کے درمیان عدل و انصاف کی فضا قائم کی جائے۔ افراد سے بڑھ کر یہی چیزیں جب حکومت کی سطح پر پیدا ہوں تو صالحہ حکومت کا بھی فرض ہے کہ رعایا میں سے جو شخص جس کام کا اہل ہے، وہی کام اس کے سپرد کیا جائے۔ نیز یہ کہ جب افراد کے تنازعات فیصلہ کے لیے حکومت تک پہنچیں تو پھر حکام پر لازم آتا ہے کہ ہر شخص سے انصاف کیا جائے۔ رشوت، سفارش، اقربا پروری اور جانبداری کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی حکومت یعنی صالح حکومت صالحہ جماعت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور صالحہ جماعت یا قوم وہ ہوتی ہے جس کے افراد کا اعتقاد، عمل اور اخلاق صالح ہو۔ حکومت کی ضروریات کی دو بنیادی چیزیں امانت اور عدل ہیں اگر حکومت کے افسر، حکام یا عمال امین اور عادل ہوں گے، تو نظام حکومت صحیح رخ پر گامزن ہوگا، لوگوں کو ان کے حقوق اور عدل و انصاف حاصل ہوگا۔ ملک میں امن و امان قائم ہوگا اور لوگ چین کی زندگی بسر کریں گے۔ برخلاف اس کے اگر کارپردازانِ حکومت خائن اور ناانصاف ہوں گے تو حکومت کا نظام درست طریقے سے نہیں چل سکے گا، ملک میں بدامنی کی فضا پیدا ہوگی لوگوں کے حقوق ضائع ہوں گے اور رعایا امن و چین کی زندگی سے محروم ہو جائے گی۔ یہود امانت میں خیانت کرتے اور فیصلہ میں رشوت لے کر ظلم و جور کرتے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان باتوں سے دور رہنے کا حکم دیا۔ یہاں امانت سے مراد ہر قسم کی امانت ہے، اس کا تعلق مذہب و دیانت سے ہو یا دنیاوی معاملات سے، لیکن یہود حق کو چھپا کر

علمی امانت میں خیانت کے مرتکب بھی تھے۔امانت میں صرف وہی چیز شامل نہیں جو بطور خاص امانت کے طور پر رکھی گئی ہو۔بلکہ کوئی شخص کسی دوسرے سے کپڑا، برتن یا کوئی دیگر چیز عاریتاً لیتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ استعمال کے بعد حسب وعدہ وہ چیز واپس کرے۔مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو راستے میں کوئی گری پڑی چیز مل جائے تو اس پر بھی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ چیز اس کے مالک تک پہنچائے۔حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق چیز پانے والا اس چیز کی تشہیر کرے تاکہ اس کے مالک کا پتہ لگایا جاسکے۔اس کے باوجود اگر گمشدہ چیز کا مالک نہ مل سکے تو پھر حکم ہے کہ ایسی چیز کو صدقہ کر دیا جائے۔اگر خود غریب اور مستحق ہے تو وہ بھی استعمال کرسکتا ہے یا اسے بیت المال میں جمع کرا سکتا ہے، بہرحال یہ چیز اس کے پاس امانت ہے۔جس کی ادائیگی معروف طریقے سے ہونی چاہئے۔اگر کسی شخص کے پاس کوئی چیز بطور رہن رکھی گئی ہے تو اس کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔اس طرح کوئی چیز کرائے پر حاصل کی ہے تو وہ بھی مقررہ وقت پر واپس پہنچنی چاہئے۔کسی کے ذمے وراثت کا حق ہے اس کو ادا کرو۔یتیم کا مال اس کے حوالے کرو۔قرضدار کا قرض ادا کرو۔غرضیکہ جو شخص جس چیز کا حقدار ہے اس کے حق کا اعتراف کرو۔یہ سب چیزیں امانت میں شامل ہیں۔اسی طرح کسی عہدے یا منصب پر تعیناتی کرنا متعلقہ حاکم کے ذمے بہت بڑی امانت ہے۔

امانتیں اہل کے سپرد کرنے کا حکم

ادائیگی امانت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس منصب کا اہل ہے وہ اس کے سپرد کرو۔اگر کوئی عہدہ اہل کی بجائے نااہل کو دیا جائیگا تو وہ خیانت ہوگی اور ایسا کرنے والا شخص قابل مؤاخذہ ہوگا۔حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو حاکم کوئی عہدہ اس کے اہل کی بجائے اپنے کسی غیر مستحق دوست یا رشتہ دار کو دیتا ہے تو وہ آدمی اللہ کے ہاں ملعون ہے،اس نے امانت میں خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔عام طور پر ادائے امانت کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی شخص کے پاس (قیمتی) چیز رکھی جائے اور پھر مطالبہ پر وہ جوں کی توں واپس کر دے۔یہ تو اس کا محدود تصور ہے اس کا وسیع تر تصور اور مفہوم یہ ہے کہ اسلامی احکام وفرائض بھی امانت ہیں ان کو ان کے اوقات میں حسنِ نیت واخلاص سے تمام تر

شرعی حدود و قیود کے ساتھ ادا کرنا بھی ادائے امانت کے حکم میں آتا ہے۔

اور حکومت و اقتدار بھی ایک امانت ہے یہ محض کسی کو دوستی، رشتہ داری، برادری، ذاتی منفعت کی بنا پر تفویض نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی ان چیزوں کو اس کے لیے معیار قرار دیا جاسکتا ہے اس کے لیے اسلامی نقطہ نظر سے معیار صرف یہی ہے کہ وہ اس عہدے کے لیے اھل ہو۔ قابل ہو یعنی صادق ہو (کذب بیانی سے گریز کرتا ہو)، امین ہو (امانت دار ہو)، خائن نہ ہو، ظالم نہ ہو، قاتل نہ ہو، رسہ گیر نہ ہو، بھتہ خور نہ ہو، تھانہ کچہری کی سیاست نہ کرتا ہو، اچھی شہرت کا حامل ہو، عمدہ سیرت و کردار رکھتا ہو، علم و عمل کا مرقع ہو، تقویٰ و طہارت اس کی پہچان ہو، ایسے باکردار اور مخلص و محب وطن شخص کو منتخب کیا جائے تاکہ اسمبلی میں پہنچ کر عوام کی صحیح نمائندگی کر سکے اور ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔ اور اپنے دامن کو کرپشن، بدعنوانی اور خیانت کے بدنما داغوں سے پاک رکھے۔

گویا تقسیم منصب بھی بہت بڑی امانت ہے۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ نظام حکومت چلانا بہت مشکل کام ہے۔ دنیادار اسے آسان سمجھ کر ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ہر جائز ناجائز طریقے سے حاکم بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن ہر صاحب اقتدار حاکم کو ندامت اور حسرت ہوگی۔ اس دن وہ تمنا کریگا، کاش میں دنیا میں حاکم نہ بنتا۔ رعایا کے حقوق اور مظالم اس کی گردن پر ہوں گے۔ ناانصافیاں گلے میں لٹکتی ہوں گی۔ مظلوم جنت میں چلا جائے گا، اور اس کے بدلے میں حاکم کو دوزخ میں پھینک دیا جائیگا، آج تو دنیا میں بڑی شان و شوکت سے حکومت کی جاتی ہے مگر جب قیامت کے دن جزائے عمل کا وقت آئیگا تو حسرت اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل کی طرف لوٹا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اچھی چیز کی نصیحت کرتا ہے۔ اس کے احکام پر عمل کرو گے تو تمہارا نظام درست ہو جائیگا۔ تمہاری سوسائٹی پاک ہو جائیگی اور تم بلاخوف وخطر خوشحالی کی زندگی بسر کرو گے۔ اِنَّ اللّٰهَ

كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۵۸ بیشک اللہ تعالیٰ سمیع ہے وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن قول کو سنتا ہے اور بصیر ہے کہ ہر شخص کا قول اور فعل اس کی نگاہ میں ہے۔ سورہ فجر میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ بیشک تمہارا رب گھات میں ہے۔ وہ تمہارے افعال و کردار سے واقف ہے۔ وہ تمہارے اقوال کو سن رہا ہے اور اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ان کا نتیجہ وقت معین پر سامنے آجائیگا۔

اسلامی تعلیمات کے شاہکار

یہ دونوں حکم اسلامی تعلیمات کے شاہکار ہیں اور امن و امان کے قیام اور حقوق کی ادائیگی میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کی کچھ تفصیل یوں ہے: (1).....امانت کی ادائیگی: امانت کی ادائیگی میں بنیادی چیز تو مالی معاملات میں حقدار کو اس کا حق دیدینا ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اور بھی بہت سی چیزیں امانت کی ادائیگی میں داخل ہیں۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے روایت ہے، رسولِ کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ''جو مسلمانوں کا حاکم بنا پھر اس نے ان پر کسی ایسے شخص کو حاکم مقرر کیا جس کے بارے میں یہ خود جانتا ہے کہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ کتاب و سنت کا عالم مسلمانوں میں موجود ہے تو اُس نے اللہ تعالیٰ، اُس کے رسول اور تمام مسلمانوں سے خیانت کی۔ (معجم الکبیر، عمرو بن دینار عن ابن عباس، ۱۱ / ۹۴، الحدیث: ۱۱۲۱۶) (2).....انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا: نظامِ عدل و عدالت کی روح ہی یہ ہے کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے۔ فریقین میں سے اصلاً کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ علماء نے فرمایا کہ حاکم کو چاہئے کہ پانچ باتوں میں فریقین کے ساتھ برابر سلوک کرے۔ (1) اپنے پاس آنے میں جیسے ایک کو موقع دے، دوسرے کو بھی دے۔ (2) نشست دونوں کو ایک جیسی دے۔ (3) دونوں کی طرف برابر مُتَوَجِّہ رہے۔ (4) کلام سننے میں ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طریقہ رکھے۔ (5) فیصلہ دینے میں حق کی رعایت کرے جس کا دوسرے پر حق ہو پورا پورا دِلائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ انصاف کرنے والوں کو قربِ الٰہی میں نور کے منبر عطا کئے جائیں گے۔ (مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل۔۔۔الخ، ص ۱۰۱۵، الحدیث: ۱۸(۱۸۲۷))

قاضی شریح رحمہ اللہ کا عادلانہ فیصلہ

مسلمان قاضیوں نے اسلام کے عادلانہ نظام اور برحق فیصلوں کی ایسی عظیم الشان مثالیں قائم کی ہیں کہ دنیا ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتی، اس موقع پر ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے: جنگِ صفین کے موقع پر حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم کی ایک زِرہ گم ہوگئی، بعد میں جب آپ کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم کوفہ تشریف لائے تو وہ زِرہ ایک یہودی کے پاس پائی، اسے فرمایا: یہ زِرہ میری ہے، میں نے تمہیں بیچی ہے نہ تحفے میں دی ہے۔ یہودی نے کہا: یہ زِرہ میری ہے کیونکہ میرے قبضے میں ہے۔ فرمایا: ہم قاضی صاحب سے فیصلہ کرواتے ہیں، چنانچہ یہ قاضی شُرَیح رحمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پہنچے، حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم ان کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ قاضی شریح رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: اے امیرُ المؤمنین! ارشاد فرمائیے۔ فرمایا: اس یہودی کے قبضے میں جو زِرہ ہے وہ میری ہے، میں نے اسے نہ بیچی ہے نہ تحفے میں دی ہے۔ قاضی شریح رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہودی سے فرمایا: اے یہودی! تم کیا کہتے ہو؟ یہودی بولا: یہ زِرہ میری ہے کیونکہ میرے قبضے میں ہے۔ قاضی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم سے کہا: اے امیر المؤمنین! کیا آپ کے پاس کوئی دلیل ہے؟ فرمایا: ہاں، قنبر اور حسن دونوں اس بات کے گواہ ہیں۔ قاضی صاحب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے کہا: (کہ حسن آپ کے بیٹے ہیں اور شرعی اصول یہ ہے کہ) بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز نہیں۔ جب اس یہودی نے قاضی صاحب کا عادلانہ فیصلہ سنا تو حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا: اے امیر المومنین! آپ مجھے قاضی صاحب کے پاس لے کر آئے اور قاضی صاحب نے آپ ہی کے خلاف فیصلہ کر دیا! میں گواہی دیتا ہوں کہ یہی مذہب حق ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، یہ زِرہ آپ ہی کی ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم اس کے اسلام قبول کرنے سے بہت خوش ہوئے، وہ زِرہ اور ایک گھوڑا اُسے تحفے میں دے دیا۔ (تاریخ الخلفاء، ابوالسبطین: علی بن ابی طالب، فصل فی نبذ من اخبار علی۔۔۔ الخ، ص ۱۸۴-۱۸۵،

الکامل فی التاریخ، سنۃ اربعین، ذکر بعض سیرتہ، ۳/ ۲۶۵)

امانت داری ایک اعلیٰ اخلاق ہے۔ دین کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ یہ ایک نادر اور بیش بہا صفت ہے۔ انسانی معاشرہ کے لیے جزءِ لا ینفک ہے۔ اس صفت میں حاکم ومحکوم کے مابین کوئی فرق نہیں ہے، تاجر وکاریگر، مزدور وکاشت کار، امیر وفقیر، بڑا اور نہ چھوٹا اور نہ ہی شاگرد واستاذ بلکہ ہر ایک کے لیے باعث شرف ومنزلت ہے۔ انسان کا اصل سرمایہ ہے۔ اور اس کے کامیابی وکامرانی کا ضامن ہے۔ اور ترقی وارتقاء کی چابی ہے۔ ہر ایک کے لیے باعث سعادت ہے۔ امانت کا معنی بہت وسیع وعریض ہے اور جو لوگ امانت کے معنی کو صرف اس معنی میں محصور کر دیتے ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے پاس کوئی چیز (سونا، چاندی، روپیے پیسے وغیرہ) ایک معین مدت تک جمع رکھے۔ تو اس جمع شدہ چیز کو صاحب مال تک واپس کر دینا ہی امانت داری ہے تو ایک بہت بڑی کج فہمی ہے لیکن حقیقت یہ کہ امانت داری بہت وسیع معنی پر دلالت کرتا ہے۔ امانت کا تعلق عقیدے سے بھی ہے اور عمل سے بھی، خواص سے بھی اور عوام سے بھی! جب دل امانت کی قدر جان لیں تو یہ انفرادی زندگی سے ہوتی ہوئی اجتماعی ثمرات بھی لاتی ہے، ورنہ خائن افرادِ معاشرہ دنیا میں بھی رسوا ہوتے ہیں اور آخرت میں تو ان کا کوئی حصّہ ہی نہیں۔ آج معاشرہ بد دیانتی، خیانت اور کرپشن کی راہوں پر گامزن ہے، جس کی وجہ سے پوری قوم دنیا بھر میں نہ صرف بدنام، ناقابلِ اعتبار اور دنیا کی نظر میں بے وقعت ہوگئی ہے، بلکہ بدامنی، فساد اور خوں ریزی جیسی لعنتیں ہمارے مقدر کا حصہ بن چکی ہیں۔ آج حاکم ومحکوم، غریب وامیر سبھی اس انسانی اور شرعی فرض سے غافل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حق تعالیٰ کے دیے ہوئے اس خوب صورت حکم کو اپنا کر دنیا بھر میں اپنا نام روشن کریں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کریں۔

☆☆☆

اسلامی حکومت کے چار اصول

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝۵۹

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْٓا	ایمان لائے ہو!
اَطِیْعُوا اللّٰہَ	تم اللہ کی اطاعت کرو	وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	اور رسول کی اطاعت کرو
وَاُولِی الْاَمْرِ	اور اصحابِ امر کی	مِنْکُمْ	اپنے میں سے
فَاِنْ	پھر اگر	تَنَازَعْتُمْ	تم باہم اختلاف کرو
فِیْ شَیْءٍ	کسی چیز میں	فَرُدُّوْہُ	تو لوٹا دو اس کو
اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ	اللہ اور رسول کی طرف	اِنْ کُنْتُمْ	اگر ہو تم
تُؤْمِنُوْنَ	ایمان رکھتے	بِاللّٰہِ	اللہ کے ساتھ
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ	اور یوم آخرت کے (ساتھ)	ذٰلِکَ خَیْرٌ	یہ بہتر
وَاَحْسَنُ	اور بہت اچھا ہے	تَاْوِیْلًا ۝۵۹	انجام میں

آج کی تلاوت کردہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے وہ قانون بتایا ہے اس کے نفاذ کے ذریعے ادائے امانت اور عدل کا فریضہ انجام دیا جاسکتا ہے ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اے ایمان والو! اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ اور تم میں سے جو صاحب امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

یہاں پر اطاعت کے تین درجات بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا درجہ اطاعت الٰہی کا ہے اور یہ اطاعت علی الاطلاق تمام انسانوں پر فرض ہے۔ یہ اطاعت مطلقہ اور بالذات ہے، لہٰذا یہ ہر حالت میں ضروری ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، اس سے سرتابی کرنے والا نافرمان، مجرم اور جہنمی ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق، مالک، مربی اور محسن ہے۔ لہٰذا اس کی اطاعت بہر صورت لازم ہے۔ دوسرے نمبر پر اطاعت رسول ہے اور یہ بھی مطلق اطاعت ہے تاہم یہ اطاعت بالذات نہیں بلکہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے، اس کے حکم کی تعمیل کرنے اور اس کی مرضیات اور نامرضیات تک پہنچنے کے لیے قطعی اور یقینی واسطہ رسول ہوتا ہے۔ لہٰذا رسول کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی، کیونکہ رسول دنیا میں اپنا حکم نافذ نہیں کرتا بلکہ اللہ ہی کے حکم کو نافذ کرتا ہے اس لحاظ سے پیغمبر کی اطاعت اس امر کی قطعی علامت ہے کہ کوئی شخص واقعی اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہے۔

رسول کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس اللہ کے احکام کی اس کی منشاء کے مطابق بجا آوری کا رسول کی اطاعت کے بغیر کوئی ذریعہ نہیں۔ لہٰذا رسول کی اطاعت بھی حقیقتاً اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اللہ کی اور رسول کی اطاعت ایک ہی اطاعت قرار پاتی ہے۔ علاوہ ازیں رسول کی اطاعت کی ایک مستقل حیثیت بھی ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ جہاں کتاب اللہ خاموش ہو اور رسول ہمیں کوئی حکم دے۔ خواہ یہ حکم قانون سے تعلق رکھتا ہو یعنی حلت وحرمت سے متعلق ہو یا اوامر ونواہی سے تو ایسا حکم ماننا بھی ہم پر ایسے ہی فرض ہے جیسے اللہ کی اطاعت اور چونکہ ایسی

اطاعت کا بھی اللہ نے خود ہمیں حکم دیا ہے تو اس لحاظ سے یہ بھی اللہ کی اطاعت کے تحت آجاتی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ وہی حکم دیتے ہیں جو اللہ کی مرضی اور اس کی طرف سے ہوتا ہے، اطاعت اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اس کے بارے احترام اور محبت کے جذبات ہوں۔

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کا تقاضا

بحیثیت مسلمان ہم رسول اکرم ﷺ سے محبت کرتے ہیں، بلکہ اپنے والدین، اولاد اور ساری مخلوق سے زیادہ محبت کرتے ہیں، یہی محبت ہمارا ایمان ہے، اسی محبت پر شفاعت کی امیدیں وابستہ ہیں، یہی محبت ہی ہمارے کل دین کی اساس و بنیاد ہے۔ ہم آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین اور آپ ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات کے مطابق ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں گے تو ہمارا دعویٰ محبت سچا ثابت ہوگا۔ اس کیلئے ہمیں اسلامی تعلیمات کا علم حاصل کرنا ہوگا کیونکہ بغیر علم کے یہ ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہماری زندگیوں میں اسلامی تعلیمات کس قدر ضروری ہیں۔ علم کے بعد عملاً ایسے طرز پر زندگی گزارنی چاہیے جو سنت رسول کی عکاس ہو، خیر کی باتیں بھی معلوم ہوں تاکہ ان پر عمل کیا جاسکے اور شر کی باتیں بھی معلوم ہوں تاکہ ان سے بچا جاسکے۔ آپ ﷺ کی محبت جب تک تمام محبتوں پر غالب رہے گی، آپ ﷺ کی سنت جب تک تمام معاشرتی طور طریقوں پر غالب رہے گی، آپ ﷺ کی تعلیمات جب تک تمام تعلیمات پر غالب رہیں گی اور سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کی ناموس کی حفاظت کیلئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ جب تک دلوں میں باقی رہے گا، ہم اور ہماری نسلوں کا ایمان باقی رہے گا۔ ورنہ خاکم بدہن اس میں کمی آگئی تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

"اُولِی الْاَمْرِ" کی اطاعت

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ اور تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں ان کی بھی۔ تیسری اطاعت ان حکام کی ہے جو مسلمان ہوں۔ حکام (اولی الامر) سے مراد وہ ہر قسم کے حکام ہیں جو کسی ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہوں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تو غیر مشروط ہوتی ہے لیکن اولی الامر کی اطاعت صرف اس صورت میں ہوگی جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے

خلاف نہ ہو۔ "أُولِي الْأَمْرِ" کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی وفکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی و معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ مسلمان حاکم کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کی شرط پر لازم ہے جب تک حاکم وقت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند رہیگا، اس وقت تک اس کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اس کی ہر جائز بات ماننا ضروری ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے عَلَيْكُمُ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ جب امیر حق بات کہتا ہے تو اس کا سننا اور اس کی اطاعت کرنا تم پر لازم ہے خواہ تمہیں یہ بات پسند ہو یا نہ ہو۔ نبی (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا مَنْ أَطَاعَ الْأَمِيرَ فَقَدْ أَطَاعَنِي یعنی جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، اس نے گویا میری ہی اطاعت کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کیا اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ (بخاری: 2957، الفاظ بخاری کے ہیں، نیز دیکھئے مسلم: 1835) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک مسلمان پر سمع واطاعت فرض ہے چاہے اسے پسند ہو یا ناپسند ہو، الا یہ کہ اگر اسے نافرمانی کا حکم دیا جائے، اگر امیر اسے نافرمانی کا حکم دے تو نہ تو اس پر سننا ہے اور نہ ماننا۔ (بخاری 7144، مسلم: 1839 الفاظ مسلم کے ہیں) مطلب یہ کہ جب تک امیر یا حاکم اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق راہنمائی کرتا رہے، اس کی اطاعت فرض ہے وَإِذَا أَمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ اور اگر وہ نافرمانی کا حکم دے تو نہ اس کی بات سننا ضروری ہے اور نہ اس پر عمل کرنا۔ کیونکہ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ اطاعت اور

فرمانبرداری نیک اور جائز امور میں ہی ہوسکتی ہے۔اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندہ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے اس کے بعد ہے۔مسلمان کی انفرادی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز ومحور خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدمقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ورنہ ہر وہ حلقہ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ یعنی اللہ کی ناراضگی کی صورت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے یہ بات یاد رہے کہ صرف حلال اور بھلے کاموں میں حاکم وقت کی اطاعت کرنا واجب ہے، رہی بات حرام کاموں کی یا ان کاموں کی جن کے انجام دینے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو اس میں حاکم وقت کی اطاعت نہیں کی جائے گی کیوں کہ وہ حرام اور ناجائز ہے۔حاکم کی اطاعت تو اس وقت تک ہی ہوسکتی ہے مَا دَامَ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ جب تک وہ اللہ کی کتاب، اس کے دین اور شریعت کے مطابق راہنمائی کرتا ہے ایسا شخص خواہ بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا چھوٹے سے، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، آقا ہو یا غلام، ہر حالت میں اس کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔حاکم چونکہ ظاہری طور پر شریعت کا قانون نافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ان کے پاس اقتدار کی امانت ہوتی ہے، اختیار ہوتا ہے، لہٰذا کسی حاکم کا جھوٹ بولنا یا غداری کرنا بہت بڑا جرم تصور ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ تفویض شدہ امانت کے مطابق شرعی احکام نافذ کرتے۔

دین کے فہم کے لیے علماء کی رہنمائی

علماء کو انبیاء کرام کا وارث مانا گیا ہے کیونکہ وہ دین کی حفاظت اور اس کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔عامتہ الناس دینی احکام، حلال وحرام اور شریعت کے مسائل سمجھنے کے لیے علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں امت پر فرض ہے کہ وہ علماء کا ادب واحترام کرے اور ان کی توہین سے بچے، علماء

کرام داعیانِ حق وصداقت، ہادیانِ راہ ہدایت، پاسبانِ مذہب وشریعت، مہمانانِ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خیابانِ علم وحکمت، رہبرانِ انسانیت، پیشوایانِ امت، مربیانِ علم ومعرفت، حاملین علومِ نبوت، معلمین کتاب وحکمت، مصلحین قوم وملت ہیں۔ اسی بناء پر رب العزت نے ان کا درجہ و مرتبہ بلند فرمایا ہے: آپ فرمادیجیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہیں؟۔ (سورہ زمر آیت نمبر 9)

علماء کی اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی بات اور رہنمائی پر اسی وقت عمل کیا جائے جب وہ شریعت (قرآن وسنت) کے مطابق ہو علماء کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کے تابع ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں جو شریعت کے خلاف ہو، تو اس میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ "معصیت (نافرمانی) میں کسی کی اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف (نیکی اور شریعت کے دائرے) میں ہے باقی رہی علماء اور فقہا کی اطاعت، تو وہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ حضرات جائز اور ناجائز امور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کے پاس علم کی امانت ہوتی ہے جسے وہ عوام تک پہنچاتے ہیں، اس ضمن میں علمائے سوء نے تو ہمیشہ غلط راستہ اختیار کیا مگر علمائے حق نے ادائے امانت کے فریضہ کو انجام دینے میں کبھی رو رعات نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مار کھائی، تکالیف برداشت کیں مگر حق کا دامن نہیں چھوڑا۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم چاروں پر اپنے اپنے وقت میں آزمائش آئی، انہوں نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں، جلاوطن ہوئے مگر صداقت سے روگردانی نہیں کی، بلکہ ہمیشہ سچی بات کی۔ لہٰذا علماء فقہا کی اطاعت اس وجہ سے ہے کہ وہ جائز اور ناجائز میں تفریق کرتے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کی اطاعت اس لیے ہے کہ وہ مالک ہے، رسول کی اطاعت اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا ہے اور علماء کی اطاعت اس لیے کہ وہ تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دینے والے ہیں۔ بہرحال یہ تیسری اطاعت جس میں حکام، فقہا اور علماء آتے ہیں مشروط ہے، اگر وہ اچھی بات کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کی جائیگی اور اگر کوئی غلط بات بتائیں تو اسے تسلیم نہیں کیا جائیگا۔ چنانچہ علامہ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی فقیہہ ایسا فتویٰ دے یا ایسا مسئلہ بتائے جو کتاب وسنت کے خلاف ہو تو اس کی بات ماننا گناہ کا ارتکاب ہوگا۔ اور اگر مسئلہ کتاب وسنت کے مطابق ہے تو پھر اس کا ماننا ضروری ہوگا۔

فرمایا فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ اگر کسی معاملہ میں تمہارا جھگڑا ہو جائے، حکام وقت یا فقہاء اور علماء کے ساتھ اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو ایسے معاملے کے متعلق فرمایا فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو کیونکہ تمام معاملات میں آخری مرجع اسلامی نظام اور شریعت میں اللہ کا حکم اور رسول کا طریقہ ہی بنیادی قانون اور آخری سند (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے فرمایا متنازعہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول کے سامنے پیش کر کے حل معلوم کرلو۔ اگر یہ مسئلہ قرآن پاک یا سنت خیر الانام سے صراحتاً حل ہو گیا تو ٹھیک ہے اسے قبول کرلو۔ وگرنہ اجتہاد واستنباط کے لیے علماء اور فقہاء کے سپرد کر دو۔ آج کل کی زبان میں پہلی صورت کو قانون (LAU) کہتے ہیں اور دوسری صورت میں ضمنی قواعد (Bye-laws) کا نام دیتے ہیں جب کوئی چیز قرآن وسنت سے صراحتاً مل گئی تو اس میں کسی تغیر وتبدل کی گنجائش نہیں ہوتی، البتہ اجتہاد کے ذریعے اخذ کیے گئے (Bye-laws) تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے معاملات میں فقہائے کرام کے اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ہر فقیہ مسئلہ کا حل بذریعہ استنباط نکالتا ہے جو کہ ایک طبعی بات ہے تاہم آخری سند اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ حتمی فصلہ وہیں سے ہوگا۔ فرمایا تمہیں اللہ اور رسول کی بات پر ہی سر تسلیم خم کرنا ہوگا اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ بشرطیکہ تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اللہ اور رسول کی اطاعت کو قبول کرلو گے تو معاشرہ بالکل درست ہو جائیگا، انصاف کا بول بالا ہوگا کسی حقدار کا حق ضائع نہیں ہوگا۔ اور اگر اپنے معاملات دوسرے انسانوں کے سپرد کر دیے تو پھر پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا، زمین میں فساد برپا ہوگا۔ اور کوئی کام درست طور پر انجام نہیں دیا جا سکے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اپنے تمام معاملات اللہ اور اس کے رسول کے تابع کرلو، قیامت میں فیصلے کا مدار یہی چیزیں ہوں گی ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ یہی طریقہ بہترین ہے اور اس کا انجام عاقبت بھی سب سے بہتر ہے۔ تاویل کے معنی تحقیق وتوجیہ کے بھی ہیں اور انجام

وعاقبت کے بھی، ترجمہ کرنے والوں نے دونوں طرح ترجمہ کیا ہے، شاہ عبدالقادر صاحب نے پہلا معنی ملحوظ رکھا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے 'عاقبت' سے ترجمہ کیا ہے، یہی چیز انجام کے اعتبار سے بہتر ہے اس پر عمل پیرا رہو گے تو دنیا میں بھی امن وسکون حاصل ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح نصیب ہوگی اور اگر ان اصولوں سے انحراف کیا تو نہ نیا میں چین نصیب ہوگا اور نہ آخرت کی کامیابی حاصل ہوگی۔ یعنی آخر میں یہ بتادیا گیا کہ اگر تم نے ان چار اصولوں میں سے کسی بھی اصول میں کوتاہی کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ اور اگر تمہارا اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ سچا ہے تو تمہیں بہر حال ان چار اصولوں پر عمل پیرا ہونا ہوگا اور جب تک تم نے ان چاروں امور کا خیال رکھا اس وقت تک تمہارے اخلاق و کردار درست اور تمہاری حکومت مستحکم رہے گی۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ ان واشگاف حقائق کو سمجھیں اور اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہو۔

☆☆☆

منافقوں کا آپ کے پاس فیصلہ لانے سے گریز/ رسول اللہ کی اطاعت کو اللہ تعالی کی اطاعت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ
الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱ فَكَيْفَ اِذَآ
اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ
اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ
عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ۝۶۳

طاغوت کا وسیع تر مفہوم

اَلَمْ تَرَ	کیا نہیں آپ نے دیکھا	اِلَى الَّذِيْنَ	ان لوگوں کی طرف جو
يَزْعُمُوْنَ	دعویٰ کرتے ہیں	اَنَّهُمْ	(اس بات کا) کہ وہ
اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہیں	بِمَآ	اس کے ساتھ جو
اُنْزِلَ	نازل کیا گیا	اِلَيْكَ	آپ کی طرف

وَمَآ اُنْزِلَ	اور جو نازل کیا گیا	مِنْ قَبْلِكَ	آپ سے پہلے
يُرِيْدُوْنَ	وہ ارادہ کرتے ہیں	اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا	یہ کہ فیصلہ لے جائیں
اِلَى الطَّاغُوْتِ	طاغوت کی طرف	وَقَدْ	حالانکہ تحقیق
اُمِرُوْٓا	وہ حکم دیے گئے تھے	اَنْ يَّكْفُرُوْا	کہ وہ کفر کریں
بِهٖ ؕ	اسکے ساتھ	وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ	اور ارادہ کرتا ہے شیطان
اَنْ يُّضِلَّهُمْ	یہ کہ انہیں گمراہ کردے	ضَلٰلًۢا	گمراہ کرنا
بَعِيْدًا ⑥۰		دور کا	

ارشاد باری تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (اے پیغمبر) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ طاغوت سے مراد شیطان اور کعب بن اشرف جیسے موذی اور غالی لوگ ہیں۔ وسیع تر مفہوم میں طاغوت ہر وہ سرکش قوت ہے جو لوگوں کو گمراہ کرتی ہے۔ نبی ﷺ کے زمانے کے بڑے بڑے طاغوت قیصر اور کسریٰ تھے۔ انہوں نے دنیا بھر کے لوگوں کو غلام بنا رکھا تھا اور وہ انسانوں کو جانوروں کی طرح استعمال کرتے تھے۔ اللہ کے دین کے مخالف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ذریعے اس طاغوتی نظام کا قلع قمع کر دیا یہ تو اس زمانے کا ذکر ہے اور اب ہمارے زمانے میں یورپی نظام طاغوتی نظام ہیں۔ ایک الحادی نظام ہے اور دوسرا سرمایہ دارانہ۔ دنیا کا ایک حصہ سرمایہ داری کی لپیٹ میں ہے اور دوسرا اشتراکیت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ مگر ہیں دونوں طاغوتی اور باطل۔ دین اسلام نے ہمیشہ ان کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اللہ نے اپنے ہر نبی کی زبان سے کہلوایا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یعنی عبادت صرف اللہ کی کرو اور ان طاغوتوں سے اجتناب کرو۔ بہر حال طاغوت ہر وہ طاقت ہے جو راہ

راست سے گمراہ کردے شرائع الٰہیہ کے خلاف جو بھی فیصلہ ہوگا وہ طاغوتی ہوگا، مارشل لاء کا نظام بھی اسی قبیل سے ہے۔ جہاں انسانوں کے بنائے ہوئے باطل قواعد جبراً نافذ کیے جاتے ہیں۔ بہرصورت! خدا کے سوا جس کی بھی عبادت کی جائے، خواہ وہ انسان ہو یا جنات یا کوئی اور چیز، طاغوت ہے، حلال وحرام کرنا اور جائز وناجائز قرار دینا اللہ ہی کا حق ہے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کو حلال وحرام کرنے کا حقدار سمجھتا ہے اور قانون کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے تو وہ طاغوت ہے، اس طرح مسلمانوں کے لئے کسی بھی ملک میں اختیار ورضامندی سے غیر شرعی قوانین کو رغبت کے ساتھ قبول کرلینا طاغوت کی اطاعت ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور قتل منافق کا واقعہ

اس آیت کا شان نزول کے متعلق مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی اور ایک کلمہ گو منافق کے درمیان جھگڑا پیدا ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں آپ خود بھی معاملات کا تصفیہ فرماتے تھے اور بعض اکابر صحابہ جیسے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبل علیہم الرضوان کو بھی قاضی مقرر کیا ہوا تھا تو اس تنازعہ کے تصفیہ کے لیے یہودی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جانا چاہتا تھا۔ مگر منافق اسے یہودیوں کے سرخیل کعب بن اشرف کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ دراصل فریقین سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں یہودی حق پر ہے۔ لہٰذا یہودی اہل اسلام سے انصاف کی توقع رکھتا تھا اور اپنا مقدمہ انہی کی عدالت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ برخلاف اس کے منافق (کلمہ گو مسلمان) کا موقف چونکہ کمزور تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ کعب بن اشرف پر اثر انداز ہوکر فیصلہ اپنے حق میں کرالے گا۔ یہودی جانتا تھا کہ کعب بن اشرف رشوت خور ہے، اس لئے اُس نے یہودی ہونے کے باوجود اُس کو پنچ تسلیم نہ کیا، ناچار منافق کو فیصلہ کے لئے سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے حضور آنا پڑا۔ رسولِ صادق وامین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے جو فیصلہ دیا وہ یہودی کے موافق ہوا اور منافق کے خلاف۔ یہاں سے فیصلہ سننے کے بعد پھر منافق اُس یہودی کو مجبور کرکے حضرت عمر رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے پاس لے آیا، یہودی نے آپ رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ

سے عرض کیا کہ میرا اور اس کا معاملہ آپ کے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ طے فرما چکے لیکن یہ حضور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے فیصلہ سے راضی نہیں بلکہ آپ سے فیصلہ چاہتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہ نے فرمایا کہ ہاں میں ابھی آ کر اس کا فیصلہ کرتا ہوں، یہ فرما کر مکان میں تشریف لے گئے اور تلوار لا کر اُس کو قتل کر دیا اور فرمایا جو اللہ عَزَّ وَجَلَّ اور اس کے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے فیصلہ سے راضی نہ ہو اُس کا میرے پاس یہی فیصلہ ہے۔ اس منافق کے ورثاء حضورِ اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں آئے لیکن اِن آیات میں حضرت عمر رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ کی تائید نازل ہوگئی تھی لہٰذا ورثاء کے مطالبے کو مُسترد کر دیا گیا۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۶۰، ۱/۳۹۷)

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر راضی رہنا ایمان کا بنیادی تقاضا

فرمایا وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ حالانکہ انہیں حکم یہ تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کر دیں۔ تمام طاغوتی نظاموں کی نفی کر کے اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لے آئیں وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ۶۰ اور ادھر شیطان یا طاغوت کی خواہش یہ ہے کہ لوگ دور کی گمراہی میں جا پڑیں، اور شریعت الٰہی سے منہ موڑ بیٹھیں۔ اس آیت میں مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، یہاں فرمایا کہ منافق ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کرتے ہیں اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے اور حکم پر راضی نہیں ہوتے، بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی مشرک سردار یا یہودی یا نصرانی عدالت یا کسی کاہن سے فیصلہ کروایا جائے، حالانکہ اسلام ان سب کے انکار کا حکم دیتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل نہ کرنے والی ہر عدالت کو طاغوت قرار دیتا ہے۔ مومن کا کام اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ سننا اور ماننا ہے۔ [دیکھیے النور: 51] اور منافقوں کا حال اس کے برعکس ہے۔ [دیکھیے النور: 48، لقمان: 21] افسوس کہ اس وقت اکثر مسلمان ملکوں کی عدالتوں میں قرآن وسنت کا نظام عدل نافذ ہی نہیں، بلکہ کفار کے بنائے ہوئے قانون نافذ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک قرآن وسنت کا کوئی متبع حکمران کفار کے اس نظام

کو بزور بازو نکال باہر نہیں کرتا اس وقت تک عدالتوں میں قرآن وسنت کی رسائی مشکل ہے۔

قرآن کریم میں رسول اللہ کی اطاعت کو اللہ تعالی کی اطاعت قرار دیا، رسول معصوم ہوتا ہے، اس کے حکم میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا، جب کہ "مرکز ملت" کے منصب پر فائز ہونے والا امتی معصوم نہیں ہوتا، اس کے حکم میں غلطی ہوسکتی ہے اور ہوتی بھی ہے اس سے گناہ بھی صادر ہوتے ہیں۔ ایسے صاحب اقتدار کو مرکز ملت کا عنوان دے کر رسول اللہ کی اطاعت کا متبادل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ نیز قرآن کریم میں رسول کی اطاعت کو مدار ایمان قرار دیا گیا ہے، اس کی اطاعت باعث ہدایت، رضائے الٰہی کا زینہ، حصول رحمت کا ذریعہ ہے، اس کا فیصلہ اٹل اور قابل قبول، امت کے لیے اس میں کسی کو اس پر نہ حق اعتراض حاصل ہے اور نہ کسی کو چوں چراں کا اختیار ہے، کیا "مرکز ملت" کے منصب پر فائز ہونے والے حکمراں کے لیے بھی یہی احکام ہیں؟ اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے؟ اس کی اطاعت مدار ایمان ہے؟ اس کے کسی حکم کا انکار کرنا کفر اکبر ہے؟ اس کے لیے ابدی جہنم ہے؟

شرائع الٰہیہ (اللہ کے احکام اور شریعتوں) کی پیروی مسلمانوں پر فرض

وَاِذَا	اور جب	قِیْلَ لَھُمْ	کہا جاتا ہے ان سے
تَعَالَوْا	تم آؤ	اِلٰی مَآ	اس کی طرف جو
اَنْزَلَ اللّٰہُ	اللہ نے نازل کیا	وَاِلَی الرَّسُوْلِ	اور رسول کی طرف (آؤ)
رَاَیْتَ	(تو) آپ دیکھیں گے	الْمُنٰفِقِیْنَ	منافقوں کو
یَصُدُّوْنَ	وہ رکتے ہیں	عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾	آپ سے اعراض کرتے ہوئے

آگے فرمایا وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ جب منافقوں سے کہا جاتا ہے تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اس چیز کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے یعنی قرآن حکیم۔ وَاِلَی الرَّسُوْلِ اور رسول کی طرف آؤ تو پھر رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ آپ ان منافقوں کو دیکھیں گے۔ مقصد یہ کہ ان منافقوں کا حال یہ ہوتا ہے یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ اعراض کرتے ہیں آپ سے اعراض کرنا صُدُوْدًا مفعول مطلق

ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ ایک خاص طریقے سے اعراض کرتے ہیں تا کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ وہ در پردہ منکر ہیں۔ منافقین بظاہر کلمہ تو پڑھتے ہیں مگر شریعت الٰہی کو تسلیم نہیں کرتے اور حیلے بہانے سے اس کے احکام کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ اپنے ترجمہ قرآن پاک کے حاشیے پر لکھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو انہیں قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کا ملجا وماویٰ یہی دو چیزیں ہیں فرماتے ہیں کہ تنازعہ کے دو فریقین میں سے اگر ایک شخص کہے کہ چلو بھائی اس کا فیصلہ شریعتِ الٰہی سے کرواتے ہیں اور دوسرا کہے کہ میں تو شریعت کو تسلیم نہیں کرتا۔ تو ایسا شخص کافر کہلائے گا کیونکہ اس نے اللہ اور رسول کا حکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ سورہ نور کے چھٹے رکوع میں آتا ہے کہ مومنین کی یہ شان یہ ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف آؤ تو وہ خوشی محسوس کرتے ہیں اور جو اس قسم کے بودے اور منافق لوگ ہوتے ہیں وہ حیلہ سازی کرتے ہیں تا کہ بچ جائیں۔

شرائع الٰہیہ کی پیروی کی بنیادی حیثیت

اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور پابندی ہی بندے کے شرف اور تقویٰ کا معیار ہے۔ امتِ محمدیہ کے لیے آخری اور مکمل شریعت شریعتِ محمدی (اسلام) ہے، جو تمام پچھلی شریعتوں کے احکام کا احاطہ کرتی ہے اور انہیں منسوخ یا پورا کرتی ہے۔ پچھلی شریعتوں (شرائع من قبلنا) کی پیروی کا حکم فقہ اور اصولِ فقہ میں اس مسئلے پر مختلف آراء ہیں کہ آیا پچھلے انبیاء کی شریعتیں ہمارے لیے قانون ہیں یا نہیں: پہلا قول: پچھلی شریعتوں کے وہ تمام احکام ہمارے لیے بھی واجب عمل ہیں جو قرآن یا سنت میں بیان ہوئے ہیں، جب تک کہ ہماری شریعت میں ان کے نسخ (منسوخ ہونے) کی دلیل نہ آجائے۔ دوسرا قول: اصل یہ ہے کہ ہر شریعت اپنے نبی اور اس کے زمانے کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ لہٰذا پچھلی شریعتیں ہمارے لیے بالذات شریعت نہیں ہیں، ہاں! جس حکم کو قرآن و سنت نے ہمارے لیے بھی برقرار رکھا ہے، ہم اس کی پیروی کرتے ہیں۔ متفقہ اصول: جن احکام کو اسلام نے باقاعدہ نقل کیا اور برقرار رکھا (جیسے روزے، قربانی، یا پچھلی قوموں کے عبرت ناک قصص واحکام)، ان پر عمل کرنا درست اور ثابت ہے۔

منافقین کی بے بسی

فَكَيْفَ	پھر کیا حال ہوتا ہے	اِذَآ اَصَابَتْهُمْ	جب انہیں پہنچتی ہے
مُّصِيْبَةٌۢ	کوئی مصیبت	بِمَا	بوجہ اس کے جو
قَدَّمَتْ	آگے بھیجا	اَيْدِيْهِمْ	ان کے ہاتھوں نے
ثُمَّ جَآءُوْكَ	پھر آتے ہیں آپ کے پاس	يَحْلِفُوْنَ	وہ قسمیں کھاتے ہیں
بِاللّٰهِ	اللہ کی	اِنْ اَرَدْنَآ	نہیں ہم نے ارادہ کیا تھا
اِلَّآ اِحْسَانًا	مگر بھلائی کا	وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲	اور موافقت کا

ایسے ہی منافقین کے متعلق فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ پس کیا حال ہوگا جب ان کو مصیبت پہنچے گی ان کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے۔ یعنی اللہ اور رسول کو چھوڑ کر طاغوتی فیصلے حاصل کرنے والوں پر جب محاسبے کا وقت آئیگا، ان کو تکلیف پہنچے گی تو ان کا کیا حشر ہوگا اس وقت یہ لوگ سخت مصیبت میں ہوں گے اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے شریعت الٰہی سے اعراض کیا۔ دنیا میں بھی جب قرآن پاک کی آیات ان کے جھوٹ کا پول کھول دیتی تھی تو انہیں سخت ندامت ہوتی تھی مگر اپنے مکروہ عزائم سے باز نہیں آتے تھے۔ فرمایا ان کا کیا حال ہوگا جب وہ اپنے کردہ گناہوں کی سزا میں مبتلا ہوں گے۔ فرمایا ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ پھر وہ آپ کے پاس قسمیں اٹھاتے ہوئے آئیں گے بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲ اللہ کی قسم دوسری جگہ مقدمہ لے جانے کا مقصد نیکی اور اتفاق رائے کرانا تھا۔ جھوٹی قسمیں اٹھائیں گے کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سورہ منافقون میں ارشاد فرمادیا کہ ان کی قسموں کا اعتبار نہ کریں۔ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ اللہ خود گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے لوگ ہیں۔ انہوں نے بچاؤ کے لیے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، لہٰذا ان پر اعتبار نہ کریں۔

منافقین کی جھوٹی قسموں کی حقیقت

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	یہ وہ لوگ ہیں کہ	يَعْلَمُ اللّٰهُ	جانتا ہے اللہ

مَا	اس کو جو	فِیْ قُلُوْبِھِمْ	ان کے دلوں میں ہے
فَاَعْرِضْ	چنانچہ آپ اعراض کریں	عَنْھُمْ	ان سے
وَعِظْھُمْ	اور نصیحت کریں انہیں	وَقُلْ لَّھُمْ	اور کہیں ان سے
فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ	ان کے دلوں میں	قَوْلًۢا بَلِیْغًا ﴿۶۳﴾	اثر کرنے والی بات

فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰہُ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ یہی لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان کا روگ بھلا خدا تعالیٰ سے کیسے چھپ سکتا ہے وہ تو عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ تمام ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ "عالم الغیب" ہے۔ اسے علم ہے کہ منافقین میں کھوٹ کی مقدار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافق کے وارثوں کی اس چال سے آپ کو مطلع کر دیا اس طرح اللہ تعالیٰ نے قصاص کے مقدمہ کو یہ آیات نازل فرما کر خارج کر دیا کہ جو لوگ اپنے مالی یا جانی مقدمات میں اللہ کے رسول کو دل و جان سے حکم تسلیم نہیں کرتے وہ فی الحقیقت مومن ہی نہیں ہیں لہٰذا قصاص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرمایا ان تمام تر حقائق کے باوجود اے پیغمبر (علیہ السلام) فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ آپ منافقین سے اعراض کریں انہیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیں۔ سورہ مزمل میں بھی فرمایا ہے۔ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا آپ انہیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیں۔ مقصد یہ کہ کوئی برا بھلا نہ کہیں بلکہ ان کے ساتھ رابطہ کی گنجائش باقی رہنے دیں وَعِظْھُمْ اور ان کو نصیحت کرتے رہیں اور خیر خواہی کا سلوک کرتے رہیں۔ وَقُلْ لَّھُمْ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًۢا بَلِیْغًا ﴿۶۳﴾ اور ان کے نفسوں کے بارے میں موثر بات کریں جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کے جھوٹ کا پول ظاہر بھی ہو جائے پھر بھی فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ علیحدگی میں انکے ساتھ خیر خواہی کی موثر بات کریں، کیونکہ اللہ کے نبیوں کا طریقہ تبلیغ یہی ہے کہ وہ مخالفین کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آتے ہیں اور ان کے ساتھ بہتر، سچی اور موثر بات کرتے ہیں تاکہ ان کی مخالفت موافقت میں تبدیل ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کے سلسلے میں یہ تعلیم بھی دے دی۔

☆☆☆

اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! صحت ایمان کی اولین شرط/ روضۂ رسول پر استشفاع

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَآءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۶۵﴾

اطاعتِ رسول فرض ہے

وَمَآ	اور نہیں	اَرْسَلْنَا	ہم نے بھیجا
مِنْ رَّسُوْلٍ	کوئی رسول	اِلَّا لِیُطَاعَ	مگر اس لیے کہ وہ اطاعت کیا جائے
بِاِذْنِ اللّٰہِ	اللہ کے حکم سے	وَلَوْ اَنَّھُمْ	اور اگر بلاشبہ وہ لوگ
اِذْ ظَّلَمُوْٓا	جب انہوں نے ظلم کیا	اَنْفُسَھُمْ	اپنی جانوں پر
جَآءُوْکَ	وہ آپکے پاس آتے	فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ	پھر وہ معافی مانگتے اللہ سے
وَاسْتَغْفَرَ	اور معافی مانگتا	لَھُمُ	ان کے لیے

الرَّسُوْلُ	رسول	لَوَجَدُوا اللّٰهَ	(تو) یقیناوہ پاتے اللہ کو
تَوَّابًا	بہت توبہ قبول کرنے والا	رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾	نہایت رحم کرنے والا

اطاعت رسول کی دوبارہ ترغیب دی ہے۔یعنی اللہ کے رسول دنیا میں اس لیے آتے ہیں کہ تمام معاملات میں اللہ کے حکم کے مطابق ان کی اطاعت کی جائے۔"ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔اللہ تعالیٰ نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول مبعوث فرما کر انہیں بنی نوع انسان کی ہدایت پر مامور کیا اور اس سلسلہ کی آخری کڑی کے طور پر حضور خاتم النبیین ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ان تمام انبیاء اور رسل کی بعثت کا مقصد ان کی اطاعت تھا اور وہ بھی باذن اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں۔اس لحاظ سے رسول کی اطاعت کو درجہ فرضیت حاصل ہے اور یہ اس لیے کہ رسول کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔یہ بات اسی سورہ میں آگے دوسرے طریقے سے بھی سمجھائی گئی ہے"مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی۔اس آیت میں ان لوگوں کے غلط استدلال کا جواب بھی موجود ہے، جو کہتے ہیں کہ حکم تو صرف اللہ کے لئے ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف:۴۰) اور اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (الاعراف:۵۴) اس لئے صرف قرآن حجت ہے نہ کہ حدیث؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ رسول کی اطاعت بھی دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے ؛اس لئے کہ اللہ ہی نے اس کا حکم دیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت تک پہنچنے کے لیے رسول ہی واحد ذریعہ ہے۔رسول کے پاس کسی شک وشبہ اور غلطی سے مبرا قطعی اور یقینی علم ہوتا ہے۔نبی کے علاوہ ایسی کوئی دوسری ہستی موجود نہیں جس کے اخذ اور بیان میں شبہ کا امکان نہ ہو۔نبی کو اس بات کی گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے احکام ٹھیک ٹھیک اخذ کرتا ہے اور پھر انہیں آگے مخلوق کے سامنے بلا کم وست کا بغیر کسی شبہ اور غلطی کے بیان کر دیتا ہے۔نبی کے بیان اور اولیاء اللہ کے کشف میں یہ بنیادی فرق ہے کہ پیغمبر کا بذریعہ

وحی اخذ، اس کا ضبط اور پھر بیان شک وشبہ سے پاک سوفیصدی درست ہوتا ہے جب کہ صاحب کشف کے کشفی بیان کو یہ قطعیت حاصل نہیں ہوتی۔ ولی کے کشف کو سمجھنے، اسے ضبط کرنے اور پھر بیان کرنے میں خطا کا امکان ہے، لہٰذا یہ سوفیصدی قطعی اور یقینی نہیں ہوتا۔

سورۂ محمد میں ارشادِ مبارک ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (سورہ محمد:33) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو (اور اطاعت سے انحراف کر کے) اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔ اطاعت رسول ﷺ کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت صرف آپ ﷺ کی زندگی تک محدود نہیں بلکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لیے فرض قرار دی گئی ہے۔ اطاعت رسول ﷺ کے بارے میں صحیح بخاری شریف کی یہ حدیث بڑی اہم ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''میری امت کے سب لوگ جنت میں جائیں گے سوائے اس شخص کے جس نے انکار کیا تو صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا انکار کس نے کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (صحیح بخاری:7280) گویا اطاعتِ رسول ﷺ اور ایمان لازم وملزوم ہیں اطاعت ہے تو ایمان بھی ہے اطاعت نہیں تو ایمان بھی نہیں۔ اطاعت رسول ﷺ کے بارے میں قرآنی آیات واحادیث شریفہ کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ دین میں اتباع سنت کی حیثیت کسی فروعی مسئلہ کی سی نہیں بلکہ بنیادی تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے۔ اتباع سنت کی دعوت کو چند عبادات کے مسائل تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ یہ دعوت ساری زندگی پر محیط ہونی چاہیے۔ جس طرح عبادات (نماز، روزہ، حج وغیرہ) میں اتباع سنت مطلوب ہے اسی طرح اخلاق وکردار، کاروبار، حقوق العباد اور دیگر معاملات میں بھی اتباع سنت مطلوب ہے۔ گویا اپنی پوری زندگی میں خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، مسجد کے اندر ہو یا مسجد کے باہر، بیوی بچوں کے ساتھ ہو یا دوست احباب کے ساتھ، ہر وقت، ہر جگہ سنت کی پیروی مطلوب ہے

محض عبادات کے چند مسائل پر توجہ دینا اور زندگی کے باقی معاملات میں سنت کی پیروی کو نظر انداز کر دینا کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں کہلا سکتا۔

فرمایا کہ لوگوں کا فرض تھا کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے۔ خدا کی نازل کردہ ہدایت کی طرف رجوع کرتے مگر یہ لوگ اپنے معاملات اللہ کے رسول کے پاس لانے کی بجائے طاغوتوں کے پاس لے جاتے ہیں وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ اور جب کہ ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا یعنی گناہ اور زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھے، تو ادھر ادھر جانے کی بجائے جَآءُوْكَ آپ کے پاس آجاتے فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ اگر یہ اس وقت تمہارے پاس آ کر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۶۴ تو یہ اللہ کو بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان پاتے۔ گویا طلب بخشش کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے کہ اللہ کے نبی کے پاس آجاتے، خود بھی اللہ سے اپنی لغزش کی معافی مانگتے۔ اللہ کے رسول سے بھی درخواست کرتے اور وہ بھی ان کے لیے بارگاہ رب العزت میں ہاتھ اٹھا دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ تو ہے ہی تو اب اور رحیم، ان کی معافی کا انتظام ہو جاتا ہے۔

معافی کیلئے اولین شرط

معلوم ہوا کہ معافی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ایمان سے متصف ہو۔ کیونکہ ایمان کے بغیر بخشش نہیں۔ نبی اسی صورت میں گنہگار کے لیے بخشش کی دعا کرے گا جب کہ اس کے اندر ایمان موجود ہو۔ کیونکہ مشرک، جس کا خاتمہ کفر اور شرک پر ہوا ہو، اس کے لے معافی کی درخواست کرنا جائز نہیں۔ بہر حال فرمایا اولاً یہ لوگ خود ایمان دار ہوں اور ثانیاً اپنی بخشش کے لیے خود اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے "مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰه" اللہ کے سوا کون ہے جو انسان کی غلطیوں، کوتاہیوں کو معاف فرما دے۔ اور تیسری بات یہ کہ اللہ کا رسول بھی ان کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے سفارش کرے۔ اور ایسا کرنا نبی کے لیے عین روا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ" (سورۃ محمد) یعنی اپنی لغزشوں کی بھی اللہ سے

معافی مانگیں اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کریں۔ حضرتِ عُبادہ بن صامت رضیَ اللہُ عَنہُ فرماتے ہیں کہ میں نے رسُولُ اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: مَنِ اسْتَغْفَرَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ کَتَبَ اللہُ لَہٗ بِکُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَۃٍ حَسَنَۃً یعنی جو شخص سب مسلمان مردوں اور عورتوں کیلئے استغفار کرے، اللہ کریم اس کے لئے ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت کے بدلے ایک نیکی لکھے گا۔

روضہ اقدس پر حاضر ہو کر شفاعت طلب کرنا

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ سے حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں آپ سے استشفاع تو بالکل واضح ہے (استشفاع کا لغوی معنی "سفارش چاہنا" یا "شفاعت کی درخواست کرنا" ہے۔) جب کوئی شخص غلطی کرتا، پھر اسے ندامت ہوتی تو وہ حضور ختمی رسالت کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرتا، پھر آپ سے بھی بخشش طلب کرنے کی درخواست کرتا تو حضور ﷺ اس کے لیے معافی مانگتے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا۔ اس قسم کے واقعات بہت سے صحابہؓ کے متعلق احادیث میں آتے ہیں۔ مثلاً حضرت اسامہؓ سے غلطی ہوگئی تو آپ ناراض ہو گئے، پھر اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، حضور میرے لیے بخشش کی دعا کریں تو آپ نے ایسا کیا تاہم مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کا عموم بتاتا ہے کہ اگر حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی کوئی شخص آپ کے روضہ اقدس پر حاضر ہو کر اپنی غلطی کی اللہ سے معافی طلب کرے اور نبی (علیہ السلام) کی خدمت میں بھی طلب معافی کی درخواست کرے تو ایسا کرنا جائز ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ حضور ﷺ سے استشفاع کی دعا کرنا جائز ہے۔ صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے بعد بندہ حضور ﷺ سے درخواست کرے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سفارش کریں کہ اللہ میرے گناہ معاف فرما دے میرا خاتمہ بالایمان ہو اور میں آپ کی ملت میں شریک رہوں۔

سماعِ موتیٰ کے بارے میں جمہور علماء کرام کا موقف

سماعِ موتیٰ کے متعلق حضور ﷺ کی یہ صحیح حدیث موجود ہے مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِی سَمِعْتُہٗ، وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ نَائِیًا أُبْلِغْتُہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے تو میں اسے خود سنتا ہوں، اور جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجتا ہے تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح) عام مردوں کے سننے کے متعلق علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض سماع کے حق میں ہیں اور بعض مخالفت میں، صحابہ کرام علیہم الرضوان کے دور سے لے کر آج تک یہ اختلاف ختم نہیں ہوسکا، لہٰذا اس مسئلہ میں زیادہ سختی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ تاہم انبیاء (علیہم السلام) کی سماعت کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔ اگر نبی (علیہ السلام) کی قبر اطہر پر جا کر سلام عرض کیا جائے تو آپ بنفس نفیس اسے سماعت فرماتے ہیں۔ علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق بھی یہ مسئلہ متفق علیہ ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ سفر پر روانگی سے پہلے اور سفر سے واپسی پر حضور ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سلام عرض کرتے۔ ظاہر ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ قبر شریف پر حاضر ہو کر سلام کرنے سے حضور خود سنتے ہیں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو انہیں وہاں قبر پر جانے کی کیا ضرورت تھی، درود وسلام تو ہر مقام سے آپ کی خدمت میں پہنچ ہی جاتا ہے۔ امام ابن کثیر نے عتبی کی روایت بیان فرمائی محمد بن حبیب العتبی کہتے ہیں کہ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی (دیہاتی) آیا اور اس نے کہا: "اے اللہ کے رسول! میں آپ کے پاس اپنے گناہوں کی معافی اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ کو واسطہ (شفیع) بنا کر حاضر ہوا ہوں۔ پھر اس نے سورۃ النساء مذکورہ آیت پڑھی جس میں ہے کہ اگر وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہوئے آپ کے پاس آتے اور اللہ سے معافی مانگتے تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا پاتے۔ عتبی کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ اعرابی چلا گیا، تو مجھے غفلت کی نیند آ گئی۔ میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ نے فرمایا: "اے عتبی! اس اعرابی کے پاس جاؤ اور اسے بشارت دو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا ہے۔

رسول کی تحکیم واطاعت ایمان کے لیے لازم

فَلَا وَرَبِّكَ	آپ کے رب کی قسم!	لَا يُؤْمِنُوْنَ	نہیں وہ مومن ہو سکتے
حَتّٰى	یہاں تک کہ	يُحَكِّمُوْكَ	وہ آپ کو حاکم مانیں
فِيْمَا	اس چیز میں کہ	شَجَرَ	اختلاف ہو جائے
بَيْنَهُمْ	ان کے درمیان	ثُمَّ لَا يَجِدُوْا	پھر نہ وہ پائیں
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ	اپنے دلوں میں	حَرَجًا	کوئی تنگی
مِّمَّا	اس سے جو	قَضَيْتَ	آپ فیصلہ کر دیں
وَيُسَلِّمُوْا	اور وہ تسلیم کر لیں	تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾	(دل وجان سے) تسلیم کرنا

ارشاد ہوتا ہے فَلَا وَرَبِّكَ تیرے رب کی قسم۔ یہاں پر تاکید قسم کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس قسم کی مثالیں قرآن پاک میں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہیں مثلاً لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ اور "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ تو معنی یہ ہوا، تیرے رب کی قسم لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ لوگ ایماندار نہیں ہو سکتے حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ جب تک کہ وہ آپ کو اپنے تنازعات میں حکم یا منصف مقرر نہ کریں شَجَرَ میں ہر قسم کے معاملات اور تنازعات شامل ہیں خواہ وہ احکام میں ہوں یا عقائد میں۔ ہر معاملہ میں اللہ کے رسول کو منصف بناؤ اور پھر آپ کے ارشادات میں جو چیز مل جائے اسے صدق دل سے تسلیم کر لو۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ اہلِ مدینہ پہاڑ سے آنے والے پانی سے باغوں میں آبپاشی کرتے تھے۔ وہاں ایک انصاری کا حضرت زبیر رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے جھگڑا ہوا کہ کون پہلے اپنے کھیت کو پانی دے گا۔ یہ معاملہ نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے حضور پیش کیا گیا۔ سرکارِ مدینہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا، اے زبیر! تم اپنے باغ کو پانی دے کر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دو۔ حضرت زبیر رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو پہلے پانی کی اجازت اس لئے دی گئی کہ ان کا کھیت پہلے آتا تھا، اس کے باوجود سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے انصاری کے ساتھ بھی احسان کرنے کا فرمادیا لیکن مجموعی فیصلہ انصاری کو

ناگوار گزرا اور اس کی زبان سے یہ کلمہ نکلا کہ زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ باوجود اس کے کہ فیصلہ میں حضرت زبیر رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ کو انصاری کے ساتھ احسان کی ہدایت فرمائی گئی تھی لیکن انصاری نے اس کی قدر نہ کی تو حضور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے حضرت زبیر رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ کو حکم دیا کہ اپنے باغ کو سیراب کر کے پانی روک لو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری، کتاب الصلح، باب اذا اشار الامام بالصلح۔۔۔الخ، ۲/ ۲۱۵، الحدیث: ۲۷۰۸)

اور بتا دیا گیا کہ حبیب خدا، محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے حکم کو تسلیم کرنا فرضِ قطعی ہے۔ جو شخص تاجدارِ رسالت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا وہ کافر ہے، ایمان کا مدار ہی اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے حکم کو تسلیم کرنے پر ہے۔ فرمایا کامل الایمان ہونے کے لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر معاملہ میں حضور ﷺ ہی کو حکم بنایا جائے۔ اور جب آپ فیصلہ فرما دیں گے ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ بلکہ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۶۵ آپ کے فیصلے کو خوشی سے قبول کر لیں۔ اسی میں اللہ کی رضا اور ہماری بہتری ہے خواہ اس فیصلے میں کوئی نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ بہر حال حضور ﷺ کا فیصلہ انجام کے لحاظ سے لازماً بہتر ہوگا۔

مرافعہ کا معنی و مفہوم

آیت بالا میں رسول اللہ ﷺ کو فیصل بنانے کا حکم ہے؛ حالاں کہ آپ تو پہلے سے فیصل ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ محض فیصل ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے پاس اپنے مقدمات لے جانا کوئی کمال نہیں ہے، یہ تو ہر حاکم اور قاضی کے یہاں ہوتا ہے کہ ماتحت افراد اس کے یہاں مقدمات لے جانے پر مجبور ہوتے ہیں اور بادل ناخواستہ فیصلہ کو قبول کرنا پڑتا ہے، یہاں باقاعدہ فیصل بنانے اور مقدمات کے مرافعہ کا حکم اس لیے دیا ہے کہ عام حاکموں کی طرح محض رسماً یا زور زبردستی کے ساتھ اپنے مقدمات آپ کی بارگاہ میں نہ لے جائیں، بل کہ دل و جان سے قبول کرتے ہوئے مقدمات لے جائیں؛ کیوں کہ آپ تو فیصل پہلے سے ہی ہیں، جب ضرورت کے موقع پر آپ کے یہاں لے جائیں تو آپ کا احترام اور تقدس زیادہ ہوگا اور یہ احساس بھی ہوگا کہ فیصلہ تو آپ ہی سے

کرانا ہے، چاہے ہمارے حق میں ہو یا ہمارے خلاف ہو، ایسا نہیں کہ اگر فیصلہ موافق ہونے کی امید ہو تو مقدمہ لے جائیں گے ورنہ نہیں، (مرافعہ کا معنی و مطلب جب کسی ماتحت عدالت (Lower Court) کا قاضی یا جج کوئی فیصلہ سناتا ہے، اور فریقین میں سے کوئی اس فیصلے سے مطمئن نہیں ہوتا، تو وہ اس فیصلے کو ختم کروانے یا اس میں ترمیم کے لیے مروجہ قوانین کے تحت اعلیٰ عدالت (Higher Court) میں لے جاتا ہے۔ قانون کی زبان میں اسے اپیل دائر کرنا یا مرافعہ کرنا کہتے ہیں۔) اسی لیے آیت میں اللہ تعالی نے صرف حَکَم بنانے پر اکتفاء نہیں کیا؛ بل کہ مزید یہ ارشاد فرمایا کہ آپ کے فیصلے کو قبول کریں، دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں اور اپنے آپ کو مکمل طریقہ سے سر تسلیم خم کر دیں؛ تاکہ کسی بھی درجہ میں رسول کی مخالفت نہ پائی جائے۔ مذکورہ آیت سے متعلق بہت ساری باتیں ذکر کی جا چکی ہیں، جن کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے لیے لازم اور ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور شریعت کو اختیار کریں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے مسائل کو حل کرانے کی کوشش کریں اور اسی کے مطابق عمل کریں، یہی ہمارے ایمان کا تقاضا ہے اور یہی ہمارے لیے بنیادی چیز ہے، باہمی اختلاف ونزاع کے مواقع پر دنیاوی عدالتوں کا رخ کرنے کے بجائے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کریں، اسی کے مطابق فیصلے کرائیں، اپنی نجی زندگیوں میں دین وشریعت کو ملحوظ رکھیں اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں، اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو اسے سمجھانے کی کوشش کریں، تھانہ پولیس سے اپنے کو بچائیں، اسی میں ہماری کامیابی ہے اور یہی رسول کی اطاعت اور رسول کو حکم اور فیصل بنانا ہے، یہی آپ کے فیصلوں کو دل وجان سے قبول کرنا ہے اور یہی اپنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خم کرنا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے چند مسائل معلوم ہوئے

(1).....اللہ عَزَّوَجَلَّ نے اپنے رب ہونے کی نسبت اپنے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی طرف فرمائی اور فرمایا اے حبیب! تیرے رب کی قسم۔ یہ نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی عظیم شان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پہچان اپنے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے ذریعے سے کرواتا ہے۔ (2).....حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا حکم ماننا فرض قرار دیا اور اس بات کو اپنے رب ہونے کی قسم کے ساتھ پختہ کیا۔ (3).....حضور اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا حکم ماننے سے انکار کرنے والے کو کافر قرار دیا۔ (4).....تاجدار مدینہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم

حاکم ہیں۔(5).....رسولِ کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا حکم دل و جان سے ماننا ضروری ہے اور اس کے بارے میں دل میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔اسی لئے آیت کے آخر میں فرمایا کہ پھر اپنے دلوں میں آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے حکم کے متعلق کوئی رکاوٹ نہ پائیں اور دل و جان سے تسلیم کرلیں۔(6).....اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی احکام کا ماننا فرض ہے اور ان کو نہ ماننا کفر ہے نیز ان پر اعتراض کرنا، ان کا مذاق اڑانا کفر ہے۔اس سے وہ لوگ عبرت حاصل کریں جو کافروں کے قوانین کو اسلامی قوانین پر فَوقِیَّت دیتے ہیں۔

☆☆☆

اسلام میں جزاوسزا کا تصور وفلسفہ/ انعام یافتہ چار جماعتیں!
انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، صالحین

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ
اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ
تَثْبِيْتًا ۝۶۶ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۶۷ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا ۝۶۸ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝۶۹ ذٰلِكَ
الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝۷۰

اللہ پر ایمان اور ثابت قدمی

وَلَوْ اَنَّا	اور اگر بیشک ہم	كَتَبْنَا	فرض کر دیتے
عَلَيْهِمْ	ان پر	اَنِ اقْتُلُوْٓا	یہ کہ تم قتل کرو
اَنْفُسَكُمْ	اپنی جانوں کو	اَوِ اخْرُجُوْا	یا تم نکلو
مِنْ دِيَارِكُمْ	اپنے گھروں سے	مَّا	(تو) نہ

فَعَلُوْهُ	وہ کرتے یہ کام	اِلَّا قَلِيْلٌ	مگر تھوڑے
مِّنْهُمْ ؕ	ان میں سے	وَلَوْ اَنَّهُمْ	اور اگر بلاشبہ وہ
فَعَلُوْا	کر لیتے	مَا	وہ (کام) کہ
يُوْعَظُوْنَ	وہ نصیحت کیے جاتے ہیں	بِهٖ	اس کی
لَكَانَ	تو ہوتا	خَيْرًا لَّهُمْ	بہت بہتر ان کے لیے
وَاَشَدَّ	اور زیادہ	تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾	ثابت قدم رکھنے والا (دین میں)

ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ ۔ اور اگر ہم لکھ دیتے یعنی ان منافقین پر فرض کر دیتے ۔کتب کا لغوی معنی لکھنا ہوتا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ فرض قرار دیتے ۔جیسے دوسرے مقام پر فرمایا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے ۔ یا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں ۔اسی طرح فرمایا کہ اگر ان پر فرض کر دیا جاتا اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کہ اپنے آپ کو قتل کرو تو فرمایا اگر ہم تم پر بھی خودکشی فرض کر دیتے اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ یا اپنے گھروں سے نکل جانے کو ضروری قرار دیتے مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ تو وہ ایسا نہ کرتے مگر ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ۔بنی اسرائیل کو خودکشی کا حکم ہوا اور انہوں نے لیت ولعل کرنے کے بعد حکم کی تعمیل بھی کی ۔ یہاں مخلص ومنافق سب کے اعتبار سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے تھوڑے ہی ایسا کرتے جیسا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے اور توبہ کے لئے اپنے آپ کو قتل کا حکم دیا تھا۔اس آیت کا شانِ نزول کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے ایک یہودی نے کہا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے ہم پر خود کو قتل کرنا اور گھر بار چھوڑنا فرض کیا تھا، ہم اس کو بجالائے تھے ۔اس پر حضرت ثابت رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا کہ اگر اللہ عَزَّوَجَلَّ ہم پر فرض کرتا تو ہم بھی ضرور بجالاتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔(تفسیر طبری، النساء، تحت الآیۃ: ۶۶، ۴ / ۱۶۳) کہ یہ کہنا تو آسان ہے لیکن اگر واقعی ایسا حکم دیدیا جاتا تو ایک بڑی تعداد اس حکم پر

عمل نہ کرتی۔اس میں بطورِ خاص منافقین یا نئے نئے مسلمان ہونے والے داخل ہوں گے جیسے منافقین اکثر جہاد سے فرار کی راہ ہی اختیار کرتے تھے اور نئے نئے مسلمان ہونے والے بھی کئی جنگوں میں ثابت قدم نہ رہ سکے۔جہاں تک مخلصین یعنی جلیلُ القدر صحابہ رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْھُم کا تعلق ہے تو کتنے ہی صحابہ رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْھُم ایسے ہیں جنہوں نے مختلف جنگوں میں خود کو سرکارِ دو عالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے آگے کھڑا کر دیا اور حضور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔مزید فرمایا کہ اگر تمہیں خود کو قتل کرنے یا اپنے گھروں سے نکل جانے کا حکم دیا جاتا تو تم میں سے تھوڑے لوگ ہی کرتے لیکن اگر وہ ہر اُس حکم پر عمل کریں جو انہیں دیا جائے خواہ خود کو جان سے مار دینے کا ہو یا گھروں سے نکل جانے کا بہرصورت یہ ان کیلئے بہت بہتر ہوتا اور ایمان پر ثابت قدمی کا ذریعہ ہوتا اور اس پر ہم انہیں عظیم اجر وثواب عطا فرماتے اور انہیں صراط مستقیم کی اعلیٰ درجے کی ہدایت عطا فرماتے۔

اَنِ اقْتُلُوْٓا اور اَوِ اخْرُجُوْا سے مراد

مفسرین کرام اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے مراد جہاد ہے اور اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ سے مراد ہجرت ہے۔مگر یہ دونوں چیزیں منافقین کے لیے بھاری ہیں۔وہ تو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں وہ جہاد اور ہجرت جیسے مشکل امور کیسے انجام دینگے، حالانکہ اسلام نے انہیں فرض قرار دیا ہے اسی لیے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان دو باتوں کا حکم دیتا ہے تو اس پر بہت قلیل تعداد عمل پیرا ہوتی۔منافقین کی اس کمزوری کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ اگر یہ لوگ ہمارے حکم کی تعمیل کر لیتے ہیں یعنی جس بات کی نصیحت کی جارہی ہے۔اسے کر گزرتے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے، اپنے تمام معاملات رسول خدا کے پاس لاتے، قرآن و سنت کو اپنی آخری پناہ گاہ بنا لیتے، تو فرمایا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہو جاتے دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہوتی اور آخرت کی فلاح تو بہرحال

یقینی ہے وَاَشَدَّ تَثْبِیْتًا ﴿۶۶﴾ اور حکم دین کی تعمیل پر پختگی کی دلیل ہوتا۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دین پر پختگی کسی شخص کے اعتقاد اور ایمان کی پختگی کی علامت ہوتی ہے دین کے احکام پر جس قدر عمل ہوگا اسی قدر اعتقاد اور ایمان میں مضبوطی آئیگی۔ اور عمل میں جس قدر کمزوری آئیگی، اعتقاد اور ایمان بھی اسی قدر کمزور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایمان میں پختگی آئیگی تو انسان جہاد اور ہجرت کے لیے تیار ہو جائے گا۔ پھر اس کے لیے کوئی کام دشوار نہیں رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ایک حکم پر عمل کرنے سے دوسرے احکام پر بھی عمل کرنے اور ثابت قدم رہنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے، جیسے مال مال کو کھینچتا ہے اور پیسہ سے پیسہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح ایک نیکی دوسری نیکی کو وجود میں لاتی ہے اور ایک برائی دوسری برائی تک انسان کو لے جاتی ہے۔

یعنی مستقل مزاج بن کر پہاڑوں کی طرح زندہ رہو، تنکوں کی طرح زندگی مت گزارو کہ ہوا تیز ہے اور شعلہ بیباک، مطلب یہ کہ اگر حقیر تنکے بن جاؤ گے تو پھر نہ ہوا کے سامنے ٹھہر سکو گے اور نہ آگ سے بچ سکو گے اگر عزت و ناموس کی زندگی گزارنا ہے، تو پہاڑوں اور چٹانوں کی طرح مضبوط بن جاؤ۔ آج کی سوسائٹی میں لوگ ڈانواں ڈول پھر رہے ہیں۔ چاروں طرف گمراہی اور اس کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ایمان کی پختگی باقی نہیں رہی لوگ معمولی سی آزمائش پر بھی پورا نہیں اترتے بلکہ قدم قدم پر پھسل جاتے ہیں۔ رسم و رواج اور بدعات میں غرق ہو چکے ہیں۔ مشرک، کافر، اور دہریہ اقوام نے دنیا میں ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ لوگ گمراہی کی طرف فوراً راغب ہو جاتے ہیں لہو و لعب، کھیل تماشہ، عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے کاموں پر فوراً تیار ہو جاتے ہیں، ایمان بالکل کمزور ہو چکا ہے ان حالات کے متعلق حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ دین پر ثابت قدم رہنا اتنا مشکل ہو جائیگا جیسے جلتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑنا مشکل ہوتا ہے۔

جزاء اور وعدہ

وَّاِذًا	اور تب	لَّاٰتَیْنٰھُمْ	البتہ ہم دیتے انہیں
مِّنْ لَّدُنَّآ	اپنی طرف سے	اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۶۷﴾	اجر بہت بڑا

فرمایا اگر یہ لوگ احکام خداوندی پر عمل پیرا ہو جائیں وَّاِذًا لَّاٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِیْمًا ۶۷ تو ہم انہیں اجر عظیم عطا کرتے۔ یعنی اگر یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تابعداری کرتے، تقویٰ کی راہ اختیار کرتے، ہر معاملہ میں شریعت سے راہنمائی حاصل کرتے اور تمام معاملات میں دین ہی کو مقدم رکھتے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں بہت بڑا صلہ عنایت فرمائے گا۔ اس آیت میں اسی بات کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ لوگ نصیحت اور احکام پر عمل پیرا ہو جاتے، تو اللہ تعالیٰ بطورِ صلہ انہیں اپنی بارگاہ سے عظیم الشان ثواب اور اجرِ عظیم عطا فرماتا مِّنْ لَّدُنَّآ (ہمارے پاس سے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اجر کسی بندے کی طرف سے نہیں بلکہ براہِ راست رب کائنات کے پاس سے ہوگا، جو اس کے فضل و کرم کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ اللہ رب العزت نے انسان کی پیدائش کے ساتھ اس میں دو قوتیں خیر و شر کی بھی رکھ دیں اور ایک ایسا نظام وضع کر دیا جس میں انسان کی ان قوتوں کے زیر اثر انجام پانے والے اعمال پر جزا و سزا کا تصور بھی رکھ دیا کہ عمل خیر پر جزا اور عمل شر پر سزا بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِیَجْزِیَ اللّٰہُ کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (ابراہیم، 14: 51) ''تاکہ اللہ ہر شخص کو ان (اعمال) کا بدلہ دے دے جو اس نے کما رکھے ہیں۔ بے شک اللہ حساب میں جلدی فرمانے والا ہے۔'' اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ ''ہر شخص اُن (اَعمال) کے بدلے جو اُس نے کما رکھے ہیں گروی ہے۔'' (المدثر، 74:38)

قرآن میں عمل خیر اور عمل شر کا تصور

انسان کی فطرت دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک اس میں ارادہ خیر پایا جاتا ہے اور دوسرا اس میں ارادہ شر پایا جاتا ہے اور ان دونوں قوتوں میں تصادم جاری رہتا ہے اور دونوں کی کشمکش بڑھتی رہتی ہے اگر انسان کے اندر ارادہ شر کی قوتیں غالب آجائیں تو انسان اسفل السافلین کے انجام تک جا پہنچا اور اگر اس میں ارادہ خیر کی قوتیں فائق و برتر اور غالب آجائیں تو ہر انسان، انسان مرتضیٰ بن جاتا ہے (مرتضیٰ کا لغوی معنیٰ ''چُنا ہوا''، ''منتخب کیا ہوا''، ''پسندیدہ'' اور ''وہ شخص جس سے اللہ راضی ہو''

ہے) اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْم اور وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ کا مستحق اور مصداق ٹھہراتا ہے اور افضلیت خلق کا تاج اس کے سر پر سجایا جاتا ہے۔ اسلام انسان کے اندر نیکی اور خیر کی قوتوں کو فروغ دینے کے لیے ایک ترغیب اور ایک تحریک پیدا کرتا ہے جبکہ برائی و شر سے متنفر کرتا ہے، گناہ و خطا سے دور لے جاتا ہے اور معصیت و نافرمانی سے کنارہ کش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام گناہ اور خطا سے نفرت کرتا ہے مگر خطا کار اور گناہگار سے نفرت نہیں کرتا۔ ظلم و استحصال سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے مگر مظلوم سے اظہار ہمدردی کا حکم دیتا ہے۔ ظالم و حاکم کے نظام ظلم سے نفرت کرتا ہے مگر محکوم رعایا کے لیے عدل و انصاف کی فراہمی کی کاوشوں کی حمایت کرتا ہے۔ جابر و ستم گر کے ظلم کو روکنے کی ترغیب دیتا ہے مگر مجبور و مقہور کے ساتھ اظہار یکجہتی کی تعلیم دیتا ہے۔ جرم سے نفرت کی صدا بلند کرتا ہے مگر مجرم سے اظہار ہمدردی اور خیر خواہی کی نصیحت کرتا ہے۔

دنیا و آخرت کی کامیابی

وَّلَهَدَيْنٰهُمْ	اور ہم انہیں ضرور چلاتے	صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۶۸	سیدھے راستے پر

فرمایا: وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۶۸ اور انہیں دنیا میں صراط مستقیم کی طرف راہنمائی بھی حاصل ہوتی۔ مقصد یہ کہ تعمیل حکم کی صورت میں انہیں دنیا میں صراط مستقیم حاصل ہو جاتا، جس پر چل کر وہ کامیاب زندگی گزار سکتے، اور پھر آخرت میں اجر عظیم کے مستحق ہوتے۔ اس طرح دنیا اور آخرت دونوں مقامات پر کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ صراط مستقیم ہر مومن کا مطلوب و مقصود ہے جس کے حصول کے لیے ہر نماز میں دعا کی جاتی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ "اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم پر چلا۔ جسے یہ چیز حاصل ہو جائے اس کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صراط مستقیم اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اس کے احکام پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔

صراط مستقیم کیا ہے؟ اور اللہ کے انعام یافتہ بندے کون ہیں؟

وَمَنْ	اور جو کوئی	يُّطِعِ اللّٰهَ	اطاعت کرے اللہ کی
وَالرَّسُوْلَ	اور رسول کی	فَاُولٰٓئِكَ	تو یہ لوگ

مَعَ	ساتھ ہوں گے	الَّذِیْنَ	ان لوگوں کے کہ
اَنْعَمَ اللّٰہُ	انعام کیا اللہ نے	عَلَیْھِمْ	ان پر
مِّنَ النَّبِیّٖنَ	نبیوں سے	وَالصِّدِّیْقِیْنَ	اور صدیقوں (سے)
وَالشُّھَدَآءِ	اور شہیدوں (سے)	وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ	اور صالحین (سے)
وَحَسُنَ	اور اچھے ہیں	اُولٰٓئِکَ	یہ لوگ
رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾		رفیق (ساتھی) کے طور پر	

ارشاد فرمایا وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، منعم علیہم کون کون ہیں؟ اس آیت میں چار قسم کے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ فضیلت اور درجہ کے لحاظ سے بلند تر مقام رکھتے ہیں۔ فرمایا مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔ نمبر 1 انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ نبی ہی اپنی امت کا افضل ترین فرد ہوتا ہے جسے اللہ نبوت کے لیے چن لیتا ہے۔ نمبر 2 صدیق سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے ہر معاملہ میں راست باز ہو حق کا ساتھ دینے والا، ہمیشہ سچ بولنے والا، حق کی فوراً گواہی دینے والا اور باطل کے خلاف ڈٹ جانے والا ہو۔ نمبر 3 شہید کا بنیادی معنیٰ گواہ ہے۔ اور اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرز عمل سے شہادت دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی جان دے کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا اسے فی الواقع درست سمجھتا تھا۔ نمبر 4 صالح سے مراد ایسا نیک سرشت آدمی ہے جس کے ہر عمل اور ہر حرکت سے اس کی نیکی ظاہر ہوتی ہو اور اپنی پوری زندگی میں نیک اعمال اور اچھا رویہ رکھتا ہو۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی بسر وچشم اطاعت کرتا ہو، اس آیت میں اسے اخروی زندگی میں مندرجہ بالا چار قسم کے لوگوں کی رفاقت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ اور یہ دراصل اس کے اعمال کا بدلہ نہیں بلکہ محض اللہ کا فضل ہوگا۔

اس آیت مبارکہ میں انسانوں کی درجہ بندی کی گئی ہے اعمال، کردار اور اعتقادات کی نسبت سے، یعنی اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو مخلوقات میں سے اکثر پر فضیلت دی اور پھر اس کی پرورش کے لیے تمام کائنات کو پیدا کر دیا ہر قسم کی سہولیات، ہر قسم کے فائدے انسان کو جسمانی صحت کے لیے دیئے اور پھر روحانی صحت کے لیے اس کو اپنے نبیوں کے ذریعے ایسے اصول دیئے جو اس کو برائی سے بچا کر نیکی کی راہیں دکھاتے ہیں۔ پیغام پہنچانے والے کو رسول، نبی یا پیغمبر کہتے ہیں۔ ان کی فطرت عام لوگوں سے بہت پاکیزہ ہوتی ہے۔ بچپن سے ہی یہ نیک فطرت، پاک دامن اور انتہائی شریف مزاج لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ رب العزت ان کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ اور انسانوں میں سب سے بلند درجہ انبیاء علیہم السلام (نبی کی جمع) کا ہے، پھر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا حکم ماننا بندوں پر فرض کر دیا گیا ہے۔ ان انبیاء میں حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، داؤد، سلیمان، عیسیٰ، موسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور حضرت محمد ﷺ شامل ہیں۔ ان پر جو لوگ سب سے پہلے اور بغیر حیل وحجت کے ایمان لے آئے وہ صدیقین کے درجہ پر آتے ہیں جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لے آئے، پھر جو لوگ ان انبیاء پر اور اللہ پر اس قدر بھروسہ کرتے ہیں اور اس قدر عزت اور احترام کرتے ہیں کہ اپنی جان، مال، اولاد اور اپنی ہر چیز ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں ان کو شہداء (شہید کی جمع ہے) کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ درجہ بھی بہت بلند درجہ ہے۔ چوتھے نمبر پر صالحین (صالح کی جمع) کا درجہ آتا ہے۔ اس میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے خیالات پاکیزہ ہوں جو کبھی بھی شیطان کے بہکانے میں آ کر غلط کام نہ کریں اور اگر کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً اللہ کے سامنے جھک کر عاجزی اور خلوص سے معافی مانگ لیتے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے، قتل نہیں کرتے، غیبت نہیں کرتے، چوری نہیں کرتے، دوسروں کو نہ تنگ کرتے ہیں، نہ ان کا حق مارتے ہیں، غرض اللہ کی بتائی ہوئی ہر بات کو دل وجان سے مانتے ہیں اور ہرگز کسی بھی فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، ہر وقت اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ غرض اللہ کی مخلوق میں اللہ

کے مقبول ترین بندوں میں سب سے پہلا درجہ انبیاء کا، پھر صدیقین کا، پھر شہداء کا اور پھر صالحین کا آتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ نیک اور اچھے لوگوں کو دوست بنانا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے جس شعبہ میں بھی رہ کر کام کر رہا ہو اس کو اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے اصولوں سے ہٹ کر ہرگز کام نہیں کرنا چاہئے۔

اللہ سبحان وتعالیٰ کا علم ہر شے پر محیط ہے

ذٰلِكَ الْفَضْلُ	یہ فضل ہے	مِنَ اللّٰهِ ؕ	اللہ کی طرف سے
وَ كَفٰى بِاللّٰهِ	اور کافی ہے اللہ	عَلِيْمًا ۝	جاننے والا

فرمایا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ انبیاء، اصدقا، شہدا اور صالحین کی معیت حاصل ہو جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل ہے، جسے نصیب ہو جائے یہ اس کی خاص مہربانی اور انعام ہے۔ اللہ اپنے فضل و کرم سے ان کو بہترین لوگوں کی دوستی عطا کر دیتا ہے اور پھر آخرت میں بھی ان کو ایسے ہی لوگوں کے قریب جگہ ملے گی۔ جنت کے بھی کئی درجات ہیں اور اسی طرح دوزخ کے بھی کئی درجات ہیں۔ اللہ جل شانہ ہمیں دوزخ سے بچا کر جنت میں اپنے مقبول بندوں کے قریب ترین بہترین جگہ عطا کرے اور اس کے لیے قرآن وسنت پر سختی سے عمل کرنا بے حد ضروری ہے وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝ اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا۔ یہ چیز رب العزت کے علم میں ہے کہ کون شخص کتنے خلوص کا حامل ہے اس میں ایمان اور تقویٰ کی کتنی مقدار ہے لہٰذا یہ شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق ثمرہ ادا کیا جائے گا۔ علیم کل فقط ذات خداوندی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحیح راستہ ان چار جماعتوں والا ہے، اس لیے ہر بندے کو چاہیے کہ اپنی دعاؤں کے اوقات اور مناجات کے وقت ان چاروں جماعتوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر ان کی راہ حق طلب کرتا رہے، آخر میں دعا ہے کہ اللہ پاک ان چار جماعتوں کی اتباع اور رفاقت نصیب کرے، آمین!

☆☆☆

جنگ احد کے بعد مسلمانوں کی حالت اور احکام/ جہاد کی حقیقت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ
مِنْکُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ
اَکُنْ مَّعَھُمْ شَھِیْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَکُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰہِ لَیَقُوْلَنَّ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْۢ
بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ مَوَدَّۃٌ یّٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَھُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْیُقَاتِلْ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ؕ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۷۴﴾

اسباب اختیار کے متعلق شرعاً حکم

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو!
خُذُوْا	تم لے لو	حِذْرَکُمْ	اپنے بچاؤ کا سامان
فَانْفِرُوْا	پھر تم نکلو	ثُبَاتٍ	گروہ گروہ
اَوِ انْفِرُوْا	یا تم نکلو	جَمِیْعًا ﴿۷۱﴾	اکٹھے

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے صاحب ایمان لوگو! خُذُوْا حِذْرَکُمْ اپنے بچاؤ کا سامان کرلو۔ خُذُوْا حِذْرَکُمْ میں یہ بات بھی آتی ہے کہ ہر زمانے میں کامیاب جنگ لڑنے

کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی کا حصول بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم دشمن کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنی قوت، سرمائے اور دیگر وسائل کے ساتھ جنگ کی تیاری کرو۔ مسلمان مادی لحاظ سے اگرچہ کمزور ہیں تاہم اگر قوت ایمان بھی موجود ہو تو پھر بھی مسلمان ناقابل تسخیر ہوتا ہے مگر افسوس کہ مسلمان اس سے بھی محروم ہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ ایمان والو! اپنے دفاع کے لیے ہر مطلوبہ سامان مہیا کرو، جدید ترین آلات حرب سے لیس ہونے کی کوشش کرو اور پھر مناسب جنگی حکمت عملی کے تحت دشمن پر حملہ آور ہو۔ اور اس سلسلہ میں فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ﴿۷۱﴾ نکل کھڑے ہو گروہوں کی صورت میں یا سب اکٹھے ہو کر۔ مقصد یہ ہے کہ موقع کی مناسبت سے خواہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں حملہ آور ہو یا یکدم پوری قوت اور لشکر جھونک دو۔ جس طریقے سے کامیابی کا امکان ہو، وہی طریقہ استعمال کرو۔ بعض اوقات کھلے عام ٹکر لینے کی بجائے گوریلا وار زیادہ مناسب حال ہوتی ہے ویت نامیوں نے امریکہ کے خلاف دس سال تک گوریلا جنگ لڑی جس میں تیس لاکھ آدمی ہلاک ہوئے اور بالآخر امریکہ کو ویت نام سے جانا ہی پڑا۔ بہرحال فرمایا کہ پوری تیاری کے بعد مناسب طریقہ سے جنگ کا آغاز کرو۔ اس آیت میں مسلمانوں کو جہاد کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے، قرآن کے اس حکم سے معلوم ہوا کہ جہاد میں اللہ پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ حفاظت اور مدافعت کے ظاہری اسباب و وسائل بھی اختیار کرنے چاہئیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ اسباب کی فراہمی کے اعتبار سے کب جہاد میں اقدام درست ہے اور کب نہیں؟ جہاں تک دشمن کے حملہ کی مدافعت کی بات ہے تو اس میں تو انسان مجبور ہے اور یہ بہرحال کرنا ہی ہے گروہ در گروہ اور اکٹھے مل کر سبھوں کو معرکۂ جہاد میں جانے کا حکم مواقع و حالات کے اعتبار سے ہے کہ حسن تدبیر کا جو تقاضا ہو، وہ کیا جائے۔

منافقوں کے کردار کا تذکرہ

وَاِنَّ	اور بلاشبہ	مِنْكُمْ	تم میں سے بعض
لَمَنْ	البتہ وہ ہے جو	لَّيُبَطِّئَنَّ	یقیناً دیر کرتا ہے (نکلنے میں)

فَاِنْ	پھر اگر	اَصَابَتْكُمْ	تمہیں پہنچے
مُّصِيْبَةٌ	کوئی مصیبت	قَالَ	(تو) وہ کہتا ہے
قَدْ	تحقیق	اَنْعَمَ اللّٰهُ	اللہ نے انعام کیا
عَلَيَّ	مجھ پر	اِذْ لَمْ اَكُنْ	جبکہ نہیں تھا میں
مَّعَهُمْ	ان کے ساتھ	شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾	حاضر

اس آیت میں جہاں اہل ایمان کو جنگ کی ترغیب دی جارہی ہے وہاں منافقین کے نفاق کا پردہ بھی چاک کیا جارہا ہے وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ اور تم میں سے بعض ایسے ہیں جو تاخیر کرتے ہیں۔ یعنی جب مجاہدین کی روانگی کا وقت آتا ہے تو منافق لوگ حیلے بہانے سے روانگی میں دیر کرتے ہیں تاکہ کسی طرح جنگ میں شریک ہونے سے بچ جائیں اور جنگ کے نتیجے میں ایسا بھی ہوتا ہے فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ اگر تم پر یعنی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے۔ شکست آجاتی ہے یا جانی اور مالی نقصان ہوجاتا ہے تو منافق کہتا ہے۔ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان کیا ہے اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ کہ میں ان مجاہدین کے ساتھ شامل نہیں تھا۔ اگر ان کے ساتھ جہاد میں شریک ہوجاتا تو مجھ پر بھی وہی آفت آتی جو ان پر آئی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں انھیں محض دنیاوی تکلیف اور دنیاوی مفادات ہی کا احساس ہوتا ہے، اخروی زندگی یا رضائے الٰہی سے انھیں کبھی غرض نہیں ہوتی اور یہی ان کے منافق ہونے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی دلیل ہے۔

خود غرضی اور مفاد پرستی کی مذمت

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خود غرضی، موقع شناسی، مفاد پرستی اور مال کی ہوس منافقوں کا طریقہ ہے۔ دنیا میں وہ شخص کبھی کامیاب نہیں ہوتا جو تکلیف کے موقع پر تو کسی کا ساتھ نہ دے لیکن اپنے مفاد کے موقع پر آگے آگے ہوتا پھرے۔ مفاد پرست اور خود غرض آدمی کچھ عرصہ تک تو اپنی منافقت چھپا سکتا ہے لیکن اس کے بعد ذلت و رسوائی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ خود غرضی، مفاد پرستی اور مطلب پرستی

سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی اغراض، فوائد اور منفعت کو دوسروں کے حقوق، اجتماعی فلاح و بہبود اور عمومی مفادات پر ترجیح دے۔ یہ ایک ایسی مہلک اخلاقی بیماری ہے جو افراد، خاندانوں، معاشروں اور اقوام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اس کا دائرہ اثر انتہائی وسیع ہے، اور یہ ہمارے دینی، سماجی، معاشی اور سیاسی ہر پہلو کو منفی طور پر متاثر کرتی ہے۔ مفاد پرست شخص ہمیشہ "میں" اور "میرا" کے گرد گھومتا ہے، جبکہ ایک صالح اور باایمان شخص "ہم" اور "ہمارا" کی سوچ رکھتا ہے۔

مسلمان بحیثیت جماعت

وَلَئِنْ	اور البتہ اگر	اَصَابَكُمْ	پہنچے تمہیں
فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ	فضل اللہ کا	لَيَقُوْلَنَّ	تو وہ ضرور کہے گا
كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ	گویا کہ نہ تھی	بَيْنَكُمْ	تمہارے درمیان
وَبَيْنَهٗ	اور اس کے درمیان	مَوَدَّةٌ	کوئی دوستی
يّٰلَيْتَنِيْ	کاش کہ	كُنْتُ	میں ہوتا
مَعَهُمْ	ان کے ساتھ	فَاَفُوْزَ	تو حاصل کر لیتا میں
فَوْزًا	کامیابی	عَظِيْمًا ⑬	بہت بڑی

یہ آیت منافقین کے رویے کو ظاہر کرتی ہے۔ جب مسلمانوں کو جنگ میں غنیمت یا فتح ملتی تھی، تو منافقین حسد کی آگ میں جلتے تھے۔ ارشاد فرمایا وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ تمہیں اللہ تعالیٰ کا فضل حاصل ہو جائے فتح حاصل ہو یا مال غنیمت ہاتھ آئے تو منافق کی حالت یہ ہوتی ہے۔ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ تمہارے اور اس کے درمیان دوستی کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اسے تمہاری کامیابی پر قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوتی اور پھر بالکل اجنبی بن کر کہتا ہے يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ کاش کہ میں بھی مجاہدین کے ہمرکاب ہوتا فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ⑬ تو مجھے بھی بہت بڑی کامیابی حاصل ہوتی اور میں بھی ایمان والوں کے برابر مفاد حاصل کرتا۔ یہ تو منافق کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مگر پکے سچے مسلمان کی حالت یہ ہے کہ شکست ہو جائے یا کوئی دیگر

نقصان ہو جائے تو ہر مسلمان کو اس پر دلی افسوس ہوتا ہے اور اگر مسلمان کی جماعت کامران ہو جاتی ہے تو ہر مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے کہ الحمدللہ ہماری جماعت کو کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر منافق ہمیشہ اپنے ذاتی نفع ونقصان پر نظر رکھتا ہے۔ مفاد حاصل ہو گیا تو خوش ہو گیا، ورنہ افسوس کرنے بیٹھ گیا۔ الغرض! یہ معاملہ اس عہد کے منافقین ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا؛ بلکہ ہر زمانہ میں جو لوگ اپنے دلوں میں بے یقینی اور خدا کے غیبی نظام کے بارے میں شکوک وشبہات چھپائے رہتے ہیں، وہ کامیابی اور ناکامی کو محض مادی پیمانوں سے ناپتے ہیں، مخلص مسلمانوں کی عارضی اور ظاہری ناکامی پر طعنے دیتے ہیں اور مادی کامیابی کی صورت میں اپنی محرومی پر حسرت کرتے ہیں۔ مسلمان اور منافق کے تقابل سے بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یَدُ اللہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے، اسے خداوند تعالی کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور جب جماعت کی بجائے انفرادیت پیدا ہو گی تو پوری قوم خود غرضی کا شکار ہو جائیگی اور تباہی کے کنارے پر پہنچ جائے گی۔ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ جو جماعت سے علیحدہ ہو گیا وہ جہنم رسید ہو گیا۔

''جہاد'' اسلامی عظمت کا نشان دین کا بنیادی شعار

فَلْيُقَاتِلْ	چنانچہ چاہیے کہ لڑیں	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کے راستے میں
الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	يَشْرُوْنَ	بیچتے ہیں
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	زندگی دنیا کی	بِالْاٰخِرَةِ ؕ	آخرت کے بدلے
وَمَنْ	اور جو کوئی	يُّقَاتِلْ	لڑے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کے راستے میں	فَيُقْتَلْ	پھر وہ قتل کر دیا جائے
اَوْ يَغْلِبْ	یا غالب آجائے	فَسَوْفَ	تو عنقریب
نُؤْتِيْهِ	ہم اس کو دیں گے	اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾	اجر بہت بڑا

مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکالنے کے لیے فرمایا فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پس چاہیے کہ اللہ کے راستے میں لڑیں وہ لوگ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ جو بیچتے ہیں دنیا

کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں۔ مقصد یہ کہ اہل ایمان محض اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جنگ میں کود جائیں۔ ان کا یہ جہاد، دولت، شہرت اور سلطنت کیلئے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی بلندی کے لیے ہونا چاہئے۔ اس مضمون کو سورہ توبہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ مومن مال اور جان کی بازی اس لیے لگاتا ہے کہ اسے ایمان میں کمال حاصل ہو جائے اور اس کی ذات میں قرآن کا اخلاق پیدا ہو جائے۔ وہ اس راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرتا چلا جاتا ہے، یہی ایک مومن کی شان ہے۔ وہ اپنی جان و مال کا نذرانہ پیش کر کے عزت اور ابدی مقام جنت کا ٹکٹ حاصل کرتا ہے۔ اس راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے یا تو ملوک ہوتے ہیں یا غلط قسم کے مولوی اور پیر یہی طاغوت ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کی اصطلاح میں ہر وہ طاقت طاغوت ہے جو ایمانی اور قرآنی اخلاق کی تکمیل میں رکاوٹ بنتی ہے۔ آگے فرمایا وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جو کوئی اللہ کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے فَیُقْتَلْ تو خواہ وہ قتل کر دیا جائے یعنی شہید ہو جائے اَوْ یَغْلِبْ یا دشمن پر غالب آجائے۔ اللہ تعالیٰ فتح عطا کر دے، دونوں صورتوں میں فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۷۴﴾ عنقریب ہم اسے اجر عظیم عطا کریں گے۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے تَکَفَّلَ اللّٰہُ لِلْمُجَاھِدِیْن اللہ تعالیٰ نے مجاہدوں کو ضمانت دے رکھی ہے کہ اگر شہید ہو گیا تو اسے اللہ تعالیٰ بلند ترین مرتبے تک پہنچائیں گے اور اگر غازی بن کر آیا تو دنیوی اعتبار سے بھی مستحق اجر ہو گا کہ اسے مال غنیمت سے حصہ ملے گا۔ جہاد اس قدر بلند مرتبہ چیز ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ذُرْوَۃُ سَنَامِ الْجِھَادِ یعنی اسلام کی بلندی جہاد میں ہے حدود اللہ جہاد کے ذریعے ہی قائم ہو سکتے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد زندہ رہے گا، وہ غالب رہیں گے۔ جب ضرورت پڑے گی میدانِ جنگ میں کودنے سے دریغ نہیں کریں گے اور خود اپنے دفاع کو مضبوط رکھیں گے۔ اسی عمل میں ان کے لیے دنیا کی عزت اور آخرت کی فلاح ہے۔ اس آیت میں ایک اہم حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، مادہ پرست ذہن ہمیشہ یہ سوچتا ہے کہ جو قدم

ظاہر کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو وہی کامیابی و کامرانی ہے، فتح ہو تو کامیابی، شکست ہو تو ناکامی، انسان غالب ہو جائے تو کامران، مغلوب و مظلوم ہو جائے تو ناکام، اسباب دنیا کو پائے تو کامیاب، نہ پائے تو محروم، قرآن نے بتایا کہ یہ تصور غلط ہے، انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اسے اللہ کی اطاعت کی توفیق میسر آجائے، خواہ ظاہری نتیجہ کچھ بھی ہو، وہ غالب ہو یا مغلوب، وہ قاتل ہو یا مقتول، اور اسے نعمت دنیا حاصل ہو یا نہ ہو؛ کیوں کہ اصل مقصود اجر آخرت ہے اور وہ اسے بہر حال حاصل ہوگا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو شخص اس حال میں مرے کہ نہ اس نے اللہ کے راستے میں جنگ کی اور نہ ہی کبھی اس کے دل میں اس کا خیال گزرا ہو تو اس کی موت نفاق کی ایک شاخ پر ہوگی۔ (مسلم) سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرے۔ فرائض اسلام میں سے ایک اہم ترین فریضہ "جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یہ وہ فریضہ ہے جو امت مسلمہ کی سربلندی و افتخار اور افراد امت کی سرخروئی کا باعث رہا ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جہاد کے تین درجات ہیں۔ (1) جہاد باللسان (2) جہاد بالقلم (3) جہاد بالسیف۔ (1) جہاد باللسان سے مراد کفر و الحاد، دین سے بغاوت و نافرمانی، شرک و بدعات کے ماحول میں وعظ و نصیحت کے ذریعے عوام و خواص کو اصلاح عقیدہ و عمل کی جانب راغب کرانا اور انہیں اللہ اور اس کے آخری رسول جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی خالص اور سچی اطاعت و فرماں برداری پر آماہ کرنا ہے، تاکہ وہ اور ہم سب جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں اور رب تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کر کے جنت کی لازوال و سرمدی نعمتوں کے حقدار بن جائیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے راستے میں اول جہاد زبان سے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا ہے، تاکہ ان کے دلوں میں رب کی خشیت پیدا ہو اور وہ ایمان کی دولت سے سرفراز ہو کر جنت کے حقدار بن جائیں۔ اسی طرح جہاد بالقلم ہے اور قلم کی اہمیت تو رب تعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ پر نازل کردہ پہلی وحی میں ہی واضح فرما دی تھی۔

اسلامی جہاد کا آخری درجہ جہاد بالسیف ہے۔ یعنی اللہ کے راستے میں اس کے دین کے غلبے

اور اللہ و رسول ﷺ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے وجود کے درپے برسرپیکار اسلام کی نظریاتی یا جغرافیائی سرحدوں پر حملہ آور غیر مسلم طاقتوں کے مقابل دین کی بقاء اور مظلوموں کے تحفظ یا تائید و نصرت کے لئے مسلح دفاع کا نام جہاد بالسیف کہلاتا ہے اور یہ آخری درجہ ہے۔ جب تمام راستے بند ہو جائیں اور کوئی صورت باقی نہ رہے کفر کی یلغار ہو اور اسلام و اہل اسلام کے وجود کو سنگین خطرات لاحق ہوں، تب امیر المومنین یا حاکم وقت جہاد بالسیف کا اعلان کرنے کا مجاز ہے اور ہر مسلمان پر اس فریضے کی بجا آوری لازم قرار پاتی ہے۔

اسلام میں اس فریضہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے ادا کرنے والے انتہائی فضیلت و بزرگی کے حامل گردانے گئے ہیں چونکہ یہ ہی وہ فریضہ ہے جس میں بندۂ مومن اپنی سب سے قیمتی متاع عزیز یعنی جان بھی اللہ کے راستے میں لٹا دیتا ہے اور اپنا مال بھی صرف کرتا ہے۔ ایسے عظیم لوگوں کا رب تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند وارفع مقام ہے۔ اللہ کے راستے میں جہاد کی فضیلت اور اس کی راہ میں شہادت پانے والوں کے لئے بڑے درجات ہیں۔ متعدد احادیث مبارکہ میں وارد ہے کہ لوگوں میں افضل ترین شخص وہ ہے جو اپنی جان و مال کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ (صحاح ستہ ابن ماجہ) اسی طرح فرمایا کہ جنت میں ایک سو درجات ہیں جنہیں اللہ نے خاص مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے تیار کر رکھا ہے اور ان ہر دو درجوں کے درمیان اتنی مسافت ہے کہ جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ (صحیح بخاری) البتہ یہ عظیم عبادت خلوص نیت کے بغیر ضائع و بے کار ہو سکتی ہے، لہٰذا اخلاص نیت پر ہی کامیابی کا دارومدار ہے۔

☆☆☆

نظریہ حق و باطل/ جہاد کے فریضہ سے غافل ہونے کا انجام

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ
وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا ۚ
وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ
فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾

جہاد فی سبیل اللہ کا مفہوم

وَمَا لَكُمْ	اور کیا ہے تمہیں	لَا تُقَاتِلُوْنَ	(کہ) نہیں تم لڑتے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	اللہ کے راستے میں	وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ	اور (ان لوگوں کی خاطر) جو کمزور ہیں
مِنَ الرِّجَالِ	مردوں میں سے	وَالنِّسَآءِ	اور عورتوں (میں سے)
وَالْوِلْدَانِ	اور بچوں (میں سے)	الَّذِیْنَ	وہ جو
یَقُوْلُوْنَ	کہتے ہیں	رَبَّنَآ	اے ہمارے رب!
اَخْرِجْنَا	ہمیں نکال	مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ	اس بستی سے
الظَّالِمِ	کہ ظالم ہیں	اَھْلُھَا ۚ	اس کے باشندے

وَاجْعَلْ	اور کردے	لَّنَا	ہمارے لیے
مِنْ لَّدُنْكَ	اپنی طرف سے	وَلِيًّا	کوئی حمایتی
وَّاجْعَلْ	اور کردے	لَّنَا	ہمارے لیے
مِنْ لَّدُنْكَ	اپنی طرف سے	نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾	کوئی مددگار

ارشاد ہوتا ہے وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا اور (اے مسلمانو) تمہارے پاس کیا جواز ہے کہ اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو یہ دعا کر رہے ہیں کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لایئے جس کے باشندے ظلم توڑ رہے ہیں۔ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا ذکر قرآن پاک میں کثرت سے ملتا ہے اور اس سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اہل ایمان کی دشمن کے ساتھ جنگ نہ کسی ذاتی مفاد کے لیے ہے، نہ ہوس ملک گیری ہے اور نہ نسلی، وطنی یا زبان کی بنیاد پر کسی کی مخالفت مقصود ہے بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کا واحد مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اللہ کا دین تمام ادیان پر غالب آجائے اور اہل دنیا پر ثابت ہو جائے کہ "كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ہر مقام پر اللہ کی بات کو ہی برتری حاصل رہے۔ چنانچہ جب تک مسلمان جہاد کے لیے کمر بستہ رہے، کامیابی ان کے قدم چومتی رہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد قائم تھا لہٰذا مسلمانوں کو ہر میدان میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اس وقت نہ کوئی فرقہ تھا، نہ پارٹی اور نہ اہل اسلام میں اختلاف رائے تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا اپنا زمانہ مبارک پھر شیخین حضرات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دور خلافت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی چھ سال کا عرصہ تاریخ اسلام میں نمونہ کے طور پر محفوظ ہے جو امور اس نمونہ کے مطابق انجام دیے جائیں گے، وہی درست ہوں گے، اس نمونہ سے ہٹ کر انجام پانے والے امور کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ فقہائے کرام باب باندھ کر سمجھاتے ہیں کہ عقیدے کی درستگی کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد پانچ عبادات فرض ہیں۔ عام طور پر جہاد فرض کفایہ میں آتا

ہے۔جب مسلمانوں کاایک گروہ جہاد کے لیے ہر وقت تیار ہوتو پھر تمام لوگوں پر جہاد ضروری نہیں رہتا۔اور بعض اوقات اگر حالات کا تقاضا ہوتو جہاد ہر مسلمان پر فرض عین بھی ہو جاتا ہے ان آیات میں اسی بات کی توجہ دلائی گئی ہے کہ مسلمان بوقت ضرورت اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑتے ،دین حق کی تبلیغ کا فریضہ کتنے لوگ ادا کر رہے ہیں۔ذاتی مفادات کے لیے کتنے لمبے لمبے سفر کیے جاتے ہیں مگر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کیا کچھ کیا جارہا ہے۔کفر اپنی پوری قوت کے ساتھ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہے مگر مسلمان لہو ولعب اور کھیل تماشے میں مصروف ہے۔وہ دین حق کو غالب کرنے کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے سے کیوں گریزاں ہے۔اس آیت کا تعلق بھی ترغیب جہاد سے ہے،یعنی دو وجوہ کی بنا پر تمہارے لیے کفار سے لڑنا ضروری ہے،اول: اعلائے کلمۃ اللہ،یعنی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے،دوم ان مظلوم مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو کفار کے چنگل میں بے بس پڑے ہیں۔(قرطبی)

ہجرت نہ کرسکنے والے

مکہ معظمہ میں بہت سے لوگ ایسے رہ گئے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے تھے اور ان کے اقارب ان پر تشدد کرنے لگے تھے،تاکہ انہیں اسلام سے پھیر کر پھر کافر بنالیں۔پس "الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا" سے مراد مکہ ہے اور مشرک ہونے کی وجہ سے یا مظلوم مسلمانوں کو ستانے کی وجہ سے اس کے باشندوں کو ظالم فرمایا ہے۔وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حامی پیدا کر دیجیے، اور ہمارلیے اپنی طرف سے کوئی مددگار کھڑا کر دیجیے۔مکہ میں بہت سے کمزور مرد،عورتیں اور بچے کفارِ مکہ کے ظلم وستم کا شکار تھے۔وہ ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور مصائب میں جکڑے ہوئے تھے۔وہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں عاجزی سے دعا کرتے تھے کہ اے رب!ہمیں اس ظالم بستی سے نجات دلا۔انہوں نے ظالموں کے مقابلے کے لیے ظاہری وسائل نہ ہونے پر اللہ سے درخواست کی کہ تو ہی ہمارا ولی (محافظ) اور نصیر (مددگار) بن جا،کیونکہ تیری مدد ہی سب سے بہتر اور کافی ہے۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت بھی مسلمان کفار کے مختلف ممالک کی غلامی میں بے بس ہیں،وہ انھیں

نہ آزادی دیتے ہیں نہ نکلنے دیتے ہیں اور نہ کوئی مسلمان ملک انھیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے، بتائیں اس وقت سے بڑھ کر جہاد کب فرض ہوگا۔

عہد نبوی میں یہودیوں کی چالبازیاں

مشرق وسطیٰ کے حالات دیکھ لیجیے فلسطینی عوام پر اسرائیلی بربریت کی سفاکانہ کاروائیوں اور حملوں سے دل چھلنی ہو کر رہ گیا، ہزاروں مسلمانوں کا قتل، بچوں اور عورتوں پر ظلم وستم، مساجد و مدارس کا انہدام، قرآن کریم کی بے ادبی وگستاخی، بیت المقدس کے تقدس کی پامالی اور ان جیسی بے شمار ذلیل حرکتوں نے روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہمیشہ سے ہی یہود ونصاریٰ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بنتے آئے ہیں۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کا سب سے بدترین دشمن یہودیوں کو ہی بتایا گیا ہے، اس لیے کہ اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی اسکیمیں عہد رسالت ہی سے شروع ہو چکیں تھیں، کسی بھی وقت اسلام کو اُن کی فتنہ انگیزیوں اور دسیسہ کاریوں سے اطمنان میسر نہ ہوا، جیسا کہ جنگ خیبر کے وقت ایک یہودی عورت "زینت بنت الحرث" نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے پر دعوت دی، جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا، اُس نے ایک دنبہ ذبح کیا اور گوشت بھوننے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آپ کون سا حصہ پسند فرمائیں گے، آپ نے جواب دیا کہ مجھے دست کا گوشت زیادہ پسند ہے، چنانچہ اُن نے سارے دنبہ پر زہر چھڑکا اور خاص کر دست کو زہر آلود کیا، دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد آپ نے ایک لقمہ منھ میں ڈالا لیکن اسے نگلا نہ تھا اور ارشاد فرمایا کہ: "یہ گوشت مجھ سے کہتا ہے کہ اسے زہر آلود کیا گیا ہے لہٰذا آپ نے اس لقمہ کو اسی وقت اُگل دیا۔ حضرت بشر بن البراء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ایک لقمہ منھ میں لیا تھا اور اسے نگل لیا تھا اس لیے آپ شہید ہو گئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظاہری طور پر دنیا سے جاتے وقت آپ کو اس زہر کی تکلیف محسوس ہوتی تھی اور آپ کا وصال پر ملال بھی اسی زہر کی وجہ سے ہوا تھا۔ اب ذرا غور کریں کہ اس قوم کی غیرت اور بزدلی دیکھیں کہ اپنے حربے استعمال کرنے کے لیے عورتوں کو بھی میدان عمل میں اتار دیتے ہیں، اپنے جنگی کام بھی عورتوں سے کروا رہے ہیں،

تاریخ اِن جیسے ہزاروں واقعات سے بھری پڑی ہے، شہنشاہ صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ پر کئی مرتبہ عورتوں کے ذریعہ سے ہی حملہ کیا گیا، یہ ہے یہودیوں کی چالبازیاں، ربِّ کریم ہم سب کو ان کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جہاد کے راستے میں رکاوٹ بننے والا ہر فرد منافق ہے، خواہ وہ مولوی ہو یا پیر۔ سلطان ہو یا بادشاہ، سرمایہ دار ہو یا دہریہ۔ فرماتے ہیں کہ ملوک و سلاطین اکثر جہاد کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں اور انہوں نے فی سبیل اللہ کا نظریہ ہی خراب کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک صحیح اور غلط کا کوئی معیار مقرر نہیں، بیت اللہ کو باپ دادا کی جاگیر سمجھ کر اپنی من مانی کارروائیوں پر صرف کرتے ہیں۔ انہوں نے دین کا نظام ہی درہم برہم کر دیا ہے ان کی حمایت علمائے سو کرتے ہیں، پیر ان کی پشت پر ہوتے ہیں اور اس طرح وہ غلط ملط فتوے حاصل کر کے اپنے مذموم عزائم پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور اس طرح عوام بیچارے ظلم کی چکی میں پستے رہتے ہیں صاحب اقتدار اپنے اقتدار کی بقا کے لیے ہر جائز ناجائز کام کر گزرتا ہے اور پھر عالمی سطح پر اقتدار کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سب مادیت پرستی کا نتیجہ ہے۔ کافر مال و دولت اور اقتدار کے لیے جنگ لڑتا ہے۔ مگر ایک سچا مسلمان اللہ کے دین کی خاطر جہاد کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہی طرہ امتیاز ہے۔

حق و باطل کی معرکہ آرائی روز اول سے ہے

تاریخ عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غیر اقوام محاذ جنگ پر جانے والے سپاہیوں کے لیے عیاشی کے تمام سامان مہیا کرتی ہیں کیونکہ ان کا مقصد ملک گیری ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ہزاروں ٹن شراب سپاہیوں کو پلائی گئی، حتیٰ کہ ان کی عیاشی کے لیے عورتیں بھی مہیا کی گئیں اس جنگ میں امریکہ کے جاپان پر حملہ کے نتیجے میں سوا لاکھ حرامی بچے پیدا ہوئے، اتنی کثیر تعداد میں جاپانی عورتیں امریکی سپاہیوں کی ہوس کا نشانہ بنیں۔ یہ کوائف تو صرف پیدا ہونے والے ناجائز بچوں کے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا کچھ ہوا، وہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں اور

فرانسیسیوں نے ان عورتوں کے لیے انعامات کا اعلان کیا تھا جو فوجی سپاہیوں کی خوش طبعی کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں دوسری طرف فی سبیل اللہ کا نظریہ ہے کوئی بدکاری اور عیاشی نہیں محض اللہ کے دین کی سربلندی مطلوب ہے، جب محمد بن قاسم حملہ آور ہوا تو ہندوؤں کی حسین ترین لڑکیاں استقبال کے لیے موجود تھیں مگر کسی سپاہی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آخر کیا وجہ تھی ان کا ایک ہی مشن تھا اور وہ یہ دین اسلام کو دنیا میں غالب کرنا ہے اور اس کی تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں اتنا لمبا سفر اللہ کے دین کی خاطر کیا ہے، نہ کہ ذاتی مفاد اور نمود و نمائش کے لیے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ دنیا کی خاطر جہاد کرنے والے اور اپنی پہلوانی کا سکہ بٹھانے والے مجاہد کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ جاؤ تمہارے لیے میرے پاس کچھ اجر نہیں تم نے ریاکاری کے لیے جہاد کیا تھا، میری رضا مقصود نہ تھی، پھر حکم ہوگا کہ اسے اٹھا کر جہنم میں پھینک دو۔ آج دنیا میں لاکھوں مظلوم ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس اکیسویں صدی ہی کو لے لیجئے اس میں لاکھوں انسان امریکی بربریت کا نشانہ بنے، جس ہزاروں زندہ باشندوں کو گڑھوں میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی گئی اور وہ بیچارے زندہ درگور ہو گئے۔ عراق میں لاکھوں انسان امریکی درندگی کا لقمہ بنے، کشمیر میں آئے دن کشمیریوں کی شہادت، فلسطین میں گذشتہ چند سالوں سے فلسطینی عوام پر اسرائیلی بربریت کی سفاکانہ کاروائیوں اور حملوں سے دل چھلنی ہو کر رہ گیا، ہزاروں مسلمانوں کا قتل، بچوں اور عورتوں پر ظلم و ستم، مساجد و مدارس کا انہدام، قرآن کریم کی بے ادبی و گستاخی، بیت المقدس کے تقدس کی پامالی اور ان جیسی بے شمار ذلیل حرکتوں نے روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، فلسطینی مسلمانوں کو اُن کو اپنے ہی ملک سے زبردستی بے دخل کیا جا رہا ہے، کوئی صدائے احتجاج بلند کرے تو اسے موت کی وادی میں ڈھکیل دیا جاتا ہے، عورتوں کی عزت و ناموس کا دامن تار تار کیا جا رہا ہے، چھوٹے چھوٹے بچوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے، غرض کہ انسانی حقوق کی سرعام پامالی کی جا رہی ہے، ان پر ہونے والے ظلم کا جواب کون دے رہا ہے ان کی تکلیف کا کس کو احساس ہے عالمی سطح پر کانفرنسیں تو ہوتی ہیں مگر ان کے دکھ کا کیا مداوا

ہوسکا ہے مسلمان ممالک ان کی کیا مدد کر پائے ہیں۔ محض بیان دینے سے کسی کی تکلیف رفع نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے عملی قدم اٹھانا ہوگا۔ جب مصریوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے تو عالم اسلام نے کیا مدد کی۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے نہر سویز پر سوا لاکھ مصریوں کو ہلاک کر دیا، اربوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔ مگر کون پوچھنے والا ہے۔

طاغوت کا قرآنی مفہوم اور اللہ اور طاغوت کے راستے

اٰمَنُوْا	وہ لوگ جو	اَلَّذِیْنَ	ایمان لائے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	وہ لڑتے ہیں	یُقَاتِلُوْنَ	اللہ کے راستے میں
کَفَرُوْا	اور وہ لوگ جنہوں نے	وَالَّذِیْنَ	کفر کیا
فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ	وہ لڑتے ہیں	یُقَاتِلُوْنَ	شیطان کے راستے میں
اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ	چنانچہ تم لڑو	فَقَاتِلُوْٓا	شیطان کے دوستوں سے
کَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾	بلاشبہ شیطان کا مکر	اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ	ہے نہایت کمزور

پھر وہی بات دہرائی جا رہی ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جو اہل ایمان ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑائی کرتے ہیں، ان کا مقصود و مطلوب محض رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا کفار کا شیوہ یہ ہے کہ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ وہ طاغوت کے راستے میں لڑتے ہیں اور طاغوت کا معنی ہی یہ ہے ہر وہ طاقت جو اللہ کے راستے سے روکتی ہے، وہ طاغوت ہے۔ اس میں وہ ملوک، سلاطین وغیرہ سب آجاتے ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کے مخالف ہیں۔ شیطان بذات خود طاغوت ہے اور اس کا یہی مشن ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ اے ایمان والو فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ شیطان کے دوستوں سے مقابلہ کرو۔ ان کے خلاف جہاد کرو کیونکہ وہ اس کے حمایتی ہیں اور کفر کے پروگرام کو غالب کرنا چاہتے ہیں اور یاد رکھو ایمان والو اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾ شیطان کی تدبیر بالکل کمزور ہے اگرچہ شیطان کے مکر و فریب کا جال بہت وسیع ہے مگر اللہ کے نزدیک اس کی کوئی تدبیر

کارگر نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ یوسف میں عورتوں کے مکروفریب کے متعلق فرمایا اِنَّ کَیْدَ کُنَّ عَظِیْمٌ کہ تمہاری مکاریاں بہت زیادہ ہیں۔ شیطان عورتوں ہی کو اپنا جال بنا کر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے لہٰذا وہ عورتوں سے بھی بڑا دھوکہ باز اور مکار ہے۔ تاہم اگر مومن صحیح راستے پر گامزن ہوجائیں۔ دین کے غلبے کے لیے کمربستہ ہوجائیں تو پھر اللہ ان کا حمایتی بن جائیگا اور جس کا حمایتی خود اللہ بن جائے، شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ شیطان کی تدبیر کمزور ہے۔ سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ "اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَ اِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِہٖ اگر خدا تعالیٰ کی مدد تمہارے شامل حال ہوگی تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر تمہاری بدعقیدگی اور بدعملی کی وجہ سے خدا تمہیں رسوا کردے تو اس کے علاوہ کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔ تم لاکھ دنیا کی طاقتوں پر بھروسہ کرو اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا، تمہیں عزت وآبرو حاصل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حمایت اور مدد حاصل کرنے کے لیے صراط مستقیم پر گامزن ہوجاؤ۔ چنانچہ بہت سے اسلامی ممالک میں آج اس پیشن گوئی کی تصویر موجود ہے۔ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ جہاد کے اس عظیم دینی فریضہ کا خیال کریں اور ہر ممکن مادی ومعنوی قوت کے ذریعہ دشمنان دین کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں عصر حاضر کی ایک اہم ترین ضرورت یہ ہے۔ ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے خلاف جہاد کرنے کی تمام شرائط کو پورا کرنا اور ان سے مسلمان قیدیوں کو چھڑانا مسلمان ممالک کے سربراہوں کی ذمہ داری ہے، چنانچہ مسلمان ممالک کے سربراہان جو باوجود قدرت کے جہاد جیسے اہم فریضہ میں کوتاہی برتتے ہیں وہ فاسق اور گناہ گار ہیں، البتہ سربراہانِ مملکت کی غفلت اور کوتاہی کی بنا پر جہاد نہ ہونے کی وجہ سے عام مسلمان فاسق نہیں ہوئے۔ آج مسلمانوں کے پاس 57 آزاد ممالک، 70 فیصد معدنیات، تمام بحری اور بری گزرگاہوں کا کنٹرول، 60 فیصد نوجوان، 85 لاکھ ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس مسلح افواج اور ایٹمی صلاحیت ہے، اس کے باوجود اگر مسلمان تخت وتاراج ہورہے ہیں تو اس کی وجہ موت کا ڈر اور دنیا سے محبت ہے۔ جب صحابہؓ کے حلقوم پر تیر لگتے تھے تو وہ پکار اٹھتے "خدا کی قسم آج ہم کامیاب ہوگئے۔"

جہاد کی عدم اجازت/مکی دور میں ہاتھ نہ اٹھانے یا عدم تشدد کے فوائد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ۷۷ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۚ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ ؕ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ فَمَالِ ھٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا ۷۸

مکی دور میں طاقت کا استعمال نہ کرنے کے فوائد

اَلَمْ تَرَ	کیا نہیں آپ نے دیکھا	اِلَی الَّذِیْنَ	ان لوگوں کی طرف کہ
قِیْلَ لَھُمْ	کہا گیا ان سے	کُفُّوْٓا	تم روکے رکھو

اَیْدِیَکُمْ	اپنے ہاتھ	وَاَقِیْمُوا	اورتم قائم کرو
الصَّلٰوۃَ	نماز	وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ	اورتم دوزکوۃ
فَلَمَّا	پھر جب	کُتِبَ	لکھ دیا (فرض کر دیا) گیا
عَلَیْھِمُ	ان پر	الْقِتَالُ	لڑنا
اِذَا	تب	فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ	ایک فریق ان میں سے
یَخْشَوْنَ	وہ ڈرتے تھے	النَّاسَ	لوگوں سے
کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ	اللہ سے ڈرنے کے مانند	اَوْ اَشَدَّ	یا (اس سے بھی) زیادہ سخت
خَشْیَۃً	ڈرنا	وَقَالُوْا	اورانہوں نے کہا
رَبَّنَا	اے ہمارے رب!	لِمَ کَتَبْتَ	کیوں لکھا (فرض کیا) تو نے
عَلَیْنَا	ہم پر	الْقِتَالَ	لڑنا
لَوْلَآ	کیوں نہ	اَخَّرْتَنَآ	مہلت دی تو نے ہمیں
اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ	ایک مدت قریب تک	قُلْ	کہہ دیجیے
مَتَاعُ الدُّنْیَا	فائدہ دنیا کا	قَلِیْلٌ ۚ	تھوڑا ہے
وَالْاٰخِرَۃُ	اورآخرت	خَیْرٌ	بہت بہتر ہے
لِّمَنِ	اس کے لیے جس نے	اتَّقٰی	تقوی اختیار کیا
وَلَا تُظْلَمُوْنَ	اور نہ تم ظلم کیے جاؤ گے	فَتِیْلًا ﴿۷۷﴾	دھاگے برابر

فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے (مکی زندگی میں) کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روک کر رکھو، اور نماز قائم کیے جاؤ اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ اس آیتِ مبارکہ کا شانِ نزول یوں ہے کہ مشرکینِ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو بہت ایذائیں دیتے تھے۔ ہجرت سے پہلے صحابۂ کرام رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْھُم کی ایک جماعت نے تاجدارِ رسالت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ہمیں کافروں سے لڑنے کی اجازت دیجئے، انہوں نے ہمیں بہت ستایا ہے اور بہت ایذائیں

دی ہیں۔حضورِ انور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ اُن کے ساتھ جنگ کرنے سے ابھی ہاتھ روک کر رکھو اور ابھی صرف نماز اور زکوٰۃ ادا کرو۔اسی کے متعلق فرمایا کہ کیا تم نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جن سے شروعِ اسلام میں مکہ مکرمہ میں کہا گیا کہ ابھی جہاد سے اپنے ہاتھ روکے رکھو اور ابھی صرف نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو۔(خازن،النساء،تحت الآیۃ:۷۷،۱/ ۴۰۳)

فرمایا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً پھر جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے ایک جماعت (دشمن) لوگوں سے ایسی ڈرنے لگی جیسے اللہ سے ڈرا جاتا ہے، یا اس سے بھی زیادہ ڈرنے لگی، اب جو (مدینہ منورہ) میں لڑائی کا حکم آیا ہے تو ان کو سمجھنا چاہیے کہ ہماری مراد ملی، لیکن کچے مسلمان کنارہ کرتے ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے برابر آدمیوں سے خطرہ کرتے ہیں۔(موضح) وہ اس وقت طبعی خوف کا شکار ہو گئے جو انسانی فطرت ہے۔ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ اور ایسے لوگ کہنے لگے کہ: اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، تھوڑی مدت تک ہمیں مہلت کیوں نہیں دی؟ مسلمان جب مکہ میں تھے اور اہل مکہ کے ظلم و جبر سے عاجز تھے تو جہاد کی اجازت چاہتے تھے؛ لیکن اسباب و وسائل سے محرومی، افراد کی کمی، دعوت دین کی مصلحت اور صحابہ کی تربیت ابھی ناتمام ہونے کی وجہ سے اجازت نہ دی گئی اور صرف نماز و زکوٰۃ پر اکتفاء کرنے کو کہا گیا، مدینہ آنے کے بعد جب جہاد کا حکم ہوا تو امن و عافیت کی اس فضا میں حکمِ جہاد سے بعض مخلص مسلمانوں کو بھی بشری مزاج کے تحت یہ خیال ہوا کہ مکہ کے ظلم و ستم سے ابھی چھٹکارا ملا ہے، اگر کچھ دن عافیت کے اور مل جاتے تو بہتر ہوتا، یہ کوئی اعتراض و احتجاج نہ تھا، بلکہ ایک تمنا اور خواہش تھی، جو گناہ نہیں، قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تو تھوڑا سا ہے اور جو شخص تقوی اختیار کرے اس کے لیے آخرت کہیں زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔اس پر تنبیہ فرمائی گئی کہ اہل ایمان کے لئے سکون و عافیت کی جگہ آخرت ہے نہ کہ دنیا، دنیا کی

متاع حقیر کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اس لئے نہ جان کی پروا کرو نہ دشمن کا خوف؛ بلکہ صرف خدا کا خوف ہو اور آخرت کی طلب، اس آیت میں یہ سوال حکمت دریافت کرنے کے لئے تھا، اعتراض کرنے کیلئے نہیں۔ اسی لئے اُن کو اس سوال پر توبیخ وزجر نہ فرمایا گیا بلکہ تسلی بخش جواب عطا کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے حبیب! صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم تم ان سے فرمادو کہ دنیا کا ساز و سامان تھوڑا سا ہے، فنا ہونے والا ہے جبکہ پرہیزگاروں کے لئے آخرت تیار کی گئی ہے اور وہی ان کیلئے بہتر ہے۔ لہٰذا جہاد میں خوشی سے شرکت کرو۔

مکی دور میں طاقت کا استعمال نہ کرنے کے اہم فوائد

مکہ میں کفار کے ظلم وستم کے خلاف مسلح جہاد کرنے کی مسلمانوں کو اجازت نہیں تھی۔ صرف ایک ہی حکم تھا کہ مسلمانوں کو صبر اور خاموشی سے کفار کا ظلم برداشت کرنا ہے، البتہ انھیں اس کی اجازت تھی کہ وہ کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں۔ اپنا دین چھپالیں۔ چھپ کر نماز پڑھ لیں، مگر اکثر صحابہ علیہم الرضوان نے اپنا دین چھپایا اور نہ چھپ چھپ کر نمازیں پڑھیں۔ انھوں نے کفار کے ظلم کو بہادری سے برداشت کیا۔ کفار کے خلاف جہاد کی اس لیے اجازت نہیں دی گئی تھی کہ اس طرح بزدل کفار سارا غصہ کمزور اور غریب مسلمانوں پر نکالتے۔ دوسرا یہ کہ مکہ کی وادی میں برتر حیثیت قریش کی تھی جس میں چند ایک کے علاوہ سبھی اسلام مخالف تھے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس تیرہ سالہ طویل دور میں، جبکہ مسلمانوں پر کفار انتہائی شدید قسم کے مظالم ڈھا رہے تھے مسلمانوں کو ہاتھ اٹھانے یا مدافعت کرنے سے کیوں روک دیا گیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک انقلابی تحریک ہے۔ عرب کے تمام تر معاشرتی، سیاسی اور تمدنی نظام کی بنیاد بت پرستی پر قائم تھی۔ اور اسلام نے اسی بت پرستی کے خلاف ہی سب سے پہلے آواز بلند کی۔ تو اس باطل نظام میں جو لوگ معاشی، تمدنی یا سیاسی فائدے اٹھا رہے تھے وہ سب اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن بن گئے۔ اور ان پر سختیاں شروع کر دیں۔ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو تاکیدی حکم یہ دیا گیا کہ اپنی مدافعت میں ہاتھ تک نہ اٹھائیں بلکہ جیسے بھی ظلم وستم ان پر ہو رہے ہیں وہ برداشت کرتے جائیں۔ اس عدم تشدد کے

حکم یا پالیسی سے تین قسم کے فوائد حاصل ہوئے۔ پہلا یہ کہ اگر مسلمان اس مرحلہ پر مقابلہ شروع کر دیتے تو مشرکین کو جو قوت، قدرت میں مسلمانوں سے بدرجہا بڑھ کر تھے اس تحریک کو شدت کے ساتھ کچل دینے کا اخلاقی جواز ہاتھ آجاتا۔ اس عدم تشدد کی پالیسی کی وجہ سے تبلیغ کا کام جاری رہا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو مصائب برداشت کرنے اور قائد تحریک نبی اکرم کا ہر حال میں حکم ماننے کی تربیت دی جارہی تھی۔ اور تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ غیر جانبدار قسم کے لوگوں کی خاموش اکثریت کی ہمدردیاں مسلمانوں سے وابستہ ہوگئیں۔ کیونکہ ہر انسان ناروا ظلم سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مکی دور میں طاقت کا استعمال نہ کرنے اور صبر کا دامن تھامنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جانی نقصان سے بچنے کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی برتری حاصل کی۔ اس ابتدائی دور میں مسلمان تعداد میں بہت کم اور کمزور تھے۔ اگر وہ ہتھیار اٹھاتے یا تشدد کا جواب تشدد سے دیتے، تو مخالفین انہیں آسانی سے ختم کر سکتے تھے۔ صبر کی حکمت نے مٹھی بھر مسلمانوں کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ کردار کی بلندی: ظلم و جبر کے باوجود انتقام نہ لینے سے مسلمانوں کا اخلاقی قد اونچا ہوا۔ اس رویے نے ثابت کیا کہ وہ کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ حق کے لیے کھڑے ہیں عدم تشدد کی پالیسی کی وجہ سے اسلام کا حقیقی اور پرامن پیغام لوگوں کے سامنے آیا۔ پرامن رویے نے دیکھنے والوں کے دلوں کو متاثر کیا۔ آزمائشوں اور مصائب کو خاموشی سے جھیلنے سے مسلمانوں کا ایمان مضبوط ہوا۔ ان کے اندر اللہ پر توکل اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوا۔ مکی دور میں جارحیت سے گریز کرنا ایک بہترین سیاسی اور الٰہی حکمت عملی تھی۔ اس نے مدینہ میں ایک مضبوط اور مستحکم معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے زمین تیار کی۔

مکہ میں مسلمانوں پر قریش مکہ نے جو ظلم و ستم ڈھائے تھے ان کا نشانہ صرف غلام مسلمان ہی نہ تھے، بلکہ آزاد اور معزز قسم کے مسلمانوں کا بھی ان لوگوں نے طرح طرح سے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کے ہاتھوں متعدد بار ایذائیں پہنچیں۔ غرض کوئی بھی مسلمان خواہ وہ کیسے عز و جاہ کا مالک تھا، مشرکین مکہ کے جور و ستم سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس طرح جب

مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تو آپ نے انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چناچہ پہلی دفعہ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔ عورتوں میں سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی یعنی رسول اللہ ﷺ کی بیٹی رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی موجود تھیں۔ اس موقعہ پر آپ نے فرمایا: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو اللہ کی راہ میں ہجرت کے لئے نکلا۔ (رحمۃ للعالمین، ج 2 باب بنات النبی) ہجرت حبشہ کے بعد بھی کفار کے تشدد کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ کفار کی طرف سے تشدد اور مسلمانوں کی طرف سے صبر و برداشت اور ہاتھ نہ اٹھانے کا یہ مرحلہ پورے مکی دور میں یعنی تیرہ سال پر محیط ہے۔ جس میں مسلمانوں کو نماز اور زکوٰۃ کے ذریعہ اپنے نفوس کا تزکیہ کرنے، مصائب پر صبر کرنے، اپنے قائد رسول اللہ ﷺ کی مکمل طور پر اطاعت کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ کئی مسلمانوں نے جان کا نذرانہ پیش کر دیا مگر نہ زبان سے کسی کو برا بھلا کہا اور نہ ہاتھ اٹھائے۔ حالانکہ موت کے وقت تو آقائی اور غلامی کے سب امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور مرنے والا یہ چاہتا ہے کہ اسے مرنا ہی ہے تو دو چار کو مار کر مرے۔ بلکہ بلی بھی جب عاجز ہوتی ہے تو شیر پر حملہ کر دیتی ہے۔ یہ بس رسول اللہ ﷺ کی تربیت اور مسلمانوں کی طرف سے مکمل اطاعت کا ہی اثر تھا کہ اسلام کی انقلابی تحریک ناکام ہونے سے محفوظ رہی اور ترقی کے مراحل طے کرتی گئی۔ پھر جب مسلمانوں کو مدینہ میں آزاد فضا میسر ہو گئی تو ہاتھ اٹھانے کی اجازت بھی مل گئی۔

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا

اَیْنَ مَا	جہاں کہیں بھی	تَکُوْنُوْا	تم ہو گے
یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ	پالے گی تمہیں موت	وَلَوْ کُنْتُمْ	خواہ ہو تم
فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ	مضبوط قلعوں میں	وَاِنْ تُصِبْھُمْ	اور اگر پہنچے ان کو
حَسَنَۃٌ	کوئی بھلائی	یَّقُوْلُوْا	(تو) کہتے ہیں
ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۚ	یہ اللہ کی طرف سے ہے	وَاِنْ تُصِبْھُمْ	اور اگر پہنچے ان کو

سَيِّئَةٌ	کوئی برائی (تکلیف)	يَّقُوْلُوْا	(تو) کہتے ہیں
هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ	یہ تیری طرف سے ہے	قُلْ	کہہ دیجیے
كُلٌّ	سب کچھ	مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے ہے
فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ	پھر کیا حال ہے ان لوگوں کا	لَا يَكَادُوْنَ	نہیں قریب کہ
يَفْقَهُوْنَ	وہ سمجھیں	حَدِيْثًا ۷۸	بات کو

ارشاد ہوتا ہے اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ تم جہاں بھی ہو گے (ایک نہ ایک دن) موت تمہیں جا پکڑے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ رہ رہے ہو۔ انسان کتنی ہی احتیاط کر لے، بہترین طبی سہولتیں لے لے یا خود کو بڑے سے بڑے محفوظ بنکر یا محل میں بند کر لے، موت اسے ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ موت نہ تو ایک لمحہ آگے ہو سکتی ہے اور نہ پیچھے۔ اس کے لیے کوئی جگہ یا قلعہ رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اس آیت میں بزدلی اختیار کرنے والوں کو سمجھایا گیا ہے کہ بستر پر موت آئے یا میدانِ جنگ میں، مرنا سب کو ہے۔ اس لیے موت کے ڈر سے حق کا ساتھ چھوڑنا یا فرض سے منہ موڑنا حماقت ہے، موت اپنے وقت پر ہی آئے گی اور آ کے رہے گی : یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مسلمان تو درکنار کوئی کافر بھی انکار نہیں کرتا۔ یہاں اس حقیقت کے ذکر کا مقصود یہ ہے کہ اگر یہ کمزور دل مسلمان اس حقیقت کو ہر وقت سامنے رکھیں تو لڑائی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ موت کا وقت بھی مقرر ہے اور جگہ بھی۔ لہٰذا اگر وہ تمہارا مقدر ہو چکی ہے تو گھر پر بھی یقیناً آ کے رہے گی اور اگر تمہاری زندگی ابھی باقی ہے تو پھر میدان جنگ میں بھی یقیناً موت نہیں آئے گی۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاش میری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مضبوط دیواریں اور قلعے فرشتوں کے سامنے ہوا میں اڑنے والے پرندوں کی مانند ہیں۔ جس طرح پرندوں کو ہوا چیرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اسی طرح ملک الموت اور دوسرے فرشتے بلا روک ہر مقام پر پہنچ جاتے ہیں لہٰذا تمہیں موت سے ہرگز خوف نہیں کھانا چاہیے اور جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہیے۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک یہ خطاب منافقین کو ہے جو جنگ احد میں شکست دیکھ کر اپنے بھائی بندوں سے کہتے تھے کہ

اگر تم ہماری بات مان لیتے تو تمہارے عزیز اس لڑائی میں نہ مارے جاتے۔ وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۚ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ ؕ اور اگر ان (منافقوں) کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر ان کو کوئی برا واقعہ پیش آجاتا ہے تو (اے پیغمبر) وہ (تم سے) کہتے ہیں کہ یہ برا واقعہ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ خطاب منافقوں سے ہے جس میں ان کے ساتھی یہود بھی شامل تھے۔ اگر انہیں کوئی راحت اور سکون کے لمحات میسر آتے اور خوشی نصیب ہوتی جیسے غلہ کی ارزانی یا جنگ میں مال غنیمت ہاتھ آتا تو اسے تو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے کہ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے اور اگر کوئی دکھ یا مصیبت پہنچے، تو پھر یہ الزام رسول اللہ ﷺ پر لگاتے اور کہتے کہ یہ آپ کی بے تدبیری یا غلط تدبیر کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے اس کے جواب میں آگے چل کر واضح فرمایا کہ کائنات میں خیر اور شر دونوں اللہ کے حکم اور اس کی تقدیر سے ہوتے ہیں۔ انسان کو جو بھی بھلائی ملتی ہے وہ اللہ کا فضل و کرم ہے، اور جو مصیبت یا برائی انسان پر آتی ہے وہ دراصل اس کے اپنے اعمال اور خطاؤں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آیت میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور ان کی رہنمائی کرنا ہے۔ آپ ﷺ کسی کے لیے فالِ بد یا نقصان کا ذریعہ نہیں ہیں، بلکہ آپ تو سراسر رحمت ہیں۔ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ کہہ دو کہ ہر واقعہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ منافقین کو جب انہیں کوئی نقصان، قحط، مصیبت یا شکست ملتی تو وہ اس کا الزام نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کی ذات یا آپ کی لائی ہوئی شریعت پر دھرتے اور کہتے کہ یہ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جاہلانہ رویے کا رد کرتے ہوئے اپنے پیارے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ کہہ دیں کہ "یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے" (یعنی خیر و شر سب اللہ کے قضا و قدر کے تحت ہے مطلب ہے کہ بھلائی، برائی، تکلیف، راحت، فتح اور شکست سب کچھ اللہ کی تقدیر اور اس کے حکم سے ہوتا ہے۔

لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا کا مطلب

فَمَالِ ھٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا ۷۸ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ

کوئی بات سمجھنے کے نزدیک تک نہیں آتے؟ لَا یَکَادُوْنَ قریب بھی نہیں آتے" یعنی یہ اتنے غافل اور ہٹ دھرم ہیں کہ حق بات کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے، اور جب قریب نہیں آتے تو پورا سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا کسی بات کو سمجھنا" یعنی اللہ اور اس کے رسول کی بات کی حقیقت، تقدیر کا فلسفہ اور اس الٰہی حکم کو پلے سے باندھنے سے بالکل قاصر ہیں۔ ان کا دل ضد اور تعصب کی وجہ سے بالکل بند ہو چکا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ رب العالمین جو سمیع و بصیر ہے اس لیے ان کا کیا ہوا غلط کام اللہ سے چھپا ہوا نہیں، لہٰذا غلط کام کی وجہ سے مصیبت تو ان پر ضرور پڑے گی۔ اتنی سی بات یہ لوگ سمجھنے کی تکلیف نہیں کرتے۔

☆☆☆

برائی اور بھلائی کا فلسفہ/ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ⑲ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ⑳ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ㉑

بھلائی کا سرچشمہ

مَآ اَصَابَكَ	جو پہنچے (اے انسان!) تجھ کو	مِنْ حَسَنَةٍ	کوئی بھلائی
فَمِنَ اللّٰهِ ۘ	تو (وہ) اللہ کی طرف سے ہے	وَمَآ	اور جو
اَصَابَكَ	پہنچے تجھ کو	مِنْ سَيِّئَةٍ	کوئی برائی (تکلیف)
فَمِنْ نَّفْسِكَ	تو (وہ) تیری اپنی طرف سے ہے	وَاَرْسَلْنٰكَ	اور ہم نے بھیجا ہے آپ کو
لِلنَّاسِ	لوگوں کے لیے	رَسُوْلًا	رسول بنا کر
وَكَفٰى بِاللّٰهِ	اور کافی ہے اللہ	شَهِيْدًا ⑲	گواہ

فرمایا: مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ تمہیں جو کوئی اچھائی پہنچتی ہے تو وہ محض اللہ کی

طرف سے ہوتی ہے، انسان کو زندگی میں جو بھی نعمت، راحت، صحت، فضل یا توفیق ملتی ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہوتی ہے۔ بندے کی اپنی کوئی طاقت اس پر حتمی نہیں ہوتی، بلکہ ہر اچھے کام اور اچھے حال کا اصل عطا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ اگر انسان اچھے اعمال کرے تو اسے اس کا اچھا بدلہ مل جائے تو یہ خالصتاً اللہ کا فضل و احسان ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انسان پر سابقہ احسانات ہی اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے شکریہ کے طور پر وہ جتنی بھی اطاعت و عبادت کرے ان احسانات کا عوض نہیں بن سکتی۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اس عبادت و اطاعت کی مزید جزا بھی عطا فرما دے تو اس لحاظ سے یہ محض اس کا فضل و احسان ہوا۔ اور نافرمانی اور گناہ کے کام کرے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کے سابقہ احسانات کی انتہائی ناشکری ہوگی اور اسے اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ آگے فرمایا: وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ اور جو کوئی برائی پہنچتی ہے، تو وہ تمہارے اپنے سبب سے ہوتی ہے، یعنی انسان کو پہنچنے والے مصائب اور تکالیف دراصل اس کے اپنے اعمال اور خطاؤں کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لحاظ سے اگر انسان کو کوئی دکھ یا مصیبت آئے تو بسا اوقات اس کی اپنی اسی شامت اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے اور خوشی اور فائدے کی بات تو محض اللہ کا فضل و احسان ہوتا ہے۔ فرمایا: وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۷۹ اور (اے پیغمبر) ہم نے تمہیں لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ (اس بات کی) گواہی دینے کے لیے کافی ہے۔ لوگوں سے مراد صرف دور نبوی کے لوگ ہی نہیں بلکہ تا قیامت آپ تمام اقوام عالم کے لیے رسول ہیں۔ اگر تمام لوگ تا قیامت آپ ہی کی رسالت کی بات تسلیم نہ کریں تو بھی اس حقیقت پر اللہ کی شہادت بہت کافی ہے۔ انسان کو تمام بھلائیاں، آرام و آسائش کی تمام چیزیں اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ یہ بندے کی مرضی ہے کہ ان کو لوگوں کی اور اپنی بھلائی کے لیے استعمال کرے یا برائی کے لیے استعمال کرے۔ قرآن پاک کا یہ اعلان کہ مصیبت، دکھ اور تکلیف انسان خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی ملک، قوم، معاشرہ یا فرد بلا خوف زندگی، اطمینان، امن اور ترقی کا خواہاں ہے تو ان کے لیے اصلاح کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ یہ دیکھیں کہ وہ اللہ کا کوئی قانون تو نہیں توڑ رہے۔

جہاں تک ظلم کا تعلق ہے اسلام اس کو مصیبتوں کی ماں سمجھتا ہے۔ اللہ کو نہ ماننا، کفر کی طرف جھکنا، بے انصافی، رشوت، کرپشن، کم تولنا، زیادہ لینا، سود خوری، یہ سب ظلم کی شکلیں ہیں۔ اس کو روکنے کے لیے رسول ﷺ نے فرمایا: مظلوم کی مدد کرو اسے اس کا حق دلا کر، ظالم کی مدد کرو اسے ظلم سے روک کر۔ اگر کوئی قوم ظلم کی جڑ کاٹتی رہے تو یقیناً اس قوم پر مصیبتیں نازل نہیں ہوں گی۔ اس کی وضاحت کچھ یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ ایک گندی ذہنیت کا آدمی غلط کام کا سوچے گا اور پھر سوچ پر عمل بھی غلط ہی کرے گا۔ غلط عمل کا نتیجہ بھی برا ہی نکلے گا گویا ایک غلط کام کرنے والے انسان نے پورے گھر، محلے، شہر، ملک اور دنیا کو مصیبتوں کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے برعکس ایک نیک نیت، پر خلوص اور صاف ستھری ذہنیت والا شخص کبھی بھی غلط اور نقصان دہ کام کا سوچ نہیں سکتا اور وہ اچھے اور فائدہ مند کام کا ہی سوچتا ہے، پھر اس پر عمل کر کے خود کو، گھر کو، شہر، محلے، ملک اور دنیا کو فائدہ پہنچاتا ہے اور اس طرح اللہ کا فرمان ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنے لیے خود مصیبتیں، پریشانیاں، دکھ اور تکلیفیں پیدا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر انسان کو کوئی دکھ یا مصیبت آئے تو بسا اوقات اس کی اپنی اسی شامت اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے اور خوشی اور فائدے کی بات تو محض اللہ کا فضل و احسان ہوتا ہے۔ اللہ نے تو اس پر پورا فضل و کرم کر رکھا ہے قرآن و سنت میں زندگی گزارنے کے بہترین اصول و قوانین بتا دیئے ہیں کہ دنیا و آخرت میں کامیابیاں حاصل کر سکے اگر ہم ان پر عمل نہیں کریں گے تو زندگی وبال اور ضرر بن جائے گی۔ برے کاموں کے برے نتیجے ہوتے ہیں۔ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ ۔۔: اس آیت میں برائی اور بھلائی کا ایک قانون بیان فرمادیا ہے کہ بھلائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے اس کا بھیجنے والا بھی گو اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے مگر اس کا سبب تمہارے گناہ ہوتے ہیں۔ اس لیے سلف صالحین کا عام قاعدہ تھا کہ جب کوئی اجتہادی رائے پیش کرتے تو کہتے، اگر یہ صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اسی کی توفیق سے ہے اور اگر غلط ہے تو ہماری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ (ابن کثیر) اس آیت میں پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے اعتبار سے "حسنۃ" اور "سیئۃ" دونوں کو "من عند اللہ" (اللہ کی طرف سے) قرار دیا ہے کہ

دونوں چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں، لیکن سبب اور کسب کی مناسبت سے برائی کی نسبت انسان کی طرف کر دی ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (رازی) موضح میں ہے: "بندہ کو چاہیے کہ نیکی اللہ کا فضل سمجھے اور تکلیف اپنی تقصیر سے۔ تقصیروں سے اللہ واقف ہے اور وہی خبر دیتا ہے۔" اس آیت میں سکھایا گیا ہے کہ وہ کامیابی اور اچھائی کا سہرا اپنے کمال کے بجائے اللہ کے فضل کے سر باندھے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرے۔

اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری

مَنْ يُّطِعِ	جس نے اطاعت کی	الرَّسُوْلَ	رسول کی
فَقَدْ	تو تحقیق	اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ	اس نے اطاعت کی اللہ کی
وَمَنْ	اور جس نے	تَوَلّٰى	روگردانی کی
فَمَآ	تو نہیں	اَرْسَلْنٰكَ	بھیجا ہم نے آپ کو
عَلَيْهِمْ	ان پر	حَفِيْظًا ۝۸۰	نگہبان

رسول کی فرمانبرداری (اطاعتِ رسول) اسلام میں ایمان کی بنیاد اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے درجنوں مقامات پر اپنی اطاعت کے ساتھ رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ جس نے رسول کی فرمانبرداری کی، حقیقت میں اس نے اللہ ہی کی فرمانبرداری کی کیونکہ رسول خود آمر نہیں ہوتا بلکہ اس کا کام احکام الٰہی لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ وہ مبلغ ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے اوامر پہنچانے کا قطعی ذریعہ ہوتا ہے۔ اس واسطے اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے اور اس سے جھگڑا کرنا اور اس پر الزام لگانا قبیح فعل ہے۔ فرمایا وَمَنْ تَوَلّٰى جس نے رسول کی اطاعت سے روگردانی کی، فرمایا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰ ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگہبان یا داروغہ بنا کر تو نہیں بھیجا۔ آپ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے ان کو پکڑ پکڑ کر راہ راست پر لانا آپ کا کام نہیں ہے باقی ان لوگوں کی گرفت کرنا اور انہیں سزا دینا ہمارا کام ہے۔ ہم انہیں مقررہ وقت پر پکڑ لیں گے۔ کیونکہ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۷۹

سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔شہید کا معنی گواہی ادینے والا ہوتا ہے۔کسی جگہ وکیل کا لفظ آیا ہے۔ کہیں ولی فرمایا ہے کہ سب اللہ کی صفات ہیں۔آپ ان پر دراوغہ نہیں ہیں۔آپ تو اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات کو پہنچانے والے ہیں۔روگردانی کرنیوالوں سے اللہ تعالیٰ خود نپٹ لے گا۔

حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ذات گرامی اہل ایمان کے لئے سرچشمہ ہدایت اور مرکزِ عشق ومحبت ہے۔مسلم معاشرہ کا سارا نظام آپ ﷺ کے اسوۂ مبارکہ پر قائم ہے اور عمل کی دنیا آپ ﷺ کی تعلیمات پر استوار ہے۔آپ ﷺ کا لایا ہوا پیغام، پیغامِ حق ہے اور آپ ﷺ کی سنت وشریعت میزان عمل ہے۔اللہ رب العالمین نے قیامت تک ساری دنیا کے لئے آپ ﷺ کو آخری رسول اور کامل اسوہ حسنہ بنا کر بھیجا ہے۔اس آیت میں اللہ رب العزت رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے ان کو تسلی دیتے ہیں کہ آپ نے میرا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا بس یہی آپ کا کام تھا۔اب یہ کام ہر شخص کا اپنا ذاتی ہے کہ وہ رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتا ہے یا نہیں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ جس نے رسول ﷺ کی پیروی کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی، کیونکہ رسول ﷺ کا فرمان دراصل اللہ کا فرمان ہے۔اب جو احکامات کو سمجھتے ہیں، عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو گویا انہوں نے جنت کمالی اور جو ایسا نہیں کرتے تو وہ اس کا اجر پالیں گے ان کی بدعملی کا خود ان سے پوچھا جائے گا۔آپ نہ ذمہ دار ہیں اور نہ آپ سے پوچھا جائے گا۔آپ نے تو اپنا کام خوبی سے کر دیا ہے، اب ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور سزا یا جزا اس کو اعمال کے مطابق ضرور ملے گی۔فرمایا مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ : چونکہ نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول اور مبلغ ہیں، اس لیے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے شریعت کے احکام سب ایسے ہیں جنھیں آپ ﷺ کی توضیح کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں، لہٰذا قرآن مجید سمجھنے کے لیے کوئی شخص سنت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔

قول وعمل کا تضاد اور اسلام

وَيَقُوْلُوْنَ	اور وہ (منافق) کہتے ہیں	طَاعَةٌ	(ہمارا کام تو) فرمانبرداری ہے
فَاِذَا بَرَزُوْا	پھر جب وہ نکلتے ہیں	مِنْ عِنْدِكَ	آپ کے پاس سے
بَيَّتَ	(تو) رات کو مشورہ کرتا ہے	طَآئِفَةٌ	ایک گروہ
مِّنْهُمْ	ان میں سے	غَيْرَ الَّذِيْ	خلاف اس (بات) کے جو
تَقُوْلُ	آپ کہتے ہیں	وَاللّٰهُ يَكْتُبُ	اور اللہ لکھتا ہے
مَا يُبَيِّتُوْنَ	جو وہ رات کو مشورہ کرتے ہیں	فَاَعْرِضْ	چنانچہ آپ اعراض کریں
عَنْهُمْ	ان سے	وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	اور آپ توکل کریں اللہ پر
وَكَفٰى بِاللّٰهِ	اور کافی ہے اللہ	وَكِيْلًا ۸۱	کارساز

ارشاد ہوتا ہے وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ان منافقوں کا حال یہ ہے کہ جب آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارا مطالبہ تو اطاعت کا ہے، آپ جو کچھ فرمادیں ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ مگر فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ جب آپ سے نکل کر چلے جاتے ہیں بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ان میں سے ایک گروہ رات کو مشورہ کرتا ہے، اس کے خلاف جو بات آپ نے کہی۔ جب تک آپ کے ہاں بیٹھے رہتے ہیں، آپ کی فرمانبرداری کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر جب اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ تو رات کو علیحدگی میں آپ کے مشن کے خلاف مشورہ اور منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ اسلام اور اہل اسلام کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے۔ اپنی انہی سازشوں کی وجہ سے منافقین اسلام کے خلاف خطرناک ترین گروہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی سازشوں کو وقتاً فوقتاً بے نقاب کیا اور انہیں سخت سزا کی وعید سنائی۔ مذکورہ سازش کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ منافقین جو کچھ مشورہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو لکھتا ہے۔ یعنی اس کے فرشتے ان کی ہر ہر حرکت کو نوٹ کر رہے ہیں۔ پھر قیامت کے دن یہی نوشتہ ان کے سامنے کر دیا جائیگا۔ اللہ نے فرمایا کہ ان لوگوں کی تمام تر کرتوتوں کے باوجود فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ آپ ان سے اعراض کریں،

ان کی طرف توجہ نہ کریں۔اور یہاں اشارتاً یہ بھی سمجھا دیا کہ منافقین یہ نہ سمجھیں کہ ان کا راز فاش نہیں ہوا۔بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو بوقت ضرورت آگاہ کرتا رہتا ہے پیغمبر خود تو عالم الغیب نہیں مگر اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے۔اپنے نبی کو غیب پر مطلع کر دیتا ہے۔قرآن پاک میں متعدد مقامات پر موجود ہے کہ اللہ نے پیغمبر (علیہ السلام) کو وحی کے ذریعے بہت سی باتیں بتلا دیں۔تو یہاں بھی مقصود یہی ہے کہ آپ فکر نہ کریں۔ہم وقت مقرر پر ضرور ان کو پکڑ لیں گے اور پھر انہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنا ہوگی۔فرمایا آپ منافقین کی طرف توجہ نہ فرمائیں بلکہ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھیں وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ⑧١ کارساز اللہ ہی کافی ہے۔وکیل کا معنی کام بنانے والا ہوتا ہے۔ہر چیز تو قبضہ قدرت میں ہے لہٰذا منافقوں کی سازشیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ضرور غالب کریگا۔اس پر پختہ یقین ہونا چاہیئے۔

اس آیت منافقین کی ایک اور مذموم خصلت بیان فرمائی ہے اور ان کو سرزنش کی ہے اور آپ ﷺ کو ان کی حرکات سیۂ سے چشم پوشی اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا حکم فرمایا ہے۔آج ہم مسلمانوں کا جرم یہی ہے کہ زبان سے اسلام کا دعویٰ ہے،لیکن عمل وہ ہیں جن سے کافر بھی شرمائے اور افراد واشخاص ہوں یا حکومتیں،راعی ہوں یا رعایا سب آج اس عظیم معصیت میں مبتلا ہیں،نفاق عملی میں تو قریباً سبھی مبتلا ہیں کہ زبان سے دعوے کچھ کیے جاتے ہیں اور عمل کچھ اور ہوتا ہے،آج عمومی طور پر مسلمان نفاقِ عملی یا اعتقادی میں مبتلا ہے،آج ہمیں جو ذلت ونکبت نصیب ہو رہی ہے،درحقیقت اس منافقانہ طرزِ زندگی کی سزا ہے،کیا یہ ارشادات ہماری تنبیہ اور گوشمالی کے لیے کافی نہیں؟ کیا دن بدن ہمارا قدم نحوست وادبار کی طرف نہیں بڑھ رہا؟ کیا ہم نے خدا کی متواتر نعمتوں کی ناشکری میں کوئی کسر چھوڑی ہے؟؟ کیا یہ سب کچھ نفاق نہیں ہے؟ غضب الٰہی کو دعوت دینے والی کون سی برائی ہے کہ اس کو ہم نے نہ اپنایا ہوا اور نیکی وفلاح وبہبود کا کون سا کام ہے جسے ہم نے نہ ٹھکرایا ہو؟ نہ معلوم کہ غفلت کے پردے کب چھٹیں گے اور بدنصیب قوم کا طالع سعید کب طلوع ہوگا؟

☆☆☆

تدبرِ قرآن کی اہمیت وفوائد/ استنباط مسائل/ استنباط شرعی حجت ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا
کَثِیْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی
الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ ؕ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾

قرآن میں غور وفکر کی دعوت

اَفَلَا	کیا پھر نہیں	یَتَدَبَّرُوْنَ	وہ تدبر (غور وفکر) کرتے
الْقُرْاٰنَ	قرآن میں	وَلَوْ کَانَ	اور اگر ہوتا یہ
مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ	غیر اللہ کی طرف سے	لَوَجَدُوْا فِیْہِ	تو وہ پاتے اس میں
اخْتِلَافًا	اختلاف	کَثِیْرًا ﴿۸۲﴾	بہت زیادہ

قرآن کریم، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس کا حق جلّ مجدہٗ کی ذات سے براہِ راست تعلق ہے، آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیے گئے اس آخری پیغامِ ربانی کے ہمارے ذمہ جو حقوق ہیں، ان میں سے ایک اہم حق یہ ہے کہ اس کتابِ ہدایت میں غور وتدبّر کرکے زندگی کی راہیں دریافت کی جائیں۔

خود قرآن کریم میں جا بجا اس کی تلقین اور ترغیب ہے۔ فرمایا اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے۔ اللہ کا رسول دین کا پروگرام تو قرآن پاک کی شکل میں پیش کرتا ہے، پھر اس کی تشریح اور وضاحت بھی کرتا ہے، اس پر عمل کر کے خود نمونہ بھی بنتا ہے۔ اگر یہ قرآن میں غور کرتے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اور دین کے پروگرام کے متعلق ان کے تمام شبہات دور ہو جاتے۔ انہیں قرآن کی حقانیت کا یقین آجاتا، وہ جان لیتے یہ اللہ کا کلام اور اس کی پاک صفت ہے، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ اس میں پیش کردہ نظام تمام عیوب سے پاک ہے۔ یہ چیزیں قرآن میں غور و تدبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں تدبر کے بغیر انسان کے شکوک و شبہات دور نہیں ہو سکتے اور نہ قرآن صحیح طور پر سمجھ میں آسکتا ہے۔ فرمایا: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۸۲ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بکثرت اختلافات پاتے۔ اس آیت میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل دی گئی ہے۔ انسان جتنا بھی بڑا عقلمند یا دانا ہو، اس کی بات میں وقت کے ساتھ تضاد (فرق یا کمی) آہی جاتی ہے۔ چونکہ قرآن مجید پورے 23 سال کے طویل عرصے میں مختلف حالات، جنگ و صلح اور خوشی و غمی کے موقع پر نازل ہوا لیکن اس کی ایک بات دوسری بات کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے احکام، عقائد، اور خبریں سب آپس میں سو فیصد متفق ہیں۔ قرآن کریم اگر غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلاف کثیر ہوتا، اب یہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لیے اختلاف کثیر کجا، سرے سے اس میں اختلاف ہے ہی نہیں۔ اگر یہ کتاب کسی انسان کی لکھی ہوئی ہوتی، تو حالات بدلنے کے ساتھ اس کے خیالات بدلتے اور اس میں بہت سے تضادات اور نقائص (غلطیاں) نکل آتے، قرآن کا سراسر باہم متفق اور درست ہونا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اور قرآن کریم نے انسانوں کو اس کائنات اور خود کتابِ الٰہی کی آیات میں بار بار غور و فکر، تدبر اور عقل و فہم استعمال کرنے کی دعوت دی ہے۔

تفکر (غور و فکر) سب سے بڑی عبادت ہے

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ تدبرِ قرآن کی اہمیت ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''بندے کی دنیا وآخرت میں سب سے مفید اور اسے سب سے زیادہ نجات سے قریب کرنے کے لیے قرآن کریم میں طویل غور وتدبر اور اس کی آیات کے معانی میں فکر کو یکجا کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں؛ کیونکہ قرآن، انسان کو خیر وشر کی تمام بنیادوں سے واقف کراتا ہے، خیر وشر کی راہوں، ان کے اسباب، نتائج وثمرات سے اور اہلِ خیر واہلِ شر کے انجام سے آگاہ کرتا ہے۔ سعادت کے خزانوں کی کنجیاں اور مفید علوم اس کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے، ایمان کی بنیادوں کو اس کے دل میں راسخ کرتا ہے، اسے دنیا وآخرت کی حقیقت دکھاتا ہے، اس کے دل میں جنت ودوزخ کا استحضار پیدا کرتا ہے، اقوامِ عالم کی تاریخ سے آگاہ کرتا اور عبرت گاہیں دکھاتا ہے، اللہ کے عدل اور فضل کا مشاہدہ کراتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات واسماء، صفات وافعال، اس کی پسند وناپسند اور اس تک پہنچانے والی راہ کی پہچان کراتا ہے۔ (مدارج السالکین، ج: ۱، ص: ۴۵۳) اللہ تعالی کی نشانیوں اور کائنات میں غور وفکر کرنا بہت بڑی قلبی عبادت ہے جو کہ انسان کو عملی اقدامات پر ابھارتی ہے، اور مفید ترین عبادت ہے، یہ انسان کو عملی عبادات کی دعوت دیتی ہے اور اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کرنے پر مجبور کرتی ہے، غور وفکر اصل میں حصولِ رحمت کی کنجی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جیسے ہی غور وفکر شروع کرے تو توبہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن پاک میں تدبر کا نتیجہ تھا کہ عربوں جیسی جاہل قوم نے دنیا بھر کی قیادت سنبھال لی۔ یہ اسی قرآن کا اعجاز تھا کہ اخلاقی طور پر انتہائی گری ہوئی قوم اخلاق کی بلندیوں تک پہنچ گئی اور نادان اور بے سمجھ لوگ علم وحکمت کے دریا بہانے لگے۔ یہ سب قرآن پاک کی برکات اور اس کا اعجاز تھا۔ ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ'' یہ شک وشبہ سے بالا کتاب ہے اس میں جن لوگوں نے شک وشبہ کا اظہار کیا وہ ان کی اپنی کج فہمی کا نتیجہ تھا۔ بھینگے آدمی کو ایک چیز دو نظر آتی ہیں۔ یرقان کے مریض کو ہر چیز زرد نظر آتی ہے یہ ان کے دماغ ونظر کی خرابی ہوتی ہے مگر درحقیقت ہر چیز اپنی اصل حالت پر ہی قائم ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں شک کرنے والوں کی اپنی عقل وفکر صحیح نہیں ہوتی، ورنہ وہ کلام پر اعتراض کی جرأت نہ کریں۔ کوئی بھی صاحب

علم وعقل اس میں غور کرے گا تو اسے کوئی تفاوت نظر نہیں آئے گا، جس طرح قرآن کے الفاظ فصاحت و بلاغت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں اس طرح اس کا نظام بھی بے مثال ہے اس کی حکمت و دانائی کا کوئی مقابل نہیں۔ یہ سب باتیں تدبر سے سمجھ میں آتے ہیں مگر منافقین اس کے لیے تیار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کی حقانیت پر انہیں یقین نہیں آتا اور وہ اللہ کے رسول کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان، قرآن کریم سے اپنا تعلق مضبوط رکھے، اس کی تلاوت کرتا رہے، اس کے مضامین میں غور وفکر کرتا رہے، اور اس کی تعلیمات پر عمل کی کوشش کرتا رہے تو راہِ حق پر گامزن رہتا، گمراہیوں سے بچا رہتا اور نفس وشیطان کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور جو انسان، قرآن سے دور ہو جائے اور اس کی راہ سے روگردانی کرے تو وہ ضلالت کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا اور شیاطین کا کھلونا بن جاتا ہے، جو اسے ذلت وہلاکت کے گھڑے میں جا گراتے ہیں، نتیجتاً ایسا انسان دنیا کے غموں اور آخرت کی حسرتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم سے استفادہ کے لیے کچھ امور معاون ہوتے ہیں اور کچھ چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں۔ کلام اللہ کی تعظیم وادب، تقویٰ وطہارت، اخلاص، دعا، قیام اللیل، سچی طلب، جذبۂ اتباع، خوفِ خداوندی، ایمان بالغیب، غور وتدبر، نفس کا مجاہدہ اس راہ میں معین ومددگار ہوتے ہیں، جبکہ بے ادبی وبے تعظیمی، کج روی، بدعقیدگی، کبر وغرور، فہم قرآن میں کوتاہی، معاصی، بلا دلیل بحث وجدال، انکارِ آخرت اور دنیا پرستی اس راستے کے پتھر ہیں۔ دروسِ قرآن کی مجالس میں شرکت، علماء کرام کی رہبری میں مستند تفسیروں کے مطالعہ، اور مضامین قرآن میں غور وفکر کرنے کی کوشش ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم کے ساتھ گہرا تعلق نصیب فرمائے، اور اس کی تعلیمات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

افواہوں کی تحقیق کا حکم

وَاِذَا	اور جب	جَآءَھُمْ	آتی ہے انکے پاس
اَمْرٌ	کوئی بات	مِّنَ الْاَمْنِ	امن کی
اَوِ الْخَوْفِ	یا خوف (کی)	اَذَاعُوْا	(تو) وہ مشہور کر دیتے ہیں

بِهٖ	اسے	وَلَوْ رَدُّوْهُ	اور اگر وہ اسے لوٹاتے
اِلَى الرَّسُوْلِ	رسول کی طرف	وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ	اور اصحابِ امر کی طرف
مِنْهُمْ	اپنے میں سے	لَعَلِمَهُ	تو جان لیتے اس (کی حقیقت) کو
الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ	تحقیق کرتے ہیں اس کی
مِنْهُمْ ؕ	ان میں سے	وَلَوْلَا	اور اگر نہ (ہوتا)
فَضْلُ اللّٰهِ	اللہ کا فضل	عَلَيْكُمْ	تم پر
وَرَحْمَتُهٗ	اور اس کی رحمت	لَاتَّبَعْتُمُ	ضرور تم پیچھے لگ جاتے
الشَّيْطٰنَ	شیطان کے	اِلَّا قَلِيْلًا ۸۳	مگر تھوڑے ہی

اللہ تعالیٰ نے ہر خبر کی بلا تصدیق و تحقیق تشہیر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اسلام کی ابتدائی جنگوں کے دوران لوگ محاذوں سے آنے والی خبروں کے منتظر رہتے تھے۔ اور پھر جونہی کوئی خبر پہنچتی اسے بلا تحقیق مشہور کر دیتے، حالانکہ جنگی حکمت عملی کے پیش نظر بعض چیزوں کی تشہیر نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ ان کے پاس کوئی خبر آتی ہے، امن کی یا خوف کی۔ یہاں امن کی خبر سے مراد خوشخبری ہے، مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگئی، مال غنیمت حاصل ہوگیا یا کوئی اور کامیابی ہوگئی تو اسے امن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف اگر شکست آگئی، جانی یا مالی نقصان ہوگیا تو اسے خوف کا نام دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب کوئی ایسی خبر پہنچتی ہے تو منافقین اور کمزور مسلمان اَذَاعُوْا بِهٖ جاس کو پھیلا دیتے ہیں، عام کر دیتے ہیں، حالانکہ ایسی باتوں کی تشہیر بعض اوقات مناسب نہیں ہوتی اور اہل اسلام اور دین کے لیے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ ہر بات کو بلا تحقیق آگے پہنچا دینا درست نہیں ہوتا۔ فرمایا جب بھی کوئی ایسی خبر پہنچے تو اس کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ اور اگر یہ لوٹاتے ایسی بات کو رسول کی طرف وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ اور اپنے میں سے صاحب امر کی طرف۔ تو اس کا فائدہ یہ ہوتا لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ کہ ان میں تحقیق و تجسس کرنے والے بات کی حقیقت کو جان لیتے۔ مقصد یہ

ہے کہ کسی خبر کو عام کرنے سے پہلے لازم ہے کہ اسے ذمہ دار لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ اس کی باقاعدہ تحقیق وتصدیق کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ آیا اس خبر کی تشہیر اسلام کے مفاد میں ہے یا نقصان میں، اس ضمن میں فرمایا کہ کسی معاملہ میں حتمی فیصلہ اللہ کے رسول کا ہوتا ہے اگر اللہ کا رسول اس مقام پر موجود ہے تو ایسی بات فوراً اس کے نوٹس میں لاؤ اور پھر اس کے فیصلے کے مطابق عمل کرو۔ اور اگر رسول خدا موجود نہیں ہیں تو پھر ایسی بات آپ کے نائب یا اُولِی الْاَمْرِ کے پاس لے جاؤ، تا کہ وہ حالات کے پیش نظر فیصلہ کر سکے کہ اس کی تشہیر مفید ہے یا نہیں۔ صاحب امر سے مراد مسلمان حکام بھی ہیں اور امت کے علماء وفقہاء بھی۔ اگر معاملہ انتظامی نوعیت کا ہے تو وہ حاکم وقت کے پاس جائیگا، کیونکہ فوج کی تنظیم، شہری دفاع اور دیگر ملکی نظم ونسق کی ذمہ داری حکام پر ہوتی ہے، اس لیے ایسے معاملہ میں وہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں اور اگر معاملہ حلت وحرمت کا ہے یا کسی بات کے جائز ناجائز کا ہے اور اس میں شرعی فتویٰ کی ضرورت ہے تو پھر ایسا معاملہ علما وفقہاء کے سامنے پیش کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنی علمی تحقیق وتجسس کی روشنی میں مسئلہ کا حل پیش کر سکیں۔ امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اُولِی الْاَمْرِ میں حکام وقت اور علماء فقہاء کے دونوں گروہ شامل ہیں۔

قرآن وسنّت کے بعد اجماع واجتہاد (قیاس)، شریعت کے بنیادی مآخذ کیوں؟

اللہ تعالیٰ نے انسانی رہنمائی کے لئے یہ صورت اختیار فرمائی کہ بنیادی طور پر (1) نبی ﷺ کے ذریعہ کتاب وسنت میں اصول ذکر فرمادئے، اور پھر امت کے (2) مجتہدین کو ہدایت کی گئی کہ وہ تخریج کر کے پیش آمدہ مسائل وحادثات کے احکامات متعین کریں، اور جو لوگ اجتہاد کی مطلوبہ شرائط کے حامل نہ ہوں ان کو پابند کیا گیا کہ وہ واقف کاروں سے مسائل معلوم کر کے عمل کر لیا کریں۔ پھر جب امت کے معتبر اور باصلاحت علماء نے اس راہ میں خدمت شروع کی تو تمام شرعی احکامات کے لئے تین ''قطعی'' مصادر: (۱) کتاب اللہ (۲) سنتِ رسول اللہ (۳) اور اجماعِ کو بنیاد بنایا۔ اور مذکورہ قطعی مصادر سے مستفاد ''ظنی'' مصدر (۴) ''قیاس واجتہاد'' کو بھی قانونِ شریعت کا چوتھا ماخذ قرار دیا، انہی چار بنیادوں پر پوری ''فقہ اسلامی'' کا مدار ہے۔ اس آیات میں چاروں دلیلوں کی

طرف اشارہ ہے: (1) اَطِیْعُوا اللّٰہَ سے مراد ''قرآن مجید'' ہے۔ (2) اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ سے مراد اسوۂ حسنہ یعنی ''نبوی زندگی'' ہے اس کے بعد مراد ''سنّت'' ہے۔ (3) اُولِوا الْاَمْرِ سے مراد ''فقہاء'' ہیں، ان میں اگر اختلاف و تنازع نہ ہو بلکہ اتفاق ہو جاتے تو اسے ''اجماعِ فقہاء'' کہتے ہیں۔ (یعنی اجماعِ فقہاء کو بھی مانو)۔ (4) اگر ان اُولِی الْاَمْر (فقہاء) میں اختلاف ہو تو ہر ایک ''مجتہد'' کے اجتہاد کو ''قیاسِ شرعی'' کہتے ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں آمدہ لفظ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ نئے پیش آمدہ مسائل کا حل کلی طور پر نصوص سے نہیں ہو سکتا۔ نص تو ایسی چیز کو کہتے ہیں جو قرآن پاک یا حدیث شریف سے صراحتاً ثابت ہو۔ نئے مسائل میں چونکہ نص موجود نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کا حل استنباط سے ہی ممکن ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے معاملات اللہ کے رسول یا صاحب امر کے پاس لے جاؤ جو استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ اگر کوئی انتظامی نوعیت کا معاملہ ہے تو حکام وقت نپٹائیں گے اور اگر حدود شریعت کا مسئلہ ہے تو اسے اہل علم کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ ہر شخص ہر مسئلہ میں خود مفتی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ عام حکم بھی موجود ہے ''فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'' اگر تمہیں کسی معاملہ کا علم نہیں تو اہل علم سے دریافت کرلو، وہی اس کا حل پیش کرینگے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں استنباط کا عظیم اصول بیان فرمایا ہے۔ یہاں بھی استنباط سے مراد قیاس و اجتہاد کے ذریعے کسی مسئلے کا استخراج ہے۔ یہ مجتہد کا کام ہے کہ وہ مسئلہ کی بنیاد تلاش کرے اور دیکھے کہ اس کا تعلق کون سی دلیل کے ساتھ ہے۔ پھر اس میں غور و فکر کر کے پیش آمدہ مسئلہ کا حل پیش کرے۔ ظاہر ہے کہ مجتہد کے پاس قطعی علم تو نہیں ہوتا کیونکہ قطعی علم فقط نبی کو بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا مجتہد کا اجتہاد ظن غالب پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اسی پر وہ مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھنا مناسب ہوگا کہ آیات و احادیث سے احکام شرعیہ کے اخذ کرنے میں فقہاء حنفیہ کا منہج کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ شروع ہی سے کتاب و سنت سے استنباط میں دو مکاتب فکر ہیں، ایک طبقہ وہ تھا جو حدیث کی حفظ و روایت کے پہلو سے غور

کرتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس نے قرآن وحدیث سے احکام کے استنباط پر زیادہ توجہ دی۔ وہ محض الفاظ حدیث کے ظاہری مفہوم پر اکتفاء کرنے کے بجائے اس کے معانی ومقاصد میں بھی غواصی کرتا تھا اور روایات کو خارجی قرائن کی روشنی میں بھی پرکھتا تھا۔ پہلا گروہ ''اصحاب الحدیث'' کہلایا اور دوسرا گروہ ''اصحاب الرائے''۔ اس لیے یہ لقب متقدمین کے نزدیک وجہ تعریف تھا نہ کہ باعث مذمت، جیسا کہ آج کل بعض کوتاہ بین سمجھتے ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استنباط حجتِ شرعی ہے۔ اور یہ ہر شخص کا کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ نیا مسئلہ اہل علم کے آگے پیش ہوگا۔ اور جب وہ اس کا حل پیش کر دے تو پھر عام لوگوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس پر عمل کریں، اس طرح گویا اہل علم کی تقلید عوام پر واجب ہوگئی۔ اسی لیے اللہ نے ایسے مسائل کو اہل علم کی طرف لوٹانے کا حکم دیا ہے تاکہ باقی لوگ ان کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرلیں۔ یہی تقلید ہے۔ امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استنباط نبی اور امتی دونوں میں پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات جب وحی نہیں آتی تو نبی خود بھی مسئلہ کا استنباط کرتا ہے اور پھر آپ کے علاوہ انتظامی امور میں ذمہ دار حکام وقت اور شرعی معاملات میں اہل علم ودانش استنباط واستخراج مسائل کے ذمہ دار ہیں۔ اہل سنت کے ائمہ اربعہ نے استنباط کے ذریعے ہزاروں اور لاکھوں شرعی مسائل کا حل پیش کر کے اس کی افادیت کو ثابت کر دیا۔

اہلسنت والجماعۃ کے نزدیک امام اور معصومیت'' کا نظریہ

استنباط کے قانون سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ استنباط یا استخراج مسائل غور وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور غور وتدبر میں آراء کا مختلف ہونا بھی عین ممکن ہے۔ اہل تشیع (اثنا عشری) کے نزدیک بارہ امام معصوم ہیں، یعنی وہ صغیرہ وکبیرہ گناہوں، خطاؤں اور بھول چوک سے پاک ہوتے ہیں۔۔ لہٰذا رافضیوں کا عصمت امام کا عقیدہ درست نہیں ہے۔ اہلسنت والجماعۃ کے نزدیک عصمت (گناہوں سے معصومیت) صرف انبیاء اور ملائکہ کا خاصہ ہے۔ انبیاء کے علاوہ کوئی بھی انسان، خواہ وہ کتنا ہی بزرگ امام یا ولی ہو، کلی طور پر معصوم نہیں ہوتا۔ معصوم وہ ہوتا ہے جس کی بات قطعی ہو، اور

وہ صرف پیغمبر کی ذات ہوتی ہے اگر امام کی بات بھی قطعی ہو تو پھر استنباط کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے استنباط تو وہیں ہوگا جہاں غور وفکر کی ضرورت ہے اور جب کوئی چیز غور وفکر کے ذریعے نکالی جائے تو وہ قطعی نہیں ہو سکتی، لہٰذا ثابت ہوا کہ امام معصوم نہیں ہوتا۔ البتہ اولیاء اور صالحین اللہ کے حفظ وامان میں گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن ان سے سہواً یا اجتہادی خطا کا امکان موجود ہو سکتا ہے۔

قیاس کی ضرورت کیوں ہے؟

قرآن وسنت کی نصوص (آیات واحادیث) محدود ہیں، جبکہ انسانی زندگی کے مسائل اور حالات روز بروز لامحدود اور تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ نئے پیش آنے والے حالات میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے قرآن وسنت کے اصولوں اور علتوں کو سامنے رکھ کر رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ قیاس شریعت کے چار بنیادی دلائل (کتاب، سنت، اجماع اور قیاس) میں سے چوتھا اہم ماخذ ہے، جو شریعت کی ہمہ گیر اور دائمی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔ قیاس خود سے کوئی نیا حکم نہیں بناتا، بلکہ شریعت کے چھپے ہوئے یا بنیادی اصولوں کو نئے معاملات پر ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال ماہرین اصول فقہ کہتے ہیں کہ دلائل شرع چار ہیں یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اجماع امت یعنی اتفاق صحابہ اور قیاس۔ مقصد یہ ہے کہ جس مسئلہ کا حل نہ قرآن پاک سے معلوم ہو اور نہ حدیث رسول سے اور جس پر اجماع صحابہ علیہم الرضوان بھی ثابت نہ ہو تو اس کا حل قیاس کے ذریعے معلوم کیا جائیگا۔ ائمہ اربعہ نے لاکھوں مسائل کا حل قیاس کے ذریعے پیش کیا اور وہ سب کے سب حق پر ہیں۔ ان کے درمیان بعض مسائل میں فروعی اختلاف پایا جاتا ہے مگر دین کے بنیادی مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ فروعی اختلاف فہم اور استخراج کے طریق کار میں اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے چونکہ یہ غور وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے اللہ کے رسول نے اسے امت کے لیے باعث رحمت فرمایا ہے۔ بہر حال دلائل شرع میں سے چوتھی دلیل قیاس ہے اور اس کی ضرورت ہر زمان اور ہر مکان میں موجود رہیگی۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ فرمایا وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل نہ ہوتی لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ تو چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے

چل نکلتے۔شیطان انسان کے دل میں وہم ڈال کر گمراہ کر دیتا ہے وہ گمراہی کی بات کو بڑا مزین کر کے پیش کرتا ہے۔جس کی وجہ سے کم علم لوگ اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔البتہ کچھ سمجھدار اور اہل علم لوگ اس کے جال سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے تمہاری ہدایت کے لیے تمام سامان مہیا کر دیے ہیں۔اور وہ طریقے بھی بتلا دیے ہیں جن سے پیش آمدہ مسائل کا حل معلوم کیا جا سکے۔الغرض! قرآن وسنت کی نصوص محدود ہیں جبکہ پیش آمدہ انسانی مسائل لامحدود ہیں۔استنباط ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے بدلتے ہوئے حالات اور نئے معاملات میں شریعت کا حکم معلوم کیا جاتا ہے۔استنباط ہر شخص کا کام نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے عربی زبان پر عبور، اصولِ فقہ کی معرفت اور قرآن وسنت کا گہرا فہم ہونا ضروری ہے۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ نئے مسائل میں علماء اُمت کو استنباط واجتہاد کا فریضہ انجام دینا ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُمت میں تمام لوگ اجتہاد کرنے کے اہل نہ ہوں گے، یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جو لوگ اجتہاد کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، ان پر اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والوں کی تقلید واتباع واجب ہے۔اسی سلسلہ میں مسلمانوں کو تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ وہ ایسی افواہوں میں ہرگز حصہ دار نہ بنیں بلکہ اگر کوئی افواہیں سن پائیں تو اسے حکام بالا تک پہنچا دیں تا کہ وہ صورتحال کی تحقیق کر سکیں۔

☆☆☆

اچھی سفارش ثواب اور بُری سفارش گناہ ہے/
سلام کے احکام وآداب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ عَسَی اللّٰہُ
اَنْ یَّکُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ وَاللّٰہُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْکِیْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ یَّشْفَعْ
شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا ۚ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ
کِفْلٌ مِّنْھَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا
بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْ رُدُّوْھَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا
ھُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ
حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾

جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب

فَقَاتِلْ	چنانچہ آپ لڑیں	فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ	اللہ کے راستے میں
لَا تُکَلَّفُ	نہیں آپ ذمہ دار بنائے گئے	اِلَّا نَفْسَکَ	مگر اپنی ہی ذات کے
وَحَرِّضِ	اور آپ رغبت دلائیں	الْمُؤْمِنِیْنَ	مومنوں کو

عَسَى اللّٰهُ	امید ہے اللہ	اَنْ يَّكُفَّ	یہ کہ روک دے
بَاْسَ	لڑائی	الَّذِيْنَ	ان لوگوں کی جنہوں نے
كَفَرُوْا	کفر کیا	وَاللّٰهُ	اور اللہ
اَشَدُّ	بہت سخت ہے	بَاْسًا	لڑائی میں
وَّاَشَدُّ	اور بہت سخت ہے	تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾	سزا دینے میں

فرمایا فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ لہٰذا (اے پیغمبر) تم اللہ کے راستے میں جنگ کرو، تم پر اپنے سوا کسی اور کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہاں مومنوں کو ترغیب دیتے رہو، شوال ۳ ہجری میں اُحد کا معرکہ ہو چکا تھا، جس میں بہ ظاہر مسلمانوں کو کافی نقصان ہوا تھا، اس موقع سے کفار مکہ کی طرف سے بدر میں دوبارہ معرکہ کا چیلنج دیا گیا، آپ ﷺ نے پوری قوت سے اس کو قبول فرمایا آپ ﷺ دوبارہ بدر کی طرف اسی ارادہ سے کوچ کرنے کو تیار ہوئے؛ چوں کہ ابھی اُحد کا زخم تازہ تازہ تھا؛ اس لئے منافقین کے علاوہ کچھ مسلمانوں کو بھی خیال ہوا کہ ابھی اس نئے معرکہ سے گریز کرنا چاہئے، مگر رسول اللہ ﷺ پوری طرح اس کے لئے تیار تھے، ان ہی حضرات کی تنبیہ کے لئے فرمایا جارہا ہے کہ اگر کوئی اور نہ نکلے تو آپ ﷺ تنہا اُٹھ کھڑے ہوں ؛ کیوں کہ آپ ﷺ دوسروں کے عمل کے ذمہ دار نہیں ہیں ؛ چنانچہ پھر آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ شعبان ۴ھ میں بدر تشریف لے گئے اور آٹھ دنوں قیام فرمایا، (البدایہ والنہایۃ)

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

کچھ بعید نہیں کہ اللہ کافروں کی جنگ کا زور توڑ دے۔ اور اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست ہے اور اس کی سزا بڑی سخت۔ اللہ تعالیٰ کے لیے "عَسٰی" کا لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، پس آیت میں وعدہ کیا جارہا ہے کہ عنقریب کفار کا زور ٹوٹ جائے گا اور مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ بدر صغریٰ (چھوٹا غزوہ بدر، اُس) کی جنگ جو ابوسفیان سے طے تھی جب اس کا وقت آپہنچا تو سرکارِ عالی وقار صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے وہاں جانے کے لئے لوگوں کو دعوت دی، بعض لوگوں پر یہ گراں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اپنے حبیب صَلَّی اللہُ

تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو حکم دیا کہ آپ جہاد نہ چھوڑیں اگرچہ تنہا ہوں اللہ عَزَّوَجَلَّ آپ کا ناصر و مددگار ہے، اللہ عَزَّوَجَلَّ کا وعدہ سچا ہے۔ یہ حکم پا کر رسولِ کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم بدر صغریٰ کی جنگ کے لئے روانہ ہوئے اور صرف ستّر سوار ہمراہ تھے۔ (مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۸۴، ص ۲۴۲) اہل مکہ نہیں آئے اور جنگ نہ ہوئی؛ لیکن اہل مکہ پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی کہ احد کے واقعہ نے مسلمانوں کے حوصلہ و ہمت کو کم نہیں کیا ہے۔ اور فرمایا کہ آپ بالکل گھبرائیں نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم ان کی جنگ کو ہی روک دیں اللہ رب نے اپنی مدد اور قوت کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ اللہ رب العزت جنگ میں بھی شدید ہے اور سزا دینے میں بھی شدید ہے، لہٰذا فتح آپ کی ہی ہوگی اور انکار کرنے والوں کو سزا ضرور بھگتنا پڑے گی۔

سفارش کی حقیقت

مَنْ یَّشْفَعْ	جو کوئی سفارش کرے	شَفَاعَةً حَسَنَةً	اچھی سفارش
یَّكُنْ لَّهٗ	ہوگا اس کیلیے	نَصِیْبٌ	حصہ
مِّنْهَا	اس میں سے	وَمَنْ یَّشْفَعْ	اور جو کوئی سفارش کرے
شَفَاعَةً سَیِّئَةً	بری سفارش	یَّكُنْ لَّهٗ ھو گا	اس کے لیے
كِفْلٌ مِّنْهَا	حصہ اس میں سے	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ	ہر چیز پر	مُّقِیْتًا ۸۵	نگہبان

اس آیت میں سفارش کی حقیقت بتائی جارہی ہے کہ نیک کام اور نیک مقصد کیلئے اگر کوئی سفارش کرے تو اس کو نیکی کا حصہ ملے گا لیکن اگر برے کام، برے مقصد اور برے شخص کے لیے سفارش کی جائے تو سفارش کرنے والا گناہ میں برابر کا حصہ دار ہوگا۔ فرمایا مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً جو شخص سفارش کریگا کوئی اچھی سفارش یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا تو اس کو اس میں سے حصہ ملیگا۔ یعنی اچھی سفارش کرنے اور پھر اس پر عملدرآمد سے جو اچھے نتائج مرتب ہوں گے، ان کے اجر و ثواب میں سے سفارش کنندہ یعنی اچھے کام کی ترغیب دینے والے کا بھی حصہ ہوگا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا ارشاد کا مفہوم ہے کہ نیکی

کی دعوت دینے والا ایسا ہی ہے جیسے ان نیکی کو انجام دینے والا۔ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس جب کوئی سائل آتا یا آپ سے کسی چیز کا سوال کیا جاتا تو آپ صحابہ علیہم الرضوان سے فرماتے تم سفارش کرو اس کا تمہیں ثواب ملے گا اور اللہ جو چاہتا ہے اسے نبی کی زبان سے جاری کرا دیتا ہے یا فیصلہ کرا دیتا ہے۔ (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب التحریض علی الصدقۃ والشفاعۃ فیہا۔) اسی طرح غلط کام کی ترغیب کے متعلق فرمایا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً جو کوئی بری سفارش کریگا يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا تو اس میں سے اس سفارش کنندہ کے لیے بھی بوجھ ہوگا یعنی بُرے کام پر اکسانے اور پھر اس پر عمل درآمد سے جو بُرے نتائج مرتب ہوں گے۔ جائز سفارش اجر و ثواب کا موجب ہے تو ناجائز سفارش معصیت میں شامل ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جائز یا ناجائز سفارش کی اجرت لینا حرام ہے۔ جائز میں اس لیے کہ یہ عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور عبادت کی اجرت لینا حرام ہے اور ناجائز سفارش کی اجرت اس لیے حرام ہے کہ وہ بذات خود معصیت ہے۔ مگر مقام افسوس ہے کہ آج کے دور میں لوگ جائز و ناجائز کی حدود کو قائم نہیں رکھتے۔ اس زمانہ میں اکثر سفارشات ناجائز ہوتی ہیں ایک شخص کسی عہدہ کا اہل نہیں مگر وہ عہدہ اسے سفارش کے ذریعے دلایا جاتا ہے، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے گرد و پیش میں کتنے معاملات ہیں جن میں سو فیصد غلط کام کی سفارش کی جاتی ہے اس کا لازماً مؤاخذہ ہوگا۔ آج کے دور میں حکومت کے اکثر محکمے رشوت اور سفارش کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رشتہ داری، دوست نوازی اور اقربا پروری کی بنیاد پر غلط ملط کام کی سفارش کی جاتی ہے۔ سفارش کے ذریعے صریح مجرم کو بچایا جاتا ہے اور بے گناہ کو سزا دلوائی جاتی ہے آخر اس ظلم کا وبال ضرور پڑے گا۔ یہ چیزیں تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے والی ہیں۔ جب حالات ایسے ہو جائیں تو پورے معاشرے کا امن و سکون تباہ ہو جاتا ہے اور "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والا ماحول جنم لیتا ہے۔ مجرم کو پناہ دینے والے پر اللہ کی لعنت برستی ہے۔ جو شخص حقیقی چور کے ہاتھ نہ کاٹنے کی سفارش کرتا ہے ظاہر ہے کہ وہ بھی اس جرم میں شریک ہے اور اس برائی میں سے اسے بھی اپنے حصے کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ ایسا سفارشی بھی اس گناہ میں شریک سمجھا جائیگا، وہ بھی مجرم تصور ہوگا اور مستوجب سزا بھی اور ایسا مؤاخذہ کرنا اللہ

تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کیونکہ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ۸۵ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں۔لہٰذا اچھے اور برے کام پر ابھارنے والوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی کوششیں رائیگاں نہیں جائینگی اور بلکہ حسب حال ان پر اچھی یا بری جزا ضرور مرتب ہوگی۔ یہ تمام معاملات اللہ رب العزت کی نظر سے ہرگز چھپے ہوئے نہیں وہ تو ہر پل اور ہر دل کا حال اچھی طرح جانتا ہے،اس لیے خبردار رہنا چاہئے۔بہرحال! آج دنیا میں نت نئے بگاڑ کی وجہ بری سفارش ہی ہے گھر محلہ،سماج سوسائٹی سے لیکر حکومتوں اور حد تو یہ ہوگئی کہ عدالتی نظام تک یہ وبا سرایت کر گئی ہے،اس سے ظلم کو بڑھاوا مل رہا ہے حالانکہ مذہب اسلام نے سفارش کی جتنی زوردار سفارش کی ہے اتنی کسی مذہب نے نہیں کی۔کسی کو مصیبت سے چھڑانے کے لئے سفارش کرنا ثواب ہے اور کسی ظالم کو چھڑانے یا ظلم کرانے کے لئے سفارش کرنا حرام ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کرنا بھی حرام ہے اور گناہ کا مشورہ دینا یہ سب حرام ہے۔معلوم یہ ہوا کہ اچھی سفارش کرنا ثواب ہے اور بری سفارش کرنا گناہ ہے۔یہی حال نیکی کا ہے۔نیکی کی سفارش ثواب ہے نیکی کرنا ثواب ہے اس آیت کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ مشکل میں کسی بھائی کی امداد کرنا اس کے حقوق کی بازیابی کی سعی کرنا،اس کو نفع پہنچانا اور اس سے کسی تکلیف کو دور کرنے میں کوشاں ہونا بشرطیکہ اس سے کسی غیر کی حق تلفی نہ ہو تو یہ اچھی سفارش ہے اور اس پر سفارش کرنے والے کو اجر ملے گا۔اور اگر ایسی سفارش کی جس سے کسی کی حق تلفی ہوئی یا کسی پر ظلم ہوا تو بُری سفارش ہے اور سفارش کرنے والا گنہگار ہوگا۔سرکار مدینہ ﷺ کا ارشاد عالی ہے ”سفارش کرو ثواب ملے گا“ لیکن یہی اسلام سزاؤں کے معاملے میں سفارش کو بالکل برداشت نہیں کرتا۔اس آیت میں اُمّت کو سفارش کے قواعد سمجھائے گئے کہ سفارش کرنا اجر وثواب کا کام ہے اور سفارش قبول نہ ہونے پر کوئی ناراضی بھی نہ ہونی چاہیے۔

سفارش کے احکام

ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سفارش ان معاملات میں کریں جن میں سفارش کرنا جائز ہے۔جہاں سفارش کرنا جائز نہیں جیسے مقدمات ہیں یا امتحانی پرچوں کی جانچ کا معاملہ ہے،ان جگہوں پر سفارش کرنا بھی جائز نہیں۔دوسرے یہ کہ سفارش جائز کام کی ہو،ناجائز کام کی نہ ہو

۔تیسرے یہ کہ سفارش کا انداز مشورے کا ہو، دباؤ ڈالنے کا نہ ہو۔چوتھے اگر مشورہ اور سفارش نہ مانی جائے تو اس پر کوئی ناراضگی اور ناگواری نہ ہونی چاہئے۔ان چار چیزوں کی رعایت کے ساتھ اگر سفارش کی جائے گی تو سفارش کی وجہ سے کوئی فساد برپا نہیں ہوسکتا، اور وہ سفارش اجر وثواب کا سبب ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سلام اور مصافحہ کا طریقہ اور آداب

وَاِذَا	اور جب	حُيِّيْتُمْ	تم دعا دیے جاؤ
بِتَحِيَّةٍ	کوئی دعا	فَحَيُّوْا	تو تم دعا دو
بِاَحْسَنَ	زیادہ بہتر کے ساتھ	مِنْهَآ	اس سے
اَوْ رُدُّوْهَا	یا اسی (دعا) ہی کو لوٹا دو	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	تحقیق اللہ ہے
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز کا	حَسِيْبًا ۝۸۶	خوب حساب لینے والا

مسلمانوں کو تہذیب اور اخلاق کے بارے میں حکم دیا جارہا ہے کہ چاہے کوئی تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو مسلمان کا اخلاق اجازت نہیں دیتا، اور اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کو سلام کرنے کی ترغیب دی ہے۔ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ جب تمہیں دعا دی جائے، سلام کے ساتھ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ط تو تم اس سے بہتر دعا دو یا کم از کم اسی کو لوٹا دو یہ تحیہ اور حیہ زندگی کے لیے دعا کو کہا جاتا ہے۔زمانہ جاہلیت میں لوگ یوں کہا کرتے تھے حَيَّاكَ اللّٰهُ یعنی تم دیر تک زندہ رہو تمہیں اللہ سلامتی کے ساتھ زندہ رکھے۔اس زمانے میں أَنْعِمْ صَبَاحاً (تمہاری صبح خوشگوار) کے الفاظ بھی بولے جاتے تھے۔آج کل بھی Good Morning (صبح بخیر) جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔تاہم اسلام نے یہ طریقہ جاری کیا۔کہ جب تمہیں کوئی سلام کہے تو اس اس سے بہتر سلام کہو یا کم از کم اسی کو لوٹا دو صرف لوٹانا یہ ہے کہ جب کوئی السلام علیکم کہے تو تم جواب میں وعلیکم السلام کہ دو۔اور بہتر سلام یہ ہے کہ السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہو۔حضور ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص صرف علیکم السلام کہتا ہے تو اسے دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں اور اگر کوئی اس کے ساتھ رحمۃ اللہ بھی کہ دے تو بیس نیکیوں کا حقدار بن جاتا ہے۔اس سے بڑھ کر اگر کوئی

وبرکاتہ کا لفظ بڑھا دے تو تیس نیکیاں بہتر جواب دینے کی تفسیر حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کے جواب میں "وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ" کا اضافہ اور "السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ" کے جواب میں "وَ بَرَکَاتُہٗ" کا اضافہ کر دیا جائے، لیکن اگر کوئی شخص یہ سارے الفاظ بول دے تو انھی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ "وَمَغْفِرَتُہٗ یا وَرِضْوَانُہٗ" وغیرہ کا اضافہ صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ہر لفظ کے اضافے کے ساتھ دس نیکیاں زیادہ ہوتی جائیں گی۔ [أحمد: 4/439، 440، 19970] حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑھانے کی حد "وبرکاتہٗ" تک ہے، اس سے زیادہ نہیں، اگر بڑھا کر جواب نہ دے، یا سلام کرنے والے نے اس کی گنجائش ہی نہ رکھی ہو تو جواب میں بھی اتنا ہی کہے، سلام کرنا مسنون ہے اور جواب دینا واجب اور سلام میں پہل کرنا افضل، قرآن مجید میں خاص طور پر سلام کا حکم فرمایا گیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں سلام کی کس قدر اہمیت ہے! انسان کا مزاج اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ دوسرے انسان سے ملاقات کے وقت محبت کے پیغام پر مشتمل کوئی جملہ دوسرے شخص کو مانوس وخوش کرنے کے لیے کہتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل زمانۂ جاہلیت میں بھی ملاقات کے وقت مبارک بادی کے کلمات کہنے کا رواج تھا، لیکن جب مذہب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کے وقت "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" کہنے کا طریقہ جاری فرمایا۔ اس کے معنی ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور سلامتی ہو۔ ان کلمات سے نہ صرف محبت کا پیغام دوسرے کو پہنچتا ہے، بلکہ یہ بہت جامع دعا بھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمام بری چیزوں، بلاؤں، آفتوں، مصیبتوں اور تکلیفوں سے محفوظ اور سلامت رکھے، پھر سلام کرنے والا سلامتی کی اس دعا کے ضمن میں گویا یہ بھی کہہ رہا ہے کہ تم خود بھی مجھ سے سلامت ہو میرے ہاتھ اور زبان کی تکلیف سے۔ قرآن وحدیث میں بار بار سلام کرنے کی تعلیم وترغیب دی گئی ہے۔ اختصار کے مدنظر صرف دو آیات کا مفہوم پیش ہے: "پس جب تم گھروں میں داخل ہونے لگو تو اپنے نفسوں کو سلام کرو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفہ ہے مبارک اور پاکیزہ۔" (سورۃ النور) "جب تمہیں تحفۂ سلام دیا جائے تو تم

اس کو سلام دو اُس سے بہتر یا اسی کو لوٹا دو۔" (سورۃ النساء) یعنی جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر الفاظ میں یا کم از کم انہیں الفاظ کے ساتھ سلام کا جواب دو۔

سلام کرنے کے بعض احکام

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" اسلام میں سلام کرنے کی خاص اہمیت وفضیلت بیان کی گئی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں سلام کرنا سنت ہے، مگر اس کا جواب دینا واجب ہے۔ سلام اور اس کا جواب اچھی نیت کے ساتھ سنت کے مطابق جمع کے صیغہ کے ساتھ دیا جائے، اگرچہ مخاطب ایک شخص ہی کیوں نہ ہو، تاکہ فرشتے (کِرَامًا کَاتِبِیْنَ) جو ہر ایک کے ساتھ ہیں، سلام میں مخاطب کے ساتھ شامل ہوں اور ان کو سلام کرنے کا بھی ثواب مل جائے اور پھر جب وہ سلام کا جواب دیں تو ان کی دعا بھی ہمیں مل جائے۔ اسی طرح سوار شخص پیدل چلنے والے کو، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں، یہ حکم صرف تواضع وانکساری کی طرف راغب کرنے کے لیے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر یہ لوگ سلام نہ کریں تو ہم پہل بھی نہ کریں، بلکہ ہم سلام میں پہل کر کے زیادہ ثواب کے حق دار بن جائیں۔ نیز حدیث میں وارد ہے کہ سلام میں پہلے کرنے والا (اس عمل کی وجہ سے) تکبر سے پاک ہے۔ (شعب الایمان)

تکبر کا بہترین علاج یہ بھی ہے کہ ملنے والے مسلمان کو سلام کرنے میں سبقت کی جائے۔ نیز ہم آپس میں ملاقات کے وقت بات چیت اور گفت گو سے قبل سلام کریں۔ موبائل بھی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے، اس لیے سلام کرنے کا جو حکم آپسی ملاقات کا ہے وہی فون کرتے اور اٹھاتے وقت کا ہوگا، لہٰذا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" کہنا بہتر ہوگا۔

حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ راستوں پر نہ بیٹھا کرو، اگر بیٹھنا ہے تو راستے کا حق بھی ادا کیا کرو۔ اور راستے کا حق یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرو، بھٹکے ہوئے آدمی کو راہ دکھاؤ اور آنے جانے والوں کو سلام کہو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جس پر عمل کر کے تم آپس میں محبت کرنے لگو اور آپس میں محبت کرو گے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت عطا

کریں گے۔ فرمایا وہ چیز ہے اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ یعنی آپس میں سلام پھیلاؤ ایک دوسرے کو السلام علیکم کہا کرو عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ جس کے ساتھ جان پہچان ہے اسے بھی سلام کہو اور جس کے ساتھ تعارف نہیں ہے، اس کو بھی سلام کرو۔ یہ پیار و محبت کا بہترین نسخہ ہے۔ مؤمنین کی ایک دوسرے کے ساتھ الفت و محبت ایک مثبت امر ہے جس کی بدولت معاشرے میں امن و سکون کی فضا قائم ہوتی ہے۔ باہمی بھائی چارے اور محبت کو فروغ دینے میں اہم ترین عنصر ایک دوسرے کو سلام کہنا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلم معاشرے اس قسم کی بہت سی اقدار سے تہی (معنی اخلاقی، سماجی یا انسانی قدروں سے خالی یا محروم ہونا ہے۔) نظر آنے لگے ہیں۔ اپنے جاننے والے کی حد تک سلام دعا باقی ہے لیکن اجنبی کو سلام کی روش متروک ہوتی جا رہی ہے۔

سلام کرتے وقت مومنوں کے حق میں نیت کرو یا فرشتوں کا تصور کر کے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" کہو۔ سلام کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ مصافحہ کرنے والوں کے گناہوں کو گراتا ہے۔ مصافحہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے ملانے کو کہا جاتا ہے اور یہ مسنون ہے۔ البتہ مصافحہ کی تکمیل دونوں ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ بعض لوگ دونوں ہاتھ ملانے سے گریز کرتے ہیں یہ ٹھیک نہیں مصافحہ کی تکمیل دونوں ہاتھوں سے ہے تاہم یہ ضروری بھی نہیں۔ بہرحال فرمایا کہ جب تمہیں سلام کے ساتھ دعا دی جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا کم از کم اسی کو لوٹا دو اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی ضائع نہیں کریگا۔ اور خلوص و محبت کے ساتھ ایک دوسرے کو سلام کہنے پر جنت نصیب فرمادیگا۔ بعض مواقع اور حالتیں سلام سے مستثنیٰ ہیں، اس سلسلے میں فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کی تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ چند صورتوں اور حالتوں میں سلام نہیں کرنا چاہیے۔ جب کوئی اطاعت میں مشغول ہو، مثلاً نماز ادا کر رہا ہے، دعا، تلاوت، اذان و اقامت، خطبہ یا کسی دینی مجلس کے وقت۔ جب کوئی بشری حاجت میں مشغول ہو، مثلاً کھانے پینے، سونے اور پیشاب پاخانہ وغیرہ کے وقت۔ جب کوئی معصیت میں مشغول ہو، مثلاً شراب پی رہا ہو تو اس موقع پر سلام

نہیں کرنا چاہیے۔تاریخ شاہد ہے کہ اسلام مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ اچھا برتاؤ اور اُن کے ساتھ نرمی کرنے کی وجہ سے پھیلا ہے، مگر عام طور پر آج ہمارے اندر یہ امتیازی صفت موجود نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر جو باتیں ذکر کی گئی ہیں، انہیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔اللہ تعالیٰ ہمیں سب کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے والا اور سلام میں پہل کرنے والا بنائے۔آمین۔

اسلام کی سب سے بنیادی اور اہم حقیقت توحید ہے

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ	اللہ، نہیں کوئی معبود (برحق)	اِلَّا ھُوَ ط	مگر وہی
لَیَجْمَعَنَّکُمْ	وہ ضرور جمع کرے گا تمہیں	اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ	قیامت کے دن
لَا رَیْبَ	نہیں ہے کچھ شک	فِیْہِ	اس میں
وَمَنْ	اور کون	اَصْدَقُ	زیادہ سچا ہے
مِنَ اللّٰہِ	اللہ سے	حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾	بات میں

فرمایا اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں یہ اسلام کی بنیاد ہے اور ہمیشہ مدنظر رہنی چاہئے۔اگر بنیاد درست ہوگی تو تمام معالات درست ہوں گے اگر بنیاد ہی غلط ہوگئی، تو اس پر تعمیر ہونے والی پوری عمارت خراب ہوگئی۔لہٰذا اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے، اسی پر تمام اعمال کا دارومدار ہے۔تمہاری عبادات، جہاد، سلام، ملاقاتیں سب اس بنیادی عقیدہ کے تابع ہیں۔یہی تمہارا نظریہ (Ideology) (آئیڈیالوجی یا نظریہ سے مراد خیالات، عقائد، اقدار اور اصولوں کا ایسا مربوط مجموعہ ہے جو کسی فرد، معاشرے، سیاسی نظام یا قوم کے سوچنے کے انداز اور طرزِ عمل کی رہنمائی کرتا ہے) اور جب اس پر یقین مکمل ہو جائے تو یاد رکھو لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ اس دن تمام قسم کے لوگ منافقین بھی، مشرکین بھی اور مسلمان بھی سب اللہ کے حضور اکٹھے کر کے لائے جائیں گے اور ان سب کا پورا پورا محاسبہ کیا جائے گا۔فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾ اور اللہ کی

بات سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہوسکتی ہے۔اس کے تمام احکام اور فرامین برحق ہیں لہٰذا ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ بلا چون و چرا ان پر عمل پیرا ہو اور اس سلسلہ کسی شک و شبہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔اللہ سے دعا ہے اللہ ہم سب جہاد کا شوق، سلام کی تشہیر، سفارش جیسے معاملے کو سمجھنے اور اسلامی شریعت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

نفاق کی قسمیں/ نفاق کی بیماری سے نجات دلانے میں کارگر نسخہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ وَاللّٰہُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ
تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ۸۸ وَدُّوْا لَوْ
تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِیَآءَ حَتّٰی
یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪
وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ۸۹ۙ

دو گروہوں کی رائے

فَمَا لَكُمْ	پھر کیا ہے تمہیں (کہ)	فِی الْمُنٰفِقِیْنَ	منافقوں (کے بارے) میں
فِئَتَیْنِ	دو گروہ (ہو گئے)	وَاللّٰہُ	اور اللہ نے
اَرْكَسَهُمْ	الٹ دیا انہیں	بِمَا	بہ سبب ان (اعمال) کے جو
كَسَبُوْا	انہوں نے کمائے	اَتُرِیْدُوْنَ	کیا تم چاہتے ہو
اَنْ تَهْدُوْا	یہ کہ تم ہدایت دو	مَنْ	ان کو جنہیں
اَضَلَّ اللّٰہُ	گمراہ کیا اللہ نے	وَمَنْ	اور جسے
یُّضْلِلِ اللّٰہُ	گمراہ کرے اللہ	فَلَنْ	تو ہرگز نہیں

تَجِدَ لَهٗ	پائیں گے آپ اس کے لیے	سَبِیْلًا ۸۸	کوئی راہ

فرمایا: فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا پھر تمہیں کیا ہوگیا (یہ استفہام انکار کے لئے ہے) کہ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ بن گئے؟ حالانکہ انہوں نے جیسے کام کیے ہیں ان کی بناء پر اللہ نے ان کو اوندھا کر دیا ہے۔ "اَرْكَسَهُمْ" اوندھا کر دیا۔ یعنی جس کفر وضلالت سے نکلے تھے، اسی میں مبتلا کر دیا، یا اس کے سبب ہلاک کر دیا۔ كَسَبُوْا (اعمال) سے مراد، رسول کی مخالفت اور جہاد سے اعراض ہے۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت کھلم کھلا مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملی۔ ان کے بارے میں صحابۂ کرام رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک فرقہ ان کو قتل کرنے پر اصرار کر رہا تھا اور ایک اُن کے قتل سے انکار کرتا تھا۔ اس معاملہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (مدارک، النساء، تحت الآیۃ: ۸۸، ص ۲۴۳) بہر حال یہ آیت کس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی؟ اس سلسلہ میں مختلف روایتیں آئی ہیں، بخاری میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ اُحد میں عبد اللہ بن ابی کے ساتھ جو منافقین عین میدان جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مخلص مسلمانوں کو چھوڑ کر واپس ہو گئے، ان کے بارے میں صحابہ علیہم الرضوان کے درمیان اختلاف ہو گیا، ایک جماعت کی رائے تھی کہ وہ مسلمان نہیں ہیں؛ اس لئے ہم ان سے جنگ کریں گے، دوسری جماعت کا خیال تھا کہ وہ مسلمان ہیں؛ اس لئے ان سے جنگ کی گنجائش نہیں، (بخاری، باب غزوۂ اُحد، حدیث نمبر: ۴۰۵۰)

ہدایت زبردستی نہیں ملتی

فرمایا اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ۸۸ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ایسے شخص کو ہدایت پر لاؤ جسے اللہ (اس کی خواہش کے مطابق) گمراہی میں مبتلا کر چکا؟ اور جسے اللہ گمراہی میں مبتلا کر دے، اس کے لیے تم ہرگز کبھی کوئی بھلائی کا راستہ نہیں پا سکتے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اس کے اپنے برے اعمال کی بنا پر گمراہ چھوڑ دے، دنیا کا کوئی بھی شخص اس کے لیے کامیابی یا ہدایت کا راستہ نہیں ڈھونڈ سکتا۔

اعتقادی منافق اور عملی منافق

مفسرین کرام نے منافقین کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم اعتقادی منافقین کی ہے اور دوسری عملی منافقین کی۔ اعتقادی منافق وہ ہے جو بظاہر کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا دل کفر پر جما رہتا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں مدینہ میں اکثر منافقین کا تعلق اس قسم کے ساتھ تھا۔ وہ حصول مقصد یا کسی ممکنہ نقصان سے بچنے کے لیے کلمہ شہادت زبان سے تو ادا کر لیتے تھے مگر ان کا باطن ایمان سے خالی ہوتا تھا۔ منافقین کی یہ بدترین قسم ہے، منافقوں کی دوسری قسم عملی منافق ہیں۔ ایسے منافقین کا ذکر احادیث میں کثرت سے آیا ہے۔ ان کو اخلاقی منافق بھی کہہ سکتے ہیں کہ دل میں نور ایمان موجود ہے، توحید کی تصدیق بھی کرتے ہیں مگر عمل اور اخلاق اس کے خلاف ہے حضور ﷺ نے ایسے منافق کی نشانیاں یہ بتائیں یعنی جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ یہ عملی منافق ہیں۔ آپ کے زمانے کے بعد اور ہر زمانہ میں عملی منافق کثرت سے موجود رہے ہیں۔ آج بھی دیکھ لیں کہ زبانی عقیدہ تو درست ہے مگر قول و فعل میں تضاد ہے نماز کو فرض مانتا ہے مگر نہیں پڑھتا۔ جانتا ہے کہ روزہ فرض ہے مگر نہیں رکھتا چوری، خیانت، جھوٹ، حرام ہیں مگر کیے چلا جا رہا ہے، یہی عملی منافقت ہے اور اس قسم کے منافقین سے دنیا بھری پڑی ہے۔ واضح رہے کہ نفاق ایک مخفی چیز ہے، جس کے بارے میں بالیقین فیصلہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ نفاق کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے ساتھ خاص تھا، اب یا تو مؤمن ہے یا کافر، لہٰذا کسی مسلمان کو متعینہ طور پر منافق کہنا جائز نہیں ہے، البتہ نفاق کی دو قسمیں ہیں: نفاق اعتقادی اور نفاق عملی۔

نفاقِ اعتقادی کا حکم

1 نفاق اعتقادی: وہ شخص جو بظاہر مسلمان ہو، لیکن در پردہ کافر ہو، منافق اعتقادی کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ نفاقِ اعتقادی کا حکم یہ ہے کہ ایسا منافق کفار کے زمرے میں آتا ہے، اگر بغیر توبہ کے مرا تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں جائے گا اور جہنم کے نچلے طبقے میں رکھا جائے گا۔

نفاقِ عملی کا حکم

2 نفاقِ عملی: وہ شخص جو عقیدے کے اعتبار سے تو پکا اور سچا مسلمان ہو، لیکن اس کے اندر منافقین سے ملتی جلتی عادتیں ہوں، مثلاً جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا اور خیانت وغیرہ کا مرتکب ہونا، جھگڑے کے وقت بدزبانی کرنا، اس جیسے اور برے افعال میں مبتلا شخص مسلمان تو رہے گا، لیکن سخت گناہ گار ہوگا، اور ایسا مسلمان شخص کا عمل منافقوں والا کہلاتا ہے، اس لیے کہ حقیقی منافق جو عہدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تھے ان کے اندر یہ تمام برائیاں اور خرابیاں موجود تھیں۔ اگر کوئی شخص واقعۃً جھوٹ بولتا ہو اور دو چہروں والا ہو تو ایسا شخص نفاقِ عملی کا مرتکب کہلائے گا، لیکن اس کے باوجود شریعت نے ہمیں اس بات کا مکلف نہیں بنایا کہ ہم اسے منافق کہتے پھریں، اس کے لیے منافق، منافق کی صدا بلند کرتے رہیں، بلکہ خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی کوشش کریں، اسے وعظ ونصیحت کریں، اس کے حق میں دعا کریں۔ نفاقِ عملی کا مرتکب مسلمان ہی کہلائے گا، لیکن اس کا یہ عمل گناہ کبیرہ کی طرح ہے، اگر بغیر توبہ کے دنیا سے چلا گیا، تو اپنے گناہوں کی سزا پانے کے لیے دوزخ میں ڈالا جائے گا، اس کے بعد ایمان کی وجہ سے جنت میں داخل ہوگا۔

عقیدے کا نفاق یہ ہے کہ ظاہری طور پر اسلام کا اظہار کیا جائے اور اس بات کا اعلان کیا جائے کہ اللہ اور اس کے رسول، کتاب، فرشتوں، آخرت، اور تقدیر پر ایمان ہے لیکن کفر اور جھوٹ کو چھپائے رکھا جائے۔ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا ارادہ ہو۔ اس نفاق کے مرض میں مبتلا شخص ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔ عمل کا نفاق یہ ہے کہ عقیدہ تو متزلزل نہ ہو مگر عمل میں نفاق موجود ہو، اس صورت میں کسی شخص کے بارے میں یہ حکم تو نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ منافق ہے، البتہ نفاق کی نشانیوں اور علامات سے آگاہ رہنا چاہیے، اور ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے ان میں سے ابھری ہوئی علامات اور نشانیوں کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا یاد رکھو۔ اس بیماری میں جو شخص مبتلا ہو گیا ہو، اس کو چاہیے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، اس سے اپنے آپ کو پاک کرنے کی کوشش کرے۔ مال واولاد کی محبت اور دینا، اور اس کے خزانوں پر فدائیت، جاہ ومنصب کی ہوس، اور ہر حال میں اس سے

منفعت کے حصول کی تمنا سے خود کو آزاد کرلے۔اس کو سوچنا چاہئے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ وہ جس جھوٹی دینداری کا اظہار کر رہا ہے،اس کا کیا حاصل ہے؟اس دنیا میں کس لئے آیا ہے؟ آخر کار اس کا انجام کار کیا ہونا ہے؟ تنہائی میں ان سوالات کا جواب اپنے آپ سے پوچھے!اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے دریافت کرے!اس کا ضمیر ضرور جاگے گا۔قرآن مجید کی اس آیت پر غور کرے ''کہو میری نماز،میری قربانی،میری موت اور زندگی صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہے۔'' کیا ہماری نمازیں اللہ کے واسطے ہیں؟ کیا ہماری قربانیاں اللہ کے لئے ہیں؟ کیا ہماری زندگی کی دوڑ دھوپ اللہ کو خوش کرنے کے لئے ہے؟ نفاق کی بیماری سے نجات دلانے میں یہ نسخہ بھی کارگر ہے۔اخلاص کے ساتھ فرائض کی پابندی۔فرائض کے ساتھ نوافل کا اہتمام۔استغفار اور توبہ اپنی غلطیوں پر ندامت۔احتساب نفس اور حضوریِ قلب کا جذبہ دل کی ایسی بیداری جس میں خالق ومخلوق کا رشتہ عیاں ہو جائے۔ایسا بیدار دل جس کے نتیجے میں حقیقی ایمان اور سچا انسان وجود میں آئے۔ایسا بیدار دل جس دل کی بصیرت سے وہ ہر آن خدا کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اللہ کی معیت میں ہوتا ہے،جس سے ایمان میں زندگی،اعمال میں بہتری اور اخلاص اور للہیت پیدا ہوتی ہے۔اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں احسان ہے۔

ہجرت کی اقسام

وَدُّوْا	وہ (لوگ) چاہتے ہیں	لَوْ تَكْفُرُوْنَ	کاش کہ تم کفر کرو
كَمَا	جس طرح	كَفَرُوْا	انہوں نے کفر کیا
فَتَكُوْنُوْنَ	پھر ہو جاؤ تم (اور وہ)	سَوَآءً	برابر
فَلَا تَتَّخِذُوْا	لہٰذا نہ تم بناؤ	مِنْهُمْ	ان میں سے
اَوْلِيَآءَ	(کسی کو) دوست	حَتّٰى	یہاں تک کہ
يُهَاجِرُوْا	وہ ہجرت کریں	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کے راستے
فَاِنْ	پھر اگر	تَوَلَّوْا	وہ پھر جائیں

فَخُذُوْهُمْ	تو تم ان کو پکڑو	وَاقْتُلُوْهُمْ	اور ان کو قتل کرو
حَيْثُ	جہاں کہیں	وَجَدْتُّمُوْهُمْ	تم ان کو پاؤ
وَلَا تَتَّخِذُوْا	اور نہ تم بناؤ	مِنْهُمْ	ان میں سے (کسی کو)
وَلِيًّا	دوست	وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾	اور نہ مددگار

فرمایا: وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جس طرح انہوں نے کفر کو اپنا لیا ہے، اسی طرح تم بھی کافر بن کر سب برابر ہو جاؤ۔ لہٰذا (اے مسلمانو) تم ان میں سے کسی کو اس وقت تک دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کے راستے میں ہجرت نہ کر لے۔ اس آیت میں خلوص کا معیار بھی مقرر کر دیا ہے۔ جب تک یہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ نہ آجائیں یہ قابل اعتماد لوگ نہیں ہیں۔ لہٰذا انہیں اس وقت تک کافر ہی تصور کیا جائے۔ ہجرت کی تین قسمیں اس کی پہلی قسم تو فرض ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ جب کسی علاقے میں کفار کا اس قدر غلبہ ہو کہ اہل ایمان شعار اسلام اور شعار ایمان ادا نہ کر سکیں تو وہاں سے ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔ ہجرت کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی پیغمبر (علیہ السلام) کے ساتھ جہاد میں شریک ہو جائے۔ منافقین مدینہ کے لیے یہ بڑی دشوار تھی۔ وہ حیلے بہانے سے جہاد سے گریز کرتے تھے، اور جان بوجھ کر پیچھے رہ جاتے تھے۔ ہجرت کی تیسری قسم کے متعلق حضور ﷺ کی حدیث مبارک ہے کہ مومن وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن وامان سے وقت گزارے، ان کو تکلیف نہ پہنچائے اور مسلمان وہ شخص ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ پھر فرمایا: مہاجر وہ ہے جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ حقیقی مہاجر وہ ہے جو گناہ سے بچ جائے۔ گھر بار اور وطن چھوڑنے کے باوجود اگر اسلام کے باقی احکام پورے نہیں کرتا، اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب نہیں کرتا تو وہ حقیقی مہاجر نہیں ہے۔

ہجرت کی اہم تین بنیادی قسمیں

لغوی اعتبار سے ہجرت کی اہم تین بنیادی قسمیں: 1. ہجرت لغویہ لغت میں کسی چیز کو چھوڑنے یا

ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو ہجرت کہا جاتا ہے۔اس سے مراد مطلق طور پر وطن یا کسی مقام کو ترک کرنا ہے،خواہ اس کا مقصد دنیاوی ہو، جیسے تجارت،نوکری یا سیر وتفریح۔2.ہجرت عرفیہ عرف عام یا حالات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ شفٹ ہونا۔جب انسان اپنے وطن میں جان ومال یا عزت کا خطرہ محسوس کرے اور امن کی خاطر کسی دوسری محفوظ جگہ منتقل ہو جائے (جیسے مسلمانوں کی طرف سے حبشہ کی طرف ہجرت)3.ہجرت حقیقیہ شرعیہ شریعت اور دین کی خاطر کی جانے والی ہجرت یا گناہوں کو چھوڑنا اس کی دو صورتیں ہیں: مکانی ہجرت: دارالکفر یا ایسی جگہ سے جہاں دین پر عمل کرنا مشکل ہو،دارالاسلام یا امن کی جگہ کی طرف ہجرت کرنا۔معنوی ہجرت (ترکِ معاصی): اللہ تعالی کی ناپسندیدہ چیزوں اور گناہوں کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دینا۔جیسا کہ حدیثِ مبارکہ کا مفہوم ہے کہ" اصل مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

حافظ بدرالعینی رحمہ اللہ تعالی نے ہجرت کی آٹھ اقسام ذکر فرمائی ہیں: (1) ہجرت حبشہ اول۔(2) ہجرت حبشہ ثانی۔(3) اَلْھِجْرَۃُ مِنْ مَّکَّۃَ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ (4) ھِجْرَۃُ الْقَبَائِلِ إِلَی الرَّسُوْلِ (5) کفار مکہ میں سے مسلمان ہونے والے لوگوں کا مدینہ کی طرف ہجرت کرنا۔(6) ھِجْرَۃُ مَا نَھَی اللّٰہُ عَنْہُ (7) الھِجْرَۃُ مِنْ دَارِ الْکُفْرِ إِلَی دَارِ الإِسْلَامِ. (8) اَلْھِجْرَۃُ إِلَی الشَّامِ یہ آخر زمانے میں ظہور فتن کے وقت ہوگا۔

فرمایا:فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۸۹﴾ چنانچہ اگر وہ (ہجرت سے) اعراض کریں تو ان کو پکڑو،اور جہاں بھی انہیں پاؤ،انہیں قتل کر دو،اور ان میں سے کسی کو نہ اپنا دوست بناؤ،نہ مددگار۔یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ منافقوں کی ایک قسم ایسی بھی تھی جو مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔یہ لوگ مسلمانوں سے خیر خواہی اور محبت کا اظہار ضرور کرتے تھے مگر عملی طور پر اپنے ہم وطن کافروں کا ساتھ دیتے تھے یا دینے پر مجبور تھے ان کے لیے معیار یہ مقرر کیا گیا کہ اگر وہ ہجرت کر کے تمہارے پاس مدینہ آجائیں اور تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں تو اس صورت میں تم

انہیں سچا بھی سمجھو اور اپنا ہمدرد بھی۔ اور اگر وہ اسلام کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑنے کی قربانی دینے پر تیار نہیں حالانکہ وہ ایسا کر سکتے ہیں تو تم ان پر ہرگز اعتماد نہ کرو نہ انہیں اپنا دوست بناؤ اور نہ سمجھو اور اگر ایسے لوگ کافروں کے ساتھ تمہارے خلاف صف بستہ ہو جاتے ہیں تو انہیں قتل کرنے سے ہرگز دریغ نہ کرو۔ اس آیت مبارکہ میں فرمایا: یہ لوگ دلوں کے اتنے برے اور بدنیت ہیں کہ ہدایت آنے کے بعد بھی ہدایت پانا نہیں چاہتے، بلکہ یہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسلام سے پھر جاؤ اور ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ یہ لوگ دوست بنانے کے قابل ہرگز نہیں نہ انہیں دوست بناؤ اور نہ ہی ان کے لیے سوچ بچار کرو۔ ہاں اگر تم ان میں سے سچے اور منافق مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ کرنا چاہو تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم ان کو دیکھو جو لوگ اللہ اور اسلام کی خاطر اپنا ملک مال و دولت بیوی بچے (اگر چھوڑنے پڑیں) چھوڑ کر صرف دین کی خاطر مدینہ ہجرت کر کے آجائیں اور اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کرنے کی نیت ہو تو پھر ان کی مدد کرو ان سے دوستی کرو۔ لیکن اگر یہ لوگ صرف جان بچانے کے لیے مسلمان بنتے ہیں تو پھر ہرگز ان سے دوستی نہ کرو بلکہ میدان جنگ میں جہاں بھی یہ تمہارے خلاف لڑ رہے ہوں ان کو قتل کر دو۔ ان آیات میں صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ منافقین سے ہرگز دوستی نہ کرو۔ آج بھی یہود و ہنود اور انگریز سے دوستانے اور سرمایہ دارانہ نظام نے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ سرمایہ داری نظام محض مفاد پرستی پر مبنی ہے اس میں حلال حرام کی کوئی تمیز نہیں دولت جس راستے سے چاہو کماؤ اور جس راستے میں چاہو خرچ کرو کسی پر کوئی پابندی نہیں مقررہ ٹیکس ادا کر کے گورنمنٹ سے لائسنس حاصل کر لو اور پھر چاہے جو نسا مرضی چینل چلا لو، شراب کی دکان کھول لو یا قحبہ خانہ چلا لو، ہوٹل قائم کر لو جہاں پر شراب اور خنزیر کا گوشت کھلاؤ، کون پوچھتا ہے۔ قرآن پاک کا اپنا نظام معیشت ہے جس کی بنیاد اللہ کی توحید اور قیامت کے تصور پر ہے یہ نظام اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم ہوتا ہے۔ حرام حلال کی تمیز سکھاتا ہے۔ نہ ناجائز ذرائع سے طلب زر کی اجازت دیتا ہے اور نہ ناجائز امور پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ "لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" کسی کا مال ناحق مت کھاؤ۔ اللہ کا یہ بھی حکم ہے لَا تُسْرِفُوْا اگر مال آ گیا ہے تو اسے

ضائع نہ کرو۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا اور فضول نہ اڑا (بے جا خرچ نہ کر اپنے مال کو ناجائز، غلط یا غیر ضروری کاموں میں خرچ کرنا تبذیر کہلاتا ہے) اسے جائز امور پر خرچ کرو۔ الغرض! فرمایا کہ اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان کافروں کے متعلق دو رائیں رکھتے ہو۔ تمہاری اجتماعیت کا تقاضا ہے کہ ہمیشہ ایک رائے پر متفق ہو جایا کرو۔ دشمنانِ دین کے متعلق تمہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے امریکہ ہو یا یہود ہوں یا ہنود اسلام دشمن میں یہ سب متفق ہیں۔ مگر مسلمانوں کی اجتماعیت کا شیراہ بکھر چکا ہے، یہ اپنوں کی بجائے غیروں سے دوستانہ رکھتے ہیں، ان سے غلط توقعات وابستہ کرتے ہیں اور پھر نقصان اٹھاتے ہیں۔

اجتماعیت کے فقدان کا نتیجہ

حالانکہ قرآن پاک بتلا رہا ہے کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونا چاہئے، ان سب کی ایک رائے ہونی چاہئے۔ مگر اجتماعیت کے فقدان نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آج کسی ملک یا کسی علاقے میں کسی مسلمان پر افتاد آجائے تو کوئی دوسرا مسلمان اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ آج مسلمان اغیار کے دام فریب میں گرفتار ہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں۔ آج کون ہے جو فلسطین، افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد کو پہنچے۔ ہماری حکومتیں بڑی طاقتوں سے اس قدر مرعوب ہیں کہ وہ کسی کو مسلمانوں کی امداد کے لیے جانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتیں۔ وجہ یہی ہے کہ آج ہم مرکزیت کو بھول چکے ہیں۔ دنیا میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں مگر ہر ایک کی رائے جدا جدا ہے، نہ کوئی مرکز ہے اور نہ اس کے تحت مسلمان کوئی مفاد حاصل کر رہے ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا زمانہ مبارک اور خلفائے راشدین کا زمانہ مرکزیت کا زمانہ تھا، اس وقت تمام دنیائے اسلام ایک مرکزی حکم کی پابندی تھی، سب ایک رائے پر متفق تھے، مگر آج یہ چیز ختم ہو چکی ہے اس لیے مسلمان طرح طرح کے مصائب کا شکار ہیں۔ اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں: (1)..... دوسرے کو کافر کرنے کی کوشش کرنا کفر ہے۔ (2)..... کافر، مرتد، بدمذہب کو دوست بنانا اور ان سے دلی محبت رکھنا حرام ہے اگرچہ وہ کلمہ پڑھتا ہو اور اپنے کو مسلمان کہتا ہو جیسے اُس زمانے کے

منافق تھے۔کفاراور مشرکین سے اتحاد و وداد حرامِ قطعی ہے قرآنِ عظیم کی نُصوص اُس کی تحریم سے گونج رہے ہیں اور کچھ نہ ہوتو اتنا کافی ہے کہ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (مائدہ:۵۱)واحد قہار فرماتا ہے کہ تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا وہ بے شک انہیں میں سے ہے۔(3).....دینی امور میں کسی مشرک سے مدد نہ لی جائے۔

☆☆☆

معاہدے کی پاسداری/
اسلام کا قانونِ جنگ امن وعافیت کا ضامن!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ
صُدُوْرُھُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا قَوْمَھُمْ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَھُمْ
عَلَیْکُمْ فَلَقٰتَلُوْکُمْ ج فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْکُمُ
السَّلَمَ لا فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا ۹۰

اسلام کا نظامِ صلح (امن کا اصول)

اِلَّا الَّذِیْنَ	سوائے ان لوگوں کے جو	یَصِلُوْنَ	جا ملتے ہیں
اِلٰی قَوْمٍ	اس قوم سے (کہ)	بَیْنَکُمْ	تمہارے درمیان
وَبَیْنَھُمْ	اور ان کے درمیان	مِّیْثَاقٌ	عہد ہے
اَوْ جَآءُوْکُمْ	یا وہ آتے ہیں تمہارے پاس	حَصِرَتْ	(اس حال میں کہ) تنگ ہیں
صُدُوْرُھُمْ	ان کے سینے	اَنْ	(اس بات سے) کہ
یُّقَاتِلُوْکُمْ	وہ لڑیں تم سے	اَوْ یُقَاتِلُوْا	یا وہ لڑیں

قَوْمَهُمْ ؕ	اپنی قوم سے	وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ	اور اگر چاہتا اللہ
لَسَلَّطَهُمْ	(تو) ضرور انہیں مسلط کر دیتا	عَلَيْكُمْ	تم پر
فَلَقٰتَلُوْكُمْ	تو وہ تم سے لڑتے	فَاِنِ	پھر اگر
اعْتَزَلُوْكُمْ	وہ تم سے کنارہ کش رہیں	فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ	اور نہ لڑیں تم سے
وَاَلْقَوْا	اور وہ پیش کریں	اِلَيْكُمُ	تمہاری طرف
السَّلَمَ	صلح	فَمَا	تو نہیں
جَعَلَ اللّٰهُ	بنائی اللہ نے	لَكُمْ	تمہارے لیے
عَلَيْهِمْ	ان پر	سَبِيْلًا ۹۰	کوئی راہ (ان سے لڑنے کی)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جن میں مذکورہ کفار منافقین کو رعایت دی جا سکتی ہے اور یہ مسلمانوں کے عتاب سے بچ سکتے ہیں۔ فرمایا اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ہاں وہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان کوئی (صلح کا) معاہدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس گروہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو چکا ہے، اس کے ساتھ لڑنے کی اجازت نہیں۔ اور اگر یہ منافق قسم کے کافر تمہارے ساتھ معاہدہ میں شریک لوگوں سے جا ملتے ہیں۔ تو پھر اس معاہدہ کی رو سے ان کو بھی امان حاصل ہو گی اور ان کے ساتھ جنگ نہیں کی جائے گی۔ یہ استثنیٰ کی پہلی صورت ہے۔ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ ان کے دل تمہارے خلاف جنگ کرنے سے بھی بیزار ہوں، اور اپنی قوم کے خلاف جنگ کرنے سے بھی، دوسرے: وہ جو خود تم سے براہ راست صلح کی پیشکش کریں، غرض کہ اسلام نے ان غیر مسلموں سے جہاد کا حکم نہیں دیا ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ پُر امن طور پر رہنے کو تیار ہوں۔ یہاں ان منافقین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جو واجب القتل منافق ہیں لیکن اگر وہ کسی ایسی قوم یا ملک میں پناہ لے لیں کہ جس سے مسلمانوں کا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس علاقے میں جا کر ان کو

قتل کریں اور نہ ہی ان کا تعاقب کریں یہ احترام منافق کا نہیں، بلکہ اس معاہدے کا احترام ہے جو اسلامی حکومت نے اس دوسری حکومت سے کر رکھا ہے۔ یہاں معاہدے کی پاسداری کا قانون بھی مسلمانوں کو بتا دیا گیا ہے۔ آگے فرمایا: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا تو وہ تم سے ضرور جنگ کرتے۔ اور تم سے لڑائی کرتے۔ مگر یہ اس مالک الملک کی خاص مہربانی ہے کہ انہیں تم پر غالب نہیں ہونے دیا۔ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ چنانچہ اگر وہ تم سے کنارہ کشی کرتے ہوئے تم سے جنگ نہ کریں، اور تم کو امن کی اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش ڈالیں۔ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۹۰ تو اللہ نے تم کو ان کے خلاف کسی کاروائی کا کوئی حق نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ تم سے آمادہ جنگ نہیں ہوتے بلکہ صلح کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو۔ یہ صلح و جنگ کے قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ اسلام کسی دشمن کے خلاف بھی اس وقت تک کارروائی کی اجازت نہیں دیتا جب تک اس کا شر و فساد واضح نہ ہو جائے لہٰذا ایسے کفار کے ساتھ بھی جنگ نہ کرو، جو تمہارے ساتھ جنگ کرنے کی بجائے صلح پر آمادہ ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا معاہدہ ہے اور مسلمان معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ فرمایا اس قسم کی پیش کش کو قبول کر لو۔ صلح و جنگ کے بعض قوانین اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں بیان کیے اور بعض دیگر قوانین سورہ انفال، سورہ توبہ اور سورہ فتح میں بھی آتے ہیں۔ یہ ایک پورا نظام صلح و جنگ ہے۔ اسلام میں صلح اور جنگ کا نظام محض عسکری حکمت عملی نہیں، بلکہ اخلاقیات، انصاف اور انسانی حقوق پر مبنی ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسلام اصل میں امن و سلامتی کا دین ہے اور جنگ کو صرف آخری چارہ کار کے طور پر اجازت دی گئی ہے۔ مگر چونکہ ہم اپنے اجتماعی نظام سے منسلک نہیں ہیں، اس لیے ہمیں علم ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں کیا قوانین نازل فرمائے ہیں۔ صلح و جنگ کے یہ بنیادی اصول اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور ان کی شرح احادیث میں موجود ہے۔ پہلی صدیوں میں ان پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں اور انہیں عمل درآمد کے لیے بالکل واضح کر دیا ہے دنیا کے کسی مذہب

اور لٹریچر میں یہ قوانین اس قدر وضاحت کے ساتھ موجود نہیں جس قدر اسلام نے پیش کیے ہیں۔ مگر آج کی دنیا میں ہم اغیار کے رحم و کرم پر ہیں۔ سیاست بھی اسی کی چلتی ہے جس کا غلبہ ہو غالب قومیں اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرتی ہیں۔ جو سراسر ناانصافی پر مبنی ہوتے ہیں۔ آج اسلام کے قانون کو کون پوچھتا ہے۔ حالانکہ یہ منزل من اللہ ہے اور اعلیٰ وارفع ہے۔ یہ قانون حضور ﷺ نے عملی طور پر نافذ کر کے دکھائے آپ کے دس سالہ مدنی دور میں چھوٹی بڑی پچاس جنگیں ہوئیں۔ آٹھ جنگوں میں تو باقاعدہ آمنے سامنے لڑائی ہوئی اور بعض میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی اگرچہ اسلامی لشکر میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں اسی محاذ پر بڑی فوج بھیجی اور کسی پر چھوٹے دستے۔ کہیں مجاہدین کی تعداد ہزاروں میں تھی اور کہیں سینکڑوں میں۔ مگر آپ نے قوانین صلح و جنگ کو نافذ کر کے ان پر عمل کر کے دکھا دیا۔

اسلام ایک امن وسلامتی والا مذہب

اسلام ایک امن وسلامتی والا مذہب ہے، جو نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں کے ساتھ بھی نرمی کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس عظیم دین کا حسن دیکھئے کہ اسلام ''سلامتی'' اور ایمان ''امن'' سے عبارت ہے اور اس کا نام ہی ہمیں امن وسلامتی اور احترام انسانیت کا درس دینے کیلئے واضح اشارہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ، صبر و برداشت، عفو و درگزر اور رواداری سے عبارت ہے۔ اسلام امن وآشتی اور صلح وسلامتی کا مذہب ہے، اس نے انسانی زندگی کی حرمت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے، اور اگر کسی مسلمان ملک میں غیر مسلم اقلیت آباد ہو تو اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور انہیں اپنی نجی زندگی میں اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اسلام کا قانونِ جنگ جسے اصطلاحِ شرع میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، کچھ تو خود ہماری بداطواریوں، اوچھی و نامناسب حرکات وسکنات، اور ہوش سے زیادہ جوش و جذباتیت کے اظہار، دوسری جانب اعداء اسلام کی سازشوں، افواہوں اور غلط پروپیگنڈوں اور ان کی جانب سے اس کی غلط توضیح وتشریح، اس کے حقیقی مفہوم کو پردۂ خفا میں رکھنے کی وجہ سے، معاشرہ کی اصلاح، امن عامہ کے قیام اور

سماج سے ظلم وسفاکیت اور فساد و بگاڑ کے دور کرنے میں اس کا حقیقی اور بامعنی کردار نگاہوں سے اوجھل ہوتا جارہا ہے۔ذرائع ابلاغ سوشل میڈیا کے پروپیگنڈے کے اس دور میں ایک حقیقی مسلمان کی یہ ذمہ داربنتی ہے کہ وہ مختلف ذرائع تشہیر کے ذریعے اسلامی احکام وتعلیمات کے روشن اور تابناک پہلوؤں کا اظہار کرتا رہے، تاکہ رفتارِ زمانہ اور خود مسلمانوں کی غفلت اور نادانی کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات کی خوبیوں پر گرد وغبار کی جو دبیز تہہ جم چکی ہے اس کی صفائی ہو،اور اسلامی تعلیمات کا حقیقی، روشن وتابناک چہرہ لوگوں کے سامنے آئے، جس کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوگا کہ اغیار واجانب کی غلط فہمیوں پر مبنی نظریات وتصورات کا خاتمہ ہوگا، دوسری جانب ان کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کی راہیں کھلیں گی ہے کہ اسلامی قانونِ جنگ کے مختلف محاسن سامنے آئیں اور غلط و باطل نظریات ومفروضات کا ازالہ ہو

اسلام کا نظریۂ جنگ

اگرچہ مذہب اسلام سراپا خیر ورحمت ہے،لیکن مطلب پرستوں،نفسانیت کے پجاریوں اور عدل وانصاف کے قاتلوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ حذف واضافہ اور ردوبدل کے ذریعے کسی بھی عبادت کے حقیقی مفہوم کو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کرکے اس سے اپنا معنی ومطلوب کشید کرلیں، جس میں وہ ماہر ہوتے ہیں چونکہ اس وقت اسلام کا نظریۂ جنگ اقوامِ عالم کی آنکھوں کا کانٹا بنا ہوا ہے، وہ تعصب اور جانب داری کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھائے ہوئے عمداً اور باتکلف اسلام کے قانونِ جنگ کو دوسرا رنگ وآہنگ دینے پر تلے ہوئے ہیں، چونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام کا حقیقی، صاف وروشن چہرہ لوگوں کے سامنے ہوگا تو اس سے ان کی چودھراہٹ اور سرداری خطرہ کی زد میں آجائے گی؛ اس لیے یہ لوگ مختلف عنوانات سے اسلام کے چمکدار اور تابناک اور بلند وبالا سورج پر تھوکنے کی احمقانہ کوشش کرتے رہتے ہیں۔جنگ علی الاطلاق ممنوع نہیں۔اللہ عزوجل نے انسان کو مجموعۂ اضداد بنایا ہے، خیر وشر دونوں پہلو انسانی طبیعت میں ودیعت کیے ہیں، انسان میں خیر کا پہلو اُسے نیکی اور بھلائی پر ابھارتا ہے، جب کہ شر کا پہلو اُسے آمادۂ معصیت اور ظلم وستم کرتا ہے؛ اس لیے

روزِ اول ہی سے اللہ عزوجل کا یہ قانون رہا ہے کہ وہ مختلف قوموں کو آمادۂ پیکار کیے رہتے ہیں، تاکہ اس طرح نیکی اور بھلائی کا پلڑا بھاری ہو جائے، سچائی وصداقت کی حقانیت آشکارا اور برائی کی قباحت وشناعت بھی عیاں ہو جائے۔ چنانچہ دنیا میں حق وصداقت کے غلبہ اور برتری اور شر وفساد کے خاتمہ کے لیے مختلف قوموں کے درمیان آویزش وٹکراؤ کے اپنے اسی ازلی قانون وروایت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے یوں ارشاد فرمایا: ''جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے، بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا، غلبہ والا ہے، وہ جس کو چاہے غلبہ دے سکتا ہے''۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو یہ جنگ کی اجازت اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ وہ زمین میں فساد و بگاڑ کریں، بلکہ اس جنگ کی اجازت کا مقصد یہ ہے کہ وہ جملہ مذاہب کی آزادی کو قائم رکھیں، بدامنی اور انارکی کا خاتمہ کریں، پارسیوں، عیسائیوں، یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مسلمانوں کی مساجد کو ہر طرح کے نقصانات اور گزند سے مامون ومحفوظ رکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قتال اور جہاد کا حکم کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کو بھی قتالِ کفار کے احکام دیئے گئے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کسی مذہب اور دین کی خیر نہ تھی، سارے ہی دین ومذہب اور ان کی عبادت گاہیں مسمار کر دی جاتیں۔

اسلام میں جہاد کا حقیقی مفہوم

جہاد سے متعلق سب سے پہلی غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ اس لفظ کو ''جنگ'' کے معنی میں لیا جاتا ہے اور اُسے عربی لفظ ''حرب'' کے مترادف باور کیا جاتا ہے جو تباہی و بربادی کے معنی میں آتا ہے۔ (المعجم الوسیط: ۱۴۶) یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہیں بھی اپنے اسلامی نظریۂ جنگ کے لیے لفظ ''حرب'' کا استعمال نہیں کیا ہے۔ قابلِ التفات امر یہ ہے کہ جس ملت ومذہب ہی کے نام میں امن وعافیت

کا مفہوم شامل ہو، وہ کیوں کر بے جا کُشت وخون اور فساد و بگاڑ کی دعوت دے سکتا ہے؟! بلکہ دین دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ اس قسم کی ظلم وفساد پر مشتمل جنگوں کا خاتمہ کرے اور امن وامان اور عدل و مساوات پر قائم ایک ایسا نظریہ جنگ اقوامِ عالم کے سامنے پیش کرے کہ دورانِ جنگ بھی کسی کی حق تلفی یا اس پر ظلم وستم جائز نہ ہو، چنانچہ مذکورہ بالا لغت میں لفظ ''جہاد'' کی تشریح یوں کی گئی ہے:

''قِتَالُ مَنْ لَیْسَ لَھُمْ ذِمَّۃٌ مِنَ الْکُفَّارِ یعنی ''غیر ذمیوں سے قتال''۔(المعجم الوسیط)

اسلامی جنگ کا مقصود فتنہ وفساد کا خاتمہ

اسلام میں جنگ ایک نہایت شریف عمل ہے، لہٰذا ہمیں اس کے متعلق کسی طرح کے بھید بھاؤ یا معذرت خواہانہ رویہ کے اختیار کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے، اس کی تعلیمات دیگر مذاہب کی طرح محض چند رسوم وعقائد کا مجموعہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسان کا خود ساختہ اپنے ہاتھوں بنایا ہوا قانون ودستور ہے؛ بلکہ خالق کائنات کا نازل کردہ نظامِ حیات ہے، جس میں ہر شعبۂ زندگی کے متعلق انسانیت کے لیے رہنمایانہ اصول بتلائے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیمات کو ہر شخص اپنا سکتا ہے، کوئی بھی شخص ان اصول کو اپنا کر اس کے دامن رحمت وعافیت میں جگہ پا سکتا ہے۔ ''اسلامی نظامِ جنگ''، ''جہاد'' یا اس جیسی نقل وحرکت کا مقصود بھی یہی ہے کہ فطرتِ انسانی سے موزون اعتدال پر مبنی ان تعلیمات کا ہر سمت بول بالا ہو، روئے زمین سے ناانصافی، بدامنی، ظلم وجبر اور شر وفساد کا خاتمہ ہو اور ہر شخص آزادی کے ساتھ اس خدائی نظام کے تحت امن وسکون کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اشاعت اِسلام کا ہرگز یہ مقصود نہیں کہ لوگوں کو مجبور کر کے اسلام میں داخل کیا جائے، ارشاد خداوندی ہے: ''لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' ''دین میں زور زبردستی نہیں''۔ اگر کوئی شخص جزیہ کی مشروعیت پر غور کرے گا تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اسلامی جنگ کا مقصود اسلام کا غلبہ ہے، خواہ وہ مخالف کے اسلام لانے سے ہو یا رعیت بن کر رہنا منظور کرنے سے۔ چوں کہ جزیہ دے کر اسلامی سلطنت میں رہنا بھی دراصل اسلامی قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہے، جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو چکا تو فتنہ وفساد کے امکانات بھی ختم ہو چکے؛ لہٰذا اب جنگ بھی موقوف کر دی جائے گی، اب اس ذمی

شخص کو اسلامی سلطنت میں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو ایک مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔اسی کو آیت کریمہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:''اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد نہ رہے اور دین (غلبہ) اللہ ہی کا ہو جاوے۔اور اگر وہ لوگ (فساد سے) باز آجاویں تو سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی بجز بے انصافی کرنے والوں کے''۔(البقرۃ:۱۹۳) اس آیتِ کریمہ میں جنگ بندی کی انتہا فتنہ وفساد کا خاتمہ بتایا گیا ہے۔ دورِ رسالت کے غزوات وسرایا کی مجموعی تعداد 82 ہے۔اگر ان لڑائیوں کو جارحانہ اور اقدامی تسلیم کیا جائے تو بھی ان میں مقتولین کی مجموعی تعداد 1018 (ایک ہزار اٹھارہ) ہے اور 82 (بیاسی) پر ان کو تقسیم کرنے سے فی جنگ 414.12 (بارہ اعشاریہ چار سو چودہ) اوسط نکلتا ہے۔ قیدیوں کی مجموعی تعداد 6564 (چھ ہزار پانچ سو چونسٹھ) ہے جو جزیرہ نما عرب کی وسعت کے مقابلہ میں ہیچ ہے اور چوں کہ ان کی تعداد کے اندر بڑی تعداد 6000 (چھ ہزار) ایک ہی غزوہ حنین کی ہے (جو کہ بعد میں تمام آزاد کر دیے گئے) اس لیے باقی جنگوں میں اسیرانِ جنگ کا اوسط 7 (سات) رہتا ہے۔ اس کے بالمقابل زمانۂ گزشتہ کی دو عظیم جنگیں اور ان کی ہلاکت خیزیوں اور تباہیوں کا اندازہ لگائیے جو صرف چھوٹی سلطنتوں کو آزاد کرانے کی غرض سے لڑی گئی تھیں۔مقتولین، مجروحین کی تعداد ساٹھ ستر لاکھ سے متجاوز ہے۔اہلِ دنیا کی لڑائیوں کا ذکر چھوڑو، مقدسین کی لڑائیاں لو، مہابھارت کے مقتولین کی تعداد کروڑوں سے کم نہیں۔ یورپ کی مقدس مذہبی انجمنوں نے جس قدر نفوس ہلاک کیے، ان کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے۔(تمام اعداد وشمار کے لیے ملاحظہ ہو: رحمۃ للعالمین، ج:۲،ص:۴۶۴) جزیہ کی ادائیگی کو بھی جو کہ دراصل اسلامی تعلیمات کی بالادستی اور روئے زمین پر فتنہ وفساد مچانے سے رکنے کا اعتراف اور عہد ہوتا ہے، اس کو بھی جنگ بندی کی انتہا بتلایا گیا ہے۔اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:''اہلِ کتاب جو کہ نہ خدا پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول (ﷺ) نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں''۔ (التوبۃ:۲۹) جزیہ کہتے ہیں اس مال کو جو اسلامی سلطنت کے ماتحت رہنے والے غیر مسلموں سے ان کی

جان، مال، عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے لیا جاتا ہے اور بالکل معمولی رقم ہوتی ہے۔ جزیہ کی یہ رقم ادا کرنے والے یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں اور ان کے اسلامی سلطنت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ان کے جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوتی ہے، ان کے مذہبی امور میں مداخلت کو اسلام منع کرتا ہے، پھر اس میں بچے، بوڑھے، عورتیں اور معذورین سے جزیہ نہیں لیا جاتا، اسی طرح مکاتب، مدبر، ام الولد پر بھی جزیہ نہیں ہوتا، (مدبر وہ غلام یا لونڈی (باندی) ہے جس کے مالک نے اسے یہ کہہ دیا ہو کہ "تم میرے مرنے کے بعد آزاد ہو") (ام الولد (بچے کی ماں) وہ لونڈی ہے جس کے بطن سے اس کے مالک (آقا) کا بچہ پیدا ہوا اور آقا اس بچے کو اپنی اولاد تسلیم کرے) مذہبی پیشوا جو گوشہ نشیں ہوں ان سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا۔ (اصح السیر، ص: ۴۷۴)

دورانِ جنگ بے قصور لوگوں سے تعرض کی ممانعت

اسلامی قانونِ جنگ کا ایک حسین اور خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے دورانِ جنگ بے قصور، نہتے اور کمزور لوگوں کے قتل کی سختی سے ممانعت کی ہے، عملاً جن لوگوں نے جنگ میں حصہ لیا ہے یا جنہوں نے مشوروں اور خدمات کے ذریعے ان کو مدد بہم پہنچائی ہے، یہی لوگ قتل کے مستحق ہوں گے، بقیہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور خلوت نشیں عابدوں اور زاہدوں سے ہرگز تعرض نہ کیا جاتا۔ دورانِ جنگ بے قصور لوگوں کے قتل کو تو رہنے دیجیے، اسلام نے سرسبز وشاداب کھیتوں، پھل دار درختوں اور باغات کو بھی نقصان پہنچانے سے روکا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "کمزور بوڑھوں، چھوٹے بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کیا جائے۔" (ابوداؤد، باب دعوۃ المشرکین إلی الإسلام، حدیث: ۸۴۹) اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر کو جو ملکِ شام ایک مہم کے لیے روانہ ہوا تھا، اُنہیں اس قسم کی ہدایات دی تھیں کہ وہ بچوں کو قتل نہ کریں، کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھائیں، کسی ضعیف بوڑھے کو نہ ماریں، کوئی پھلدار درخت نہ کاٹیں، کسی باغ کو نہ جلائیں۔ (مؤطا مالک: ۱۶۸) یہ بات پیشِ نظر رہے کہ عہدِ نبوی میں آنحضرت ﷺ نے جہاں کہیں بھی کسی آبادی کو نرغے میں لیا ہے، وہاں کی ساری آبادی اور قبیلے کے سارے لوگ بنفس نفیس اور عملاً جنگ میں شریک تھے؛ البتہ عہدِ صحابہ علیہم الرضوان

میں عموماً مسلمانوں کا مقابلہ وہاں کی آبادی سے نہیں، بلکہ حکومت کے منظم فوجیوں سے ہوا ہے؛ اس لیے مجاہدین نے اس ملک میں فاتحانہ داخل ہونے کے بعد وہاں کی عوامی املاک یا وہاں کے باشندوں کے مال وجان پر کسی طرح کی دست درازی نہیں کی ہے، بلکہ وہاں کے مقامی لوگوں نے مسلمانوں کے حسنِ سلوک اور رواداری اور انصاف پر مبنی طرزِ عمل کو دیکھ کر کئی موقعوں پر اپنے ہم مذہب عیسائیوں اور پارسیوں کے خلاف ہی جاسوسی، خبر رسانی اور رسد بہم پہنچانے اور اس قسم کی مختلف طرح سے امداد کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگِ یرموک پیش آنے کے وقت جب مسلمان شہر حمص سے نکلے تو یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا: ”جب تک ہم زندہ ہیں کبھی رومی یہاں نہ آنے پائیں گے“۔ عیسائیوں نے نہایت حسرت سے کہا: ”خدا کی قسم! تم رومیوں کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر ہم کو محبوب ہو“۔ (الفاروق، ج: ۲، ص: ۱۲۰) غور طلب امر یہ ہے کہ اگر اسلامی جنگ کا مقصود کشیدگی اور بدامنی اور انارکی کا ازالہ اور وہاں عدل وانصاف پر مبنی طرزِ حکومت کا قیام نہ ہوتا تو وہاں کے مقامی باشندے اپنے ہم مذہب پیشواؤں کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ کیوں دیتے؟ اور ان کے ساتھ اس جذباتی محبت وعقیدت کا اظہار کیوں کرتے؟

معاہدے کی پاسداری کی تاکید

اسلام نے حالتِ جنگ میں جن چیزوں کی سخت تاکید کی ہے، ان میں سے ایک عہد کی پاسداری بھی ہے، بلکہ عام حالات میں بھی وفائے عہد کو ایک مسلمان کے لیے اس کے ایمان کا لازمہ اور خاصہ قرار دیا گیا ہے: ”ایک ایمان والے کے شایانِ شان نہیں کہ وہ وعدہ خلافی یا عہد شکنی کرے، بدعہدی یہ تو منافق کا شیوہ ہوتا ہے“۔ (ریاض الصالحین: ۲۹۳) عہد وپیمان کے پاس ولحاظ کی تاکید کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے یوں ارشاد فرمایا: ”معاہدے کی پاسداری کرو؛ کیوں کہ اس کے تعلق سے باز پرس ہوگی“۔ عام حالات میں پابندیِ عہد کا اس قدر سختی کے ساتھ اسلام مطالبہ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جنگ کی حالت میں اس کی اہمیت مزید دوچند ہو جاتی ہے، اس لیے خصوصاً دورانِ جنگ یہ تاکید کی گئی ہے کہ دشمن خواہ بدعہدی کیوں نہ کرے، مسلمانوں کے لیے ہرگز یہ اجازت نہیں کہ قبل از اطلاع ان کی جانب پیش قدمی کریں یا بغیر انقطاعِ عہد کی اطلاع کے ان پر چڑھ دوڑیں؛

بلکہ ان کی جانب سے عہد شکنی کے باوجود بھی مسلمانوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ پہلے صاف اور صریح الفاظ میں معاہدہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیں، پھر اس کے بعد ہی وہ جنگی کارروائی کر سکتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: ''اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قسم سے دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغاباز'' (الانفال: ۵۸) اس آیت کریمہ میں قانون کی ایک اہم دفعہ بتلائی گئی ہے جس میں معاہدہ کی پابندی کی خاص اہمیت کے ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھیں؛ لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدہ کو صاف طور پر ختم کر دینے سے پہلے ہم ان کے خلاف کوئی اقدام کریں، بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ ان کو اطمینان و فرصت کی حالت میں اس سے آگاہ کر دیا جائے کہ تمہاری بدنیتی یا خلاف ورزی ہم پر ظاہر ہو چکی ہے، یا یہ کہ تمہارے معاملات مشتبہ نظر آتے ہیں؛ اس لیے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے، تم کو بھی ہر طرح اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو!۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ اور مشہور واقعہ جس کا ذکر مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی رحمہ اللہ نے کیا ہے: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لیے التوائے جنگ کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامان جنگ اس قوم کے قریب پہنچا دیں، تاکہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں، مگر عین اس وقت جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر اس طرف روانہ ہو رہا تھا، یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہا ہے: ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَفَاءً لَا غَدْرًا'' یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہیے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترکِ جنگ کا معاہدہ ہو جائے تو چاہیے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر کی گئی، دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا، تاکہ التوائے جنگ کی

میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں"۔ (معارف القرآن، ج: ۴، ص: ۲۷۰)

اسیرانِ جنگ کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ

دنیا میں جتنی قومیں اور سلطنتیں گزری ہیں، وہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ نہایت ہی وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک کرتے تھے۔ موجودہ یورپین حملہ آور اقوام کا جنگی قیدیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک ان کے اسیرانِ جنگ کے ساتھ سلوک کے حوالے سے شاہدِ عدل ہے۔ گوانتاناموبے اور ابوغریب کی بدنام زمانہ جیل اور وہاں کی انسانیت سوز اور حیا باختہ انواعِ تعذیب وعقوبت کو دیکھ کر ہر شخص تلملا اٹھا، اس کے ساتھ اسلام کا اسیرانِ جنگ کے ساتھ حسنِ سلوک بھی مشاہدہ کرتے چلئے: "جنگ بدر کے 72 (بہتر) قیدیوں میں آنحضرت ﷺ نے 70 (ستر) قیدیوں کو جرمانہ لے کر آزاد فرما دیا تھا۔ ان قیدیوں کو دورانِ اسارت مہمانوں کی طرح رکھا گیا، اہلِ مدینہ نے ان کے ساتھ نہایت ہی اچھا برتاؤ کیا، اپنے بچوں سے بڑھ کر ان کی خاطر مدارات کی۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کو بدر کے قیدیوں کی بندش کے تنگ ہونے کی وجہ سے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں، آنحضرت ﷺ وان کی اس تکلیف کی وجہ سے ساری رات نیند نہ آئی، جب آپ ﷺ کے حکم سے تمام قیدیوں کی بندش ڈھیلی کی گئی، تب آپ ﷺ کو راحت ہوئی۔ بدر کے تمام قیدیوں میں سے صرف دو شخص (عقبہ بن مُعیط اور نضر بن حارث ان کے بھیانک جرائم کی وجہ سے) قتل کر دیے گئے۔ جنگ بدر کے بعد غزوۂ بنی مصطلق میں بھی (100) سے زیادہ مرد وزن قید ہوئے، آپ ﷺ نے ان سب کو بلا کسی شرط اور جرمانہ کے آزاد کر دیا۔ جنگ حنین کے موقع سے بھی چھ ہزار مرد وزن قیدیوں کو بلا کسی شرط ومعاوضہ کے آزاد فرما دیا، بلکہ بعض اسیروں کی آزادی کا معاوضہ آپ ﷺ نے اسیر کنندگان کو خود ادا کیا، پھر اکثر اسیروں کو خلعت اور انعام سے نواز کر رخصت کیا۔ ان جملہ نظائر سے اسلام کے حملہ آور دشمنوں اور قابو یافتہ قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور رحم و کرم کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی پاک تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ خلفائے راشدین علیہم الرضوان کے عہد میں جب کہ عراق، مصر، شام، ایران اور خراسان، جیسے بڑے اور متمدن علاقے فتح ہوئے، لیکن کسی بھی جگہ حملہ آور یا جنگ آزما رعایا میں سے کسی کو لونڈی، غلام بنانے کا ذکر نہیں ملتا، بلکہ مغلوب دشمن سے تاوانِ

جنگ لینے کا ذکر بھی درج نہیں ہے۔ (رحمۃ للعالمین، ج:۱،ص:۲۱۲) مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا قانونِ جنگ امن و عافیت کا ضامن ہے۔ سسکتی بلکتی اور تڑپتی انسانیت کو اگر کوئی جائے پناہ اور موقع نجات مل سکتا ہے تو اسلامی تعلیمات کے زیرِ اثر، ورنہ یہ خوف او راندیشوں کے سائے انسانیت کا یوں ہی پیچھا کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

فتنوں کے زمانہ میں ایمان کی اہمیت اور اُس کی حفاظت کے طریقے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَیَاْمَنُوْا قَوْمَھُمْ ؕ کُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَی الْفِتْنَۃِ اُرْکِسُوْا فِیْھَا ۚ فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْکُمْ وَیُلْقُوْٓا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ وَیَکُفُّوْٓا اَیْدِیَھُمْ فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ ؕ وَاُولٰٓئِکُمْ جَعَلْنَا لَکُمْ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ۹۱

فتنہ پرور لوگ

سَتَجِدُوْنَ	عنقریب تم پاؤ گے	اٰخَرِیْنَ	کچھ اور لوگوں کو
یُرِیْدُوْنَ	جو چاہتے ہیں	اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ	کہ وہ امن میں رہیں تم سے
وَیَاْمَنُوْا	اور امن میں رہیں	قَوْمَھُمْ ؕ	اپنی قوم سے (بھی)
کُلَّمَا	جب بھی	رُدُّوْٓا	وہ لوٹائے جاتے ہیں
اِلَی الْفِتْنَۃِ	فتنے کی طرف	اُرْکِسُوْا	(تو) الٹا دیے جاتے ہیں
فِیْھَا	اس میں	فَاِنْ لَّمْ	پھر اگر

یَعْتَزِلُوْکُمْ	نہ وہ کنارہ کش رہیں تم سے	وَیُلْقَوْا	اور (نہ) پیش کریں
اِلَیْکُمُ	تمہاری طرف	السَّلَمَ	صلح
وَیَکُفُّوْٓا	اور (نہ) روکیں تم سے	اَیْدِیَھُمْ	اپنے ہاتھ
فَخُذُوْھُمْ	تو تم پکڑو ان کو	وَاقْتُلُوْھُمْ	اور تم قتل کرو ان کو
حَیْثُ	جہاں کہیں بھی	ثَقِفْتُمُوْھُمْ	تم پاؤ ان کو
وَاُولٰٓئِکُمْ	اور یہی لوگ ہیں	جَعَلْنَا	(کہ) ہم نے بنایا
لَکُمْ	تمہارے لیے	عَلَیْھِمْ	ان پر
سُلْطٰنًا	غلبہ	مُّبِیْنًا ﴿۹۱﴾	ظاہر

فرمایا سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ تم بعض ایسے لوگوں کو بھی پاؤ گے یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ جو چاہتے ہیں کہ تمہاری طرف سے بھی امن میں رہیں وَیَاْمَنُوْا قَوْمَھُمْ اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں۔ فرمایا یہ فتنہ پرور لوگ ہیں۔ ان کی خصلت یہ ہے کہ کُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَی الْفِتْنَۃِ جب انہیں فتنہ کی طرف پلٹایا جاتا ہے اُرْکِسُوْا فِیْھَا تو فوراً اس کی طرف پلٹا دیے جاتے ہیں۔ امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں فتنہ سے مراد کفر اور شرک ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے مسلمانوں اور کفار دونوں طرف سے مامون ومحفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ مگر جونہی انہیں موقع ملتا ہے یہ فوراً کفر وشرک کی طرف لوٹ جاتے ہیں گویا ان کے دلوں میں اسلام کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی کسی کارروائی سے بچنے کی خاطر ان کے ساتھ چاپلوسی کا اظہار کرتے ہیں، حقیقت میں ان کا رجحان کفر وشرک کی طرف ہی ہے مفسرین کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں بنی اسد اور بنی غطفان کے قبائل کا یہی حال تھا۔ وہ کفار اور مسلمانوں دونوں طرف سے مامون رہنا چاہتے اور دونوں طرف اپنی ہمدردی کا یقین دلاتے تھے۔ مگر جونہی موقع ملتا، وہ کفر وشرک میں مبتلا لوگوں کے ساتھ مل جاتے اور اس طرح اسلام کی عملی طور پر مخالفت کرتے۔

ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْکُمْ اگر یہ تم سے الگ نہ رہیں وَیُلْقُوْٓا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ اور صلح کی پیش کش نہ کریں وَیَکُفُّوْٓا اَیْدِیَھُمْ اور اپنے ہاتھوں کو تمہارے خلاف لڑنے سے نہ روکیں۔ مقصد یہ کہ اس قسم کے فتنہ پرداز لوگ اہل ایمان کے ساتھ تعاون نہ کریں بلکہ موقع ملنے پر انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوں فَخُذُوْھُمْ پھر ان کو پکڑ لو وَاقْتُلُوْھُمْ ان کے ساتھ لڑائی کر حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ جہاں بھی انہیں پاؤ۔ اب ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں۔ وہ جہاں بھی ملیں ان سے لڑو۔ یہ عرب کے مشرکین تھے اور بظاہر مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے مگر دل سے کفار کے ساتھ ہی تھے۔

جزیرۃ العرب کی پاکیزگی

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین عرب کے متعلق اللہ تعالیٰ کا آخری فیصلہ یہی ہے کہ انہیں جہاں بھی پاؤ، مارو۔ فتح مکہ کے بعد مشرکین کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا، کچھ لوگ مرتد ہوگئے، جن کا خاتمہ کردیا گیا اور باقی وہاں سے بھاگ گئے۔ مقصد یہ تھا کہ جزیرۃ العرب کو مشرکین کی نجاست سے بالکل پاک کردیا جائے کیونکہ اس خطہ زمین کو مرکز اسلام کی حیثیت دلانا مقصود تھا۔ حضور ﷺ کا اپنا بھی ارشاد موجود ہے کہ جزیرہ نما عرب میں دو دین نہیں چل سکتے، یہاں ایک ہی دین ہوگا اور وہ دین اسلام ہے جب وہاں پر حق آگیا تو باطل کو جانا ہی تھا۔ وہاں پر ایک قبلہ ہوگا، دوسرا نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اس سرزمین میں جزیہ کے عوض بھی کسی کو امان دینا روا نہیں کیونکہ وہاں دو دین نہیں چل سکتے۔ دوسرے مقامات پر تو غیر مسلم جزیہ ادا کرکے مامون ہوسکتے ہیں لیکن اس پاک سرزمین پر ایسا کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔ وہاں کا اٹل فیصلہ یہی ہے کہ اسلام قبول کرلو، یا وہاں سے چلے جاؤ ورنہ قتل کردیے جاؤ گے۔

فرمایا اگر یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائیں، صلح کی پیش کش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو پھر یہ جہاں ملیں انہیں قتل کرو۔ یہ مباح الدم لوگ ہیں۔ ان لوگوں کا خون تمہارے لیے مباح ہے۔ معاہدہ یا صلح کی صورت میں تو خون گرانا حرام ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کے سازشی لوگوں

کے لیے کوئی رعایت نہیں ان کا معاملہ ویسا ہی ہے جیسا کھلے کافروں وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ یہی لوگ ہیں کہ ہم نے تمہارے لیے ان پر غلبہ یا کھلی سند بنائی ہے۔ یعنی ان فتنہ پرور لوگوں کا خون تم پر مباح کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکوبی کی اجازت دے دی ہے لہٰذا مذکورہ صورتوں کے خلاف یہ جہاں بھی چاہے جائیں، انہیں قتل کر دو۔

فتنوں کے متعلق کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تعلیم

دین اسلام میں عقائد کی بڑی اہمیت ہے اور آخرت کی نجات عقیدہ کی درستگی پر موقوف ہے، اس اہمیت کی وجہ سے نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ ابتدا سے ہی بچہ کو عقیدۂ توحید و رسالت کی تلقین ہو جائے اور جب بچہ بولنا شروع کرے تو پہلی بات جو اُسے سکھائی جائے وہ عقیدۂ توحید پر مشتمل کلمہ ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے متعلق یہ تعلیمات دی ہیں کہ: ''جب تمہاری اولاد بولنے لگے تو ان کو 'لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ' سکھاؤ''، جب اس کے اندر کچھ سمجھ بوجھ پیدا ہو تو اس کلمہ کا مطلب اور معنیٰ سکھایا جائے، یہ کلمہ اسلام کے تمام عقائد کو شامل ہے، گویا جو شخص اس کلمہ کا اقرار کرتا ہے، اس کے لیے ہر اس بات پر دل و جان سے ایمان لانا فرض ہو جاتا ہے، جو اللہ اور اس کے رسول نے بتلائی ہیں، آج کل بہت سے مسلمان اپنے بچوں کو دینی تعلیم اور اسلامی عقائد نہیں سکھاتے، بلکہ خود بھی ان سے ناواقف ہوتے ہیں، اس ناواقفیت کی وجہ سے بسا اوقات اسلامی عقائد کا انکار کر کے اسلام کے دائرہ سے نکل جاتے ہیں، اس لیے عقائد پر مشتمل کتابوں کا مطالعہ اور تعلیم ضروری ہے کہ اس سے عقائد کی درستگی رہتی ہے۔ فضائل کی کتابوں کی تعلیم و مطالعہ سے اچھے اعمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات اور نہ کرنے پر وعیدیں سامنے آتی ہیں، برے اعمال کا انجام، دنیا کی حقیقت، موت کے بعد کے مراحل، قبر اور آخرت، جنت، جہنم کے احوال سامنے آتے ہیں، جس کی وجہ سے نیک اعمال کرنے کا شوق اور برے اعمال سے بچنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

فتنوں کے متعلق احادیث میں ''کتاب الفتن'' ایک مستقل عنوان ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فتنوں سے متعلق اپنی امت کی رہنمائی کی ہے اور ان سے بچنے کے بارے میں ہدایات دی ہیں کہ ان سے کیسے بچا جائے؟ ان کے مطالعہ سے فتنوں سے آگاہی حاصل ہوتی اور اس سے بچنے کے لیے جو تدابیر بتلائی گئی ہیں وہ بھی سامنے آجاتی ہیں، اس حوالے سے دو کتابوں کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا: 1 دورِ حاضر کے فتنے اور اُن کا علاج (محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ) 2 حدیثِ نبوی اور دورِ حاضر کے فتنے (شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ، تخریج وتشریح: مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان مفتاحی)۔ اس کے ساتھ آج کل جو گمراہ فرقے مسلمانوں کا ایمان خراب کر رہے ہیں، اِلحاد اور تشکیک پیدا کر رہے، ان کے بارے میں علماء نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گھروں میں اس طرح کی کتابوں کا مطالعہ اور تعلیم سے ایمان کی پختگی اور فتنوں سے حفاظت اور دین کی سمجھ اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

نام نہاد اسلامک اسکالرز کا فتنہ اور نوجوانوں کی ذمہ داریاں

اسلام بیزار اور نام نہاد مسلمان نوجوانوں کے بعد اب دین دار نوجوانوں میں بھی علماءِ کرام سے تنفیر کا فتنہ کچھ عرصے سے بڑھتا جا رہا ہے کہ جس کی بنیادی وجہ جہاں عام مسلمانوں میں دین بیزار طبقوں کا علماء کے خلاف پروپیگنڈہ ہے وہیں سوشل میڈیا پر بعض نام نہاد فتنہ پرور خود ساختہ "جعلی اسلامک اسکالرز" کے باطل افکار ونظریات ہیں کہ جن لوگوں کو بدقسمتی سے بعض جذباتی دین دار نوجوان طبقہ بھی پسند کرتا ہے کہ جو علماء کے خلاف باقاعدہ پروپیگنڈہ کر کے بالخصوص دین دار نوجوانوں اور بالعموم مسلمانوں کو متنفر کرنے کی مذموم سازش کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ طبقہ لوگوں کی یہ ذہن سازی کرنا چاہتا ہے کہ سارے مولوی دو نمبر اور ناقابل اعتماد ہیں۔ صرف ہم ہی ایک نمبر ہیں لہٰذا اب "ہم جیسے جاہل" تمہیں دین سکھائیں گے! چونکہ یہ دین دار نوجوان طبقہ علمی طور پر انتہائی کمزور جبکہ عملی طور پر اسلام کے ساتھ سچی محبت اور ایک جذباتی تعلق رکھتا ہے لہٰذا وہ انجانے میں اس سازش کا حصہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ شریر طبقہ نوجوانوں کے جذبات کو مزید بھڑکانے اور اپنے دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے بطورِ دلیل علماءِ سوء کی غلطیوں یا خامیوں کو بھی نہ صرف خوب

اچھالتے ہیں بلکہ ان خامیوں کی بنیاد پر یہ قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ سارے مولوی ایسے ہی ہوتے ہیں! یہی وجہ ہے کہ علماء سے متنفر دین دار نوجوانوں کی اکثریت ان نام نہاد اسکالرز سے متاثر نظر آتی ہے۔ایسے نوجوانوں کی خدمت میں چند بنیادی باتیں عرض کرنا چاہوں گا تاکہ وہ ان خود ساختہ اسکالرز کے فتنوں سے باہر نکلیں: 1 جس طرح دنیاوی علوم آپ اس فن کے ماہرین سے سیکھتے ہیں اسی طرح دینی علوم بھی ہمیشہ مستند علماء کرام سے سیکھیں نہ کہ نام نہاد "اسلامک اسکالرز" سے کہ جو شرعی علوم پر دسترس رکھنا تو دور کی بات اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں کی علماء سے متعلق آراء کو سرِ تسلیم خم کرنے سے قبل قرآن وسنت میں جو علماء کی قدر ومنزلت بیان کی گئی ہیں ان کا ایک بار ضرور مطالعہ کریں۔نیز ایسے اسکالرز سے علماء کے بارے میں سوال کرنے کے بجائے علماء سے ایسے اسکالرز سے متعلق دریافت کریں۔2 قرآن وحدیث کی درست تشریحات وہی ہیں کہ جو امت کے عظیم مفسرین کرام، محدثین عظام اور جلیل القدر علماء کرام نے بیان فرمائی ہیں۔اس کے مقابلے میں ریسرچ کا لیبل لگا کر ایسی نت نئی تشریحات اور خود ساختہ آراء کو دین کے نام پر پیش کرنا کہ جو آئمہ سلف میں سے کسی نے بھی بیان نہ کی ہوں عین جہالت، حماقت اور گمراہی ہے۔3 یہ بات خوب اچھی طرح جان لیں کہ دین اسلام کے تعلق سے اب تک کوئی ایک بھی ایسا شبہہ نہیں ہے کہ جس کا علماء نے جواب نہ دیا ہو۔یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم شبہہ تو سن لیتے ہیں لیکن اس سے متعلق علماء کے جوابات تلاش نہیں کر پاتے لہٰذا اسکالرز کی چرب زبانی اور ان کے پیش کردہ اشکالات سے متاثر ہونے کے بجائے بلا جھجک انہیں علماء کے سامنے پیش کریں۔4 ہمیشہ یہ بات یاد رکھیں کہ ہر داڑھی والا مولوی نہیں ہوتا اگرچہ وہ کسی مذہبی شعبہ سے وابستہ ہی کیوں نہ ہو حتی کہ وہ امام، قاری یا داعی ہی کیوں نہ ہو۔ضروری نہیں کہ وہ عالم بھی ہو۔لہٰذا ان میں پائی جانے والی خامیوں کو علماء کے کھاتے میں نہ ڈالیں اور نہ ہی ان سے فتویٰ کے لیے رجوع کیا جائے۔چہ جائیکہ نام نہاد اسلامک اسکالرز کی طرف رجوع کیا جائے۔5 علماء بھی آپ ہی کی طرح انسان اور اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔وہ غلطیوں سے قطعاً پاک نہیں ہیں۔جس طرح آپ کی ذاتی خامیوں سے

اسلام موردِ الزام نہیں ٹھہرتا ٹھیک اسی طرح کسی عالم میں پائی جانے والی ذاتی خامیاں بھی اسی قبیل سے ہی ہیں ۔لہٰذا ایسی غلطیوں کو بنیاد بنا کر دین اسلام یا علماءِ کرام پر زبان درازی کرنے سے احتیاط کریں ۔6 کون کتنا بڑا عالم یا اسلامک اسکالر ہے اس کا فیصلہ آپ نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ فیصلہ سوشل میڈیا یا فالورز کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے ۔بلکہ یہ فیصلہ تو علماء میں اس شخص کی علمی مقبولیت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے ۔7 "سارے مولوی ہی ایسے ہوتے ہیں" نام نہاد اسکالرز کی پیش کردہ یہ جھوٹ پر مبنی رائے قائم کرنے سے قبل آپ یہ دیکھ لیں کہ آپ کتنے علماء کو جانتے ہیں ۔8 نام نہاد اسکالرز کی آراء کو علماء کی آراء پر قطعاً مقدم نہ کریں ۔اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو یہ آپ کی کم عقلی ہے ۔اس سے احتیاط کریں ۔اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں اَن گنت نعمتیں ہیں، ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ایمان کی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان میری نعمتوں کا شکر ادا کرے، ان کی حفاظت کرے اور ان نعمتوں کے تقاضوں کو صحیح طریقوں سے پورا کرتے ہوئے اس کا اظہار کرے ۔ایمان کا شکریہ ہے کہ ایک مسلمان اس کی حفاظت کرے اور اسے اپنے ساتھ قبر تک لے جائے، گویا اپنے اور دوسروں کے ایمان کی حفاظت کرنا یہ اہم ترین فریضہ ہے، کیونکہ ایک حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "میں دیکھ رہا ہوں کہ (عن قریب) تمہارے گھروں میں فتنے اس طرح برس رہے ہوں گے، جیسے بارش برستی ہے ۔" (صحیح البخاری، نسخۃ طوق النجاۃ، ص: ۱۰۲)

اہلِ حق علماء اور صلحاء کی صحبت اور ان کی مجالس میں شرکت

ایمان کی حفاظت اور اعمالِ صالحہ کی پابندی اور اخلاق کی درستگی کے لیے اللہ والوں کی صحبت ضروری ہے، کیونکہ انسان کے اندر یہ خاصیت ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے خیالات و حالات سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے اور دوسروں کا اثر قبول کرتا ہے، اسی وجہ سے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کی دین اسلام میں بہت تاکید آئی ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں ایمان والوں کو اس بات کا حکم دیا کہ سچوں کی صحبت اختیار کرو: ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو ۔" (سورۃ التوبہ: ۱۱۹) اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطاء فرمائے ۔آمین

قتل کی اقسام اور ان کے احکام

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑨②

اسلام میں قتل کی سنگینی اور سزا

وَمَا كَانَ	اور نہیں ہے (لائق)	لِمُؤْمِنٍ	کسی مومن کے
اَنْ	یہ (بات) کہ	يَّقْتُلَ	وہ قتل کرے
مُؤْمِنًا	کسی مومن کو	اِلَّا خَطَـًٔا	مگر غلطی سے
وَمَنْ قَتَلَ	اور جو کوئی قتل کرے	مُؤْمِنًا	کسی مومن کو
خَطَـًٔا	غلطی سے	فَتَحْرِيْرُ	تو آزاد کرنا ہے
رَقَبَةٍ	ایک گردن	مُّؤْمِنَةٍ	مومن کا
وَّدِيَةٌ	اور دیت	مُّسَلَّمَةٌ	سونپی جائے گی

اِلٰٓی اَھْلِہٖ	اسکے وارثوں کی طرف	اِلَّآ اَنْ	مگر یہ کہ
یَّصَّدَّقُوْا	وہ معاف کر دیں	فَاِنْ کَانَ	پھر اگر ہو وہ (مقتول)
مِنْ قَوْمٍ	ایسی قوم میں سے جو	عَدُوٍّ لَّکُمْ	دشمن ہے تمہاری
وَھُوَ	جبکہ وہ (خود)	مُؤْمِنٌ	مومن تھا
فَتَحْرِیْرُ	تو آزاد کرنا ہے	رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ	ایک مومن گردن کا
وَاِنْ کَانَ	اور اگر ہو وہ	مِنْ قَوْمٍ	ایسی قوم سے کہ
بَیْنَکُمْ	تمہارے درمیان	وَبَیْنَھُمْ	اور ان کے درمیان
مِّیْثَاقٌ	عہد ہے	فَدِیَۃٌ	تو دیت
مُّسَلَّمَۃٌ	سونپی جائے گی	اِلٰٓی اَھْلِہٖ	اس کے وارثوں کی طرف
وَتَحْرِیْرُ	اور آزاد کرنا ہے	رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ	ایک مومن گردن کا
فَمَنْ	پھر جو	لَّمْ یَجِدْ	نہ پائے (غلام)
فَصِیَامُ	تو روزے رکھنے ہیں	شَھْرَیْنِ	دو مہینے

مُتَتَابِعَیْنِ	لگاتار	تَوْبَۃً	(یہ کفارہ) توبہ (کا قبول کرنا) ہے
مِّنَ اللّٰہِ ؕ	اللہ کی طرف سے	وَکَانَ اللّٰہُ	اور ہے اللہ
عَلِیْمًا	خوب جاننے والا	حَکِیْمًا ﴿۹۲﴾	خوب حکمت والا

شرعِ متین میں شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قتل ناحق ہے۔ قرآن وحدیث میں قتل انسانی کی شدید مذمت اور دنیا وآخرت میں اس کی سخت سزا ہے۔ فرمایا: وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا کسی مسلمان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی دسرے مسلمان کو قتل کرے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ فرمایا: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ وَّدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّصَّدَّقُوْا اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر بیٹھے تو اس پر فرض ہے کہ وہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور دیت (یعنی خون بہا) مقتول کے وارثوں کو پہنچائے، الا یہ کہ

وہ معاف کر دیں۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل خطا کی یہ دیت مقرر فرمائی: "ایک سال کی بیس اونٹنیاں، ایک سال کے بیس اونٹ، دو سال کی بیس اونٹنیاں، تین سال کی بیس اونٹنیاں اور چار سال کی بیس اونٹنیاں۔" (سنن ترمذی: 1291، سنن اَبی داوٗد: 4545) قتل قائم مقام خطا وہ ہے جس میں قاتل کے اختیاری فعل کو کوئی دخل نہ ہو، جیسے سوتے شخص نے کروٹ لی اور غیر اختیاری طور پر دوسرے پر آپڑا، جس کی وجہ سے دبنے والا فوت ہوگیا۔اس کے بھی قتل خطا والے احکام ہیں۔(الدر المختار: 5/342) قتل بہ سبب وہ قتل ہے جس میں کوئی شخص کسی کے قتل و ہلاکت کا بالواسطہ سبب بنا ہو۔مثلاً کسی شخص نے دوسرے شخص کی زمین میں بلا اجازت کنواں کھود دیا یا راستے میں لکڑی رکھ دی جس کی وجہ سے کوئی شخص کنویں میں گر گیا یا لکڑی کی ٹھوکر سے فوت ہوگیا، اس صورت میں عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔(الدر المختار: 5/342) غلطی کے اسباب و وجوہ متعدد ہو سکتے ہیں۔مقصد ہے کہ نیت اور ارادہ قتل کا نہ ہو۔ مگر بوجوہ قتل ہو جائے۔یہ قتل خطا کا جرمانہ بیان کیا جا رہا ہے جو دو چیزیں ہیں۔ایک بطور کفّارہ واستغفار ہے۔یعنی مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور دوسری چیز بطور حق العباد کے ہے اور وہ ہے "دِیَۃٌ" (خون بہا)۔مقتول کے خون کے بدلے میں جو چیز مقتول کے وارثوں کو دی جائے، وہ دیت ہے۔اور دیت کی مقدار احادیث کی رو سے سو اونٹ یا اس کے مساوی قیمت سونے، چاندی یا کرنسی کی شکل میں ہوگی۔الغرض! قتل کی تین قسمیں ہیں: آلۂ قتل سے حملہ کیا جائے اور مقتول پر وار کرنا مقصود ہو، اس کو 'قتل عمد' کہتے ہیں، مقتول پر وار کرنا مقصود ہو لیکن حملہ ایسی چیز سے کیا گیا جو عام طور پر قتل کا سبب نہیں ہوتا، یہ 'شبہ عمد' ہے، تیسری صورت 'قتل خطاء' ہے، کہ غلطی سے مقتول کی جان چلی جائے، ورنہ مقتول کی جان لینا مقصود نہ ہو، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ سمجھنے میں غلطی ہو جائے، جیسے دور سے جانور سمجھا اور گولی چلا دی، قریب آئے تو معلوم ہوا کہ وہ آدمی تھا، دوسرے یہ کہ نشانہ لگانے میں غلطی ہو جائے، مثلاً نشانہ لیا شیر کا اور لگ گیا کسی انسان کو۔(الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۶/ ۲۲۲)

دیت کے متعلق چند اہم مسائل

فرمایا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ط اور اگر مقتول کسی ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہو جو تمہاری دشمن ہے، مگر وہ خود مسلمان ہو تو بس ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا فرض ہے، (خون بہا دینا واجب نہیں) ۔ اگر اس کے وارث حربی کافر ہوں تو پھر قاتل کے ذمے صرف کفارہ ہے، یعنی ایک مسلمان گردن آزاد کرنا، اگر نہ ہو سکے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا۔ مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ دشمن ہیں۔ (قرطبی) کفارہ میں روزے خود قاتل کو رکھنے ہوں گے البتہ دیت قاتل کے اہل نصرت پر ضروری ہوگی جسے شرعی اصطلاح میں عاقلہ کہتے ہیں۔ دیت میں حاصل شدہ مال مقتول کے ورثہ میں شرعی اعتبار سے تقسیم ہوگا۔ جو وارث اپنا حصہ معاف کر دے گا اس قدر معاف ہو جائے گا اور اگر سب نے معاف کر دیا تو سب معاف ہو جائے گا۔ اگر کسی ایک شرعی وارث نے بھی اپنی حصہ کی دیت کا مطالبہ کر لیا یا معاف کر دیا تو پھر قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اب دوسرے ورثاء کے لئے دو ہی اختیار ہوں گے یا تو اپنے حصہ کی دیت لیں یا پھر معاف کر دیں۔ فرمایا وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جو (مسلمان نہیں، مگر) ان کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہے تو بھی یہ فرض ہے کہ خوں بہا اس کے وارثوں تک پہنچایا جائے، اور ایک مسلمان غلام کو آزاد کیا جائے۔ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مقتول مسلمان ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جن سے تمہارا معاہدہ ہے، یا ذمی ہیں تو اس صورت میں بھی دو چیزیں واجب ہوں گی، دیت (خون بہا)، اور کفارہ۔ یہاں دیت کو کفارہ سے پہلے ذکر فرمایا ہے کہ اسے غیر مسلم قوم کا فرد سمجھ کر دیت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی جائے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مقتول معاہد یا ذمی ہو (مسلمان نہ ہو) تو اس صورت میں بھی کفارہ اور وارثوں کو خون بہا ادا کرنا پڑے گا، مگر زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں بھی مسلمان مقتول ہی کی بات ہو رہی ہے غرضیکہ قتل عمد میں قصاص یا دیت واجب ہوتی ہے، لیکن قتل عمد اور شبہ عمد کی دیت اونٹوں کی عمر

کے لحاظ سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور قتل خطاء کی دیت عمر کے لحاظ سے نسبتاً ہلکی ہے، (البحر الرائق: ۸/ ۳۲۷) رسول اللہ ﷺ نے قتل خطاء کی دیت سو اونٹ مقرر کی ہے، (سنن ابی داؤد، باب الدیۃ کم ہی؟ حدیث نمبر: ۴۵۴) دیت میں اصل معیار اونٹنیاں ہیں؛ البتہ فقہاء نے اپنے اپنے عہد میں اونٹنی کی قیمت کے اعتبار سے مروجہ سکوں میں قیمت مقرر فرمائی ہے، واضح رہے کہ شریعتِ مطہرہ نے قتل خطاء کی صورت میں قاتل پر کفارہ (یعنی مسلسل ساٹھ روزے) اور دیت (یعنی سونے یا چاندی کی شکل میں رقم) دونوں لازم کرتی ہے، بشرطیکہ قتل خطاء یعنی غلطی کی وجہ سے قتل ہوا ہو، نیز دیت کی مقدار یہ ہے کہ دیت اگر سونے کی صورت میں ادا کی جائے تو اس کی مقدار ایک ہزار (1000) دینار یعنی 375 تولہ سونا جس کا اندازا جدید پیمانے سے 4 کلو 374 گرام سونا یا اس کی قیمت بنتی ہے، اور اگر دراہم (چاندی) کے اعتبار سے ادا کرنا ہو تو دس ہزار (10000) درہم یعنی 2625 تولہ چاندی جس کا اندازا جدید پیمانے سے 30 کلو 618 گرام چاندی یا اس کی قیمت بنتی ہے، ملحوظ رہے دیت کی ادائیگی قاتل کی "عاقلہ" کے ذمہ ہے، اور عاقلہ سے مراد وہ جماعت، تنظیم یا کمیونٹی ہے جس کے ساتھ اس قاتل کا تناصر (یعنی باہمی تعاون) کا تعلق ہو، نیز یہ دیت تین سال میں ادا کی جائے گی، البتہ اگر قاتل اور مقتول کے ورثاء آپس میں اپنے درمیان متعین کردہ رقم پر مصالحت کریں تو وہ بھی درست ہے۔

فرمایا: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ ہاں اگر کسی کے پاس غلام نہ ہو تو اس پر فرض ہے کہ دو مہینے تک مسلسل روزے رکھے۔ یہ توبہ کا طریقہ ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے، اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا اور ایک شخص کی زندگی کی حفاظت کو پوری انسانیت کی زندگی قرار دی۔ غرضیکہ دیت کی ادائیگی خاندان کے تمام افراد پر رکھی گئی ہے تاکہ دیت کے خوف سے ہر شخص معاشرہ کو قتل سے محفوظ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ کفارہ کے روزے میں اگر مرض کی وجہ سے تسلسل باقی نہ رہے تو از سر نو رکھنے پڑیں گے، عورت کے حیض کی

وجہ سے تسلسل ختم نہیں ہوگا یعنی اگر کسی عورت نے کسی شخص کو قتل کر دیا اور وہ 60 روزے کفارہ میں رکھ رہی ہے، 60 روزے رکھنے کے دوران ماہواری کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا وہ ماہواری سے فراغت کے بعد 60 روزوں کو جاری رکھے گی۔ اگر کوئی قاتل اپنی کمزوری کی وجہ سے 60 روزے رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے تو اسے قدرت تک توبہ کرتے رہنا ہوگا۔ آیت میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ مقتول مسلمان ہو یا غیر مسلم، ان کا خوں بہا برابر ہے، جیسا کہ حنفیہ کا نقطۂ نظر ہے۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۶/ ۳۱۱) بہر حال کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے اور اس قتل کو حلال جاننا کفر ہے، کوئی معاشرہ جہاں جان و مال محفوظ نہ ہو وہاں انسانی نسل کی بقا اور ترقی خطرے میں پڑ جاتی ہے، اس لیے دنیا کی کوئی آبادی، گروہ، جماعت ایسی نہیں ہے جو جان و مال کے تحفظ کے لیے قانون وضع نہ کرے۔ کافروں نے اپنی رسم و رواج، پارلیمنٹ کی قرارداد، وغیرہ کے ذریعے ان جرائم کی روک تھام کے لیے مختلف قوانین وضع کیے، لیکن ان کا خاطر خواہ فائدہ ان کے معاشرہ کو نہیں پہنچا اور یہ جرائم بلا کسی رکاوٹ کے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اُمت محمدیہ پر خدا کا کرم ہے کہ خالق کائنات جو انسانوں کا بھی خالق ہے، ان کی نفسیات سے بھی واقف ہے، اپنے نبی کے واسطے سے ان جرائم کی سزا سے امت کو مطلع کیا ہے اور تاریخ گواہ ہے جہاں جہاں ان قوانین کو عملی طور پر نافذ کیا گیا وہاں امن و سکون کی بہار آگئی، عوام الناس کی جان و مال محفوظ ہوگئی، اگر چہ بظاہر ناقص العقل انسان کو یہ سزائیں بہت سخت لگتی ہیں، لیکن معاشرے کے تحفظ کے لیے ان سخت اقدامات کو اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں، اگر ایک دو مجرموں پر سزا کے نفاذ سے ہر انسان کی جان و مال محفوظ ہو جائے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود و تعزیرات کو "وحشی سزائیں" کہنے والا درحقیقت قاتلوں اور ڈاکوؤں کا پشتی بان ہے، جسے ایک فرد سے ہمدردی ہے، مگر معاشرے سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔

قتل ناحق کی مذمت قرآن و حدیث کی روشنی میں

قرآن و حدیث میں متعدد مقامات پر مختلف پیرایے میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ اسلام

میں انسانی جان علی الاطلاق محترم ہے۔ چناں چہ ہر ذی روح کی جان کا احترام ضروری ہے، نہ تو کسی جان دار کو بلا وجہ مارنے کی اجازت ہے اور نہ ایذا رسانی کی۔ اس حوالے سے ذیل میں چند آیات وروایات ملاحظہ فرمائیں! حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب نازل کرے گا اور لعنت بھیجے گا اور اللہ نے اس کے لیے زبردست عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (النساء) ایک اور جگہ ارشاد باری ہے: اور جس جان کو اللہ تعالیٰ نے حرمت عطا کی ہے، اسے قتل نہ کرو؛ مگر یہ کہ تمہیں (شرعاً) اس کا حق پہنچتا ہو اور جو شخص مظلومانہ طور پر قتل ہو جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار دیا ہے، چناں چہ اس پر لازم ہے کہ وہ قتل کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرے، یقیناً وہ اس لائق ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ (الاسراء) اسی طرح رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ناروا قتل پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں اور اس گناہ کبیرہ سے باز رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول نقل فرمایا ہے: کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور کسی انسان کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی بات کہنا۔ (بخاری) ایک جگہ تو قتل ناحق کو کفر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنے کے لیے لڑنا کفر ہے۔ (بخاری) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر گناہ کے بارے میں امید ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو معاف فرما دے، سوائے اس شخص کے جو مشرک ہونے کی حالت میں مرا ہو یا جس نے کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کیا ہو۔ (مجمع الزوائد) حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص دوسرے کے پاس جا کر اسے قتل کر دے تو مقتول جنت میں ہوگا اور قاتل جہنم میں۔ (مجمع الزوائد) قتل کی سنگینی کے باعث اسلام نے اسلحہ کے ذریعے مذاق اور اسلحہ کی نوک سے کسی معصوم کی طرف اشارہ کرنے سے بھی منع فرما دیا، چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: کوئی بھی اپنے بھائی کی طرف اسلحہ سے اشارہ نہ کرے؛ کیوں کہ اسے نہیں معلوم کہ شیطان اس کے ہاتھ کو چوک لگا دے اور وہ جہنم کے گڑھے میں جا گرے۔ (بخاری ومسلم) نیز نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: جو شخص اپنے کسی بھائی کی طرف خنجر سے بھی اشارہ کرے تو فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں، چاہے وہ اس کا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ (مسلم، ترمذی) مختصر یہ کہ قتل کے پیہم واقعات کا رونما ہونا' قوتِ برداشت کے فقدان، غصے میں آپے سے باہر ہوجانے اور اسلامی تعلیمات سے جہالت وناواقفیت کا نتیجہ ہے جو مسلم معاشرے کے لیے کسی بدنما داغ سے کم نہیں۔

موجودہ حالات میں اہل اسلام کا فرض تھا کہ اپنے انفرادی واجتماعی اختلافات کی پستی سے ذرا اوپر اُٹھتے اور وحدتِ اسلام کی رسی تھام کر دوسروں کو سرتوڑ جواب دیتے، اگر یہ نہ سہی کہ دوسروں کو اپنے حلقہ میں لے لیتے، تو یہ ہوتا کہ دوسروں کو اپنے حصار میں فاتحانہ داخل نہ ہونے دیتے؛ لیکن کسی اور کو کیا کہیے اور کس منھ سے کہیے، جب کہ خود اپنوں نے یہ وحدت پارہ پارہ کی، خود اپنا حصار انہوں نے توڑا، جس ملت کے قانون میں عام انسانوں کی زندگی کی ضمانت تھی، آج اسی کے ہاتھ ایک دوسرے کے گلا گھونٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں پر کیا نظر اُٹھائیے جنہیں خدا سے سروکار نہیں، آخرت سے وہ غافل ہیں، جنت وجہنم کو صرف خوش فہمی سمجھتے ہیں، جن کے نزدیک مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ہی سب کچھ ہے، وہ اگر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں تو عین ممکن ہے، کیوں کہ ان کے سامنے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا نقشہ نہیں ہے؛ لیکن جس قوم کا ایمان یہ ہو کہ یہ دنیا ایک رہ گزر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، پھر جونہی آنکھیں بند ہوں گی اپنے مالک ومولیٰ کے حضور اپنے کیے دھرے کا لچا چٹھا پیش کرنا ہے، اسے کیسے جرات ہوتی ہے کہ جس کام کو اسی مالک نے جس مالک کے سامنے بالآخر حاضری ہے، جرم اور بدترین جرم قرار دیا ہے، اسی کے ارتکاب کی جرات کر بیٹھے وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۹۲﴾ اللہ تعالیٰ علیم کل ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ حکیم بھی ہے کہ اس نے اپنی کمال حکمت سے جس طرح مناسب سمجھا، انسانوں کے لیے احکام نازل فرمائے ہیں۔

قتل گناہِ کبیرہ اور قبیح ترین فعل ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خٰلِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ﴿۹۳﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَتَبَیَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۹۴﴾

ایک بے گناہ انسان کا قتل دراصل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے

وَمَنْ یَّقْتُلْ	اور جو کوئی قتل کرے	مُؤْمِنًا	کسی مومن کو
مُّتَعَمِّدًا	جان بوجھ کر	فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ	تو اس کی سزا ہے جہنم
خٰلِدًا فِیْھَا	وہ ہمیشہ رہے گا اس میں	وَغَضِبَ اللّٰہُ	اور غضبناک ہوا اللہ
عَلَیْہِ	اس پر	وَلَعَنَہٗ	اور اس نے اس پر لعنت کی
وَاَعَدَّ	اور اس نے تیار کر رکھا ہے	لَہٗ	اس کیلیے
عَذَابًا	عذاب	عَظِیْمًا ﴿۹۳﴾	بہت بڑا

اس آیت میں غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کر دینے کا حکم بیان کیا گیا اور اس آیت میں جان بوجھ

کرکسی مسلمان کوقتل کرنے کی اُخروی وعید بیان کی گئی ہے۔(تفسیر کبیر،النساء،تحت الآیۃ: ۹۳، ۴/ ۱۸۲)قتل عمد (جان بوجھ کرکسی کو ناحق قتل کرنا) شرک کے بعدسب سے بڑااورعظیم ترین کبیرہ گناہ ہے۔اسلام میں انسانی جان کی عظمت اورحرمت کااندازہ اس بات سے لگایاجاسکتاہے کہ ایک انسان کا ناحق قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے،فرمایا:وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۹۳ اورجو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کرقتل کرے تواس کی سزاجہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گااوراللہ اس پرغضب نازل کرے گااورلعنت بھیجے گا،اوراللہ نے اس کے لیے زبردست عذاب تیار کررکھا ہے۔نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایاکہ کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ یہ ہیں:اللہ کے ساتھ شرک کرنا،کسی انسان کو ناحق قتل کرنا،والدین کی نافرمانی کرنااورجھوٹی بات کہنا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے"جوکوئی کسی کوقتل کرے جبکہ یہ قتل نہ کسی اورجان کابدلہ لینے کیلئے ہواورنہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے ہو،تو یہ ایسا ہے،جیسے اس نے تمام انسانوں کوقتل کردیا،اورجوشخص کسی کی جان بچالے،تو یہ ایسا ہے،جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی"(سورۃ المائدہ:32)یعنی ایک شخص کے خلاف قتل کا یہ جرم پوری انسانیت کے خلاف جرم ہے،کیونکہ کوئی شخص قتل ناحق کاارتکاب اسی وقت کرتاہے،جب اس کے دل سے انسان کی حرمت کااحساس مٹ جائے،ایسی صورت میں اگراس کے مفاد یاسرشت کا تقاضاہوگا تووہ کسی اورکوبھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کرے گااوراس طرح پوری انسانیت اس کی مجرمانہ ذہنیت کی زد میں رہے گی۔

انسانی خون کی حرمت

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اورمہاجروہی ہے جوگناہوں اور برائیوں کو چھوڑ دے"(صحیح البخاری:6484)۔ایک مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے بھی زیادہ ہے،حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خانہ کعبہ کاطواف کرتے دیکھااور یہ فرماتے سنا:اے کعبہ تو کتنا عمدہ ہے اور

تیری خوشبو کتنی پیاری ہے، تو کتنا عظیم المرتبت ہے اور تیری حرمت کتنی زیادہ ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے، مومن کے جان و مال کی حرمت اللہ کے نزدیک تیری حرمت سے زیادہ ہے" (صحیح الترغیب 2339) فولادی اور آتشیں اسلحہ سے لوگوں کو قتل کرنا تو بہت بڑا اقدام ہے، حضور نبی اکرم ﷺ نے اہلِ اِسلام کو اپنے مسلمان بھائی کی طرف اسلحہ سے محض اشارہ کرنے والے کو بھی ملعون و مردود قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے، تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ کو ڈگمگا دے اور وہ (قتل ناحق کے نتیجے میں) جہنم کے گڑھے میں جا گرے (صحیح البخاری: 7072)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص نیزے سے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرے، فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اسے رکھ دے (صحیح مسلم 2616)۔

مومن کو قتل کرنیوالے کی بخشش نہیں

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امید ہے کہ اللہ ہر گناہ معاف فرما دے سوائے اس شخص کے جو حالت شرک میں فوت ہو گیا ہو یا جس نے عمداً کسی مومن کو قتل کیا ہو" (سنن ابی داؤد)۔ افسوس کہ آج کل قتل کرنا بڑا معمولی کام ہو گیا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جان سے مار دینا، غنڈہ گردی، دہشت گردی، ڈکیتی، خاندانی لڑائی، تعصّب والی لڑائیاں عام ہیں۔ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جاتا ہے، گروپ اور جتھے اور عسکری وِنگ بنے ہوئے ہیں جن کا کام ہی قتل و غارتگری کرنا ہے۔ اگر مسلمانوں کے قتل کو حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کیا تو یہ خود کفر ہے اور ایسا شخص ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور قتل کو حرام ہی سمجھا لیکن پھر بھی اس کا ارتکاب کیا تب یہ گناہ کبیرہ ہے اور ایسا شخص مدت دراز تک جہنم میں رہے گا۔ آیت میں "خَالِدًا" کا لفظ ہے اس کا ایک معنیٰ ہمیشہ ہوتا ہے اور دوسرا معنیٰ عرصہ دراز ہوتا ہے یہاں دوسرے معنیٰ میں مذکور ہے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے

موقع پر فرمایا: میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر کافر نہ بن جانا (صحیح البخاری: 7080)، آپ ﷺ نے میدانِ عرفات میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: بلا شبہ تمہارے خون اور تمہارے مال آپس میں ایک دوسرے پر حرام ہیں، جیسا کہ آج کے دن کی بے حرمتی تمہارے اس مہینے میں، تمہارے اس شہر میں حرام ہے (صحیح البخاری: 1739)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ مومن کا (ناحق) قتل اللہ تعالیٰ کے ہاں ساری دنیا کی تباہی سے زیادہ ہولناک ہے (صحیح النسائی: 3997)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک پوری دنیا کا زوال وتباہی ایک مسلمان کے قتل سے کم تر ہے، یعنی ساری دنیا تباہ ہو جائے، یہ اللہ کے ہاں چھوٹا عمل ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک مسلمان کو قتل کیا جائے'' (صحیح الترمذی: 1395) نبی کریم ﷺ نے ارشاد نے فرمایا: ''اگر تمام آسمان اور زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جہنم میں ڈال دے گا'' (صحیح الترمذی: 139) مذکورہ آیت اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں اس قدر تاکید اور شدت کے ساتھ شاید ہی کسی جرم کی سزا بیان کی گئی ہو، اول تو جہنم، پھر اس میں ہمیشہ کا قیام، اس کے ساتھ ساتھ اللہ کا غضب اور اللہ کی لعنت، اور مزید یہ کہ اللہ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے؛ اسی لئے فقہاء کے نزدیک کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ یہی ہے اور بعض علماء کے نزدیک تو قاتل کے لئے توبہ ہی نہیں ہے، ویسے جمہور اہل سنت کے نزدیک قاتل کی توبہ بھی اللہ چاہیں، تو قبول ہو سکتی ہے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں نہ رہیں گے؛ بلکہ اپنے گناہ کی سزا پانے کے بعد دوزخ سے نکالے جائیں گے، جیسا کہ احادیث اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے یا اس آیت میں ایسے قاتل مراد ہیں جن کو پشیمانی تک نہ ہو اور توبہ بھی نہ کریں، گویا وہ قتل مومن کو گناہ ہی نہیں سمجھتے، ایسا سمجھنے والے دائرہ ایمان سے خارج ہیں؛ لہٰذا ان کے لئے ہمیشہ کی سزا ہے اللہ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔

ہمارے ہاں اب تک تعزیرات کا انگریزی قانون جاری ہے، اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود

پاکستان میں اسلامی قانون نافذ نہیں ہوسکا، محض نام بدل کر اسے تعزیرات پاکستان کر دیا گیا ہے، حقیقت میں یہ وہی انگریز کا جاری کردہ فوجداری قانون ہے، یہ ایسا پیچیدہ قانون ہے جس میں صریح مجرم بھی سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کمزور آدمی پھنس جاتا ہے اس قانون کے تحت کسی کی رعایت نہیں کی جاتی۔ اس قانون میں فیصلہ حقائق کی بجائے وکلاء کی قانونی موشگافیوں پر ہوتا ہے۔ صاحب ثروت آدمی وکلا کی بھاری فیسیں اور رشوت دیکر اکثر بچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون کی موجودگی میں کسی شخص کی جان محفوظ نہیں پاکستان میں بے دریغ قتل کیے جاتے ہیں، مگر قاتل کا بال بیکا تک نہیں ہوتا اگر قانون قصاص و دیت نافذ کر دیا جائے تو ساری غنڈہ گردی ختم ہو جائے اور ملک میں لوگوں کو حقیقی زندگی نصیب ہو جائے۔ انگریزی قانون میں دیت کا مسئلہ تو بالکل ہی ناپید ہے اگر عدالت جرمانہ عاید کرے تو وہ حکومت کے خزانے میں چلا جاتا ہے اور مقتول کے ورثا کو کچھ نہیں ملتا۔ مگر شرعی قانون دیت کی بہت بڑی رقم مقتول کے ورثا کو دلاتا ہے۔ ہمارا انگریزی دان طبقہ اسلامی تعزیرات سے بلاوجہ خوف زدہ ہے یہ ایک مکمل قانون ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور اس کی مکمل تشریح احادیث میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ فقہائے کرام نے پوری ریسرچ کے بعد اس کی جزیات کا فیصلہ کیا ہے اور یہ قانون ہر طرح سے قابل عمل ہے اس قانون کے ذریعے جہاں جرم ثابت ہونے پر سخت سزا ملتی ہے، وہاں شک کی بناء پر ملزم کو رعایت بھی ملتی ہے۔ حضور ﷺ کا واضح ارشاد ہے اِدْرَؤُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُھَاتِ یعنی شک کی صورت میں ملزم پر حد جاری نہ کرو، اسے شک کا فائدہ دو۔ غرضیکہ اسلامی تعزیراتی قانون ایک فطری قانون ہے جس میں کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جاتی۔ فرمایا وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا اللہ نے قاتل کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے یہ اس کے کیے کا وبال ہے۔ اس نے ایک مومن کی جان لے کر بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ حالانکہ کسی مومن کی جان حلال نہیں۔ یہ آخری سزا کا ذکر ہے اور دنیا میں اگر اسلامی قانون نافذ ہوگا تو قصاص یا دیت بھی دینا ہوگا۔ اُمت محمدیہ پر خدا کا کرم ہے کہ خالق کائنات جو انسانوں کا بھی خالق ہے، ان کی نفسیات سے بھی واقف ہے، اپنے نبی کے واسطے سے ان جرائم کی سزا سے امت کو مطلع کیا ہے اور

تاریخ گواہ ہے جہاں جہاں ان قوانین کو عملی طور پر نافذ کیا گیا وہاں امن وسکون کی بہار آگئی، عوام الناس کی جان ومال محفوظ ہوگئی، اگر چہ بظاہر ناقص العقل انسان کو یہ سزائیں بہت سخت لگتی ہیں لیکن معاشرے کے تحفظ کے لیے ان سخت اقدامات کو اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں، اگر ایک دو مجرموں پر سزا کے نفاذ سے ہر انسان کی جان ومال محفوظ ہو جائے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود وتعزیرات کو "وحشی سزائیں" کہنے والا درحقیقت قاتلوں اور ڈاکوؤں کا پشتی بان ہے، جسے ایک فرد سے ہم دردی ہے، مگر معاشرے سے کوئی ہم دردی نہیں ہے۔ جب سے ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور امام الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سنت کی پیروی کرنے سے منہ موڑا ہے، آئے روز ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں کہ بھائی غیرت کے نام پر اپنی بہن کو قتل کر رہا تو بہن آشنا کے ساتھ مل کر بھائی کو قتل کر رہی ہے، باپ بیٹے کو قتل کر رہا ہے تو بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کا دشمن بنا ہوا ہے، جہیز کم لانے کی وجہ سے بہوؤں کی جان لے لی جاتی ہے، کیا ہم انسان کہلانے کے لائق ہیں، یہ سب کچھ اسلام سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ خلاصہ کلام: قرآن وحدیث کی تعلیمات سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کو قتل کرنا شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے اور قاتل کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ایک طویل عرصہ تک رہے گا، اللہ تعالیٰ اس پر اپنا غضب نازل کرے گا اور لعنت بھیجے گا اور اللہ تعالیٰ نے قاتل کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے، لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ قتل جیسے کبیرہ گناہ سے ہمیشہ بچے، حتیٰ کہ کسی بھی درجہ میں قتل کی معاونت سے بچنا بھی ضروری ہے، کیونکہ بسا اوقات ایک شخص کے قتل سے نہ صرف اس کی بیوی بچوں کی زندگی، بلکہ خاندان کے مختلف افراد کی زندگی بعد میں دوبھر ہو جاتی ہے اور اس طرح خوش حال خاندان کے افراد بیوہ، یتیم اور محتاج بن کر تکلیفوں اور پریشانیوں میں زندگی گزارنے والے بن جاتے ہیں، جس کا سبب یہ قاتل بنتا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو صراط مستقیم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم ایک دوسرے کی جان ومال کے محافظ بن جائیں (آمین)۔

مسلمانوں پر جہاد کب فرض ہوتا ہے؟
جہاد فرضِ عین کی تعریف واحکام

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی
اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰہِ
مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَتَبَیَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ
کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۹۴﴾ لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی
الضَّرَرِ وَالْمُجٰھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰہُ
الْمُجٰھِدِیْنَ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَۃً ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ
الْحُسْنٰی ؕ وَفَضَّلَ اللّٰہُ الْمُجٰھِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْہُ
وَمَغْفِرَۃً وَّرَحْمَۃً ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۹۶﴾

جنگ کے دوران قتل خطا

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْٓا	ایمان لائے ہو!
اِذَا ضَرَبْتُمْ	جب تم سفر کرو	فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	اللہ کے راستے میں

فَتَبَيَّنُوْا	تو تم تحقیق کرلیا کرو	وَلَا تَقُوْلُوْا	اور نہ تم کہو
لِمَنْ	اس شخص کو جو	اَلْقٰٓى	عرض کرے
اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ	تمہیں سلام	لَسْتَ مُؤْمِنًا	نہیں ہے تو مومن
تَبْتَغُوْنَ	تم طلب کرتے ہو	عَرَضَ	سامان
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	حیات دنیا کا	فَعِنْدَ اللّٰهِ	تو اللہ کے ہاں
مَغَانِمُ	غنیمتیں ہیں	كَثِيْرَةٌ	بہت سی
كَذٰلِكَ	اسی طرح	كُنْتُمْ	تھے تم
مِّنْ قَبْلُ	(اس سے) پہلے	فَمَنَّ اللّٰهُ	پھر اللہ نے احسان کیا
عَلَيْكُمْ	تم پر	فَتَبَيَّنُوْا	چنانچہ تم تحقیق کرلیا کرو
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	یقیناً اللہ ہے	بِمَا	اس کے ساتھ جو
تَعْمَلُوْنَ	تم عمل کرتے ہو	خَبِيْرًا ۹۴	خوب خبردار

ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اے ایمان والو! اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جب تم سفر کرو، اللہ کے راستے میں۔ ضرب کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ضرب کا عام فہم معنی تو مارنا ہے اور اس کا معنی بیان کرنا بھی ہے جیسے قرآن پاک میں يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ" اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور ضرب کا معنی سفر کرنا بھی ہے جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے اور فی سبیل اللہ سے مراد جہاد کے لیے نکلنا ہے۔ اس کی تشریح گزشتہ دروس میں بھی کی جا چکی ہے تو بہر حال مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم جہاد کے لیے سفر پر نکلو یعنی تمہارا سفر محض اللہ کی رضا کے لیے ہو اس میں ملک گیری اور ہوس زر کو دخل نہ ہو۔ تو دوران سفر اگر کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے فَتَبَيَّنُوْا تو اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا اور جو شخص تمہیں اسلامی طریقے سے سلام کرے اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ مقصد یہ کہ جو شخص ظاہری طور پر زبان سے کلمہ پڑھ لیتا ہے اور تمہیں سلام کہتا ہے اس کو مسلمان سمجھو اور اس

کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کرو اس کو قتل کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ اگر وہ تمہیں دھوکہ دینے کے لیے اسلام کا اقرار کر رہا ہے تو اس کا م معاملہ اللہ کے پاس ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اسے سزا دے گا۔ تمہیں اس پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے اور کسی ایسے عقیدہ کا اظہار نہ کرے جو باعث کفر ہے، تو اسے مسلمان ہی سمجھا جائے گا، اس کا قتل جائز نہ ہوگا اور قاتل پر قتل کی سزا جاری ہوگی، اس آیت کے سلسلہ میں کئی واقعات نقل کئے گئے ہیں، اس آیت میں تحقیق کا حکم سفر کے ساتھ اس لیے متعلق کیا گیا ہے کہ ایسا واقعہ سفر جہاد میں ہوا تھا ورنہ تحقیق کا حکم حضر میں بھی ایسے ہی ہے جیسے سفر میں۔ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنی تھوڑی سے بکریوں کے پاس تھا، کچھ مسلمان وہاں سے گزرے، اس نے "السَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کہا لیکن مسلمانوں نے اسے قتل کر ڈالا اور اس کی بکریاں لے لیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری، جس میں ہے تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تم دنیا کا سامان چاہتے ہو؟" اس سے مراد وہ تھوڑی سی بکریاں ہیں فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ "، کیونکہ اللہ کے پاس مال غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں۔۔[بخاری، التفسیر، سورۃ النساء: 4591] ایک روایت کے مطابق اس آیتِ مبارکہ کا شانِ نزول کچھ اس طرح ہے کہ مِرْدَاس بن نہیک جو فدک کے رہنے والے تھے اور اُن کے سوا اُن کی قوم کا کوئی شخص اسلام نہ لایا تھا، اس قوم کو خبر ملی کہ لشکرِ اسلام ان کی طرف آرہا ہے تو قوم کے سب لوگ بھاگ گئے مگر مِرْدَاس ٹھہرے رہے۔ جب انہوں نے دور سے لشکر کو دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں کوئی غیر مسلم جماعت نہ ہو یہ پہاڑ کی چوٹی پر اپنی بکریاں لے کر چڑھ گئے۔ جب لشکر آیا اور انہوں نے اَللّٰهُ اَكْبَر کے نعروں کی آوازیں سنیں تو یہ خود بھی تکبیر پڑھتے ہوئے اتر آئے اور کہنے لگے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، السّلام علیکم۔ مسلمانوں نے خیال کیا کہ اہلِ فدک تو سب کافر ہیں یہ شخص دھوکہ دینے کے لیے ایمان کا اظہار کر رہا ہے۔ اس خیال سے حضرت اُسامہ بن زید رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے ان کو قتل کر دیا اور بکریاں لے آئے۔ جب تاجدارِ مدینہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے

حضور میں حاضر ہو کر تمام ماجرا عرض کیا تو حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو نہایت رنج ہوا اور فرمایا تم نے اس کے سامان کے سبب اس کو قتل کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضور سیدُ المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے حضرت اسامہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو حکم دیا کہ مقتول کی بکریاں اس کے اہلِ خانہ کو واپس کر دو۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۹۴، ۱/ ۴۱۷)

یہ روایت الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ بخاری اور دیگر کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔ یہاں اسی کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! جب تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلو تو خوب تحقیق کر لیا کرو اور جو تمہیں سلام کرے یا جس میں اسلام کی علامت و نشانی پاؤ تو اس سے ہاتھ روک لو اور جب تک اس کا کفر ثابت نہ ہو جائے اس پر ہاتھ نہ ڈالو اور اسے یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔ ابو داؤد اور ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی رحمت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ جب کوئی لشکر روانہ فرماتے تو حکم دیتے کہ اگر تم کوئی مسجد دیکھو یا اذان سنو تو قتل نہ کرنا۔ (ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین، ۳ / ۶۰، الحدیث: ۲۶۳۵، ترمذی، کتاب السیر، ۲- باب، ۳ / ۱۹۴، الحدیث: ۱۵۵۴) حاصل سب کا یہی ہے کہ دورانِ سفر بعض لوگوں نے صحابہ کو سلام کیا، صحابہ کو خیال ہوا کہ شاید جان بچانے کے لئے سلام کر رہا ہے؛ چنانچہ قتل کر دیا، اس پر مؤاخذہ تو نہ ہوا؛ البتہ چوں کہ صحابہ علیہم الرضوان پہلے سے اس تفصیل سے واقف نہ تھے، اس لئے تنبیہ پر اکتفا فرمایا گیا۔

تحقیق کی اہمیت قرآن کی نظر میں

فرمایا: كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر اللہ نے تم پر فضل کیا۔ لہٰذا تحقیق سے کام لو، بیشک جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب سے پوری طرح باخبر ہے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا اپنا طریق کار بھی یہ تھا کہ جب دشمن پر حملہ مطلوب ہوتا تو آپ رات کو طلوع فجر تک انتظار فرماتے اگر اس بستی سے اذان فجر کی آواز آجاتی تو سمجھتے کہ یہاں کچھ مسلمان بھی موجود ہیں۔ لہٰذا حملہ کا ارادہ ترک کر دیتے اور اگر وہاں سے شعائرِ اسلام کی کوئی نشانی نہ ملتی تو حملہ کا حکم دے دیتے۔ بہر حال قانون یہی ہے کہ کوئی مسلمان

کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہ مارا جائے۔ فرمایا پہلے تم بھی ایسے ہی تھے فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ پھر اللہ نے تم پر احسان فرمایا، تم مسلمان ہو گئے فَتَبَیَّنُوْا اب لازم ہے کہ تحقیق کر لیا کرو۔

اس آیت میں بڑی سختی سے حکم دیا گیا ہے کہ بغیر تحقیق کے فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ ابتدائے اسلام میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا لفظ مسلمانوں کے لیے شعار اور فریقین کے مسلمان ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس دور میں عرب کے نو مسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان یا کسی دوسری چیز میں نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی بنا پر ایک مسلمان سرسری طور پر دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو لیکن کافروں سے لڑائی کے دوران یہ پیچیدگی پیش آجاتی کہ جس قوم پر مسلمان حملہ آور ہوتے ان میں سے کوئی شخص اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یا لا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کہنے لگتا جس سے مسلمانوں کو یہ مغالطہ ہوتا کہ وہ حقیقتاً مسلمان نہیں بلکہ محض اپنی جان بچانے کے لیے یہ کلمہ زبان سے ادا کر رہا ہے تو وہ اپنے اسی گمان کی بنا پر اسے قتل کر دیتے اور اس کا مال لوٹ لیتے۔ اس لئے فرمایا یہ سمجھ کر اس کو قتل مت کرو کہ یہ اصل میں مسلمان نہیں۔ بلکہ اس وقت اپنی جان اور مال بچانے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے۔ بلکہ اس کی بات پر یقین کرو اور اس کو ہرگز قتل نہ کرو اور نہ ہی اس کا مال غنیمت میں رکھ لو اگر کوئی کافر جھوٹ بول کر جان بچا لیتا ہے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم کسی مسلمان کو صرف شک کی بنا پر قتل کر ڈالو، پھر فرمایا کہ اللہ رب العزت کا احسان ہے کہ آج تم مسلمانوں کی ایک جماعت کی شکل میں زندگی گزار رہے ہو ورنہ وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے کہ تم مختلف قبیلوں میں منتشر تھے اور تم اپنے بچاؤ کے لیے اپنے اسلام کو چھپاتے تھے ویسے بھی زبانی اقرار کے سوا تمہارے پاس مسلمان ہونے کا کوئی ثبوت نہ تھا، پھر تاکید کی جا رہی ہے کہ دیکھو تحقیق کے چکر میں مت پڑو دلوں کے بھید تو اللہ رب العزت ہی جانتا ہے کیونکہ وہ تو نیت اور ارادے تک کو جانتا ہے۔ تم لوگ دوسروں کے دعویٰ اسلام پر یقین کرو اور مسلمان بھائی کے ساتھ پوری رعایت، خلوص اور مہربانی سے پیش آؤ۔ دوسروں کے لیے نیک گمان رکھنے کی فضیلت اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضور ﷺ نے اسے "عبادت" فرمایا ہے حسن ظن بہت سی روحانی بیماریوں کا علاج ہے، جبکہ بدگمان شخص کو دوسروں کا حسن سلوک

بھی منافقت بن کر نظر آتا ہے۔

قاعدین (بیٹھنے والوں) اور مجاہدین (جہاد کرنے والوں) کا تقابل

لَا يَسْتَوِي	نہیں برابر ہو سکتے	الْقٰعِدُوْنَ	(وہ جو ہیں) بیٹھ رہنے والے
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں میں سے	غَيْرُ	نہیں ہیں وہ
أُولِي الضَّرَرِ	تکلیف (عذر رکھنے) والے	وَالْمُجٰهِدُوْنَ	اور جو جہاد کرنے والے ہیں
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کے راستے میں	بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ	اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ
فَضَّلَ اللّٰهُ	اللہ نے فضیلت دی	الْمُجٰهِدِيْنَ	جہاد کرنے والوں کو
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ	اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ	عَلَى الْقٰعِدِيْنَ	بیٹھ رہنے والوں پر
دَرَجَةً	مرتبے میں	وَكُلًّا	اور سب سے
وَّعَدَ اللّٰهُ	اللہ نے وعدہ کیا ہے	الْحُسْنٰى	بھلائی (جنت) کا
وَفَضَّلَ اللّٰهُ	اور اللہ نے فضیلت دی ہے	الْمُجٰهِدِيْنَ	مجاہدین کو
عَلَى الْقٰعِدِيْنَ	بیٹھ رہنے والوں پر	أَجْرًا عَظِيْمًا ⑮	بلحاظِ اجرِ عظیم کے

قاعدین (بیٹھنے والے) اور مجاہدین (جہاد کرنے والے) دو اہم قرآنی اصطلاحات ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بیٹھ رہنے والے مومن جن کو کوئی عذر نہیں اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے مجاہد برابر نہیں ہیں اور مجاہدین بھی ایسے جو جہاد کرتے ہیں۔ قاعدین قعود سے نکلا ہے، جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی عذر یا بغیر عذر کے جہاد میں شامل نہیں ہوئے اور گھروں میں بیٹھے رہے۔ مجاہدین جہاد سے نکلا ہے، جس کے معنی کوشش اور جدوجہد کے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑتے ہیں۔ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یعنی جب اللہ کے راستے میں نکلتے ہیں تو پھر اپنا مال اور جان دونوں اٹاثے اللہ کی راہ میں پیش کر دیتے ہیں۔ مال" سے جہاد اللہ کی راہ میں مال کی قربانی ہے اور

''جان'' سے جہاد اللہ کے راستہ میں جان وتن کے ذریعہ کوششیں ہیں، جس کی ایک صورت قتال بھی ہے، علم دین کے حصول، نیکی کی دعوت اور برائی سے روکنے کی کوشش ''جہاد بالنفس'' میں داخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ روافض کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں؛ کیوں کہ انھوں نے بہ مقابلہ ان حضرات کے جہاد زیادہ کیا ہے، درست نہیں ہے؛ کیوں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دعوت پر جتنے لوگوں نے اور خاص کر روٴساء عرب نے اسلام قبول کیا، شاید ہی کسی اور صحابی کی دعوت پر اتنے اور ایسے لوگ مسلمان ہوئے ہوں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلام کو جو قوت وسربلندی حاصل ہوئی، وہ وضاحت کی محتاج نہیں، پھر اگر محض جہاد ہی معیار فضیلت ہو تو جہاد تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے بھی زیادہ جہاد کیا ہے تو کیا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم ﷺ سے بھی افضل ہیں؟

فرمایا فَضَّلَ اللّٰہُ الْمُجٰھِدِیْنَ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَۃً اللہ تعالیٰ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنیوالوں کو بیٹھنے والوں پر فضیلت بخشی ہے ایک درجہ کے اعتبار سے یعنی پیچھے رہنے والوں کو وہ درجہ کہاں حال ہوسکتا ہے جو مال وجان کی بازی لگانیوالوں کو اللہ کے ہاں حاصل ہے۔ البتہ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی اللہ نے سب کے ساتھ بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مقصد یہ کہ درجات میں تو دونوں گروہ برابر نہیں مگر بھلائی اور نیکی دونوں گروہوں کو حاصل ہوگی بشرطیکہ گھر بیٹھنے والے اسلام کے باقی احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ پر عمل پیرا ہوں۔ ان لوگوں کو بھی نجات نصیب ہوگی، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بھی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ تاہم وہ مجاہدین کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے کیونکہ انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنی سب سے قیمتی متاع بھی اللہ کے حضور پیش کر دی ہے۔

جہاد فرض کفایہ ہے

آیت کے اس حصہ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔ امام ابوبکر جصاص اور دیگر مفسرین کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم فرماتے ہیں کہ جہاد میں حصے لینے اور نہ لینے والوں سب کے ساتھ بھلائی کا وعدہ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد ہر کس وناکس کے لیے فرض عین نہیں ہے لہٰذا جماعت المسلمین میں سے کچھ لوگ جہاد میں حصہ لے لیں تو پوری

ملت اس فرض سے سبکدوش سمجھی جائے گی اور اگر کوئی شخص بھی یہ انتظام نہ کرے تو سارے کے سارے بستی والے گنہگار ہوں گے نماز جنازہ بھی فرضِ کفایہ ہے۔ البتہ بعض غیر معمولی حالات میں جہاد فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ اگر دشمن مسلمانوں کی جماعت پر حملہ کر دے، تو اس وقت ہر عاقل بالغ، مرد اور عورت پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ ملکی دفاع کے لیے ہر مسلمان کو اپنا حصہ ادا کرنا پڑیگا۔ اسی بنا پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے حالات میں عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر دشمن کے خلاف تدبیر کے لیے جاسکتی ہے۔ اسی طرح غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہوسکتا ہے۔ فرمایا وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو فضیلت بخشی ہے پیچھے بیٹھنے والوں پر اور اجرِ عظیم بھی۔ جہاد کے متعلق چند ضروری احکامات ان آیات میں بیان کئے گئے ہیں۔ بغیر کسی معذوری کے جہاد میں شریک نہ ہونے والے جہاد میں شریک ہونے والوں کے برابر نہیں ہوسکتے۔ مطلب یہ ہے کہ معذور قاعدین اندھے، لنگڑے، بیمار یا وہ لوگ جن کے پاس جہاد کے وسائل نہیں ہیں۔ قرآن نے انہیں ملامت سے مستثنیٰ کیا ہے۔ بغیر عذر کے قاعدین وہ صحت مند لوگ جو سستی یا دنیاوی مفاد کی وجہ سے پیچھے رہ گئے۔ اگرچہ بنیادی ایمان کی وجہ سے اللہ نے ان سے بھی بھلائی (جنت) کا وعدہ کیا ہے، لیکن وہ مجاہدین کے مرتبے کو نہیں پاسکتے۔ ویسے تو ہر نیک مسلمان کو جنت اور مغفرت اعمال کے حساب سے ضرور ملے گی مگر یہاں خاص طور پر جہاد کی درجہ بندی کی گئی ہے، ایک جہاد تو اسلام کے دشمنوں کے خلاف ملک کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے اور خاص لوگ اس کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، لیکن اگر ان کی طاقت کمزور پڑے اور مزید فوجی طاقت کی ضرورت پڑے تو پھر آس پاس کے مسلمانوں کا جہاد میں شامل ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا درجہ ہے، پھر اگر ان کی طاقت بھی کم پڑ جائے تو پھر مزید قریب تر لوگوں پر جہاد میں شامل ہونا ضروری ہو جاتا ہے یہ تیسرا درجہ ہے، پھر بھی اگر طاقت کم پڑ جائے تو پھر مشرق و مغرب کے ہر مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ جہاد میں شریک ہو یہ چوتھی صورت ہے، جہاد میں شریک ہونے کی ویسے تو انسان کی زندگی خود ایک

جہاد سے کم نہیں، عام طور پر انسان کی اجتماعی اور قومی ضرورتوں کو فرض کفایہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ فرض کفایہ کا مطلب ہے پوری جماعت میں سے کچھ لوگ اس فرض کے ادا کرنے میں شامل ہو جائیں تو پوری جماعت کی طرف سے فرض ادا ہو جاتا ہے اور اگر ایک فرد بھی شامل نہ ہو تو پھر پوری جماعت گناہ گار ہوگی۔ یہ اس لیے تاکہ تمام لوگ اپنے اپنے مستقل محاذ پر کام کر سکیں، یعنی کچھ لوگ جہاد میں شریک ہو کر اپنا کام کریں، کچھ تعلیم، رفاعی کام، سائنس، طب اور دوسری اسلامی اور انسانی ضروریات کو پورا کریں اور ان تمام کاموں کو جسمانی، مالی اور روحانی طریقہ سے جہاد ہی سمجھیں۔ یہ سب جہاد ہی ہیں مگر ان آیات میں بطور خاص جہاد سے مراد کفار و مشرکین سے قتال کرنا ہے۔ اللہ رب العزت نے ہر جہاد کا درجہ مقرر کر دیا ہے اور پھر فرمایا کہ ہر مجاہد کے لیے مہربانی، رحمت اور بخشش رکھ دی گئی ہے ہاں، اگر ان تمام فرائض کی ادائیگی میں اگر کبھی کوئی بھول چوک ہو جائے تو اللہ رب العزت کے خزانے رحمت اور بخشش سے بھرے پڑے ہیں اللہ غفور و رحیم ہے۔ اپنے بندوں سے بے حد پیار کرتا ہے۔ جو مال اور جان اللہ کے لیے قربان کرنے کے لیے تیار رہے اس پر اللہ رب العزت بہت مہربان رہتا ہے۔ مسلمان کا جہاد ہر وقت جاری رہتا ہے۔ قرآن، زبان، قلم، دل، مال اور جان سب کچھ اگر اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور بندوں کی بھلائی کے لیے استعمال کیے جائیں تو جہاد ہی جہاد ہے۔ جہاد کا مطلب ہے سچائی اور اسلام کی سربلندی کے لیے بھرپور کوشش اور محنت کرنا۔ اللہ بدلہ دینے والا ہے۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔

جنت میں سو درجے

دَرَجٰتٍ	(یعنی) درجے ہیں	مِّنْهُ	اس کی طرف سے
وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ	اور بخشش اور رحمت	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
غَفُوْرًا	بہت بخشنے والا	رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾	نہایت رحم کرنے والا

فرمایا دَرَجٰتٍ مِّنْهُ یہ درجے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے

والوں کے لیے تیار کیے ہیں، اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ (صحیح البخاری حدیث نمبر: 2790) یہ حدیث ہمیں اللہ کی رحمت، سخاوت اور اجر کی وسعت کا احساس دلاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جنت کے درجات کا ذکر اس لیے فرمایا تاکہ دلوں میں نیکی کی محبت اور بلند ہمت پیدا ہو۔ اس حدیث سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ: اللہ کے راستے میں کی گئی محنت ضائع نہیں ہوتی اخلاص کے ساتھ کیا گیا عمل اللہ کے ہاں بہت اونچا مقام پا سکتا ہے۔ فرمایا اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی وَمَغْفِرَۃٌ بخشش بھی ہے جو انہیں نصیب ہوگی۔ جہاد میں بعض کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔ کوئی مسلمان غلطی سے مارا جاتا ہے تو اس قسم کی لغزشوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی بخشش حاصل ہوگی وَرَحْمَۃً اور اللہ تعالیٰ مجاہدین کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے گا۔ اس کی مہربانی شامل حال ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت یہ ہے وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ وہ بخشنے والا ہے۔ انسان کا اعتقاد صحیح ہو، جذبہ اور طلب صادق ہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے۔ وہ ضرور معاف کر دے گا اور رحیم ہے، اس کی مہربانی بڑی وسیع ہے جب کوئی شخص اللہ کے دین، اس کی کتاب اور نبی کے مشن کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے مال و جان کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت جوش میں آ کر اس کی تمام کوتاہیاں معاف فرما دیتی ہے۔

جہاد ایک پُر اَمن، تعمیری، سماجی، اَخلاقی اور روحانی جدو جہد کا نام

حقیقت میں جہاد ایک ایسی پُر اَمن، تعمیری، سماجی، اَخلاقی اور روحانی جدو جہد کا نام ہے جو حق و صداقت اور اِنسانیت کی فلاح کے لیے انجام دی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر اِس جدو جہد کا جنگی معرکہ آرائی اور مسلح ٹکراؤ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جدو جہد اُصولی بنیادوں پر صرف ایسے ماحول کا تقاضا کرتی ہے جس میں ہر شخص کا ضمیر، زبان اور قلم اپنا پیغام دلوں تک پہنچانے میں آزاد ہو۔ معاشرے میں اَمن اَمان کا دور دورہ ہو۔ اِنسانی حقوق مکمل طور پر محفوظ ہوں۔ ظلم و اِستحصال اور جبر و اِستبداد کی کوئی گنجائش نہ ہو اور دنیا کے تمام ممالک پُر اَمن بقاے باہمی کے رشتے میں منسلک ہوں۔ لیکن جب اَمن دشمن طاقتیں علم و عقل کی رہنمائی سے محروم ہو کر مقابلہ پر آجائیں اور اِجتماعی

اَمن وسکون اور نظم ونسق کے خلاف تباہ کن سازشیں اور علی الاعلان جنگی تدابیر کرنے لگیں تو ایسے وقت میں جہاد کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اَمن وسلامتی اور اِنسانیت کے دشمنوں کے خلاف مسلح جدو جہد کی جائے تاکہ اَمن وآشتی کے ماحول کو بحال اور خیر وفلاح پر مبنی معاشرہ قائم کیا جاسکے۔ خدارا اے مسلمانو کیا اب بھی نہیں جاگو گے ذرا دیکھو فلسطینی مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے ہیں یہ کٹی پھٹی لاشیں یہ میرے بچوں اور بچیوں، بہنوں اور بیٹیوں کے بے گور وکفن لاشے کشمیر میں تڑپتے سسکتے مسلمان اے بے ضمیرو بے حمیت مسلم حکمرانو اور مسلمانو کب جاگو گے خواب غفلت سے، کب اٹھو گے؟ اے اللہ میں تیرا عاجز وکمزور بندہ اس کے علاوہ کیا کرسکتا ہوں میرے مولا میرے اختیار میں کچھ نہیں جو توفیق توں نے عطاء فرمائی تیری ہی توفیق سے اس بے ضمیر مردہ ضمیر قوم کو جھنجھوڑنا پیغام جہاں تک ممکن ہوسکا پہنچا دیا میرے کریم مالک تیرا عاجز گناہ گار بندہ تیری بارگاہ لم یزل میں التجا کرتا ہے میرے مالک ہمیں غیرت مند مسلم حکمران عطاء فرمادے صدقہ پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔

☆☆☆

ہجرت کے مقاصد اور ضرورت/
ہجرت، دینی ابتلا کے شکار مسلمان پر فرض

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ ط قَالُوْا کُنَّا
مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ط قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا
فِیْھَا ط فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰىھُمْ جَھَنَّمُ ط وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَا یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۹۸﴾
فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ ط وَکَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ یُّھَاجِرْ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰہِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَۃً ط وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِہٖ
مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ط وَکَانَ
اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۰۰﴾

دین کی خاطر ہجرت کا حکم

اِنَّ الَّذِیْنَ	تحقیق وہ لوگ کہ	تَوَفّٰىھُمُ	فوت کرتے ہیں انکو
الْمَلٰٓئِکَۃُ	فرشتے	ظَالِمِیْٓ	دراں حالیکہ وہ ظلم کرنیوالے ہیں

اَنْفُسِهِمْ	اپنی جانوں پر	قَالُوْا	(تو فرشتے) کہتے ہیں
فِيْمَ	کس (حال) میں	كُنْتُمْ	تھے تم
قَالُوْا	وہ کہتے ہیں	كُنَّا	ہم تھے
مُسْتَضْعَفِيْنَ	کمزور	فِي الْاَرْضِ	زمین میں
قَالُوْٓا	وہ (فرشتے) کہتے ہیں	اَلَمْ تَكُنْ	کیا نہ تھی
اَرْضُ اللّٰهِ	اللہ کی زمین	وَاسِعَةً	فراخ
فَتُهَاجِرُوْا	لہٰذا تم ہجرت کرتے	فِيْهَا	اس میں
فَاُولٰٓئِكَ	چنانچہ یہ لوگ	مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ	ان کا ٹھکانہ ہے جہنم
وَسَآءَتْ	اور بہت بُری ہے (وہ)	مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾	پھرنے کی جگہ

ان آیات میں جہاد کے ساتھ ساتھ ہجرت کی ضرورت اور اس کی فرضیت کا تذکرہ ہے۔ اور بوقت ضرورت ہجرت نہ کرنے والوں کی سزا کا بیان ہے جس طرح بعض حالات میں جہاد فرض کفایہ سے فرض عین بن جاتا ہے اسی طرح بعض اوقات ہجرت بھی فرض عین کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے جب کسی مقام میں کفار کو اس قدر غلبہ حاصل ہو جائے کہ مومن اپنے دین کے شعار پر عمل نہ کر سکے، تو مومن پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے گھر بار، کاروبار، وطن، عزیز و اقارب وغیرہ کو اللہ کی رضا کی خاطر چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے جہاں وہ دین کے احکام پر آسانی سے عمل پیرا ہو سکے۔

ہجرت نہ کرنے پر قرآن کی وعید

اسلام میں جب دین کی حفاظت اور احکامِ الٰہی پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے اور انسان کے پاس ہجرت کی استطاعت بھی ہو، تو ہجرت فرض ہو جاتی ہے، اور اس فریضے میں بلا عذر کوتاہی کرنے پر قرآن کریم میں سخت ترین سزا اور وعید آئی ہے یعنی جب ہجرت فرض ہو جاتی ہے تو پھر صاحب استطاعت کو دار الکفر میں ٹھہرے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی اور اگر وہ جان بوجھ کر بلا عذر ہجرت نہیں کرتا تو جہنم کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں سخت وعید فرمائی ہے۔ البتہ بعض کمزور طبقوں کو ہجرت

سے اس بناء پر مستثناء قرار دیا گیا ہے۔ کہ سفر ہجرت ان کے بس میں نہیں ہوتا بعض جسمانی طور پر اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ سواری پر بھی سفر نہیں کر سکتے۔ بعض کے پاس زاد راہ نہیں ہوتا اور بعض راستے سے ناواقف ہوتے ہیں اور اس معاملہ میں انہیں کسی کا تعاون بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ معذور سمجھے جاتے ہیں اور عنداللہ ماخوذ نہیں ہوتے بہر حال بلا عذر ہجرت سے گریز کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ بیشک وہ لوگ جن کی جان فرشتے نکالتے ہیں ان حالات میں ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ کہ وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوں تَوَفّٰی کا معنی کسی چیز کو پورے طریقے سے قبض کر لینا ہوتا ہے۔ یہ لفظ موت پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کے بعض دیگر معانی بھی ہیں۔ اپنی جانوں پر ظلم کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ہجرت فرض ہو چکی تھی۔ مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے عاید کردہ فرائض مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ادا نہیں کرتا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ اسی طرح ہجرت بھی فرض تھی مگر اس فرض کو انجام نہ دینے والا ظالموں کی فہرست میں آ گیا۔ تو فرمایا اس قسم کے مجرم لوگوں کی جب فرشتے روح قبض کرتے ہیں قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ تو ان سے کہتے ہیں، تم کس حال میں تھے۔ تم پر ہجرت فرض ہو چکی تھی، مگر تم نے دارالکفر کو کیوں نہ چھوڑا۔ تو وہ لوگ جواب دیتے ہیں قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ہم زمین میں کمزور خیال کیے جاتے تھے۔ فرشتے پھر سوال کرتے ہیں قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہ درست ہے کہ تم کفار کے مقابلے میں کمزور تھے مگر کیا چلنے پھرنے سے بھی معذور تھے۔ تم میں اتنی ہمت تو تھی کہ اس مقام سے چلے جاتے، پھر تم نے اللہ کے حکم کے مطابق ہجرت کیوں نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۹۷﴾ اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت بُری جگہ ہے غرضیکہ فرض عین کے ہر تارک کے لیے یہی حکم ہے۔ واضح رہے کہ اگر کسی خطے/علاقہ/ملک میں وہاں کے مسلمانوں کے لیے وہاں کے ظالم و جابر حکمران اور رعایا کی وجہ سے دین پر عمل کرنا مشکل ہو جائے اور احکام شرعیہ آزادی کے

ساتھ نہ کیے جاسکتے ہوں، تو جو مسلمان سفر کرنے پر قادر ہوں، ان کے لیے ترکِ وطن کر کے کسی اسلامی مملکت میں چلے جانا ضروری ہے، البتہ جس کسی کو سفر پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہو، جہاں آسانی سے دین پر عمل کر سکے تو وہ شخص معذور ہے۔

معذور افراد کا استثناء

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ	مگر (وہ) جو کمزور ہیں	مِنَ الرِّجَالِ	مردوں سے
وَالنِّسَآءِ	اور عورتوں (سے)	وَالْوِلْدَانِ	اور بچوں (سے)
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	نہیں (اختیار) کر سکتے وہ	حِيْلَةً	کوئی تدبیر
وَّلَا يَهْتَدُوْنَ	اور نہ وہ پاتے ہیں	سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾	کوئی راہ

اللہ تعالیٰ نے ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس سزا سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جو واقعی بے بس ہیں، کوئی تدبیر نہیں جانتے یا سفر کی طاقت نہیں رکھتے۔ امید ہے کہ اللہ ایسے معذوروں کو معاف فرما دے گا۔ فرمایا اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے کمزور طبقہ، بعض اتنے معمر ہوتے ہیں کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتے ہیں اور بعض عورتوں بچوں کے ساتھ جانے والا کوئی نہیں ہوتا یا راستے کا علم نہیں ہوتا فرمایا: لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً ایسے کمزور لوگ ہجرت کر جانے کی کوئی تدبیر نہیں پاتے۔ ان کے پاس ہجرت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾ انہیں راستے کا علم بھی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اللہ کے ہاں معذور تصور ہوں گے اور ان پر ہجرت نہ کرنے کی صورت میں کوئی گناہ نہیں ہوگا البتہ استطاعت رکھنے کے باوجود ہجرت سے گریز کرنے والا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

حقیقی مجبوری اور عذر کی قبولیت

فَاُولٰٓئِكَ	پس یہ لوگ	عَسَى اللّٰهُ	امید ہے اللہ
اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ	یہ کہ معاف فرما دے انہیں	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ

عَفُوًّا	نہایت معاف کرنے والا	غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾	بہت بخشنے والا

ان معذور اور کمزور لوگوں کے متعلق فرمایا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ امید ہے کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا کیونکہ وہ مجبور ہیں۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا اور بہت زیادہ بخشش کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی انسان سچے دل سے دین پر عمل کرنا چاہتا ہو لیکن حالات یا جسمانی کمزوری اس کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں، تو اللہ تعالیٰ اس کی مجبوری کو قبول فرماتا ہے اور اس پر گرفت نہیں کرتا۔

لفظ عَسٰی (قریب ہے/ امید ہے) کی حکمت

مفسرین (جیسے ابن کثیر اور دیگر) لکھتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں جہاں "عسیٰ" کا لفظ آئے وہ محض "شک یا شاید" کے لیے نہیں بلکہ یقینی وعدے کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں اس لفظ کے استعمال کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان اپنی مجبوری کے باوجود بالکل بے فکر نہ ہو جائے، بلکہ اس کے دل میں خوف اور رجا (امید) کی کیفیت برقرار رہے اور وہ حالات سازگار ہوتے ہی حکمِ الٰہی پر عمل کی کوشش کرے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو عظیم صفات "عَفُوٌّ" (بہت معاف کرنے والا) اور "غَفُوْرٌ" (بڑا بخشنے والا) کا ذکر فرمایا ہے۔ "عفو" کا مطلب ہے گناہ کو اس طرح مٹا دینا کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہے، اور "غفور" کا مطلب ہے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ سچے معذورین اللہ کی رحمت اور مغفرت کے سائے میں ہیں ہمارے لیے عملی سبق اللہ تعالیٰ انسان کی ظاہری حالت کے ساتھ اس کی نیت اور صلاحیت کو دیکھتا ہے۔ اگر نیت سچی ہو تو وہ تھوڑی کوشش پر بھی بڑا اجر دیتا ہے۔ اسلام ایک دین فطرت ہے، اس میں کسی پر اس کی بساط سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔ جہاں واقعی مجبوری ہو، وہاں احکام میں نرمی اور معافی پیدا ہو جاتی ہے

اسلام میں ہجرت کا مقام و مرتبہ اور برکات

وَمَنْ يُّهَاجِرْ	اور جو شخص ہجرت کرے	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کے راستے میں

یَجِدْ	وہ پائے گا	فِی الْاَرْضِ	زمین میں
مُرٰغَمًا کَثِیْرًا	جگہ بہت	وَّسَعَۃً	اور فراوانی
وَمَنْ یَّخْرُجْ	اور جو کوئی نکلے	مِنْۢ بَیْتِہٖ	اپنے گھر سے
مُھَاجِرًا	ہجرت کرتے ہوئے	اِلَی اللّٰہِ	اللہ کی طرف
وَرَسُوْلِہٖ	اور اسکے رسول (کی طرف)	ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ	پھر آپکڑے اسکو موت
فَقَدْ وَقَعَ	پس تحقیق ثابت ہوگیا	اَجْرُہٗ	اس کا اجر
عَلَی اللّٰہِ	اللہ پر	وَکَانَ اللّٰہُ	اور ہے اللہ
غَفُوْرًا	بہت بخشنے والا	رَّحِیْمًا ﴿۱۰۰﴾	نہایت رحم کرنے والا

فرمایا وَمَنْ یَّخْرُجْ مُھَاجِرًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جو شخص اللہ کے راستے میں ہجرت کرے یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وہ زمین میں بہت جگہ پائے گا مُرٰغَمًا اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی بھاگ کر چلا جائے اور رغام مٹی کو بھی کہتے ہیں اور رغم کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے مخالف کی ناک پر مٹی مل کر چلا جائے بہر حال مراغم کا معنی جائے ہجرت ہے کہ جو شخص ہجرت کے ارادے سے نکلے گا وہ ضرور مناسب جگہ تلاش کرلے گا۔ اس کے علاوہ وَّسَعَۃً اسے وسعت بھی میسر آجائے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں کشادگی پیدا فرمادیں گے، گویا اللہ تعالیٰ ہجرت کے نتیجہ میں ممکنہ تکالیف کو دور فرمادیگا۔ ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اِنَّ شَاْنَ الْھِجْرَۃِ شَدِیْدٌ جب آدمی اپنا کاروبار، زمین، مکان وغیرہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو بعض اوقات نئی جگہ پر اسے آب وہوا موافق نہیں آتی اور انسان طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ مکہ سے مدینے جانے والے بہت سے مہاجرین بخار میں مبتلا ہوگئے تھے۔ بعض اوقات غذا موافق نہیں آتی، زبان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور دیگر کئی قسم کی پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اس لیے ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے۔ مگر اس کا اجر بھی بہت بڑا ہے۔

ہجرت کے اہم مقاصد

ہجرت دو مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ایسے دارالکفر میں ہیں جہاں وہ دین کے شعار پورے نہیں کر سکتے، اس لیے انہیں ایسی جگہ پر ہجرت کرنا فرض عین ہو جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی مرکزی قوت موجود ہو اور وہ اپنے دینی فرائض آزادی کے ساتھ پورے کر سکیں۔ حضور ﷺ کے مدینہ طیبہ پہنچنے پر وہاں مرکزی قوت میسر آ گئی تھی وہ دارالہجرت قرار پایا۔ چنانچہ اس دور میں مسلمانوں کا مرکزی مقام پر پہنچنا ضروری ہو گیا تھا۔ اسی مشن کے تحت صحابہ کرام علیہم الرضوان اور خود حضور ﷺ نے بھی ہجرت کی۔ اس سے پہلے جدالانبیاء حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی عراق سے ہجرت کی تھی۔ اسی طرح مکہ میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے جان چھڑا کر عبادتِ الٰہی کو آزادانہ طور پر قائم کرنا۔ اور مدینہ منورہ میں سازگار ماحول فراہم کر کے دین اسلام کو پھیلانا اور مستحکم کرنا۔ اور ایک ایسی ریاست کا قیام جہاں عدل و انصاف، بھائی چارہ اور باہمی تعاون کا نظام نافذ ہو۔ اللہ کی راہ میں قربانی وطن، مال اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر صرف حکمِ خداوندی کی تعمیل کرنا۔ اگر کسی مقام پر اسلام کی مرکزی قوت ضائع ہو جائے تو اس کی بحالی کے لیے بھی ہجرت ناگزیر ہو جاتی ہے، یہ ہجرت کا دوسرا مقصد ہے۔ قریبی زمانہ میں اس کی مثال حضرت سید احمد بریلوی رحمہ اللہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی ہجرت ہے۔ یہ بزرگ دہلی سے ہجرت کر کے سرحد پہنچے تاکہ وہاں مرکز اسلام قائم کر کے ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کر سکیں۔ انہوں نے ہجرت کے لیے بڑا طویل اور کٹھن راستہ اختیار کیا۔ رائے بریلی سے دہلی پہنچے وہاں سے کلکتہ، پھر مدراس اور پھر سندھ سے ہوتے ہوئے قندھار گئے، قندھار سے پشاور آئے اور اس طرح انہوں نے تقریباً اڑھائی تین ہزار میل کا سفر طے کیا، یہاں سے وہ کشمیر جا کر اسے مرکز بنانا چاہتے تھے مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ انہوں نے چار سال تک انتھک جدوجہد کی مگر مسلمانوں کی بدبختی اور ان کی نالائقی اور جاسوسی کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے اور جام شہادت نوش فرما گئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے زمانے میں جب انگریز نے ہندوستان میں غلبہ حاصل کر لیا تو شاہ صاحب

نے اپنے فتویٰ کے ذریعے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا تھا۔ بہرحال یہ وہ مقاصد ہیں جن کے حصول کے لیے ہجرت ضروری ہوجاتی ہے۔

قرآن کریم میں مہاجرین کا ثواب

آیت کے اگلے حصے میں مہاجر کی فضیلت اور اس کے لیے اجروثواب کا ذکر ہے۔ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف اپنے گھر سے مہاجرین کر نکلا ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ پھر راستے میں اس کو موت نے پالیا فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ پس اس کا اجر اللہ پر واقع ہوگیا۔ یعنی مہاجر گھر سے چل کر اگر جائے ہجرت پر نہ بھی پہنچ سکے تو اسے ہر ہجرت کا ثواب حاصل ہوجائے گا۔ مکی دور میں جب ہجرت کا اعلان ہوا تو ایک ضعیف اور بیمار شخص بھی ہجرت کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ خود تو چل پھر نہیں سکتا تھا، اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ مجھے کسی طرح یہاں سے نکال کر لے چلو۔ انہوں نے ہر چند کہا کہ تم سفر کے قابل نہیں ہو، لہٰذا تم ہجرت سے مستثنیٰ ہو، مگر بوڑھا بضد تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ضرور ہجرت کریگا۔ بالآخر اس کے بیٹے اسے اٹھا کر چل پڑے۔ ابھی مکہ سے چند میل دور تنعیم کے مقام پر آئے تھے کہ بوڑھے کا انتقال ہوگیا۔ کافروں نے خوب تمسخر اڑایا مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی کہ جو کوئی ہجرت کے لیے چل نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے، تو اس کا اجروثواب اللہ پر واقع ہوگیا۔ یعنی خداوند کریم اسے ہجرت کا پورا پورا بدلہ عطا فرمادیں گے۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ ہجرت کے ثواب کا حقدار وہی شخص ہے، جو خالص نیت سے اللہ کی رضا، اس کے رسول کے اتباع اور دین کی بلندی کے لیے ہجرت کرتا ہے جو شخص کسی دیگر نیت سے ہجرت کریگا، اللہ تعالیٰ اس کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کریگا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ مکہ سے ایک شخص عورت کی خاطر ہجرت کرکے گیا، حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص دنیا یا عورت کی خاطر ہجرت کرکے جائے گا اسے وہی کچھ ملیگا۔ وہ آخرت میں اجروثواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

وسیع معنوں میں ہجرت کے مختلف پہلو

وسیع معنوں میں ہجرت کا مطلب ہے" ہر اس حالت، جگہ یا سوچ کو چھوڑ دینا جو انسانی ترقی، امن اور رضائے الٰہی کی راہ میں رکاوٹ ہو، اور ایک بہتر، پاکیزہ اور بامقصد زندگی کی طرف قدم بڑھانا۔ مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر مقدس سفر کا حکم ہجرت کے سفر کا ہی ہے جو شخص خالص نیت سے حج کے سفر پر روانہ ہوتا ہے، جہاد کے لیے نکلتا ہے یا دین کی تعلیم کی خاطر گھر سے چلتا ہے، پھر راستے میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ واقع ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہجرت بعض دیگر وجوہات سے بھی فرض ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان کسی مقام میں گناہ میں مبتلا ہے اور اس سے بچ نہیں سکتا۔ تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ جائے تا کہ وہ گناہ سے بچ جائے یا کسی جگہ مسلمان کو رزق حلال نصیب نہیں، وہ ایسی جگہ پھنسا ہوا ہے۔ جہاں اسے سو فیصدی حرام رزق حاصل ہوتا ہے تو ایسے شخص کے لیے بھی ہجرت فرض ہو جاتی ہے آپ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دنیاوی اشغال میں اس قدر منہمک ہو کہ خدا کی طرف توجہ دینا نصیب نہیں ہوتا، تو اسے چاہئے کہ مسجد میں اعتکاف بیٹھے تا کہ اپنے رب سے تعلق پیدا کر سکے۔

بہر حال فرمایا جو کوئی شخص اپنے گھر سے ہجرت کے لیے نکلے گا تا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف جائے اور پھر اسے راستے میں موت آجائے گی تو اسے اللہ تعالیٰ ہجرت کا پورا ثواب عطا کریں گے وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر خاص مہربانی فرمائے گا۔

☆☆☆

سفر کے احکام ومسائل قرآن وسنت کی روشنی میں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ⑩۱

سفر میں قصر صلوٰۃ کی مشروعیت

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ	اور جب تم سفر کرو	فِی الْاَرْضِ	زمین میں
فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ	تو نہیں تم پر	جُنَاحٌ	کوئی گناہ
اَنْ تَقْصُرُوْا	یہ کہ تم قصر کرو	مِنَ الصَّلٰوۃِ	نماز
اِنْ خِفْتُمْ	اگر تم ڈرو	اَنْ	اس بات سے کہ
یَّفْتِنَکُمُ	تمہیں فتنے میں ڈال دیں گے	الَّذِیْنَ	وہ لوگ جنہوں نے
کَفَرُوْا	کفر کیا	اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ	یقیناً کافر
کَانُوْا لَکُمْ	ہیں تمہارے	عَدُوًّا مُّبِیْنًا ⑩۱	دشمن ظاہر

سفر انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے، جس کے بغیر کوئی بھی اہم مقصد حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ انسان متعدد مقاصد کے تحت سفر کرتا ہے اور دنیا میں گھوم پھر کر اپنے مطلوبہ فوائد حاصل کرتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے جس نے ان انسانی ضرورتوں اور سفر کی مشقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے

بعض رخصتیں اور گنجائشیں دی ہیں ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ جب تم زمین میں سفر کرو فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں سے کچھ کم کر دو۔ اس کمی سے مراد تعداد رکعت کی کمی ہے نہ کہ کسی ایک رکعت میں مطلوبہ قرأت میں کمی۔ اس طرح چار رکعت والی نماز کی صرف دو رکعت ادا کی جائیں گی۔ سفر ایک دشوار چیز ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے یعنی سفر عذاب کا ٹکڑا ہے، جو تمہاری نیند میں بھی خلل کا باعث بنتا ہے۔ دورانِ سفر انسان آرام و راحت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کھانے پینے کا نظام متاثر ہوتا ہے، گھر بار سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ تم میں جب کوئی سفر کرتا ہے تو کسی ضرورت کے تحت ہی کرتا ہے، لہٰذا جب ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً اپنے گھر کی طرف واپس آجانا چاہیئے۔ سفر بہر حال کلفت کا باعث ہے۔ سفر کی حالت میں بعض شرعی احکام بدل جاتے ہیں اور مسافر کو بعض رعائتیں حاصل ہو جاتی ہیں مثلاً روزہ افطار کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور چار رکعت والی نماز نصف رہ جاتی ہے۔ سفر میں قصر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے جس مدت سفر کو سفر قرار دیا ہے۔ اس مسافت اور مدت میں چار رکعتوں والی نمازوں یعنی ظہر، عصر، عشا، کو دو رکعتوں میں پڑھنا قصر کہلاتا ہے۔ خواہ سفر میں امن ہو یا خوف، نماز قصر ہی میں پڑھی جائے گی۔ البتہ دو یا تین رکعت والی نماز پوری پڑھی جاتی ہے کیونکہ تین کا نصف ڈیڑھ ہے اور ڈیڑھ رکعت کی کوئی نماز نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ تاہم ظہر، عصر اور عشاء کی نمازوں میں دو رکعت کی تخفیف ہو جاتی ہے۔ ان میں قصر کرنے کا حکم ہے۔

شریعت میں شرعی سفر کی مقدار/معیار سفر اشکال اور اس کا جواب

اللہ تعالیٰ نے سفر کی وجہ سے کچھ سہولتیں اور رعایتیں رکھی ہیں، مثلاً: نماز میں قصر اور رمضان میں روزے کو قضاء کرنے کی گنجائش وغیرہ اس کی بھی علت "سفر کی مشقت" ہے، لیکن سفر جو کہ اس کا سبب ہے، حکم کا مدار اس پر ہے، لہٰذا جب بھی سفر شرعی پایا جائے گا، سفر کی سہولتیں مسافر کو دی جائیں گی، چاہے اس سفر میں مسافر کو مشقت کا سامنا ہو یا نہ ہو، لہٰذا موجودہ دور میں نقل و حمل کے ذرائع اگرچہ

آرام دہ ہونے کی وجہ سے مشقت نہ ہو، تب بھی سفر کی سہولتیں ملیں گی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر مسافت شرعی کا سفر ہو تو چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی، مسافت شرعی سے مراد قدیم پیمائش میں 'چار برید' ہے جیسا کہ روایات میں آیا ہے، (بخاری تعلیقاً، باب کم یقصر الصلوٰۃ؟) یہ چار برید ۴۸ میل شرعی اور موجودہ مروجہ پیمائش میں مشہور قول کے مطابق تقریباً وہ سفر ہے جس کی مسافت کم از کم 77.25 کلو میٹر (یا تقریباً 92 کلو میٹر احتیاطاً فقہاء کی مختلف آراء کے مطابق) ہو اور انسان اپنے شہر یا بستی کی آبادی سے باہر نکل جائے۔

موجودہ دور میں سفری سہولیات زیادہ ہونے کی وجہ سے ذہن میں سوال آسکتا ہے، کیا اب بھی سفر کا تعین اسی مسافت سے کیا جانا ضروری ہے، جبکہ جہاز اور تیز ترین سواریاں موجود ہیں؟ کیا صورتحال تبدیل ہونے سے مسائل کی نوعیت بدلی نہیں جاسکتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ 1) احادیث میں جو سفر کی مسافت بیان کی گئی ہے، وہ اس زمانے کے وسائل سفر کو سامنے رکھتے ہوئے بیان کی گئی ہے (جبکہ تیز رفتار سواریاں نہیں تھیں اور مسافت کی پیمائش کے موجودہ زمانے کی طرح باریک سے باریک معیارات بھی نہیں تھے) وہ یہ کہ سفر میں اگر اتنا دور جانا ہو کہ منزل تک پہنچنے میں پیدل متوسط رفتار سے راستوں میں آرام کرتے ہوئے دن کو چلا جائے تو تین دن لگ جائیں۔ اس کو بنیاد بنا کر فقہاء نے آسانی کے لیے ہر زمانے اور ہر علاقے کے رائج پیمائش کے معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے تین دن کی مسافت کی تحدید کی ہے، چنانچہ ہمارے زمانے میں رائج معیار پیمائش کے اعتبار سے سفر شرعی کی مسافت سوا ستتر کلو میٹر طے کی ہے۔ 2) اگرچہ ذرائع نقل وحمل تیز ترین ایجاد ہو چکے ہیں، جن کی بدولت مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو رہا ہے اور پہلے جیسی مشقت بھی نہیں رہی، لیکن چونکہ سفر کے بارے میں شریعت نے جو آسانیاں رکھی ہیں، آج بھی انسان ان کا محتاج ہے، صرف اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ وسائل سفر تیز ہو گئے ہیں، وہ آسانیاں ختم کر دی جائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا بارہا ہوا ہے کہ انہی تیز رفتار سواریوں میں کوئی خرابی آگئی، موسم موافق نہ ہوا اور سفر کا دورانیہ طویل ہو گیا۔ مثلاً: کسی مسافر نے روزہ رکھ لیا، جبکہ اس کو سفر میں روزہ چھوڑنے کی گنجائش تھی

اور پھر ریل بیچ جنگل میں خراب ہوگئی یا فلائٹ میں آٹھ دس گھنٹے کی تاخیر ہوگئی، ایسی صورت میں مسافر کو ایک تو اپنے روزے کی مشقت اور اوپر سے ریل کی خرابی کی وجہ سے یا جہاز کی تاخیر کی وجہ سے سفر طویل ہونے کی مشقت، یہ دونوں مل کر اس کی پریشانی میں اضافہ کریں گے، لہٰذا اب بھی وہ پہلے زمانے جیسی مشقت پیش آسکتی ہے، اس لیے ہم سفر کی رخصتوں کو ختم نہیں کر سکتے ہیں۔

3) عورت کے بغیر محرم سفر کرنے میں اصل علت "فتنہ" ہے اور سفر اس کا سبب ہے، لہٰذا مسافت شرعی کے بقدر سفر میں خواہ فتنے کا اندیشہ ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ سفر حج وعمرے کا سفر ہی کیوں نہ ہو، جائز نہیں ہے اور آج کل کے زمانے میں فتنے کے اسباب بہت زیادہ ہیں، آئے روز ایسے واقعات رپورٹ ہو رہے ہیں کہ عورت کے دوران سفر اجنبی مرد سے رابطہ ہوا اور بات بڑھتے بڑھتے عزت و عصمت داغ دار کر بیٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عورت پر حج فرض ہو جائے اور اس کے ساتھ جانے کے لیے کوئی محرم سفر کے شروع میں ساتھ نہ ہو تو فقہاء نے اس کے لیے حج ادا کرنے کو فرض قرار نہیں دیا، جب تک اپنے محرم کا انتظام نہیں کر لیتی، چاہے اسے محرم کا خرچ خود برداشت کرنا پڑے اور یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی محرم نہیں مل رہا اور وہ عورت غیر شادی شدہ ہے تو کسی مرد سے نکاح کر لے اور پھر حج پر اس کے ساتھ جائے، اس لیے کہ پردے کے احکام میں شریعت نے عورت کی عفت کی حفاظت کے لیے بہت احتیاط کرنے کا حکم دیا ہے۔ 4) اس کے علاوہ اگر ہم معیار کلو میٹر کو نہ بنائیں، بلکہ جہاز کی رفتار کو بنائیں تو کبھی بھی ہم کسی معیار کو مقرر نہیں کر سکتے، کیونکہ آج سے تیس سال پہلے کے جہازوں کی رفتار 300 کلو میٹر فی گھنٹہ تھی، اب تقریباً 500 کلو میٹر فی گھنٹہ ہے، کچھ عرصہ بعد مزید ترقی ہوگی، تو شاید 1000 کلو میٹر فی گھنٹہ کے حساب سے جہاز کی رفتار ہوا کرے گی، اسی طرح آج بھی مختلف جہازوں کی رفتار مختلف ہوا کرتی ہے تو ہم کس کو معیار بنائیں گے؟

لہٰذا اسی لیے ہم کلو میٹر کو ہی معیار بنائیں گے کہ 77.25 کلو میٹر کو جو بھی پار کرے گا، وہ مسافر کہلائے گا، چاہے وہ آہستہ چل کر جائے یا وہ مسافت ایک منٹ میں پار کر جائے، فقہاء نے تین دن کے سفر میں اونٹ، پیدل اور گھوڑے سے سفر کو معیار بنایا، لہٰذا آج کے دور میں اگر آپ پوری دنیا کا

چکر لگانا چاہیں تو آج کل کے جہازوں میں چند دنوں میں پوری دنیا گھوم سکتے ہیں یا کم از کم تین دن میں کئی براعظم گھوم سکتے ہیں، اس حساب سے ہم اگر ہوائی جہاز کی رفتار کو معیار بنائیں تو آپ پوری دنیا کا چکر لگا دینے کے باوجود بھی مسافر نہیں بنیں گے، کیونکہ آپ نے صرف تین دن کی مسافت طے کی ہے، اس لحاظ سے اگر کوئی جہاز آپ کو تین دن میں پوری دنیا کا چکر لگوا دے، تب بھی آپ مسافر نہیں بنیں گے تو کیا اس صورت میں بھی آپ یہ کہیں گے کہ خواتین بغیر محرم کے پوری دنیا کا چکر لگا سکتی ہیں؟ ظاہر سی بات ہے کہ آپ کا جواب نفی میں ہوگا اور لا محالہ آپ کو یہ کہنا پڑے گا کہ کلومیٹر کے پیمانے کو سفر کے معیار کی حد کے طور پر مقرر کرنا چاہیے۔ 5) سفر کی دوسری سہولیات یعنی نماز میں قصر اور روزہ چھوڑنے کی گنجائش پر آپ اشکال نہیں کرتے کہ آج کل سفر با سہولت ہو گیا ہے، اس میں مشقت نہیں ہے، لہٰذا مشقت ہوگی تو قصر کریں گے اور مشقت ہوگی تو روزہ چھوڑیں گے، بلکہ جس طرح وہاں اصل مشقت کے اوپر حکم کا مدار نہیں رکھتے، بلکہ سبب پر رکھتے ہیں کہ جہاں سفر ہوگا تو نماز میں قصر اور روزہ چھوڑنے کی اجازت ہوگی، چاہے مشقت ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح عورت کے سفر میں "فتنہ" کو سبب نہیں بنایا گیا، بلکہ سفر کو سبب بنایا گیا ہے کہ جہاں سفر پایا جائے گا تو عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، چاہے "فتنہ" کا اندیشہ ہو یا نہ ہو۔ بہر صورت ہمارے زمانہ میں علماء احناف کا فتویٰ بھی وہی چار برید والے قول پر ہے پھر حنفیہ کے نزدیک سفر میں قصر واجب ہے نہ کہ محض جائز؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نماز دو دو رکعت فرض کی گئی تھی، پھر سفر میں یہی برقرار رہی اور حضر یعنی وطن میں رہنے کی حالت میں اس میں اضافہ کر دیا گیا، (بخاری، باب التاریخ من أین ارخوا التاریخ؟ حدیث نمبر: ۳۹۳۵)

اگر کوئی مسافر شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہے یا امامت کرا رہا ہے تو وہ چار کی بجائے دو رکعت پڑھے گا اور اگر مقیم امام کے پیچھے نماز ادا کر رہا ہے تو پھر اسے چار رکعت پوری کرنا ہوں گی، حتیٰ کہ امام کے پیچھے اگر چوتھی رکعت میں آ کر شامل ہوا تو پھر بھی اسے چار رکعت ہی پوری کرنا ہوں گی۔ خود امام ہونے کی صورت میں حضور ﷺ نے منیٰ اور عرفات میں دو دو رکعت ہی پڑھائیں اور مسافر امام کیلئے یہ بھی حکم ہے کہ وہ بلند آواز سے اعلان کر دے کہ ہم مسافر ہیں اَتِمُّوا الصَّلٰوۃَ تم اپنی نماز

پوری کرلو۔ چناچہ حضور ﷺ نے دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا، مسافر نمازیوں نے بھی ایسا ہی کیا البتہ مقیم نمازیوں کے لیے چار رکعت مکمل کرنے کا حکم تھا۔

اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت یعلیٰ ابن امیہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر کا حکم صرف خوف کی حالت میں ہے جب کہ حضور ﷺ نے امن کی حالت میں بھی قصر نماز پڑھی، فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کو پورے عرب میں غلبہ حاصل ہوگیا تھا مگر آپ نے دو سال بعد یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر بھی نماز دو رکعت ہی ادا فرمائی اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے کہا، بھائی! میں نے بھی حضور ﷺ سے سنا ہے کہ بظاہر یہ آیت خوف کی حالت کے متعلق ہی ہے مگر درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے معافی اور صدقہ ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ صدقہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے ایک دفعہ دے کر اسے واپس نہیں لیا جاتا کہ یہ ایک کمینہ حرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سب کریموں کا کریم ہے لہٰذا اس کی طرف سے سفر میں دو رکعت کی معافی کا صدقہ قبول کرنا چاہیئے۔ بہرحال اگر سفر میں ہوں یا جنگ کی حالت تو نماز میں رعایت دی گئی ہے مگر چھوڑنے کا ذکر بالکل آخر میں ہوا ہے وہ بھی چھوڑنے کا نہیں بلکہ قضا کرنے کا حکم ہے اس سے ظاہر ہوا کہ نماز کس قدر ضروری فریضہ ہے۔ سفر کے لیے یہ رعایت ہے، اگر کوئی آدمی اپنے اصلی وطن سے اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ دور جا کر پندرہ دن سے کم مدت ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو وہ مسافر شمار ہوگا اور نماز قصر ادا کریگا۔ کسی شخص کا وطن اصلی وہ مقام ہے، جہاں وہ پیدا ہوا، اس کا گھربار، بیوی بچے، مکان، زمین، دکان، فیکٹری، دفتر وغیرہ اور وطن اقامت وہ جگہ ہے جہاں کوئی شخص شرعی سفر کرکے پندرہ دن یا زیادہ مدت کے لیے عارضی طور پر مقیم ہوتا ہے۔ نماز سے متعلق وطن اصلی اور وطن اقامت کا حکم یکساں ہے ہر دو مقامات پر انسان پوری ہی نماز ادا کریگا۔

سفر میں قصر مباح ہے یا واجب؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حج کے لیے مکہ مکرمہ آئے تو انہوں نے منیٰ اور عرفات وغیرہ میں پوری

نماز ادا کی، تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ باقی صحابہ علیہم الرضوان نے ان مقامات پر نماز قصر ادا کی ہے، مگر آپ پوری نماز پڑھتے ہیں اس معاملہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بہت ناراض ہوئے کیونکہ مسافر کے لیے نماز قصر واجب ہے نہ کہ محض مستحب۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ لوگو! میں نے مکہ میں نکاح کر لیا ہے اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے سنا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی شہر میں نکاح کر لیتا ہے تو اسے وہاں پر مقیم کی نماز پڑھنی چاہئے چنانچہ یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ سسرال میں جا کر پوری نماز ادا کرنی چاہئے۔ اب رہا سنتوں کا مسئلہ کہ کیا یہ بھی پڑھی جائیں گی یا نہیں۔ یہ مسئلہ فتاویٰ عالمگیری میں بھی موجود ہے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سفر کی دو حالتیں ہوتی ہیں جب کوئی شخص فی الواقع سفر کر رہا ہوتا ہے تو وہ سفر جاری کہلاتا ہے اور جب دوران سفر کسی مقام پر قیام کرتا ہے تو وہ نزول ہوتا ہے۔ سفر جاری میں سنتوں کو ترک کر دینا چاہئے اور نزول کی حالت میں اگر سنتیں پڑھ لے تو بہتر ہے، ضروری نہیں۔ اگر نہ پڑھیگا تو کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ البتہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ فجر کی سنتیں سفر و حضر ہر حالت میں ادا فرماتے تھے۔ اور وتر چونکہ واجب ہیں، آپ وہ بھی ضرور پڑھتے تھے۔

فرمایا اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے، بہر حال مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ خِفْتُمْ کا لفظ اتفاقی ہے۔ ضروری نہیں۔ لہٰذا جب خطرہ ٹل جائے اور امن و امان قائم ہو جائے، تو قصر کرنا اس وقت بھی روا ہے۔ مفسرین کریم یہ بھی فرماتے ہیں کہ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ تک جملہ مکمل ہے اور اس میں نماز قصر کا واضح حکم موجود ہے۔ لہٰذا آیت کے اس حصے کا قصر کے ساتھ تعلق باقی نہیں رہتا۔ قصر کا ذکر پہلے حصے میں مکمل ہو چکا ہے۔ فرمایا اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۱۰۱﴾ بیشک کافر تمہارے صریح دشمن ہیں۔ ان سے بچاؤ کی تدابیر کرنا تمہارے لئے ہر حالت میں ضروری ہے خواہ سفر امن کا ہو یا خوف کا۔

☆☆☆

حالتِ جہاد یعنی نماز خوف سے متعلق احکام ومسائل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا
اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ
يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ
تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا
اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ⑩②

صلوۃ الخوف (جنگ کے وقت کی نماز) کا طریقہ

وَاِذَا	اور جب	كُنْتَ فِيْهِمْ	ہوں آپ ان میں
فَاَقَمْتَ	پھر آپ قائم کریں	لَهُمُ	ان کے لیے
الصَّلٰوةَ	نماز	فَلْتَقُمْ	تو چاہیے کہ کھڑی ہو
طَآئِفَةٌ	ایک جماعت	مِّنْهُمْ	ان میں سے
مَّعَكَ	آپ کے ساتھ	وَلْيَاْخُذُوْٓا	اور چاہیے کہ (ساتھ) لے لے وہ
اَسْلِحَتَهُمْ	اپنے ہتھیار	فَاِذَا سَجَدُوْا	پھر جب وہ سجدہ کر لے

فَلْيَكُوْنُوْا	تو ہو جائے	مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ	تمہارے پیچھے
وَلْتَاْتِ	اور چاہیے کہ آئے	طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى	جماعت دوسری
لَمْ يُصَلُّوْا	(کہ) نہیں اس نے نماز پڑھی	فَلْيُصَلُّوْا	تو وہ نماز پڑھے
مَعَكَ	آپ کے ساتھ	وَلْيَاْخُذُوْا	اور چاہیے کہ لے لے وہ
حِذْرَهُمْ	اپنا بچاؤ	وَاَسْلِحَتَهُمْ	اور اپنے ہتھیار
وَدَّ الَّذِيْنَ	چاہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا
لَوْ تَغْفُلُوْنَ	کاش کہ تم غافل ہو جاؤ	عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ	اپنے اسلحے سے
وَاَمْتِعَتِكُمْ	اور اپنے سامان سے	فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ	پھر وہ ٹوٹ پڑیں تم پر
مَّيْلَةً	ٹوٹ پڑنا	وَّاحِدَةً	یکبارگی
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ	اور نہیں کوئی گناہ تم پر	اِنْ كَانَ بِكُمْ	اگر ہو تمہیں
اَذًى	تکلیف	مِّنْ مَّطَرٍ	بارش (کیوجہ) سے
اَوْ كُنْتُمْ	یا ہو تم	مَّرْضٰٓى	بیمار
اَنْ تَضَعُوْٓا	یہ کہ تم رکھ دو	اَسْلِحَتَكُمْ	اپنے ہتھیار
وَخُذُوْا	اور تم (ساتھ) لیے رکھو	حِذْرَكُمْ	اپنا بچاؤ
اِنَّ اللّٰهَ	تحقیق اللہ نے	اَعَدَّ	تیار کر رکھا ہے
لِلْكٰفِرِيْنَ	کافروں کے لیے	عَذَابًا مُّهِيْنًا ۱۰۲	عذاب رسوا کن

نمازِ خوف میدانِ جنگ، شدید دشمن، درندوں یا جان کے لاحق خطرے کے وقت پڑھی جانے والی مخصوص باجماعت نماز ہے۔ اس کا مقصد حالتِ جنگ میں بھی باجماعت نماز کا اہتمام اور دشمن سے بچاؤ دونوں کو برقرار رکھنا ہے۔ احادیث اور فقہی روایات میں اس کی مختلف صورتیں وارد ہوئی ہیں، اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ جب آپ ان میں موجود ہوں اور انہیں نماز پڑھائیں فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ تو چاہیے کہ ان میں سے

ایک گروہ آپ کے پیچھے (نماز کے لیے) کھڑا ہو جائے وَلْيَأْخُذُوٓا اَسْلِحَتَهُمْ اور وہ اپنا اسلحہ بھی اپنے ساتھ رکھیں۔ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ پھر جب یہ سجدہ کرلیں تو آپ کے پیچھے چلے جائیں وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا پھر دوسرا گروہ آجائے جس نے نماز نہیں پڑھی فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ پھر وہ بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھے وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ اور اپنے دفاع کا سامان اور اسلحہ اپنے ساتھ رکھیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر نماز خوف سفر کی حالت میں ادا کی جارہی ہے تو ایک گروہ بمعہ اسلحہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ ایک رکعت مکمل کرلیں تو اپنے اسلحہ سمیت واپس اپنے محاذ پر چلے جائیں گے اور دوسرا گروہ آکر حضور ﷺ کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے گا اور ایک رکعت آپ کے ساتھ ادا کریگا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی دو رکعت پوری کرکے سلام پھیر دیں گے جب کہ یہ دونوں گروہ ایک ایک رکعت اپنے طور پر ادا کریں گے۔

اب بقیہ ایک رکعت ادا کرنے کے مختلف طریقے وارد ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ پہلا گروہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر واپس محاذ پر جائے اور وہیں اپنی دوسری رکعت پوری کرلے۔ اسی طرح جب دوسرا گروہ ایک رکعت امام کے ساتھ ادا کرلے تو اپنی دوسری رکعت واپس جا کر الگ پڑھ کر سلام پھیر دے احادیث میں یہ طریقہ بھی آتا ہے کہ پہلا گروہ ایک رکعت پڑھ کر محاذ پر چلا جائے اور دوسرا گروہ آجائے، وہ بھی ایک رکعت پڑھ کر محاذ پر چلا جائے تو پہلا گروہ واپس آکر اسی جگہ اپنی دوسری رکعت مکمل کرلے۔ یہ پھر اپنے محاذ پر چلا جائے تو دوسرا گروہ پھر واپس آکر اپنی دوسری رکعت مکمل کرلیں۔ اور اگر اقامت کی حالت میں چار رکعت نماز ادا کرنا ہے تو ایک کی بجائے دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کی جائیں گی اور دو دو رکعت مقتدی علیحدہ ادا کریں گے۔ اس طرح نماز میں دونوں گروہوں نے آنے جانے میں جو حرکات کی ہیں، وہ جائز ہیں۔ نماز خوف کے لیے یہ خاص حکم ہے، ورنہ عام حالات میں اگر کوئی نمازی نماز کے دوران کوئی ایسی حرکت کرتا ہے تو اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ صلوٰۃِ خوف کا ایک طریقہ یہ بھی آیا ہے کہ پہلا گروہ ایک یا دو رکعت امام کے ساتھ ادا

کرنے کے بعد اپنی بقیہ ایک یا دو رکعتیں وہیں پوری کر کے محاذ پر آجائے اور دوسرا گروہ آ کر ایک یا دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے۔ امام سلام پھیر دے تو یہ گروہ وہیں پر اپنی بقیہ ایک یا دو رکعت ادا کرنے کے بعد محاذ پر واپس جائے یہ سب طریقے روا ہیں اور مغرب کی نماز ادا کرنا مقصود ہو تو پہلا گروہ دو رکعت امام کے ساتھ پڑھے گا اور بقیہ ایک رکعت علیحدہ ادا کرے گا پھر دوسرا گروہ آ کر ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھیگا۔ اور وہ رکعت علیحدہ ادا کرے گا۔

یہ تمام طریقے اس صورت میں اختیار کیے جائیں جب کہ دشمن قبلہ کی طرف نہیں ہے بلکہ الٹی طرف ہے یا کسی دوسری سائیڈ میں ہے اور اگر دشمن قبلہ کی سمت میں صف آرا ہے تو ایسی صورت میں حضور ﷺ نے تمام مجاہدین کی دو صفیں بنائیں اور سب نے بیک وقت نماز شروع کی۔ دونوں صفوں نے قیام اور رکوع اکٹھا کیا، پھر حضور ﷺ سجدہ میں گئے تو پہلی صف والے آپ کے ساتھ سجدہ میں شریک ہوئے جب کہ دوسری صف والے دشمن کی نگرانی کے لیے کھڑے رہے۔ جب اگلی صف سجدے سے فارغ ہوگئی تو پچھلی صف والوں نے بھی سجدہ کیا۔ جب دوسری رکعت شروع ہوئی تو اگلی صف پیچھے چلی گئی اور پچھلی صف آگے آگئی ہے۔ پھر سب نے رکوع اکٹھا کیا۔ پھر اگلی صف نے حضور کے ساتھ سجدہ کیا اور پچھلی صف والے کھڑے رہے اس کے بعد پچھلی صف والوں نے سجدہ کیا۔ اور پھر تشہد کے بعد سب نے نماز اکٹھے مکمل کی۔ جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم نے ضَجْنَان اور عُسْفَان کے درمیان پڑاؤ کیا۔ مشرکوں نے کہا: ان مسلمانوں کی ایک نماز ہے جسے وہ اپنے باپ اور بیٹوں سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں اور وہ عصر کی نماز ہے لہٰذا تم اپنے اسباب جمع کرو اور اس وقت یکبارگی ان پر حملہ کر دو۔ اتنے میں جبریل نازل ہوئے اور نبی اکرم کو حکم دیا کہ وہ اپنے اصحابؓ کے دو حصے کریں۔ ایک حصے کو نماز پڑھائیں اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابل ان کے پیچھے کھڑا رہے اور اپنی ڈھالیں اور اپنے ہتھیار پہنے رہیں۔ پھر دوسرا حصہ آئے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے اور پہلے حصے والے اپنی ڈھالیں اور ہتھیار پہن لیں۔ اس طرح ہر گروہ کی ایک ایک رکعت، اور نبی اکرم کی دو رکعتیں ہوں گی۔ (ترمذی، ابواب التفسیر)

دشمن کا منصوبہ/ وحی کا نزول اور دفاعی تدبیر

اس آیت میں نمازِ خوف کی جماعت کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ غزوۂ ذاتُ الرِّقاع میں جب رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو مشرکین نے دیکھا کہ آپ نے تمام صحابہ رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کے ساتھ نمازِ ظہر باجماعت ادا فرمائی تو انہیں افسوس ہوا کہ انہوں نے اس وقت میں کیوں نہ حملہ کیا اور آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ کیا ہی اچھا موقع تھا۔ ان میں بعضوں نے کہا کہ اس کے بعد ایک اور نماز ہے جو مسلمانوں کو اپنے ماں باپ سے زیادہ پیاری ہے یعنی نمازِ عصر، لہٰذا جب مسلمان اس نماز کے لیے کھڑے ہوں تو پوری قوت سے حملہ کر کے انہیں قتل کر دو۔ اس وقت حضرت جبریل امین علَیْہِ السَّلَام نازل ہوئے اور انہوں نے حضور سیدُ المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے عرض کیا: یارسولَ اللہ! یہ نمازِ خوف ہے یعنی اب یوں نماز پڑھیں۔ (خازن، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۲، ۱/ ۴۲۳)

فرمایا نمازِ خوف کا یہ طریقہ دشمن سے حفاظت کے لیے اختیار کیا گیا ہے کیونکہ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ کفار کا منصوبہ تو یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور سامان سے غافل ہو جاؤ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً اور وہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں اس آیت اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب مسلمان نماز میں مشغول ہوں تو ان پر ٹوٹ پڑیں مگر پیشتر اس کے کہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کرتے اللہ تعالیٰ نے نمازِ خوف کا طریقہ بتلا کر دشمنوں کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔ بہر حال یہ سب طریقے اسی صورت میں اختیار کیے جائیں گے جب دورانِ جنگ تھوڑا بہت موقع مل جائے جس کے دوران مذکورہ طریقہ سے نماز ادا کی جا سکے۔ اور اگر حالات ایسے ہوں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی دشمن سے غافل ہونا باعث نقصان ہو سکتا ہے، تو پھر نماز کو قضا کرنے کی بھی اجازت ہے۔ جنگ خندق کے موقع پر مسلمانوں کی چار نمازیں فوت ہو گئی تھیں جن کی قضا رات کو بعد از نمازِ عشاء ادا کی گئی۔ صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان موجود ہے کہ جب صبح کی روشنی میں تستر کے قلعے پر حملہ اور چڑھائی ہو رہی تھی، تو شدید جنگ کی وجہ

سے مسلمان فجر کی نماز وقت پر ادا نہ کر سکے اور سورج بلند ہونے کے بعد قضا کی یعنی حضور ﷺ کے زمانہ مبارک کے بعد مسلمانوں نے ایران کے قلعہ تستر پر سحری کے وقت حملہ کیا اور اس دوران نماز فجر ادا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ مسلمان صلوٰۃ خوف بھی ادا نہ کر سکے اور جنگ جاری رکھی۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوئی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ مسلمانوں نے نماز فجر سورج نکلنے کے بعد ادا کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس قضا کی ادائیگی میں مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ دنیا و مافیہا کے خزانے مل جانے سے بھی اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اس طرح قلعہ بھی فتح ہو گیا اور نماز بھی ادا ہو گئی اگرچہ بعد از وقت بہر حال اس قسم کی صورت حال بھی واقع ہو سکتی ہے اور یہ طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

عذر میں رخصت

اسلامی فقہ میں وہ تمام افراد جو کسی شرعی عذر (بیماری، سفر، معذوری اور نسوانی عوارض) کی بناء پر دینی احکام پر عمل نہ کر سکتے ہوں یا انہیں دینی احکام کے باب میں کچھ رخصتیں حاصل ہوں تو انہیں ''اہل الاعذار'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے فقہ اسلامی میں رخصت (چھوٹ) اس حکم کو کہتے ہیں جو کسی عذر یا مجبوری کی صورت میں دیا جاتا ہے، تاکہ دین آسانی کا باعث بنے، نہ کہ تنگی کا۔ یعنی رخصت دین کی رحمت اور سہولت ہے، جو انسان کی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے ہیں آسانی پیدا کرتی ہے، بشرطیکہ اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

فرمایا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف میں ہو یا بیمار ہو جاؤ اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ کہ تم اپنے ہتھیار اتار دو۔ آیت کے پہلے حصہ میں ہر وقت ہتھیار بند رہنے کا حکم تھا۔ حتیٰ کہ نماز کے وقت بھی ہتھیار ساتھ رکھنا ضروری فرمایا تھا۔ اب فرمایا کہ اگر کوئی معقول عذر ہو، یعنی بارش ہو جائے یا تم میں سے کوئی مجاہد بیمار ہو جائے تو اپنے ہتھیار اتار لینے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ زخمی تھے اور اس وقت ہتھیار رکھنا ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا، ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی اور حالتِ عذر میں ہتھیار کھول کر رکھنے

کی اجازت دی گئی۔ (قرطبی، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۲، ۳ / ۲۵۶، الجزء الخامس) آیت مذکورہ میں صرف دو صورتوں میں ہتھیار اتارنے کی اجازت ہے۔ پہلی یہ کہ بارش ہو رہی ہو کپڑے اور ہتھیار بھیگ رہے ہوں۔ دوسری یہ کہ کوئی شخص بیماری کی وجہ سے ہتھیار بند رہنے کا متحمل نہ ہو۔ ان صورتوں کے علاوہ ہتھیار اتارنے کی اجازت نہیں۔ اس لیے آخر میں تاکیدی طور پر دوبارہ سہ بارہ اس حکم کو دہرایا۔ ایسا کر سکتے ہو مگر یاد رکھو! وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اپنے بچاؤ کا سامان ہر حالت میں اختیار کرو۔ اپنے دفاع سے کبھی غافل نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اسلحہ اتار کر کسی ایسی جگہ نہ رکھو جہاں سے بوقت ضرورت فوری طور پر دستیاب نہ ہو، بلکہ اپنے قریب اور نگرانی میں رکھو تاکہ بوقت ضرورت فوراً اس سے لیس ہو سکو خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے الفاظ بڑے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں، اس کے معنی ہوشیار اور چوکنا رہنا مسلح رہنا اور اپنے بچاؤ کے تمام ذرائع اختیار کیے رکھنا ہے۔ مثلاً مورچوں کی حفاظت کرنا اور ان میں پناہ پکڑنا، لڑائی سے پہلے سامان جنگ تیار رکھنا۔ دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رہنا، اس کا مداوا سوچنا بے خبری میں دشمن کے حملے کے لیے تیار رہنا سب کچھ خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے مفہوم میں سما جاتا ہے۔ دور نبوی ﷺ میں اسلحہ جنگ ہر مجاہد کی انفرادی ملکیت ہوتا تھا مگر آج اسلحہ جنگ مہیا کرنا حکومتوں کی ذمہ داری ہے لہٰذا اسلحہ جنگ کے تیار کرنے والے کارخانوں، اسلحہ کے ذخائر اور دشمن سے ان کا بچاؤ بھی (خُذُوْا حِذْرَكُمْ) میں شامل ہے۔ غرض قوم و ملک کا تحفظ، افراد فوج کے تحفظ کی تدابیر، آلات جنگ کا تحفظ، لڑائی کے منصوبوں کو صیغہ راز میں رکھنا سب کچھ اس حکم میں داخل ہے۔ آج دشمن سب سے پہلے اسلحہ کے محفوظ ذخائر کو یا اسلحہ ساز فیکٹریوں کو اچانک حملے کے ذریعے تباہ کر دیتا ہے۔ ان سب امور کی طرف مسلمانوں کو اس آیت میں متوجہ کیا گیا ہے۔

ناکامی کے اسباب

آج مسلمانوں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے پاس اپنے بچاؤ کا سامان نہیں ہے اور دشمن ان پر غالب آ رہا ہے گزشتہ چار سو سال سے یہی حالت ہے۔ دشمن ہر محاذ پر مسلمانوں کو ناکام

بنا رہا ہے۔ مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بالکل پسپا ہو رہے ہیں۔ ان کے پاس اپنے بچاؤ کا کوئی سامان نہیں۔ پہاڑوں سے معدنیات نکالنا ہو یا تیل کے لیے کنواں کھودنا ہو، مسلمانوں کے پاس کوئی انتظام نہیں۔ نہ اوزار ہیں اور نہ ٹیکنالوجی۔ ماہرین بھی باہر سے منگوانا پڑتے ہیں اور مشینری بھی باہر سے درآمد کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر محاذ پر شکست کھا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں مگر اغیار نے ان کے دماغ اس قدر ماؤف کر دیے ہیں کہ یہ اپنے وسائل سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لِكُلِّ حَالٍ عِنْدَهُ عَتَادٌ حضور ﷺ ہر موقع و ہر حالت کے لیے سامان تیار رکھتے تھے، مگر آج مسلمان بہت پیچھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں، سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت، تجارت جنگ غرضیکہ ہر میدان میں آج مسلمان دوسروں کا دست نگر ہے لہٰذا دشمن کی زد میں ہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ⑩ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ذلت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے اگر تم مستعد ہو گے تو اللہ تمہارے ہاتھوں سے ہی دشمن کو سزا دلوا دے گا۔ ورنہ اپنے قانون مکافات کے مطابق ان کو آخرت میں تو سزا مل کر رہیگی۔ تم اپنے بچاؤ کا سامان بہر حال تیار رکھو۔

☆☆☆

ذکر اللہ کی اہمیت! / اللہ تعالیٰ کا نام کائنات کی روح ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَہِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَکُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّہُمْ یَاْلَمُوْنَ کَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۱۰۴﴾

ذِکر اللہ کی تعریف/ ذِکر اللہ کی مختلف اقسام

فَاِذَا	پھر جب	قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ	تم پوری کرلو نماز
فَاذْکُرُوا اللّٰہَ	تو تم ذکر کرو اللہ کا	قِیٰمًا	کھڑے ہوئے
وَّقُعُوْدًا	اور بیٹھے ہوئے	وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ	اور اپنی کروٹوں پر
فَاِذَا	پھر جب	اطْمَاْنَنْتُمْ	بے خوف ہو جاؤ
فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	تو تم قائم کرو نماز	اِنَّ الصَّلٰوۃَ	تحقیق نماز
کَانَتْ	ہے	عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ	مومنوں پر
کِتٰبًا	فرض	مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾	مقررہ وقتوں میں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے بعد ذکر کرنے کی ترغیب دی ہے۔ نماز خواہ سفر کی ہو یا

خوف کی یا عام نماز، اس کے بعد ذکر الٰہی پر مداومت اور اوقات نماز کا بیان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ جب تم نماز پوری کر چکو۔ یعنی نماز کے لیے تو وقت مقرر ہے، اس مقررہ وقت میں جب نماز سے فارغ ہو جاؤ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ تو اللہ کا ذکر کرو اور ذکر کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں، ہر وقت اور ہر حالت میں روا ہے قِیٰمًا کھڑے ہو وَّقُعُوْدًا بیٹھے ہو وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ یا اپنی کروٹوں کے بل یعنی لیٹے ہو، ذکر الٰہی ہر حالت میں جاری رہے گا۔ مفسرین کرام اس جملے کی تفسیریوں بیان کرتے ہیں کہ جب نماز پوری کر چکو تو ذکر پر مداومت اختیار کرو۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کا کوئی وقت ذکر سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب آپ کسی مجلس میں تشریف لاتے تو مجلس کی ابتداء بھی اللہ کے ذکر سے کرتے اور اس کی انتہا بھی ذکر الٰہی سے ہوتی۔

ذِکر کے معنی یاد کرنا، یاد رکھنا، چرچا کرنا، خیر خواہی اور عزت و شرف کے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ذِکر اِن تمام معنوں میں آیا ہوا ہے۔ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کو یاد کرنا، اسے یاد رکھنا، اس کا چرچا کرنا اور اس کا نام لینا ذِکر اللہ کہلاتا ہے۔ ذِکر اللہ کی تین قسمیں ہیں: (1) ذِکر لسانی کہ بندہ زبان سے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کا ذِکر کرے، اس میں تسبیح، تقدیس، ثنا، حمد، مدح، خطبہ، توبہ، اِستغفار، دعا وغیرہ داخل ہیں۔ (2) ذِکر قلبی کہ بندہ دل سے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کا ذکر کرے، اس میں اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی نعمتوں کو یاد کرنا، اس کی عظمت و کبریائی اور اس کے دلائل قدرت میں غور کرنا علمائے کرام رَحِمَہُمُ اللّٰہُ کا اِستنباط مسائل (قرآن و حدیث سے مسائل اَخذ کرنے) میں غور و فکر کرنا داخل ہے۔ (3) ذِکر بالجوارح کہ بندہ مختلف اَعضائے جسم سے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کا ذکر کرے۔ جیسے حج کے لیے سفر کرنا، آنکھ کا خوفِ خدا میں رونا، کان کا ربّ تَعَالٰی کا نام سننا۔ نماز تینوں قسم کے ذکر پر مشتمل ہے: تسبیح و تکبیر ثناء و قراءت تو ذکر لسانی ہے اور خشوع و خضوع اِخلاص ذِکر قلبی اور قیام رکوع و سجود وغیرہ ذِکر بالجوارح ہے۔ ☆ ذِکر اللہ بالواسطہ بھی ہوتا ہے اور بلاواسطہ بھی۔ (1) اللہ تَعَالٰی کی ذات و صفات کا تذکرہ بلاواسطہ ذِکر اللہ ہے۔ (2) اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے محبوبوں کا

محبت سے چرچا کرنا، اس کے دشمنوں کا برائی سے ذِکر کرنا سب بالواسطہ ذِکر اللہ ہیں۔ سارا قرآنِ پاک ذِکر اللہ ہے مگر اس میں کہیں تو اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی ذات وصفات مذکور ہیں کہیں حضور نبی رحمت شفیع اُمت صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اَوصاف ومحامد (تعریفیں) کہیں کفار کے (بطورِ مذمت) تذکرے۔ ذِکر اللہ بہترین عبادت ہے اسی لیے اللہ عَزَّ وَجَلَّ اور اس کے حبیب صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اس کا تاکیدی حکم ارشاد فرمایا ہے۔ ☆ پھر ذِکر کی مزید دو صورتیں بھی ہیں: (1) ذِکر خفی کہ بندہ دل میں یا آہستہ آواز سے ذِکر اللہ کرے۔ (2) ذِکر جلی یا ذِکر بالجہر کہ بندہ بلند آواز سے ذِکر اللہ کرے۔ بعض علماء کے نزدیک ذِکر خفی افضل تو بعض کے نزدیک ذِکر جلی افضل۔

ذِکر اللہ کے فضائل وفوائد/ ہر سانس کے ساتھ ذکر

بزرگانِ دین یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان کا کوئی سانس ذکر الٰہی سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ نفی اثبات کا ذکر لا الہ الا اللہ کے ذریعے کرے یا صرف ذکر جلالہ اللہ کرے۔ آدھا ذکر سانس لیتے وقت ہو اور آدھا سانس ختم ہوتے وقت۔ اس ذکر کے لیے کوئی پابندی نہیں، یہ ہر حالت میں روا ہے جو لوگ اس کی مشق کر لیتے ہیں، وہ نیند کی حالت میں بھی اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں سوئے ہوئے ہیں مگر ہر سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر جاری ہے۔ نقشبندی حضرات کسی سانس کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ چلتے وقت ان کا کوئی قدم بھی ذکر الٰہی سے خالی نہیں ہوتا، بلکہ ہر قدم پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اللہ کا ذکر ایک ایسی عبادت ہے جس کی کوئی حد (Limit) نہیں قرآن پاک میں موجود ہے۔ اللہ عَزَّ وَجَلَّ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ''اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد کرو۔ زبان کے ساتھ ذکر ہر شخص کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتکبیر بیان کرے، اس کی حمد وثنا بیان کرے، عظمت کے کلمات دہرائے، استغفار کے کلمات کہتا ہے یا قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول رہے۔ بہر حال ہر قسم کی نماز کی ادائیگی کے بعد ذکر الٰہی پر مداومت کا حکم دیا گیا ہے اور ذکر کھڑے بھی ہوتا ہے، بیٹھ کر بھی اور کروٹ کے بل لیٹ کر بھی جاری رہتا ہے۔ ذِکر اللہ کرنے والا خشک جنگل میں سرسبز درخت کی طرح ہے۔ ذِکر اللہ کرنے والا مجاہد کی

طرح ہے۔☆رحمت الٰہی بندے کے ساتھ ہوتی ہے جب تک وہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کا ذکر کرتا رہتا ہے اور اس کے ہونٹ ذِکر اللہ سے ہلتے رہتے ہیں۔☆ذِکر اللہ سے بڑھ کر عذابِ الٰہی سے نجات دلانے والا عمل کوئی نہیں۔☆ذِکر اللہ کی کثرت کرنے والے کے لیے باغِ جنت میں آسودگی کی خوشخبری ہے۔☆سب سے افضل عمل ذِکر اللہ ہے۔☆صبح وشام ذِکر اللہ سے اپنی زبان کو تر رکھنے والا گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ذِکر اللہ کرنے والے کے تمام اُمور کو اللہ عَزَّ وَجَلَّ سنوار دیتا ہے، اُسے اپنی رحمت عطا فرماتا اور اپنا دوست بنالیتا ہے۔اللہ کے نام کی بڑی عظمت ہے۔جب تک ایک اللہ کا بندہ بھی ایسا رہے گا جو صرف اللہ کا نام لے گا، اللہ پاک اپنے نام کی برکت سے اس دنیا کے نظام کو چلائے گا، اور جب وہ ''اللہ، اللہ'' کہنے والا واحد بندہ بھی دنیا سے رخصت ہو جائے گا تو پھر اللہ پاک اس دنیا کے نظام کو لپیٹ لیں گے کہ اب میرا نام لینے والا کوئی نہیں رہا، اب یہ دنیا بے مقصد ہو چکی ہے، بے فائدہ ہو چکی ہے۔سو اللہ کے نام کی بڑی قیمت ہے، بڑا وزن ہے، اس لیے کہ اللہ بڑے ہیں، اللہ کا نام بھی بڑا ہے، تو اللہ کا نام عظمت سے لینا چاہیے۔زبان کے ساتھ ذکر ہر شخص کر سکتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتکبیر بیان کرے، اس کی حمد وثنا بیان کرے، عظمت کے کلمات دہرائے، استغفار کے کلمات کہتا ہے یا قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول رہے۔بہر حال ہر قسم کی نماز کی ادائیگی کے بعد ذکر الٰہی پر مداومت کا حکم دیا گیا ہے اور ذکر کھڑے بھی ہوتا ہے، بیٹھ کر بھی اور کروٹ کے بل لیٹ کر بھی جاری رہتا ہے۔خلاصہ یہ کہ آیت کریمہ میں ذکر اللہ کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کی کوئی حد اور تعداد متعین نہیں، ہر وقت، ہر حال میں ذکر اللہ کثرت سے کرنے کا حکم ہے، سفر ہو یا حضر، بیماری ہو یا تندرستی اس کی کوئی تخصیص نہیں ہے، حاصل یہ ہے کہ: ذکر اللہ کی کم سے کم کوئی مقدار متعین نہیں ہے، اور زیادہ سے زیادہ ذکر اللہ یہ ہے کہ: ہر سانس میں نام پاک جاری رہے۔

''معارف القرآن مفتی محمد شفیع'' صاحب رحمہ اللہ اس آیت کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ذکر اللہ کے سوا کوئی ایسی عبادت عائد نہیں کی جس کی کوئی خاص حد مقرر نہ ہو، نماز پانچ وقت کی اور ہر نماز کی رکعات متعین ہیں، حج بھی خاص مقام پر

خاص اعمال مقررہ کرنے کا نام ہے، زکوٰۃ بھی سال میں ایک مرتبہ فرض ہوتی ہے، مگر ذکر اللہ ایسی عبادت ہے کہ نہ اس کی کوئی حد اور تعداد متعین ہے، نہ کوئی خاص وقت اور زمانہ مقرر ہے، نہ اس کے لیے کوئی خاص ہیئت قیام یا نشست کی مقرر ہے، نہ اس کے لئے ظاہر اور باوضو ہونا شرط ہے، بہر حال ذکر اللہ کرنے کا حکم ہے، سفر ہو یا حضر، بیماری ہو یا تندرستی، خشکی میں ہو یا دریا میں، رات ہو یا دن ہر حال میں ذکر اللہ کا حکم ہے۔ امام ترمذی نے ابواب الدعوات میں ذکر کی فضیلت میں حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ ایک آدمی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! اسلامی احکام مجھ پر غالب آگئے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں، جسے میں انہماک سے کرتا رہوں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا یَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ''تیری زبان ذکرِ الٰہی سے ہمیشہ تر رہنی چاہئے۔'' (ترمذی)

آگے فرمایا فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ جب تم اطمینان کی حالت میں ہو جاؤ تو (دستور کے مطابق) نماز قائم کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس حصہ آیت کا تعلق نماز سفر اور نماز خوف کے ساتھ ہے۔ سفر کے دوران نماز میں کمی آگئی تھی اور خوف کی حالت میں نماز کا طریقہ بدل گیا تھا۔ اب فرمایا کہ جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے یعنی سفر سے واپس آجاؤ یا خوف کی حالت زائل ہو جائے، تو پھر اسی طریقے سے نماز ادا کرو جس طرح عام حالات میں کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آدھی کی بجائے پوری نماز پڑھو اور پھر اس میں رکوع سجود، قومہ، قعدہ پوری طرح ادا کرو، استقبال قبلہ بھی ضرور ہو۔ غرضیکہ نماز کی تمام شرائط پوری کرو۔ کیونکہ اب عذر رفع ہو چکا ہے۔

اوقاتِ صلاۃ کی ابتدا و انتہا کی علامات

فرمایا اِنَّ الصَّلٰوۃَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ بیشک نماز مومنوں پر بقید وقت فرض کی گئی ہے۔ پانچوں نمازوں کے اوقات مقرر ہیں جن کے اندر ہر نماز ادا کی جائیگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا إِنَّ لِلصَّلَاةِ أَوَّلًا وَآخِرًا بے شک نماز کا ایک اول وقت ہے اور ایک آخری وقت۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اول اور آخر اوقات میں خود نمازیں ادا کر کے اوقات نماز کی عملاً تعلیم

دی۔اور ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے جبرئیل (علیہ السلام) کو بھیج کر نمازوں کے اوقات بتلائے۔ جبریل (علیہ السلام) نے دو دن آپ کو نماز پڑھائی۔ پہلے دن اول اول اوقات میں اور دوسرے دن آخر اوقات میں تاکہ اوقات نماز کا تعین ہو سکے۔ بہرحال اوقات نماز کا تعین اسی دنیا میں ممکن ہے جہاں نظام شمسی کے تحت دن رات کا نظام موجود ہے۔

نمازیں کب ادا ہوتی ہیں اور کب قضاء ہوتی ہیں؟

رات کے آخری پہر میں صبح ہوتے وقت مشرق کی طرف سے آسمان کی لمبائی میں کچھ سفیدی دکھائی دیتی ہے، جو تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتی ہے، اور اندھیرا ہو جاتا ہے، اسے ''صبح کاذب'' کہا جاتا ہے، اس کے تھوڑی دیر بعد آسمان کے کنارے پر کچھ سفیدی چوڑائی میں دکھائی دیتی ہے جو بڑھتی رہتی ہے، اور تھوڑی دیر میں بالکل روشنی ہو جاتی ہے، اسے ''صبح صادق'' کہا جاتا ہے، جس سے فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور سورج نکلنے تک باقی رہتا ہے، اور جب سورج تھوڑا سا بھی طلوع ہو جائے تب فجر کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ فجر کی نماز وقت ختم ہونے سے اتنا پہلے پڑھنا مستحب ہے کہ اگر کسی وجہ سے نماز فاسد ہو جائے تو طہارت حاصل کر کے سنت کے مطابق قراءت کر کے نماز ادا کی جا سکے۔ جب آفتاب کا ذرا سا کنارہ بھی نکل آئے تو فجر کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور یہ وقت مکروہ ہوتا ہے اور اس کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے۔ وقت ظہر کے متعلق سورہ بنی اسرائیل میں آتا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ''یعنی یہ نماز سورج کے ڈھلنے کے وقت ادا کریں۔ ظہر کے منتہائے وقت میں آئمہ کا کچھ اختلاف ہے۔ اکثر ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ ظہر کا وقت سورج ڈھلنے کے بعد سے لیکر کسی چیز کے ایک مثل سایہ تک رہتا ہے جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کا سایہ دو مثل ہونے تک ظہر کا وقت ہوتا ہے۔ سایہ مثل معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی چھڑی وغیرہ دھوپ میں کھڑی کر دی جائیگی۔ عین زوال کے وقت اس چھڑی کا جتنا سایہ ہو، اس پر نشان لگا دیا جائے۔ اس کے آگے جب سایہ بڑھتے بڑھتے اس چھڑی کی لمبائی کے برابر ہو جائے تو وہ ایک مثل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ظہر کی نماز کا وقت سورج کے زوال کے

بعد سے شروع ہو کر مثل ثانی کے آخر تک ہوتا ہے، یعنی جب ہر چیز کا سایہ، اصلی سایہ کے علاوہ اس چیز کے دو مثل ہو جائے۔ اس کے بعد قضاء ہو جاتی ہے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مثل ثانی شروع ہونے سے پہلے پہلے ظہر کی نماز پڑھ لی جائے۔

عصر کا وقت دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء بعض آئمہ کے نزدیک ایک مثل اور بعض کے نزدیک دو مثل سایہ کے بعد ہوتی ہے اور غروب آفتاب تک نماز کا وقت ہوتا رہتا ہے۔ تاہم جب سورج میں زردی آجائے تو نماز کے لیے وقت مکروہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زردی آنے سے پہلے پہلے عصر کی نماز ادا کر لینی چاہئے۔ الحاصل! عصر کی نماز کا آخری وقت غروبِ شمس (سورج غروب ہونے) سے پہلے تک ہے، لیکن سورج کی ٹکیا زرد پڑ جانے اور اس کی تیزی ماند پڑ جانے سے پہلے ہی عصر کی نماز ادا کر لینی چاہیے، سورج کی تیزی ماند پڑ جانے کے بعد غروب سے پہلے عصر کی نماز پڑھنے سے نماز تو ہو جائے گی، لیکن اتنی تاخیر کرنا مکروہ ہے۔ اگر سورج غروب ہونے سے پہلے نماز شروع نہیں کی تو وہ قضاء شمار ہوگی۔

نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کے انتہائی وقت میں بھی قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز مغرب کا وقت شفق یعنی سرخی کے غائب ہونے تک ہے جو کہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سرخی ختم ہونے کے بعد سفیدی کے اختتام تک نماز مغرب کی تعیین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے سرخی پر محمول کرتے ہیں اور بعض سفیدی یعنی مغرب کی نماز کا وقت سورج غروب ہونے سے لے کر شفق ابیض غروب ہونے تک ہے اور شفق ابیض سے مراد وہ سفیدی ہے جو سورج غروب ہونے کے بعد آنے والی سرخی کے بعد آتی ہے، اس کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے۔

نماز عشاء کا وقت تین حیثیت سے ہے۔ اس کا اول وقت غروب آفتاب سے لیکر ایک تہائی رات ہے۔ مستحب یہ ہے کہ نماز کو ایک رات تک موخر کرے اور اگر لوگوں کو دقت ہو تو ابتدائی وقت

میں بھی پڑھی جاسکتی ہے۔عشاء کا دوسرا وقت تہائی رات سے نصف شب تک ہے اور صحیح وقت یہی ہے۔تیسرا وقت نصف رات کے بعد ہے۔اگر چہ نماز تو اس وقت بھی ادا ہو جائیگی مگر اس میں کراہت پائی جاتی ہے۔لہٰذا اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔بہر حال تیسرے وقت کی انتہا طلوع فجر تک ہے،مطلب یہ ہے کہ عشاء کی نماز کا وقت شفق ابیض غروب ہونے بعد شروع ہو جاتا ہے اور صبح صادق سے پہلے تک رہتا ہے۔اگر کسی عذر کی وجہ سے عشاء کی نماز میں تاخیر ہوگئی اور طلوعِ فجر سے پہلے پہلے عشاء کی نماز پڑھ لی تو وہ نماز ادا شمار ہوگی،قضا شمار نہیں ہوگی۔البتہ شدید عذر کے بغیر آدھی رات سے زیادہ تاخیر کرنا مکروہ ہے،اس لیے آدھی رات سے پہلے عشاء کی نماز پڑھ لینی چاہیے؛ تاکہ کراہت نہ ہو۔وتر کے لیے مستحب یہ ہے کہ اخیر رات میں تہجد کے بعد پڑھے،بشرطیکہ تہجد پڑھنے اور رات کو اٹھنے کا اہتمام ہو،لیکن اگر جاگنے کا اعتبار نہ ہو،اور سوتے رہ جانے کا ڈر ہو تو سونے سے پہلے پڑھ لینا چاہیے،باقی وتر کا وقت عشاء کے بعد سے لے کر صبح صادق ہونے سے پہلے پہلے تک ہے۔اور صبح صادق تک بھی عشاء کی نماز ادا نہیں کی تو قضا شمار ہوگی۔

نیز صبح صادق،طلوع وغروبِ آفتاب اور زوالِ شمس کا وقت ہر علاقے اور ہر موسم میں یکساں نہیں ہوتا،اس لیے اوقات نماز میں تفاوت اور فرق ہوتا رہتا ہے،لہٰذا مغرب اور عشاء کے درمیانی وقت کی تحدید نہیں کی جاسکتی؛ کیوں کہ اس وقت کی مقدار ماہ بماہ ہر علاقے اور موسم میں مختلف ہوتی رہتی ہے،تاہم عموماً یہ وقت سوا گھنٹے سے کم نہیں ہوتا، اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ یا ایک گھنٹہ پینتیس منٹ ہوتا ہے،سردیوں میں وقت کم اور گرمیوں میں کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔چوں کہ سایہ اصلی اور ایک مثل یا دو مثل یا مغرب کے وقت میں آسمان کی سرخی اور سفیدی کا سمجھنا عام لوگوں کے لیے دشوار ہے،اس لیے نمازوں کے اوقات کے سلسلے میں جو دائمی نقشہ اوقات کے کیلنڈر ترتیب دیئے گئے ہیں،اور جو محقق علماء کرام سے تصدیق شدہ ہیں،اس سے استفادہ کیا جائے،یعنی موثوق اور معتبر شائع دائمی نقشہ اور گھڑی کے مطابق اوقات نماز کا خیال رکھا جائے۔

نظام الاوقات کی عدم موجودگی میں نماز

جیسا کہ پہلے عرض کیا، اوقاتِ نماز کا تعین اسی خطہ ارضی میں کیا جاسکتا ہے۔ جہاں نظام الاوقات میں باقاعدگی پائی جاتی ہے البتہ جن مقامات پر یہ نظام ہی موجود نہ ہو، یا جہاں اس میں معتد بہ تبدیلی آجائے وہاں اوقات نماز کے تعین میں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص ہوائی جہاز کے ذریعے مغرب کی طرف مسلسل بیس گھنٹے سفر کرتا ہے تو اس کے لیے تو سورج غروب ہی نہیں ہوگا بلکہ ایک ہی حالت پر قائم رہے گا۔ تو ایسی صورت میں نماز ظہر اور عصر کیسے ادا کی جائیگی؟ قطبِ شمالی یا قطب جنوبی جہاں پر دن رات چھ ماہ یا کم وبیش عرصہ کے ہوتے ہیں، وہاں پر بھی نماز پنجگانہ کے اوقات کا تعین کسی دوسرے طریقے سے کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان چاند یا کسی دوسرے سیارے پر پہنچ جائے جہاں اس زمین کا نظام شب وروز موجود نہیں، تو وہ کیسے نمازیں ادا کریگا؟ دنیا میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں صرف چار نمازوں کا وقت ملتا ہے یعنی مغرب کی غروب شفق سے پہلے فجر طلوع ہوجاتی ہے اور اس طرح نماز عشاء کے لیے وقت نہیں ملتا۔ تو اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائیگا۔ اس ضمن میں حضور ﷺ نے قاعدے کے طور پر یہ بات سمجھادی کہ جب دجال کا ظہور ہوگا تو ایک دن ایک سال کے برابر طویل ہوجائے گا۔ ایک صحابی نے عرض کیا، حضور! کیا اتنے لمبے عرصہ میں پانچ ہی نمازیں ادا کرنا ہوں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں بلکہ ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ادا کرنی ہوں گی اور اس کے لیے اوقات کا تعین خود حساب لگا کر کرنا ہوگا تو مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ مقام جہاں نظام الاوقات معمول کے مطابق جاری نہیں یا کسی دوسرے سیارے میں جہاں زمین کا نظام لیل ونہار موجود نہیں، وہاں اوقاتِ نماز کا تعلق خود حساب لگا کر کرنا پڑے گا۔ اور ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں پڑھنا ہوں گی۔ غیر معمولی حالات میں بھی نماز ترک نہیں کی جاسکتی، کیونکہ نماز میں دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی چھوڑا نہیں جاسکتا پہلی چیز تہذیب نفس ہے۔ کہ نماز کے ذریعے انسان میں شائستگی پیدا ہوتی ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ نماز کے ذریعے انسان تعلق باللہ قائم کرتا ہے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں لہٰذا نماز پنج وقتہ بھی لازمی ہے۔ فرضیت نماز بقید وقت کا یہی مطلب ہے۔

دشمن کے تعاقب میں سستی نہ کرو

وَلَا تَهِنُوْا	اور نہ تم ہمت ہارو	فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ	(دشمن) قوم کی تلاش میں
اِنْ تَكُوْنُوْا	اگر ہوتم	تَاْلَمُوْنَ	دکھ اُٹھاتے
فَاِنَّهُمْ	تو بلاشبہ وہ (بھی)	يَاْلَمُوْنَ	دکھ اُٹھاتے ہیں
كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ	جیسے تم دکھ اُٹھاتے ہو	وَتَرْجُوْنَ	اور تم امید رکھتے ہو
مِنَ اللّٰهِ	اللہ سے	مَا لَا	جس کی نہیں
يَرْجُوْنَ ؕ	وہ امید رکھتے	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
عَلِيْمًا	خوب جاننے والا	حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾	بڑا حکمت والا

فرمایا وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو۔ یہاں پر قوم سے مراد دشمن ہے۔ جس طرح نماز میں سستی کرنا منع ہے، اس طرح دشمن کے تعاقب میں بھی سستی کی ممانعت ہے۔ گزشتہ سورہ میں گزر چکا ہے کہ احد کے موقع پر زخم خوردگی کے باوجود صحابہ کرام علیہم الرضوان نے کئی میل تک دشمن کا تعاقب کیا تاکہ وہ دوبارہ حملہ آور نہ ہو سکے۔ فرمایا اپنی تکالیف کے باوجود دشمن کا تعاقب کرو اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ اگر تم تکلیف میں مبتلا ہو فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ تو وہ کفار بھی تمہاری طرف تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ان کے اور تمہارے اجسام کی ساخت میں کوئی فرق نہیں نہ وہ زیادہ مضبوط ہیں اور نہ تم کمزور۔ جس طرح تمہیں دکھ درد آتا ہے اسی طرح انہیں بھی آتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کافر تو شیطانی پروگرام کے لیے تکالیف برداشت کرتے ہیں جب کہ تم اللہ کے دین کی خاطر نکلے ہو لہٰذا تمہیں بطریق اولیٰ مشقت برداشت کرنی چاہئے اور دشمن کا تعاقب کر کے اس پر کاری ضرب لگانی چاہئے۔ اس آیت میں بھی جنگ کے داؤ پیچ سکھائے گئے ہیں اور حکم ہو رہا ہے کہ جب ایک دفعہ تمہارا آمنا سامنا کفار سے ہو ہی جائے تو پھر ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت نہ برتی جائے ان کو آخر دم تک دھکیلتے رہو اور پوری طرح ان کا پیچھا کرو اور اچھی طرح ان کو سزا دو تاکہ فتنہ و فساد پوری طرح ختم ہو جائے۔ لڑائی سے جو کچھ تکالیف تمہیں اٹھانی پڑتی ہیں وہ تکالیف ان کو

بھی اٹھانی پڑتی ہیں مگر کیونکہ ان کا مقصد لڑائی کا اللہ کے خلاف لڑنا ہے جبکہ تمہارا مقصد صرف اور صرف اللہ اور اس کے دین کی سربلندی ہے، لہٰذا تمہیں خوش ہونا چاہیے اور مطمئن بھی کہ تم جیت گئے تو غازی، مارے گئے تو شہید، غازی اور شہید دونوں ہی اللہ رب العزت کی طرف سے بہترین انعامات کے مستحق ہوتے ہیں جو کہ دنیا میں بھی ملتے ہیں اور آخرت میں بھی ملیں گے فرمایا اس تمام جدوجہد کے نتیجے میں وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ تم اللہ تعالیٰ سے اس اجر کی امید رکھتے ہو، جو کافر نہیں رکھتے۔ کافر و مشرکین جہنم رسید ہوں گے جب تم میں سے ہر زخمی اور شہید اللہ تعالیٰ سے عظیم بدلا پائے گا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں درجات عالیہ پر فائز فرمائیں گے۔ اس دنیا میں بھی تمہارا مطمح نظر یہ ہے کہ اللہ کا دین غالب ہو۔ پیغمبر آخر الزمان کی بعثت کا مقصد ہی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنا چاہتا ہے اور اس کا صلہ تم اس دنیا میں بھی پالو گے اور آخرت میں بھی درجات عالیہ کے مستحق ہو گے۔ لہٰذا دشمن کے تعاقب میں سستی نہ دکھانا۔ فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کی نیت اور ارادے سے واقف ہے۔ ہر شخص کا خلوص اس کی نگاہ میں ہے اور وہ کمال حکمت کا مالک ہے۔ اس کے تمام احکام نسل انسانی کی فلاح کے لیے ہیں۔ اس آیت کے اسباق: تعاقب سے دشمن پر نفسیاتی دباؤ بڑھتا ہے۔ دوبارہ منظم ہونے سے روکنا یعنی دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا اسی طرح ادھوری کامیابی مستقبل کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اس ہدایت و اصول کو ہم اپنی روزمرہ زندگی کے چیلنجز پر بھی لاگو کر سکتے ہیں مثال ہم اپنے مسائل کو جڑ سے ختم کریں۔ اور سستی سے گریز یعنی اہداف کے حصول میں ڈھیل نہ دیں۔ اور مستقل مزاجی سے کامیابی کے آخری قدم تک جدوجہد جاری رکھیں۔ لہٰذا انسانوں کا فرض ہے کہ وہ بلاشک شبہ ان قرآنی احکام پر کماحقہ عمل پیرا ہو کر ہمیشہ کی کامیابی حال کر لیں۔

☆☆☆

اِستغفار کرنے کے دینی اور دُنیوی فوائد/ خیانت ایک سنگین گناہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ
لِّلْخَآىِٕنِیْنَ خَصِیْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ
عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ﴿۱۰۷﴾
یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا
یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ
عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ
عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۱۰۹﴾

صرف قبضے سے جرم ثابت نہیں ہوتا

اِنَّآ	تحقیق ہم نے	اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ	نازل کی آپ کی طرف
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	کتاب حق کے ساتھ	لِتَحْكُمَ	تا کہ آپ فیصلہ کریں
بَیْنَ النَّاسِ	درمیان لوگوں کے	بِمَآ	اس کے ساتھ جو
اَرٰىكَ اللّٰهُ	آپ کو اللہ نے سکھلایا	وَلَا تَكُنْ	اور نہ ہوں آپ
لِّلْخَآىِٕنِیْنَ	خیانت کرنے والوں کی خاطر	خَصِیْمًا ﴿۱۰۵﴾	جھگڑنے والے

جمہور مفسرین نے ان آیات (104 سے لیکر 113 تک) کی شان نزول چوری کا ایک واقعہ بتایا ہے، ارشاد ہوتا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ بیشک ہم نے یہ کتاب (قرآن مجید) آپ کی طرف حق کے ساتھ اتاری ہے۔ اس کتاب کے اصول، ضوابط احکام اور فرامین سب برحق ہیں۔ اور اسے نازل کرنے کا مقصد یہ ہے لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ فیصلہ کریں، جو اللہ نے آپ کو سمجھائی ہے اَرٰىكَ بمعنی رویت یعنی دیکھنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ اس چیز کے ساتھ فیصلہ کریں جو چیز اللہ نے آپ کو دکھائی ہے یا سمجھائی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس روایت یا فقاہت کا ذریعہ اللہ کی وحی ہے۔ تو فرمایا وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِیْنَ خَصِیْمًا ﴿۱۰۵﴾ آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں۔ یعنی ان منافقین نے اپنی صفائی کے لیے جو ماحول پیدا کر دیا ہے، ان سے متاثرہ ہو کر آپ ان کی حمایت نہ کریں۔

مدینہ میں ایک خاندان 'بنو اُبَیْرِق' تھا، بشر، بشیر اور مبشر تین بھائی تھے، جو ابیرق یا طعمہ بن ابیرق کے بیٹے تھے۔ بعض نے کہا کہ ان میں سے بشیر کی کنیت اور بعض نے کہا کہ بشر کی ابوطعمہ تھی، یہ لوگ مدینہ کے قبیلہ بنوظفر سے تھے۔ ان میں بِشر سب سے بدتر تھا، یہ شخص منافق تھا اور مسلمانوں کی ہجو کر کے وہ شعر دوسروں کے نام لگا دیتا تھا۔ تھا یعنی اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی مذمت کرتا اور دوسروں کی طرف منسوب کر کے ان بے ہودہ اشعار کو نقل کرتا اور پھیلاتا، اخلاق و اطوار بھی اس کے بہتر نہ تھے؛ چنانچہ شام سے ایک تجارتی قافلہ آیا، حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے چچا رِفاعہ بن رافع نے قافلہ سے سفید اچھا آٹا خرید کیا اور اسے بالاخانہ میں رکھ دیا، جس میں ان کے ہتھیار بھی تھے، رات میں بشر نے مکان میں نقب لگائی اور سامان و ہتھیار دونوں لے بھاگا، صبح تلاش ہوئی تو لوگوں نے بعض قرائن و علامات کی وجہ سے بشر پر شبہ ظاہر کیا، تفتیش کے دوران خود بنو ابیرق نے ایک مخلص مسلمان حضرت لبید بن سہل ؓ پر اس چوری کا الزام لگا دیا، چچا کی خواہش پر حضرت قتادہ ؓ نے بارگاہ نبوی میں مقدمہ پیش کیا اور بشر کو ملزم ٹھہرایا اور کہا کہ کم سے کم ہتھیار واپس مل جائے، ادھر بشر کے ہمنواؤں نے اُسَیْر بن عُروہ کو اپنا وکیل بنایا، اسیر نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ قتادہ نے بلا ثبوت ہم میں

سے ایک مخلص مسلمان پر چوری کی تہمت لگائی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت قتادہؓ سے فرمایا کہ تم نے بلا ثبوت وشہادت ایک مسلمان کو متہم کیا، رِفاعہ نے بھی صبر کیا، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی اور بشر کی خیانت کا پردہ فاش کر دیا گیا، پھر بِشر نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا، ہتھیار واپس کیا اور مشرکین مکہ سے جاملا۔ (ترمذی، باب ومن سورۃ النساء، حدیث نمبر ۳۰۳۶)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے جنہوں نے بنو ابیرق کی باتوں میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ان کی صفائی پیش کی تھی حضور ﷺ نے بھی ظاہری حالات کے مطابق منافقین کو بے گناہ سمجھ کر حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کو ڈانٹا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی ہے اور تمام اہل ایمان کو یہ بات اصولاً سمجھادی ہے کہ خائن لوگوں کی طرف داری نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیشہ پوری تحقیق کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہئے اور حق کی حمایت کرنی چاہئے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات قاضی ایک فریق کی چرب زبانی کی وجہ سے اس کے حق میں فیصلہ دے دے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صحیح نہیں ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "خبردار! میں ایک انسان ہی ہوں اور جس طرح سنتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہوں، ممکن ہے ایک شخص اپنی دلیل وحجت پیش کرنے میں تیز طرار اور ہوشیار ہو اور میں اس کی گفتگو سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، حالانکہ وہ حق پر نہ ہو اور اس طرح میں دوسرے مسلمان کا حق اسے دے دوں، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ آگ کا ٹکڑا ہے، اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔" [بخاری، المظالم، باب إثم من خاصم۔۔:2458]

استغفار کی تلقین اور بہترین خطا کار کون؟

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ	اور بخشش مانگیں اللہ سے	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بیشک اللہ ہے
غَفُوْرًا	بہت بخشنے والا	رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾	نہایت رحم کرنے والا

فرمایا منافقوں کو بے گناہ سمجھنے میں جو لغزش ہوئی ہے اس کے لیے وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ آپ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، اس کی بخشش کے طلب گار ہوں۔ اور ساتھ ساتھ تمام اہل اسلام کو بھی یہ بات

سمجھادی کہ جب بھی کوئی ایسی غلطی ہوجائے۔فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنی چاہئے۔اللہ تعالیٰ کا قانون حق وانصاف پر مبنی ہے۔اس کے مطابق اپنے تنازعات نپٹائے جائیں۔رشتہ داری،خویش پروری اور اقربانوازی نہیں ہونی چاہئے۔ایسی خطا پر جب معافی طلب کریں گے اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۰۶﴾ تو اللہ تعالیٰ بھی بخشش کرنے والا اور مہربان ہے۔وہ ضرور معاف فرمادے گا۔لہٰذا غلطی پر معافی مانگنے میں تامل نہیں کرنا چاہئے۔۔حضرت عبداللہ بن عباس رضیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے روایت ہے،رسولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جس نے استغفار کو اپنے لئے ضروری قرار دیا تو اللہ تعالیٰ اسے ہر غم اور تکلیف سے نجات دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرمائے گا جہاں سے اسے وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔(ابن ماجہ،کتاب الادب،باب الاستغفار،۴/ ۲۵۷،الحدیث:۳۸۱۹) حضرت)انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر انسان خطا کار ہے(یعنی ہر انسان گناہ کرتا ہے،سوائے انبیاء کے؛ کیوں وہ معصوم عن الخطاء ہیں)،اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں"۔بندہ مومن خطا کار تو ہے ہی لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق بہترین خطا کار وہ ہوتا ہے جو اپنی خطاؤں کو اللہ تعالیٰ سے معاف کروانے کے لیے ہر دم فکر مند رہتا ہے اور اس کے لیے عملی طور پر جدوجہد بھی کرتا ہے تاکہ اس کے گناہ مٹ جائیں اور اللہ اس پر راضی ہوجائے۔مومن جب اپنی خطاؤں کی طرف دیکھتا ہے اور دوسری طرف اسے اللہ کے عذاب کا ڈر بھی ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان نیک اعمال کو بجالاتا ہے جو اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں کیونکہ نیک اعمال ہی وہ چیز ہیں جنہیں اخلاص ومحبت کے ساتھ سرانجام دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے خطا کار انسان کی خطاؤں کو معاف فرمادیتا ہے۔

خیانت،اس کی اقسام اور خیانت کار

وَلَا تُجَادِلْ	اور نہ آپ جھگڑا کریں	عَنِ الَّذِیْنَ	ان لوگوں کی طرف سے جو
یَخْتَانُوْنَ	خیانت کرتے ہیں	اَنْفُسَھُمْ ؕ	اپنے آپ سے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ	تحقیق اللہ نہیں پسند کرتا	مَنْ کَانَ	اس شخص کو جو ہے
خَوَّانًا	خائن	اَثِیْمًا ﴿۱۰۷﴾	گنہگار (۱۰۷)

فرمایا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ اور آپ ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں جو اپنے نفسوں کے ساتھ خیانت کرنے والے ہیں۔ جو شخص چوری کرتا ہے، وہ ظاہر ہے کہ اپنے ہی نفس سے خیانت کرتا ہے۔ اس کا وبال اسی پر پڑے گا، دنیا و آخرت میں اسی سے باز پرس ہوگی اور اسے اس کا بدلہ چکانا ہوگا۔ فرمایا خائنوں کی حمایت نہ کریں، 'خیانت'، جیسا کہ معروف ہے، 'امانت' کی ضد ہے۔ 'خیانت' کی برائی کی سنگینی کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کا یہ اعلان کافی ہے کہ اللہ رب العزت، 'خیانت' میں ملوث ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرمائے اس کے انجامِ بد کے بارے میں کیا شبہ ہوسکتا کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ﴿۱۰۷﴾ بیشک اللہ تعالیٰ خائن اور گنہگار آدمی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تو عدل و انصاف کا حامی ہے اور اطاعت گزار کو پسند فرماتا ہے۔ دھوکہ باز اور خیانت کرنے والوں سے وہ بیزار ہے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرمائے اس کے انجامِ بد کے بارے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ اس کے موجب وبال و مہلک ہونے کے سلسلے میں قرآن کی یہ مزید وضاحت لائق توجہ ہے کہ اللہ کو ہر خیانت کار ناپسند ہے، اسلئے کہ وہ سخت گنہ گار اور ناشکرا ہوتا ہے۔

خیانت کی اقسام

امانت کی طرح خیانت کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم میں جہاں امانت کی ادائیگی کا تاکیدی حکم ہے (النساء: ۵۸)، وہاں لفظ 'امانات' (جمع) استعمال ہوا ہے اور جن آیات میں امانت کی ادائیگی اہلِ ایمان کے ایک امتیازی وصف کے طور پر بیان ہوئی ہے ان میں بھی 'امانات' ہی مذکور ہے (المؤمنون: ۸؛ المعارج: ۳۲)۔ اور جہاں امانت میں خیانت کی ممانعت وارد ہوئی ہے (الانفال: ۲۷) وہاں بھی جمع ہی مستعمل ہے۔ اس سے یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ امانت کی مختلف صورتیں ہیں، اسی طرح اس کی ضد یعنی خیانت کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور یہ تمام کی

تمام ممنوع ہیں۔ان میں دو سب سے بڑی یا بدترین قسم کی خیانت، اللہ و رسول ﷺ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ خیانت ہے۔ان کے علاوہ خیانت کی اور جتنی شکلیں ہیں وہ سب کسی نہ کسی طور پر ان میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتی ہیں۔ارشادِ ربانی ہیں: ''اے اہلِ ایمان! اللہ و رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ اپنی [آپس کی] امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت کا ارتکاب کرو۔'' (الانفال: ۲۷) اردو تفاسیر میں اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کا مفہوم جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ ہے: اللہ کے حکموں کو توڑنا، کتابِ الٰہی کی ہدایات کی خلاف ورزی کرنا اور روز مرہ زندگی میں سنتِ رسول ﷺ پر عمل سے انحراف کرنا۔بعض مفسرین کے یہاں اس کی ایک تعبیر یہ بھی ملتی ہے کہ ظاہر میں تو حکمِ الٰہی پر پابند رہا جائے، لیکن پوشیدہ طور پر یا تنہائی میں اس کی خلاف ورزی کی جائے اسی کا نام خیانت ہے۔(معارف القرآن، ج ۸، ص ۵۰۶؛ تفسیر احسن البیان، ص ۷۳۴) ان سب تشریحات کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ خیانت سے مراد ہے: ایمان کے تقاضوں کو پورا نہ کرنا، اللہ کے حکموں کو توڑنا، روز مرّہ زندگی کے معاملات میں کتابِ الٰہی کی ہدایات، اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر عمل نہ کرنا اور اللہ اور رسول ﷺ اور مسلمانوں کے دشمنوں کو خفیہ طور پر مدد بہم پہنچانا یا مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے خلاف کام کرنا۔جہاں تک آیت میں مذکور آپس میں امانتوں میں خیانت کا تعلق ہے، اس میں وہ تمام معاملات آتے ہیں جن کا تعلق حقوق العباد یا اللہ کے بندوں کے حقوق سے ہے۔ان حقوق کی عدمِ ادائیگی یا ادائیگی میں غفلت و کوتاہی خیانت ہے۔اسی طرح کوئی کام یا ذمہ داری کسی کے سپرد ہو اسے نہ انجام دینا یا اس میں لاپرواہی برتنا خیانت ہے۔اللہ کے بندوں کے حقوق کی عدمِ ادائیگی سے خیانت کی جو مختلف شکلیں ظہور میں آتی ہیں ان کی ایک جامع تعبیر علّامہ سیّد سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے اِن الفاظ میں ملتی ہے: ''ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے۔اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسا کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر

ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا،علیٰ ہٰذا،عام مسلمانوں،ائمۂ وقت اور اپنے متفقہ قومی وملّی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بد دیانتی ہے۔دوست ہو کر دوستی نہ نبھانا بھی خیانت ہے۔شوہر و بیوی ایک دوسرے کی وفاداری نہ کریں تو یہ بھی خیانت ہے،دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں۔"(سیرۃ النبی ﷺ ج ۶،ص ۳۹۶) واقعہ یہ کہ جس کسی کے قلب میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت اور اس کے احکام کی قدر و قیمت جاگزیں ہوگی وہ اس کے بندوں کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں کرسکتا جو ان کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو۔اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ خیانت و بد دیانتی بہر صورت لوگوں کے لئے زحمت،مضرت اور دل آزاری کا باعث بنتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ خیانت،خواہ کسی بھی صورت میں ہو،اس کا تعلق انسان کے اندرون یا اس کے نفس سے ہوتا ہے۔خیانت کو چھپی ہوئی برائی یا اندرونی بیماری اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس میں سب سے بڑا دخل نیت کی خرابی کا ہوتا ہے۔در اصل یہ ناپاک ارادے (کسی کو نقصان پہنچانا،کسی کے مخالف یا دشمن کی خفیہ مدد کرنا،کسی کو ذہنی اذیت دینا،بد دیانتی کرکے مال کی ہوس پوری کرنا،اپنے فائدے کے لئے کسی کے راز کو افشاء کرنا) ہوتے ہیں جو خیانت جیسی سنگین برائی کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں۔اس سے وکالت کا پیشہ کرنے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ وکیل کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا موکل مجرم و خائن ہے لیکن وہ مال بٹورنے کے چکر میں مظلوم کو ظالم اور ظالم کو مظلوم بنا دیتا ہے اور ظالم کی طرف داری کرتا ہے،اس کی طرف سے دلائل پیش کرتا ہے،جھوٹ بولتا ہے،دوسرے فریق کا حق مارتا ہے اور نہ جانے کن کن حرام کاموں کا مُرتکِب ہوتا ہے۔کورٹ کچہری سے تعلق رکھنے والے حضرات ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے اس فرمان کو بغور پڑھیں، نیز اللہ تعالیٰ کے ان فرامین پر غور کریں۔اور حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے ان ارشادات پر غور کریں اور اپنے برے افعال سے توبہ کریں،چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ

سے روایت ہے، رسولُ اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ''جو خیانت کرنے والے کی پردہ پوشی کرے تو وہ بھی اس ہی کی طرح ہے۔ (ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب النہی عن السترعلی من غلّ، ۳/ ۹۳، الحدیث: ۲۷۱۶) حضرت ابو بکر صدیق رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ''وہ شخص ملعون ہے جو اپنے مسلمان بھائی کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ دھوکہ کرے۔ (تاریخ بغداد، ۲۶۲- محمد بن احمد بن محمد بن جابر۔۔۔الخ، ۱/ ۳۶۰) یہ بھی یاد رہے کہ جھوٹی وکالت کی اجرت حرام ہے۔

تقویٰ وطہارت کی بنیاد

يَّسْتَخْفُوْنَ	وہ چھپتے ہیں	مِنَ النَّاسِ	لوگوں سے
وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ	اور نہیں وہ چھپ سکتے	مِنَ اللّٰهِ	اللہ سے
وَهُوَ	اور وہ	مَعَهُمْ	ان کے ساتھ ہوتا ہے
اِذْ يُبَيِّتُوْنَ	جب کہ وہ مشورہ کرتے ہیں	مَا لَا	اس چیز کا کہ نہیں
يَرْضٰى	وہ راضی ہوتا	مِنَ الْقَوْلِ ؕ	اس بات سے
وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ	بِمَا	اس کو جو
يَعْمَلُوْنَ	وہ کرتے ہیں	مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾	گھیرنے والا

فرمایا يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ لوگوں سے چھپ چھپا کر معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں چوری کرتے ہیں خفیہ سازش کرتے ہیں۔ مگر انہیں علم ہونا چاہئے وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو ہر آن ہر چیز کو دیکھ رہا ہے، وہ گوشتہ کہاں پائیں گے جہاں اللہ تعالیٰ کی نظر نہ پہنچتی ہو يَّسْتَخْفُوْنَ کا معنی شرمانا بھی ہو سکتا ہے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ منافقین لوگوں سے شرما کر چوری چھپے غلط کام کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ جو حاضر ناظر ہے اس سے نہیں شرماتے، یہ اس قدر ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ یعنی طعمہ اور اس کی قوم کے افراد لوگوں سے حیا کرنے کی بنا پر اور ان کی طرف سے نقصان پہنچنے کے ڈر سے اُن سے تو شرماتے اور چھپتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں

شرماتے حالانکہ وہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے اور اس کے عذاب سے ڈرا جائے کیونکہ وہ ان کے احوال کو جانتا ہے اور اس سے ان کا کوئی عمل چھپا ہوا نہیں حتی کہ وہ ان کے اس عمل سے بھی واقف ہے جب وہ اپنے دل میں ایسی بات تجویز کرتے ہیں اور رات میں ایسی بات کا مشورہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں جیسے بے گناہ پر الزام لگانا، جھوٹی قسم کھانا اور جھوٹی گواہی دینا، اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام ظاہری و باطنی تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ان کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں۔ (جلالین، النساء، تحت الآیۃ: ۹۷ ص ۸۶، روح البیان، النساء، تحت الآیۃ: ۱۰۸، ۲/ ۲۷۹-۲۸۰ ملتقطاً)

اَللّٰہُ مَعِیْ، اَللّٰہُ نَاظِرِی، اَللّٰہُ شَاھِدِی کے فوائد و برکات

فرمایا وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ ؕ حالانکہ وہ اس وقت بھی ان کے پاس ہوتا ہے جب وہ راتوں کو ایسی باتیں کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں۔ یہ آیتِ مبارکہ تقویٰ و طہارت کی بنیاد ہے۔ اگر انسان یہ خیال رکھے کہ میرا کوئی حال اللہ عَزَّوَجَلَّ سے چھپا ہوا نہیں تو گناہ کرنے کی ہمت نہ کرے۔ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ اسی چیز کے ذریعے لوگوں کو گناہوں سے رکنے کا حکم دیا ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ دیکھ رہا ہے۔ اس جملے کا اگر کوئی شخص مراقبہ کرلے اور اسے اپنے دل و دماغ میں بٹھالے تو گناہوں کا علاج نہایت آسان ہوجائے گا۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں: میں تین سال کی عمر کا تھا کہ رات کے وقت اٹھ کر اپنے ماموں حضرت محمد بن سوار رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کو نماز پڑھتے دیکھتا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے فرمایا: کیا تو اس اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتا جس نے تجھے پیدا کیا ہے؟ میں نے پوچھا: میں اسے کس طرح یاد کروں؟ آپ رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے فرمایا: جب لیٹنے لگو تو تین بار زبان کو حرکت دیئے بغیر محض دل میں یہ کلمات کہو: "اَللّٰہُ مَعِیْ، اَللّٰہُ نَاظِرِی، اَللّٰہُ شَاھِدِی" (تصوف اور سلوک کی اصطلاح میں "اَللّٰہُ مَعِیْ، اَللّٰہُ نَاظِرِی، اَللّٰہُ شَاھِدِی" (اللہ میرے ساتھ ہے، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اللہ میرا گواہ ہے) کو "کلماتِ حضور" یا "مراقبہ" کہا جاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اٹھتے بیٹھتے، خاص طور پر رات کو

سونے سے پہلے، دل کی دھڑکن کے ساتھ ان کلمات کا دھیان کرنا زبان سے پڑھنے سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ حضرت سہل رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں) میں نے چند راتیں یہ کلمات پڑھے اور پھر ان کو بتایا، انہوں نے فرمایا: ہر رات سات مرتبہ یہ کلمات پڑھو، میں نے ایسا ہی کیا اور پھر انہیں بتایا تو انہوں نے فرمایا: ہر رات گیارہ مرتبہ یہ کلمات پڑھو۔ میں نے اسی طرح پڑھا تو مجھے اپنے دل میں اس کی لذّت معلوم ہوئی۔ جب ایک سال گزر گیا تو میرے ماموں نے کہا: میں نے جو کچھ تمہیں سکھایا ہے اسے یاد رکھو اور قبر میں جانے تک ہمیشہ پڑھنا، یہ تمہیں دنیا و آخرت میں نفع دے گا۔ میں نے کئی سال تک ایسا کیا تو میں نے اپنے اندر اس کا مزہ پایا، پھر ایک دن میرے ماموں نے فرمایا: اے سہل! اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ ہو، اسے دیکھتا ہو اور اس کا گواہ ہو، کیا وہ اس کی نافرمانی کرتا ہے؟ تم اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھو۔ (احیاء علوم الدین، کتاب ریاضۃ النفس وتہذیب الاخلاق۔۔۔الخ، بیان الطریق فی ریاضۃ الصبیان۔۔۔الخ، ۳ / ۹۱) زرہ کا چور دراصل سچا مسلمان نہیں بلکہ منافق آدمی تھا اور اس کے خاندان والے بھی کچھ پختہ ایمان والے نہ تھے۔ جب یہ مقدمہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے ہاں چلا گیا تو ان لوگوں کے مشورے کا موضوع یہ ہوتا تھا کہ چور کس طرح چوری کے اس جرم سے بچ سکتا ہے اور یہ جرم اس یہودی کے سر کیسے تھوپا جائے۔ دراصل اس طرح راتوں کو مشورے کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس طرح ان کے جرم پر پردہ پڑا رہے گا، یہی ان لوگوں کے ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے اور اللہ سے کوئی معاملہ بھلا کیسے چھپا رہ سکتا ہے۔ فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ منافقین جو کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا احاطہ کرنے والا ہے۔ وہ محیط کل ہے کوئی چیز اس کے علم اور احاطہ قدرت سے باہر نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی تمام چالوں سے اپنے نبی کو بذریعہ وحی آگاہ کر دیا اور اس طرح ان کی سازش کو بے نقاب کر دیا۔

اللہ کی گرفت اور مجرمین کی بے بسی و بے اختیاری

هٰۤاَنْتُمْ	(ہاں!) تم	هٰۤؤُلَآءِ	وہی لوگ ہو
جٰدَلْتُمْ	(کہ) تم نے جھگڑا کیا	عَنْهُمْ	ان کی طرف سے

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ	زندگانی دنیا میں	فَمَنْ	پھر کون
یُّجَادِلُ اللّٰہَ	جھگڑا کرے گا اللہ سے	عَنْھُمْ	ان کی طرف سے
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ	قیامت کے دن	اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ	یا کون ہوگا
عَلَیْھِمْ	ان کی طرف سے	وَ کِیْلًا ﴿۱۰۹﴾	وکیل؟

آگے فرمایا ھٰٓاَنْتُمْ "ھا" حرف تنبیہ ہے۔یعنی تم غور سے سنو ھٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف سے تم دنیا کی زندگی میں جھگڑا کرتے ہو۔ان خائنوں اور گنہگاروں کی طرفداری کرتے ہو،ان کی سفارش کرتے ہو اور ان کی صفائی پیش کرتے ہو۔اس دنیا میں تو ایسا کر رہے ہو فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰہَ عَنْھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مگر قیامت کے دن اللہ کے سامنے ان کی طرف سے کون جھگڑا کریگا۔اس دن تمام راز فاش ہوجائیں فَمَا لَہٗ مِنْ قُوَّۃٍ وَّلَا نَاصِرٍ "تو اس دن ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہوگا۔تو فرمایا اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْہِ وَکِیْلًا ﴿۱۰۹﴾ اس دن گنہگاروں کی کون وکالت کریگا،یہ لوگ اس دنیا میں تو چرب زبانی کر کے غلط سفارش کرا لیتے ہیں مگر قیامت کے دن اللہ کے ہاں کون سا ایڈوکیٹ (Advocate) یا بیرسٹر (Barrister) پیش کریں گے۔وہاں کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا گویا اہل ایمان کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ آئندہ ایسے دھوکہ بازوں کی طرفداری نہ کریں اور ہمیشہ حق کی حمایت کریں۔اس آیت میں عام لوگوں سے اور بطورِ خاص طعمہ کی قوم سے خطاب فرمایا گیا ہے کہ اے لوگو! سن لو،تم جو آج دنیا کی زندگی میں ان خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑتے ہو تو جب قیامت کے دن خیانت کرنے والا مجرم اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی بارگاہ میں پیش ہوگا اور اللہ عَزَّ وَجَلَّ اس کے عذاب کا فیصلہ فرمادے گا تو اس وقت کون ان کی طرف سے اللہ عَزَّ وَجَلَّ سے جھگڑے گا یا کون ان کا وکیل و کارساز ہوگا؟ یعنی جیسے دنیا میں تم فیصلہ کرنے والے کو دھوکہ دیدیتے ہو اس طرح دھوکہ دینے کے لئے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی بارگاہ میں جھگڑنا ناممکن ہے کہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ سے کچھ پوشیدہ نہیں۔

☆☆☆

اپنے گناہ دوسروں کے ذمہ لگانا اور بہتان تراشی/ عصمت انبیاء علیہم السلام

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ⑩

وَمَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَکْسِبُہٗ عَلٰی نَفْسِہٖ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ⑪ وَمَنْ

یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَۃً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُھْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ⑫

گناہوں کی بخشش کیلئے استغفار کا طریقہ کار

وَمَنْ یَّعْمَلْ	اور جو کوئی عمل کرے	سُوْٓءًا	بُرا
اَوْ یَظْلِمْ	یا ظلم کرے	نَفْسَہٗ	اپنی جان پر
ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ	پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے	یَجِدِ اللّٰہَ	(تو) پائے گا اللہ کو
غَفُوْرًا	بہت بخشنے والا	رَّحِیْمًا ⑩	نہایت رحم کرنے والا

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اصول کے طور پر یہ ارشاد فرمایا وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا جو شخص برائی کا ارتکاب کرے گا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ یا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا سوء، اور ظلم تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں اور برائی یا گناہ پر محمول کیے جاتے ہیں تاہم سوء سے مراد وہ گناہ ہے جو متعدی ہو یعنی خود گناہ کر کے الزام دوسرے پر لگا دیا جائے یا بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر وہ براہ راست

دوسروں پر پڑتا ہے، جیسے کسی کو قتل یا زخمی کر دیا جائے، کسی کی بے عزتی کی جائے یا مال چوری کر لیا جائے اور ظلم وہ گناہ ہے جس کا اثر مرتکب کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، جیسے نماز، روزہ وغیرہ کا تارک یا حلال وحرام سے بے نیاز، تو فرمایا کسی قسم کا گناہ بھی کیا ہے، اس کے بعد ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے تو يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ⑩ یقینا اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا، کیونکہ اس زندگی میں بڑے سے بڑے گناہ کفر اور شرک سے بھی توبہ ہوسکتی ہے۔ البتہ حقوق العباد میں یہ شرط ہے کہ توبہ کے ساتھ وَاَصْلَحَ یعنی جس شخص کا حق تلف کیا ہے، اسے ادا کرے یا اس سے معاف کرالے۔ اگر متعلقہ شخص معاف کر دے تو بھی مجرم بری الذمہ ہوگیا بہرحال اللہ نے یہ توبہ کا قانون بھی بتادیا ہے کہ اِنَّ التَّوْبَةَ مَعْرُوْضَةٌ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ انسان کی توبہ اس وقت تک قابل قبول ہے۔ جب تک زندگی کے آخری لمحات میں غرغرے کی حالت طاری نہ ہوجائے، جب اس کی جان لبوں پر آجاتی ہے اور عالم غیب کا پردہ اٹھ جاتا ہے فرشتے اور برزخ کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں، تو اس وقت توبہ کی قبولیت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے پہلے تندرستی ہو، بیماری ہو، ہر حالت میں توبہ قبول ہوتی ہے۔

گناہ ایک سنگین ومہلک ترین روحانی مرض ہے۔ اللہ کی نافرمانی اور گناہ وہ مضر شے ہے جس سے انسان کے قلب میں زنگ لگ جاتا ہے اور قلب سیاہ ہوجاتا ہے، اس کا بہترین علاج توبہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان خطاونسیان کا پتلا ہے، غلطی اور گناہ کرنا اس کی جبلت میں داخل ہے، مگر بہترین گناہ گار وہ ہے جو اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہائے اور اپنے کیے پر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرے، معافی مانگے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرے۔

توبہ کیا ہے؟ اور استغفار کس طرح کیا جائے؟

تین چیزوں کے مجموعہ کا نام توبہ ہے، ایک یہ کہ جو گناہ سرزد ہوجائے اس پر دل سے ندامت وشرمندگی اور پشیمانی ہو۔ دوسرے یہ کہ جو گناہ ہو اس کو فوراً چھوڑ دے۔ تیسرے یہ کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم مصمم (پکا ارادہ) ہو، ان ہی تین چیزوں کے مکمل ہونے پر توبہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ قرآن وحدیث میں توبہ کرنے والوں کے لیے خوش خبری اور بشارت دی گئی اور اللہ تعالیٰ توبہ کرنے

والوں کو پسندیدگی اور محبوبیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بہر حال! ''استغفار'' کے معنی ہیں توبہ کرنا، یعنی اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی مانگنا اور بخشش طلب کرنا۔ اور اس کی حقیقت اور روح یہ ہے کہ آدمی اپنے گناہوں کو سوچے، جنہوں نے اس کے نفس کو گھیر رکھا ہے، یعنی اس کو میلا اور گندہ کر رکھا ہے اور پھر اسبابِ مغفرت اختیار کر کے نفس کو ان گناہوں سے پاک کرے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول باری تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرے، اور اس پر ندامت کا اظہار کرے، اور آئندہ گناہ نہ کرنے پکا عزم کرے اور اس کے بعد صدقِ دل سے توبہ و استغفار کرے، اور اس کے لیے کوئی بھی ایسے الفاظ جن میں اللہ سے معافی مانگنے کا معنی موجود ہو استعمال کیے جاسکتے ہیں، اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے سچے دل سے "أَسْتَغْفِرُ الله" بھی کہا جاسکتا ہے، اور اس کے بہترین الفاظ میں سے چند یہ ہیں: أَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِیْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَأَتُوْبُ إِلَیْهِ، أَسْتَغْفِرُ اللهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ أَتُوْبُ إِلَیْهِ اور رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ استغفار کے کلمات تو مسلسل پڑھتے رہنا چاہیے، نبی کریم ﷺ سے ایک ایک مجلس میں ستر ستر مرتبہ استغفار ثابت ہے۔ البتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد گناہوں کے بارے میں اپنے اختیار سے بار بار نہیں سوچنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھی جائے کہ وہ صدقِ دل سے توبہ کے بعد معاف کر دیں گے۔

انفرادی ذمہ داری کا اصول

وَمَنْ یَّكْسِبْ	اور جو شخص کماتا ہے	اِثْمًا	کوئی گناہ
فَاِنَّمَا	تو بلاشبہ	یَكْسِبُهٗ	وہ کماتا ہے اسے
عَلٰی نَفْسِهٖ ؕ	اپنے ہی خلاف	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
عَلِیْمًا	خوب جاننے والا	حَكِیْمًا ﴿۱۱۱﴾	نہایت حکمت والا

آگے فرمایا وَمَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا جو کوئی شخص گناہ کمائے گا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ تو یقیناً وہ اپنے نفس پر ہی کمائے گا، یعنی جو آدمی قصداً برائی کا ارتکاب کرتا ہے اس کا وبال اسی کی جان

پر پڑے گا۔ایسے جرم میں وہ خود ہی ماخوذ ہوگا۔وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪۱ اللہ تعالیٰ علیم ہے کہ ہر چیز سے واقف ہے اور حکیم ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔وہ گناہ کرنے والے کے گناہ اور اس کی سزا کو جانتا ہے اور اس کا ہر فیصلہ پر از حکمت ہے۔

اس آیت کی تشریح ان درج ذیل نکات سے سمجھی جا سکتی ہے: 1۔انفرادی ذمہ داری کا اصول کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔گناہ کا نقصان صرف گناہگار کو ہوتا ہے۔2۔گناہ کا حقیقی نقصان گناہ سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔گناہ انسان کی اپنی روح کو آلودہ کرتا ہے۔اس سے انسان دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھاتا ہے۔3۔شانِ نزول کا پس منظر یہ آیت طعمہ بن ابیرق نامی شخص کے واقعے کے تناظر میں نازل ہوئی۔اس نے چوری کر کے الزام ایک بے گناہ یہودی پر لگا دیا تھا۔اللہ نے واضح کیا کہ جھوٹا الزام لگا کر اس نے اپنا ہی نقصان کیا۔4۔اللہ کی صفات (علیم وحکیم) علیم: اللہ ہر چھپی اور کھلی بات کو جانتا ہے۔وہ نیتوں اور سازشوں سے پوری طرح باخبر ہے۔حکیم: اس کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہے۔وہ مجرم اور بے گناہ کو اچھی طرح جانتا ہے اور عادلانہ سزا دیتا ہے۔

بُہتان طرازی..... سنگین معاشرتی بُرائی

وَمَنْ يَّكْسِبْ	اور جو شخص کرتا ہے	خَطِيْٓئَةً	کوئی خطا
اَوْ اِثْمًا	یا کوئی گناہ	ثُمَّ يَرْمِ	پھر وہ الزام لگاتا ہے
بِهٖ	اس کا	بَرِيْٓـًٔا	(کسی) بے گناہ پر
فَقَدِ احْتَمَلَ	تو تحقیق اس نے اپنے ذمے لے لیا	بُهْتَانًا	بہتان
وَّاِثْمًا	اور گناہ	مُّبِيْنًا ⑫	ظاہر

فرمایا وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا جس شخص نے کوئی خطا کی یا گناہ کا ارتکاب کیا۔خطا سے مراد صغیرہ گناہ جو بغیر ارادے کے سہواً سرزد ہو گیا۔اور اثم وہ بڑا گناہ ہے جو نیت اور ارادے سے کیا جائے نیکی اور بدی وہی موثر ہوتی ہے جو قصداً کی جائے۔تو فرمایا جس شخص نے چھوٹا گناہ کیا

یا بڑا اُثْمًّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓـًٔا پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دی جیسا کہ اس منافق نے چوری کا ارتکاب کر کے دوسروں کو ملوث کرنے کی کوشش کی تھی، تو فرمایا فَقَدِ احْتَمَلَ بُہْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۱۱۲﴾ ایسے شخص نے بہت بڑا افترا اور گناہ اٹھالیا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کر دیا کہ کسی بے گناہ پر اتہام لگانا بہت بڑا جرم ہے۔ اس سے بچتے رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ منافقین کی مذمت بھی بیان فرمادی۔ اخلاقی رذائل میں بُہتان طرازی یا تُہمت وہ بدترین گُناہ ہے کہ جس کے متعلق قرآن وحدیث میں متعدد بار سرزنش کی گئی ہے اور اس سے بچنے اور اس کے وبال کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن میں اس جرم کی سنگینی کے پیشِ نظر اس کی سزا 'حدِ قذف' تک مقرر کر دی گئی ہے۔ شرعی اصطلاح میں وہ بُرائی جو کسی شخص میں سرے سے موجود ہی نہ ہو اور اُس سے منسوب کر دی جائے یا اُس بے گناہ کے سر اِس لیے تھوپ دی جائے کہ اُس کی تذلیل و بدنامی مقصود ہو اِسے تُہمت یا اِتّہام کہتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاحزاب، آیت 58 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، 'اور جو لوگ مومن مرد اور عورتوں کو ایسے کام سے جو اُنہوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو اُنہوں نے بُہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا'۔ یہاں پر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تُہمت کے دائرہ کار میں بہت سی بُرائیوں کے ذریعے سے بُہتان طرازی شامل ہے مثال کے طور پر چوری، غلط بیانی، خیانت اور کسی کی اولاد کو دوسرے مرد کی طرف منسوب کر دینا وغیرہ۔ کسی پر بے جا تہمت اور بہتان لگانا شرعاً انتہائی سخت گناہ اور حرام ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: بے گناہ لوگوں پر الزام لگانا آسمانوں سے زیادہ بوجھل ہے، یعنی بہت بڑا گناہ ہے۔ الغرض مسلمان پر بہتان باندھنے یا اس پر بے بنیاد الزامات لگانے پر بڑی وعیدیں آئی ہیں، ہمارے یہاں معاشرے کا مزاج بن گیا ہے کہ وہ الزام تراشی اور بہتان کو تیزی سے پھیلانے کا کام کرتے ہیں، اس میں ان کو ایک خاص لذت محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ شیطان ان کو اس کام پر ابھارتا ہے اور لایعنی باتوں اور کاموں میں مشغول کر دیتا ہے، شریعت کے نزدیک یہ عمل انتہائی بُرا، ناپسندیدہ اور انسانیت سے گری ہوئی بات ہے۔ جس نے کسی کے بارے میں ایسی بات کہی (الزام لگایا، تہمت، یا جھوٹی بات منسوب کی) جو اس میں حقیقت میں تھی

ہی نہیں، تو اللہ اسے (الزام لگانے والے، تہمت لگانے والے، جھوٹی بات منسوب کرنے والے کو) دوزخ کی پیپ میں ڈالے گا (وہ آخرت میں اِسی کا مستحق رہے گا) یہاں تک کہ اگر وہ اپنی اِس حرکت سے (دنیا میں) باز آجائے۔ (رک جائے، توبہ کرلے تو پھر نجات ممکن ہے) (مسند احمد، سنن ابی داؤد، مشکوۃ المصابیح) اِس لیے اِس عمل سے باز آنا چاہیے اور جس پر تہمت لگائی ہے اس سے معافی مانگنی چاہیے؛ تاکہ آخرت میں گرفت نہ ہو۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ رکھنا ضروریاتِ دین میں سے ہے

انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ رکھنا ضروریات دین میں سے ہے اور اس میں کسی بھی قسم کی جھول ایمان کے لئے خطرناک ہوسکتی ہے۔ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ عصمت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔: عصمت کا معنیٰ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اقوال وافعال، عبادات وعادات، معاملات ومقامات اور اخلاق واحوال میں حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کی بدولت اُن کو مداخلتِ نفس وشیطان اور خطاونسیان سے محفوظ رکھتا ہے اور محافظ ملائکہ کو ان پر متعین کردیتا ہے تاکہ بشریت کا غُبار اُن کے پاک دامن کو آلودہ نہ کردے اور نفس بہیمیہ اپنے بعض امور اُن پر مسلّط نہ کردے اور اگر قانون رضائے الٰہی کے خلاف اُن سے شاذ ونادر کوئی امر واقع ہو بھی جائے تو فی الفور حافظ حقیقی (اللہ تعالیٰ) اس سے انہیں آگاہ کردیتا ہے اور جس طرح بھی ہوسکے غیبی عصمت ان کو راہ راست کی طرف کھینچ لاتی ہے" (منصب امامت: ۱۷) یہ حقیقت مسلم اور ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ نبوت ورسالت وہ اعلیٰ ترین منصب ہے جو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے مخصوص بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ تمام کائنات میں انسان اشرف المخلوقات ہے اور نبوت انسانیت کی آخری معراجِ کمال، انسانیت کے بقیہ تمام مراتب وکمالات اس سے پست اور فروتر ہیں۔ انسانی فکر کی کوئی بلندی نبوت کی حدوں کو نہیں چھوسکتی، نہ انسانیت کا کوئی شرف وکمال اس کی گردِراہ کو پہنچ سکتا ہے، اس سے اوپر بس ایک ہی مرتبہ ہے اور وہ ہے حق تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت کا مرتبہ! منصبِ نبوت عقولِ انسانی سے بالاتر ہے، اس کی پوری حقیقت صرف وہی جانتا ہے جس نے یہ منصب عطا فرمایا، یا پھر ان مقدس ہستیوں کو معلوم ہوسکتی ہے جن کو اس منصب رفیع سے سرفراز کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا کہ منافقین حضور ﷺ کو اپنے ساتھ شامل کر کے آپ کو بھی ملوث کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے سفارش بھی بہم پہنچائی اور دوسروں پر بھی الزام لگایا تا کہ وہ خود بری قرار پائیں مگر اللہ تعالیٰ نے ساری صورت حال سے بذریعہ وحی مطلع فرما دیا اور اس طرح آپ کو غلطی سے بچا کر عصمت انبیاء کو برقرار رکھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اگر اس کا نبی بعض ظاہری حالات کو دیکھ کر یا کسی قرینے کی بنیاد پر کوئی خلاف معمول رائے قائم کرے یا حکم جاری کر دے تو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اپنے نبی کو مطلع کر دیتا ہے اور اسے اپنی خلاف حقیقت رائے پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ اگر نبی غلطی پر قائم رہے تو یہ اس کی عصمت کے خلاف ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ اسے ایسی حالت پر نہیں چھوڑتا۔ نبی اور مجتہد میں یہ بنیادی فرق ہے کہ مجتہد جب اپنے اجتہاد اور غور و فکر سے کوئی غلط فیصلہ کرتا ہے تو اس کا اجر تو بہر حال اس کو مل جاتا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اسے اس کی غلطی سے مطلع کر کے اصلاح کر دی جائے۔ اس کے برخلاف اگر نبی سے کسی فیصلہ میں کوئی لغزش ہو جائے تو اسے فوراً بذریعہ وحی مطلع کر دیا جاتا ہے اور ایسی خطا سے بچا لیا جاتا ہے۔ عصمت کا یہی معنی ہے جس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ الغرض نبوت و رسالت کے عظیم ترین منصب کے لیے حق تعالیٰ اسی شخصیت کو بحیثیت نبی و رسول کے منتخب کرتا ہے جو حسب و نسب، اخلاق و اعمال، عقل و بصیرت، عزم و ہمت اور تمام کمالات میں اپنے دور کی فائق ترین شخصیت ہو۔ نبی تمام جسمانی و روحانی کمالات میں یکتائے زمانہ ہوتا ہے اور کسی غیر نبی کو کسی معتد بہ کمال میں اس پر فوقیت نہیں ہوتی۔ قرآنی و شرعی الفاظ میں اس شخصیت کا ''انتخاب''، ''اجتباء'' اور ''اختیار'' خود حق تعالیٰ فرماتا ہے، کون نہیں جانتا کہ حق تعالیٰ کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے، اس کے لیے ظاہر و باطن اور سر و جہر سب عیاں ہے، ماضی و مستقبل اور حال کے تمام حالات بیک وقت اس کے علم میں ہیں، اس میں نہ غلطی کا امکان، نہ جہل کا تصور، قرآن کریم کی بے شمار آیات میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو منافقین کے شر سے محفوظ فرمانا / مقصدِ حیات! رضائے الٰہی کی تلاش

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْكَ وَرَحْمَتُہٗ لَھَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْھُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۱۴﴾

انبیاء علیہم السلام حفاظت خداوندی میں

وَلَوْلَا	اور اگر نہ ہوتا	فَضْلُ اللّٰہِ	اللہ کا فضل
عَلَیْكَ	آپ پر	وَرَحْمَتُہٗ	اور اس کی رحمت
لَھَمَّتْ	(تو) یقینا ارادہ کرلیا تھا	طَّآىِٕفَةٌ	ایک گروہ نے
مِّنْھُمْ	ان میں سے	اَنْ یُّضِلُّوْكَ ؕ	یہ کہ آپ کو بہکائیں
وَمَا یُضِلُّوْنَ	اور نہیں وہ بہکاتے	اِلَّآ	مگر

اَنْفُسَھُمْ	اپنے آپ ہی کو	وَمَا	اور نہیں
یَضُرُّوْنَكَ	وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتے	مِنْ شَیْءٍ ؕ	کچھ بھی
وَاَنْزَلَ اللّٰهُ	اور اللہ نے نازل کی	عَلَیْكَ الْكِتٰبَ	آپ پر کتاب
وَالْحِكْمَةَ	اور حکمت	وَعَلَّمَكَ	اور اس نے آپ کو سکھایا
مَا لَمْ تَكُنْ	وہ جو نہیں تھے آپ	تَعْلَمُ ؕ	جانتے
وَكَانَ	اور ہے	فَضْلُ اللّٰهِ	اللہ کا فضل
عَلَیْكَ	آپ پر	عَظِیْمًا ﴿۱۱۳﴾	بہت بڑا

اللہ نے ارشاد فرمایا وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ وَرَحْمَتُهٗ اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ تو ان میں سے ایک گروہ نے ارادہ کر رکھا تھا کہ آپ کو بھی بہکا دیں۔ اور اپنا طرفدار بنالیں۔ منافقین نے اس مقصد کے لیے بھرپور کوشش کی تھی اور معززین کا ایک وفد لے کر حضور ﷺ کے پاس گئے۔ آپ نے بھی ظاہری حالات کے مطابق ان کو بے گناہ سمجھا، اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تم ایسے باصلاحیت اور نیک لوگوں پر کیوں شبہ کرتے ہو۔ قریب تھا کہ حضور ﷺ ان کی باتوں میں آ کر ان کے طرفدار بن جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو متنبہ کر دیا۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ یہ لوگ اپنے آپ کو ہی بہکا رہے ہیں۔ اور وہ نہیں نقصان پہنچا سکتے آپ کو کسی قسم کا اب بھی اگر کوئی ایسی حرکت کرے گا تو مجرم ٹھہرے گا۔ اگر کوئی دوسرا شخص بہکاوے میں آ کر غلط طور پر طرفدار بن جائے گا تو اس سے کام کا محرک بری الذمہ نہیں ہوگا۔ نہ اس کا گناہ کم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اسے جواب دینا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ ظاہری حالات سے متاثر ہو جانے کی وجہ سے آپ پر تو کوئی الزام نہیں آتا۔ کیونکہ بسا اوقات ایسے حالات میں کوئی شخص ایسی رائے قائم کر لیتا ہے مگر جن لوگوں نے یہ ساری کارروائی کی ہے، وہ نقصان سے نہیں بچ سکیں گے۔ اور اس گناہ کا وبال انہی پر پڑے گا۔ یاد رکھئے! اہلِ سنت والجماعت کے اعتقاد کے

مطابق انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام معصوم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محفوظ کہلاتے ہیں۔ عصمت کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام سے گناہ و معصیت کا صدور ہی ممنوع اور غیر متصور ہو اور حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کا امکان فطرۃً ممنوع تو نہ ہو، لیکن گناہ کے صدور سے حفاظت رہتی ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عقیدہ و عمل کے اعتبار سے اسی منصب کے صدر نشین ہیں۔ اسی بنیاد پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معیارِ حق و معیارِ ایمان قرار دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسی مقام کی نزاکت کے پیشِ نظر اُمت کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ اُمت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عیب جوئی سے باز رہے، ورنہ ایسے لوگ مردود و ملعون کہلائیں گے۔ مگر افسوس کہ فی زمانہ اہلِ سنت کی طرف نسبت رکھنے والے بعض لوگ جادۂ اعتدال سے منحرف ہو کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دشنام طرازوں کی صف میں جا کھڑے ہونے لگے ہیں۔ آگے فرمایا وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے اور بقول امام مالک رحمہ اللہ حکمت سے مراد سنت ہے۔ حکمت کی تفسیر میں اور بھی کئی اقوال آئے ہیں۔ جو باتیں حضور ﷺ کی زبان مبارک سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاشدہ ہیں۔ حضور ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے قرآن پاک کی تشریح کی ہے اور یہی حکمت ہے۔

کلی اور جزوی علم میں بنیادی فرق

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے یہی مضمون دوسرے مقام پر اس طرح آیا ہے مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (الشوریٰ) آپ کتاب اور ایمان کی تفصیلات نہیں جانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرما کر آپ کو آگاہ کیا بعض چیزیں وحی جلی کے ذریعہ بتائیں اور بعض وحی خفی کے ذریعے۔ (وحی جلی اور وحی خفی اسلامی اصطلاحات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے انبیاء علیہم السلام، خصوصاً حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والے احکام اور پیغام کی دو اہم اقسام کو ظاہر کرتی ہیں۔ 1. وحی جلی (ظاہر اور واضح وحی) اصطلاحِ شریعت میں وحی جلی سے مراد قرآن مجید

ہے۔2.وحی خفی (پوشیدہ یا مخفی وحی) اصطلاحِ شریعت میں وحی خفی سے مراد وہ احکام اور الہامات ہیں جو آپ ﷺ کے قلبِ مبارک پر بطورِ معنی یا مضمون ڈالے گئے، جنہیں عام طور پر احادیث اور سنتِ نبوی کہا جاتا ہے۔قرآن مجید کی تشریح، احکام کی تفصیل اور بہت سے شرعی ضابطے اسی وحی خفی کے تحت آتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی تائید اس ارشاد کے ذریعے فرمائی ہے کہ آپ ﷺ اپنی مرضی سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو آپ پر کی جاتی ہے۔)

بعض اہل بدعت آیت کے اس ٹکڑے سے حضور ﷺ کا کلی علم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔حالانکہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔کلی علم سے مراد وہ مکمل، احاطہ کرنے والا اور ازلی و ابدی علم ہے جو کائنات کی ہر شے، ماضی، حال اور مستقبل کی تمام تفصیلات کو بغیر کسی واسطے کے جانتا ہو۔خصوصیت: یہ صفتِ الٰہی ہے۔اللہ تعالیٰ کا علم کلی ہے، جو ہر ذرہ سے واقف ہے۔جزوی علم سے مراد وہ محدود اور عطائی علم ہے جو کسی مخلوق (انسان یا نبی) کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے، یہ علم محدود ہوتا ہے اور تمام غیب یا کائنات کی ہر شے کا احاطہ نہیں کرتا۔جیسے انبیاء اور رسل علیہم السلام کو اللہ نے جتنا چاہا، اتنا غیب اور حوادث کا جزوی علم عطا فرمایا۔اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو نبوت سے متعلقہ تمام چیزیں سکھا دیں، اور جن کا تعلق منصب نبوت کے ساتھ نہیں ہے ان میں سے بھی بہت سی چیزوں کا علم دیدیا مگر ذرے ذرے کا علم نہیں دیا۔اگر اس آیت کے ذریعے اللہ نے سب کچھ آپ کو بتادیا تھا تو یہ آیت تو 4ھ یا 5ھ میں نازل ہوئی اس کے بعد باقی سورتوں کے نزول کی کیا ضرورت تھی۔اور واقعہ یہ ہے کہ اس سورہ کے بعد سورہ مائدہ، سورہ توبہ، سورہ احزاب اور بہت سی سورتیں نازل ہوئیں۔جب ایک چیز سکھادی تھی تو دوبارہ نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکے۔اللہ تعالیٰ نے جتنا علم حضور ﷺ کو دیا وہ سب سے زیادہ تھا جیسا فرمایا أُوتِيتَ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ مجھے پہلوں اور پچھلوں کا علم دیا گیا، بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلی امتوں کے حالات بتائے، قرآن پاک میں قصص کا ایک معتدبہ حصہ موجود ہے اور بعد میں پیش آنے والے بہت سے واقعات سے بھی آپ کو آگاہ کیا۔جن کا ذکر قرآن وسنت میں تفصیل

کے ساتھ موجود ہے۔اس کے باوجود آپ علم محیط کے مالک نہیں ہیں۔یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاصا ہے۔عالم الغیب والشہادۃ صرف وہی ذات ہے اللہ نے اپنے انبیاء اور رسل علیہم السلام کو دین اور شریعت کا مکمل علم دیا مگر ذرے ذرے کا علم نہیں دیا، کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔اب اگر کوئی کہے کہ حضور ﷺ فلاں مشینری جوڑنا یا ہوائی جہاز بنانا نہیں جانتے تھے، تو اس سے آپ کی ذات پر کیا فرق پڑتا ہے؟ اور آپ کی شان میں کیا کمی آتی ہے؟ یہ تو ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق کائنات سے ہے اور ان کا جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں تھا۔ہاں! اگر کوئی یہ کہے کہ حضور علیہ السلام دین کی فلاح بات یا حلال و حرام کا فلاں مسئلہ نہیں جانتے تھے، تو یقیناً یہ کلمہ کفر ہے۔مگر دنیا کی عام چیزیں تو انسان اپنے مشاہدے اور عقل سے سیکھتے ہیں اور اپنے تجربات کو بروے کار لاتے ہیں۔البتہ بعض علم مضر ہیں وہ اللہ نے اپنے نبی کو نہیں سکھائے اور نہ وہ آپ کی شان کے لائق ہیں۔سحر، کہانت، نجوم آپ کے منصب کے شایان شان نہیں اور اللہ نے آپ کو نہیں سکھائے۔اسی شعر وشاعری کے متعلق فرمایا وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو شعر کا علم نہیں سکھایا، نہ وہ اس کی شان کے لائق ہے۔اگر ایسی چیزیں آپ نہیں جانتے تو آپ کی شان میں ذرا برابر فرق نہیں آتا، مزید برآں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی آپ نے نفی کرنی ضروری ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ آپ کے واجب الوجود ہونے کی نفی کرنا ضروری ہے، ورنہ انسان ایماندار نہیں ہوگا۔واجب الوجود، قادر مطلق اور علیم کل تو صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے حضور ﷺ کی ذات سے ان سب کی نفی لازم ہے۔اس کے باوجود یہ کہنا کہ حضور کو ذرے ذرے کا علم دیا گیا، درست نہیں ہے۔فرمایا وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ﴿۱۱۳﴾ اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے، امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ آپ ﷺ کو نبوت عطا فرمائی، پھر آپ ﷺ کو ختم نبوت کا تاج پہنچایا۔آپ ﷺ کو جو کتاب دی گئی وہ سب کتابوں سے افضل۔آپ ﷺ کی امت بھی تمام امتوں سے افضل۔آپ ﷺ کے متبعین بھی سب سے زیادہ، آپ ﷺ کو معجزات بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام سے زیادہ دیئے گئے۔اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ظاہری اور

معنوی اولاد بھی سب سے زیادہ بنائی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔

منافقین کے خفیہ مشوروں کے مقاصد

لَا خَيْرَ	نہیں ہے کوئی بھلائی	فِيْ كَثِيْرٍ	اکثر میں
مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ	ان کی سرگوشیوں سے	اِلَّا مَنْ	مگر جو شخص
اَمَرَ	حکم دے	بِصَدَقَةٍ	صدقے کا
اَوْ مَعْرُوْفٍ	یا نیکی کا	اَوْ اِصْلَاحٍ	یا صلح کرانے کا
بَيْنَ النَّاسِ ؕ	درمیان لوگوں کے	وَمَنْ	اور جو شخص
يَّفْعَلْ ذٰلِكَ	کرے یہ	ابْتِغَآءَ	تلاش کرنے کے لیے
مَرْضَاتِ اللّٰهِ	اللہ کی رضامندی	فَسَوْفَ	تو عنقریب
نُؤْتِيْهِ	ہم اسے دیں گے	اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾	اجر بہت بڑا

ارشاد ہوتا ہے لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ ان کے بہت سے پوشیدہ مشوروں میں کوئی بہتری نہیں ہے۔ نَّجْوٰی سرگوشی یا کانا پھوسی کو کہتے ہیں اور اس سے مراد خفیہ میٹنگ ہے جس میں صلاح مشورہ کیا جائے تو فرمایا کہ یہ لوگ بِشر منافق کی صفائی کے لیے اور دوسروں پر الزام لگانے کے لیے جو خفیہ میٹنگیں یا مشورے کرتے ہیں اور مشورے بھی ایسے کہ "لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ جو منشائے الٰہی کے خلاف ہیں، فرمایا ایسے مشوروں کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ منافقین کے خفیہ مشوروں کے مقاصد یہ ہیں کہ اسلام کو نقصان پہنچانا، مسلمانوں کی صفوں میں فتنہ اور انتشار پیدا کرنا۔ باہمی سازشیں کرنا، کافروں اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مدینہ کی اسلامی ریاست کو کمزور کرنا۔ اور مسلمانوں کو ڈرانا بزدلی اور خوف پھیلا کر مسلمانوں کے حوصلے پست کرنا۔ بہرصورت منافقین کے تمام منصوبے ناکام ہوئے اور ان کا اصل چہرہ معاشرے کے سامنے بے نقاب ہوگیا۔ فرمایا بعض خفیہ مشورے مفید بھی ہیں مثلاً اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ یہ کوئی شخص صدقہ کرنے کا حکم دے، تاکہ غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اس قسم کا مشورہ کرنا تو بڑی خوبی کی بات ہے کہ کسی کی حاجت

براری بھی ہو سکے اور اس کی عزت نفس بھی برقرار رہے۔ قرآن پاک میں صدقہ کی بڑی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے تاکہ سوسائٹی کو امن وسکون حاصل ہو۔ محتاجوں کو اپنا بھائی سمجھنا اور اللہ کے عطا کردہ وسائل سے ان کی مدد کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ فرائض میں سے ہے۔ اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ صدقہ سے انسان میں تزکیہ نفس پیدا ہوتا ہے بخل ختم ہو کر فیاضی جیسی اعلیٰ اقدار پیدا ہوتی ہیں۔

صدقے کا وسیع مفہوم

صدقہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَۃٌ یعنی ہر نیکی صدقہ کے حکم میں آتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انسانی جسم کے تین سو ساٹھ اعضا (جوڑ) ہیں۔ جب انسان صبح نیند سے صحیح سلامت بیدار ہوتا ہے۔ تو اس پر لازم ہوتا ہے کہ ہر عضو کے بدلے صدقہ کرے۔ عرض کیا گیا، حضور! یہ تو بہت بڑا بوجھ ہے۔ اگر کوئی شخص ہر جوڑ کے بدلے ایک ایک پیسہ بھی صدقہ کرے تو سارے جسم کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہوگی۔ اور ہر ایک کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔ نبی (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کوئی شخص جو بھی کلمہ اپنی زبان سے نکالتا ہے وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص سُبْحَانَ اللّٰہِ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یا لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ یا اَللّٰہُ اَکْبَرُ، کہتا ہے۔ درود شریف پڑھتا ہے یا استغفار کے کلمات ادا کرتا ہے، تو یہ سب اس کے لیے صدقہ بن جاتے ہیں۔ آج ماہرین طب بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ حدیث کے مطابق روزانہ ان پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ہفتہ میں تقریباً دو ہزار پانچ سو بیس صدقات ہوئے۔ ان پر صدقہ کا حکم فرماتے ہوئے، آپ ﷺ نے ان کی ادائی کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ اس کے لیے آپ نے جو طریقے بیان فرمائے ہیں وہ نہایت آسان ہیں، جنھیں امیر و غریب یکساں طور پر انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً دو لوگوں کے درمیان انصاف کرنا خواہ سمجھا بجھا کر یا ایک فیصلہ دے کر۔ لوگوں کی مدد کرنا۔ مثلاً ایک شخص کے پاس سواری تو ہے مگر وہ خود سے اس پر سوار ہونا اس کے لیے دشوار ہے

اور کوئی ساتھ بھی نہیں ہے جو اس کی مدد کرے تو ایسے شخص کو اس کی سواری پر سوار کرنے میں مدد کرنا، یا پھر اس کا سامان سواری پر رکھنا وغیرہ۔ حدیث میں کلمہ طیب کو بھی صدقہ قرار دیا ہے۔ خواہ یہ اللہ کی تسبیح وتہلیل بیان کرکے ہو، یا لوگوں کے مابین اپنی گفتگو میں اچھے اخلاق کے ساتھ اچھے انداز میں نرم لہجہ اختیار کرکے ہو۔ نماز کے لیے مسجد کی طرف بڑھنے والے قدم کو بھی صدقہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اس میں مسافت کی قید نہیں ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب انسان اپنے گھر سے وضو کرکے نماز کے لیے مسجد جاتا ہے تو اللہ اس کے ہر قدم پر اس کے درجات کو بلند کرتا ہے۔ آخر میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ یہ انسان کے لیے ایک اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے جس میں دوسروں کو تکلیف دینے سے بچنا ہی نہیں بلکہ ہر اس چیز کو دور کر دینا شامل ہے، جو انسان کو راہ چلتے ہوئے تکلیف پہنچا سکتی ہے۔ اسی طرح صدقہ کی ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن میں مال واسباب تو صرف نہیں ہوتے مگر انھیں بھی صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے: مثلاً کوئی کمزور آدمی کنویں سے پانی نکال رہا ہے۔ اس کا ڈول بھر دے۔ یا کوئی مسافر راہ سے بھٹک گیا ہے، اس کی رہنمائی کر دے۔ یا کسی ضعیف و ناتواں کو راہ پار کرا دے اور کسی کی بینائی کمزور ہوگئی ہو، اس کی مدد کر دے۔ اسی طرح خدمت خلق کی اور بھی دوسری صورتیں ہو سکتی ہے جن میں مال تو صرف نہیں ہوتا مگر ضرورت مند کی ضرورت ضرور پوری ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنا بھی صدقہ ہے۔ فرمایا اگر کسی کو کوئی چیز بھی میسر نہ ہو تو چاشت کے وقت دو رکعت نفل ادا کرے تو یہ سب اعضا کی طرف سے کفایت کر جائیں گے۔ بہر حال صدقے کا بشرطیکہ یہ سب کچھ خالص اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔ بہ ہر حال صدقہ کی ادائی کی مختلف صورتیں ہیں۔ خواہ انفاق کے ذریعے ہو یا دیگر طریقوں سے۔ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ صدقے کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں کوئی ننگا بھوکا نہ رہے اور معاشرہ ہر طرح کی گندگی اور شر سے پاک اور پر امن ہو۔ تمام بندگان خدا کی تمام ضروریات کی تکمیل ہو۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے سلسلے میں ایک جامع بات بیان فرمائی: كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ ہر نیک کام صدقہ ہے اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی واضح

کر دیا کہ "نیکی اور بھلائی کے کسی بھی کام کو معمولی نہ سمجھو" کیوں کہ یہ بھی صدقہ ہے۔ فرمایا تیسری چیز جس کے لیے مشاورت جائز ہے۔ وہ ہے اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ یا کسی نیکی کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے۔ بعض افراد یا جماعتوں کے درمیان تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے ان کی اصلاح کرنے کے لیے جھگڑے کو مٹانے کے لیے اگر میٹنگیں اور مشورے کیے جائیں تو بہت اچھی بات ہے اسے اصلاح ذات البین کہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ اللہ تعالیٰ نے اپنے حالات اچھے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے برخلاف فساد ذات البین بہت بری بات ہے۔ مسلمانوں کا آپس میں جھگڑا و فساد مختلف وجوہات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جھگڑا معاملات میں ہوتا ہے اور اخلاق میں بھی، حتیٰ کہ بسا اوقات فساد و عقیدے کے بارے میں بھی ہوتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ فساد بالوں کو مونڈتا ہے بلکہ یہ دین کو مونڈ کر رکھ دیتا ہے آپس کا فساد دین کو ایسے برباد کر دیتا ہے۔ جیسے استرا بالوں کو بیخ کنی کر دیتا ہے۔

جائز اور ناجائز مشورے

مشورے افراد کے درمیان بھی ہوتے ہیں اور مقامی اور ملکی سطح پر جماعتوں کے درمیان بھی۔ میونسپل کمیٹی کے ممبران بھی میٹنگ کرتے ہیں اور شہر کی اصلاح کے لیے مشورے کرتے ہیں۔ اسی طرح صوبائی اور ملکی سطح پر ممبران صوبائی و قومی اسمبلی اجلاس کر کے صوبائی اور ملکی بہبود کے لیے مشورے کرتے ہیں اور پھر بڑے بڑے منصوبے معرض وجود میں آتے ہیں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ سب لوگ قوم و ملت کی اصلاح احوال کے لیے مشورے کرتے ہیں یا کھیل تماشے اور دیگر فضول باتوں کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تین چیزوں کا ذکر کیا ہے یعنی صدقہ، نیکی اور اصلاح ذات البین کیا ہمارے شہر، صوبے، یا ملک کے نمائندگان کو کبھی یہ توفیق حاصل ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ مذکورہ بالا تین آئٹمز کو بھی زیر بحث لائیں؟ کیا ان امور کی انجام دہی کے لیے بھی قانون سازی ہوتی ہے۔؟ کیا غریبوں کی بہبود کے لیے کبھی مشورہ ہوا ہے؟ وہاں تو فضول چیزوں کے لیے قانون بنتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کی باتیں

ہوتیں؟ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ پیش ہوتا محتاجوں کی عزت نفس کے لیے کوئی منصوبہ بنتا، غربت دور ہو کر لوگوں کی بنیادی ضروریات کا اہتمام ہوتا۔ مگر ایسی چیزیں انہیں کہاں نصیب ہیں۔

یہاں پر اختلاف دور کرنے کی بجائے افراد اور پارٹیوں کے درمیان اختلاف بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ انگریز کا پرانا اصول ہے کہ ااختلاف بڑھاؤ اور حکومت کرو" (Divide et Impera / Divide and Rule) ایک ایسی سیاسی، عسکری اور سماجی حکمت عملی ہے جس کا مقصد کسی بڑے یا متحد گروہ کو آپس میں لڑا کر کمزور کرنا اور خود طویل عرصے تک اقتدار یا برتری پر قابض رہنا ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت حاکم یا قابض طاقت لوگوں کے درمیان موجود نسلی، لسانی، مذہبی، علاقائی یا طبقاتی فرق کو ہوا دیتی ہے تاکہ وہ سب مل کر مشترکہ حاکم کے خلاف آواز نہ اٹھا سکیں کیونکہ اگر لوگ اچھی بات پر متفق ہو جائیں تو انہیں حکومت کرنے کا موقع کیسے مل سکتا ہے۔ یہاں تو سیاسی پارٹیوں میں رسہ کشی کی ہوا دی جاتی ہے۔ شیعہ سنی کا فساد کرایا جاتا ہے۔ مقلد غیر مقلد کا مسئلہ پیدا کیا جاتا ہے، دیوبندی اور بریلوی کو لڑایا جاتا ہے اور یہی ایک اصول ہے جس کے ذریعے اپنی حکومت کو طول دے سکتے ہیں۔ اقتدار پر قبضہ جما سکتے ہیں۔ بھائی تمہارے ذمے تو لازم تھا کہ نیکی کا نظام قائم کرتے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرتے برائی کا قلع قمع طاقت کے ساتھ کرتے عریانی اور فحاشی کے خلاف جہاد کرتے، نظام صلوۃ قائم ہوتا، ہر شخص کی عزت آبرو، مال اور جان محفوظ ہوتی۔ اگر تم برائی ختم نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کی پیش کردہ باتوں پر عمل نہیں کرتے تو تمہاری ممبریاں کسی کام کی نہیں۔ تم اپنے فرائض کو کماحقہ ادا نہیں کر رہے۔ اقتدار کی امانت اللہ تعالیٰ نے تمہارے سپرد کی ہے اسے محض تنخواہ اور بھتہ وصول کرنے تک محدود نہ رکھو بلکہ عوام کی خدمت کر کے نہ صرف دنیا میں سرخروئی حاصل کرو بلکہ آخرت کے لیے ذریعہ نجات بھی پیدا کرلو۔

رضائے الٰہی کا حصول کیوں ضروری ہے؟

عمل کی قبولیت حسن نیت پر ہے اور حسن نیت کا نکھار اور کمال اللہ کی رضا سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا

کسی بندے سے راضی ہو جانا دراصل دنیا و آخرت کی سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑا انعام ہے فرمایا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ لله جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تلاش میں ایسا کرے گا، صدقہ یا نیکی کا حکم کرے گا یا لوگوں کے درمیان صلح کرا دے گا یا ان مقاصد کے حصول کے لیے مشورہ کرے گا اور اس کی مراد رضائے الٰہی ہو، اپنی نیک نامی اریاکاری یا ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتا، فرمایا فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ عنقریب ہم اسے بہت بڑا اجر عطا کریں گے نیکی دراصل وہی ہے جو صرف خدا کی رضا کے لیے ہو۔ اور ہر اس شخص کے ساتھ کی جائے جو اس کا مستحق ہو۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ زکوٰۃ و خیرات اس شخص کو دی جاتی ہے جو اپنی پارٹی کا آدمی ہو سفارش اس کی جاتی ہے، جس نے ووٹ دیا تھا یا آئندہ دے گا یا پھر نیکی اس لیے کی جاتی ہے کہ اپنے فرقے کو عروج حاصل ہو۔ حکومت بھی انعامات سے اسی شخص کو نوازتی ہے جسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مطلوب ہو۔ یہ تمام چیزیں نیکی کی روح کے خلاف ہیں۔ نیکی جب تک محض اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہوگی۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ سے یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ اور اللہ کی خوشنودی کے لیے وہی نیکی کرے جب کسی شخص، جماعت یا معاشرے کا نظریہ (Ideology) صحیح، مثبت اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے، تو اس کے دوررس اور تعمیری نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ نظریہ دراصل ایک ایسا فکری ڈھانچہ ہے جو انسان کے فیصلوں، اخلاقیات اور مستقبل کے اہداف کا تعین کرتا ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کا بھی محبوب ہوگا اور ملاء اعلیٰ کا دعاؤں کا مستحق بھی۔ زندگی کا معنی اور مقصد؛ اللہ کی عبادت، اس کی مرضی کے سامنے سر جھکانا اور اس کے فضل سے اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سبق کو سمجھنے اور اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

☆☆☆

اجماعِ امت اور عدالتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ
الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ⑮

دلائل شرعیہ کی تعریف اور تعداد

وَمَنْ	اور جو شخص	یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ	مخالفت کرے رسول کی
مِنْۢ بَعْدِ مَا	بعد اس کے کہ	تَبَیَّنَ	واضح ہوگئی
لَهُ الْهُدٰی	اس کے لیے ہدایت	وَیَتَّبِعْ	اور وہ پیروی کرے
غَیْرَ	سوائے	سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ	مومنوں کے راستے کے
نُوَلِّهٖ	(تو) ہم اسے پھیر دیں گے	مَا تَوَلّٰی	جدھر وہ پھرتا ہے
وَنُصْلِهٖ	اور ہم اس کو داخل کریں گے	جَهَنَّمَ	جہنم میں
وَسَآءَتْ	اور (وہ) بُری ہے	مَصِیْرًا ⑮	پھرنے کی جگہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ جو کوئی اللہ کے رسول کی مخالفت کرتا ہے مشاقت دشمنی ضد، عناد، یا پارٹی بازی کو کہتے ہیں، یہ تمام قبیح صفات بشر بن ابیرق پر صادق آتی ہیں اور اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس شخص نے خود چوری کی، پھر دوسروں پر اتہام لگایا اور آخر میں اللہ کے

رسول کی نافرمانی کا مرتکب ہو کر کفار مکہ سے جاملا۔ اسی لیے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے، مخالفت کرتا ہے مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی تھی۔ اور ہدایت کا راستہ وہی ہے جس پر اللہ کا رسول اور اس کے متبعین چل رہے ہیں اور جس کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ وہی ہدایت کا پروگرام ہے۔ جو اللہ جل شانہ، نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید میں نازل فرمایا ہے۔ اور حضور ﷺ جس کی تشریح و توضیح بیان فرماتے ہیں۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں اس طرح بیان فرمایا قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یعنی ہدایت کا راستہ گمراہی کے راستے سے بالکل واضح ہو گیا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی شخص اللہ کے رسول اور اس کے لائے ہوئے دین کی مخالفت کرتا ہے۔ تو فرمایا: ہم اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور کیا ہی بری جگہ پلٹنے کی۔

سزا کے بنیادی مقاصد اور وجوہات

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی ہمیشہ اپنی قوم کی زبان میں ان کو دین کی دعوت دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ہم نے رسول کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا تا کہ کسی کو کوئی اشتباہ نہ رہے کہ اللہ کا نبی کس چیز کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ لہٰذا جب کوئی نبی اپنی قوم کو انہی کی زبان میں سمجھائے، پھر قوم کا کوئی آدمی دعوت کو سن کر اس کا انکار کرے، تو وہ قطعی طور پر سزا کا مستحق ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ چار چیزیں انسان کو سزا کا مستحق بناتی ہیں۔ پہلی چیز پیدائشی فطرت ہے کہ اس اعتبار سے بھی کوئی انسان سزا یا جزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ دوسری چیز ملاء اعلیٰ کے فرشتے ہیں جو اچھا کام کرنے والوں کے لیے دعا اور برا کام کرنے والوں کے لیے بد دعا کرتے ہیں لہٰذا یہ فرشتے بھی جزا و سزا کا سبب بنتے ہیں۔ فرمایا تیسری چیز شریعت مکتوبہ ہے۔ جب یہ نازل ہوتی ہے تو اس پر عمل کرنے والے جزا پاتے ہیں اور انکار کرنے والے سزا پاتے ہیں۔ پھر چوتھے درجے میں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر ہدایت کا راستہ واضح کرتا ہے اس حجت کے اتمام پر بھی اللہ تعالیٰ جزا و سزا کا

فیصلہ کرتا ہے۔ بہر حال سزا کا مقصد معاشرے کے دوسرے افراد کو جرم کرنے سے روکنا اور قانون شکنوں کے دل میں خوف پیدا کرنا ہے۔ اور متاثرہ شخص یا فریق مظلوم کو اس کا حق دلانا اور جرم کا بدلہ دینا ہے۔ اسی طرح مجرم کو اس کے برے رویے کا احساس دلانا اور اسے معاشرے کا ایک بہتر اور کارآمد شہری بنانا ہے۔ خطرناک اور قانون شکنی کرنے والے عناصر کو معاشرے سے الگ یا معذور کرنا تاکہ وہ مزید نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اسلامی اور قانونی نظام کے تحت دین، جان، عقل، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے۔

اتباع کے اہم درجات و مراتب

فرمایا کہ جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اللہ کے رسول کی مخالفت کرے گا وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ اور مومنین کے راستے کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چلے گا۔ جیسا کہ بشر منافق مومنوں کا راستہ چھوڑ کر مشرکوں کے ساتھ جا ملا، تو فرمایا ہم اس کو وہ سزا دیں گے جس کا ذکر آگے آرہا ہے اور یہ اس لیے کہ اس نے نبی کی اتباع چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا، حالانکہ نبی ﷺ کا اتباع فرض ہے۔ اس سورہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس لحاظ سے فرض ہے کہ وہ خالق اور مالک ہے اور نبی کی اطاعت اس کی رسالت کی وجہ سے لازم ہے اور اس آیت کی رو سے تیسری چیز یہ آگئی ہے کہ مومنین کے راستے پر چلنا بھی فرض ہے اور مومنین وہ جو اللہ اور اس کے رسول کے راستہ پر چلنے والے ہیں اور جن کا اعتقاد اور عمل بالکل صحیح ہے۔ یہ تینوں چیزیں درجہ بدرجہ آتی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مومنین سے مراد حضور ﷺ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان ہیں، جو آپ ﷺ پر ایمان لائے، آپ ﷺ کی زیارت کی اور آپ ﷺ کا اتباع کیا۔ پھر ان کا کسی بات پر اتفاق ہو جائے تو وہ دلیل شرعی بن جاتی ہے۔ گویا اجماع امت میں سب سے پہلے صحابہ علیہم الرضوان کی جماعت آتی ہے اور جو کوئی ان کے طریقے کے خلاف کرے گا، تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ صحیحین میں حضور ﷺ کے ارشاد مبارک کی شرح میں محدثین کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ جس شخص

نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں ہے تو وہ مردود ہے اس طریقے کے متعلق محدثین کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم فرماتے ہیں کہ دلائل شرعیہ چار ہیں اور کسی معاملہ کو سمجھنے کے لیے ان چاروں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے کتاب اللہ ہے، دوسرے نمبر پر سنت رسول اللہ تیسرا اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اور چوتھا قیاس ہے۔ اگر کوئی چیز پہلے تین دلائل سے ثابت نہ ہو، تو پھر چوتھی دلیل کو بروے کار لایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ تمام چیزوں کی تفصیل قرآن پاک میں تو نہیں ہے ، وہاں تو اصول وضوابط ہیں۔ پھر ان اصولوں کی بہت، حد تک تشریح وتفسیر حضور ﷺ کے قول، فعل یا تقریر سے ملے گی۔ مگر تمام مسائل وہاں سے بھی حل نہیں ہوں گے، پھر اس مسئلہ کو امت کے بہترین لوگوں یعنی صحابہ علیہم الرضوان پر پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ کسی نتیجہ پر متفق ہیں تو وہ حل ساری امت کے لیے واجب العمل ہے ورنہ ایسی بات میں مجتہدین اجتہاد کر کے مسئلہ کا حل نکالیں گے، چناچہ یہ اجتہاد یا قیاس بھی شرعی دلیل ہے۔ دنیا میں ہر روز نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا حکم واضح طور پر قرآن، سنت اور اجماع صحابہ علیہم الرضوان میں نہیں ملتا، تو پھر ایسے مسائل قیاس و اجتہاد کے ذریعے ہی حل کیے جائیں گے اور ان پر عمل کرنا عام لوگوں کے لیے ضروری ہوگا، فرماتے ہیں کہ ان چار دلائل شرعیہ میں سے دو مثبت ہیں یعنی قرآن وسنت ایسے دلائل ہیں جن کے ذریعے مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ مثبت دلائل ہیں اور دو دلائل مظہر ہیں کہ ان کے ذریعے مسائل کا حل ظاہر ہوتا ہے اور یہ ہیں اجماع اور قیاس ظاہر ہے کہ جس چیز پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا اجماع اور قیاس ہوگا اس کی ضرور کوئی نہ کوئی بنیاد ہوگی اور جو بات کوئی مجتہد بتلاتا ہے وہ بھی کسی دلیل کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ مجتہد مطلوبہ مسئلہ کے لیے پہلے علت (Cause) سے مراد وہ بنیادی سبب، وجہ یا وصف ہے جس پر کسی حکم، واقعے یا چیز کا وجود موقوف ہے جو کہ مجتہد دریافت کرتا ہے اور پھر اس علت کی بنیاد پر مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے، لہٰذا یہ بھی شرعی دلیل کا درجہ رکھتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت سے اجماع کو ثابت کیا۔ بعض کتب میں لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کو اس معاملہ میں تردد تھا کہ اجماع کا ثبوت قرآن پاک کی کس آیت سے ہوتا ہے۔

چناچہ انہوں نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی آپ نے ایک دن میں تین دفعہ پورے قرآن پاک کی تلاوت کی مگر آپ کی تسلی نہ ہوئی۔آپ متواتر تین دن تک تین تین مرتبہ اول سے آخر تک قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے اور آخر کار اسی آیت پر آ کر اٹک گئے وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ اب آپ کی تشفی ہوگئی کہ اجماع بھی قطعی دلیل شرعی ہے۔الحاصل! دلائل شرعیہ سے مراد وہ بنیادی شرعی ذرائع ہیں، جن سے احکامِ شرعیہ ثابت کیے جاتے ہیں، اصولِ فقہ کے اعتبار سے جمہور اہلِ علم کے نزدیک دلائل شرعیہ چار ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔(1) قرآنِ کریم: قرآنِ کریم شریعت کا سب سے بنیادی اور اولین ماخذ ہے۔

(2) سنتِ رسول ﷺ: قرآنِ کریم کے بعد شرعی احکام کا دوسرا بنیادی ماخذ سنّتِ رسول ﷺ ہے۔(3) اجماع: حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر متفق ہو جانا "اجماع" کہلاتا ہے، اجماع بھی شرعی حجت ہے۔

(4) قیاس: کسی غیر منصوص مسئلے کا منصوص مسئلے پر بہ علتِ مشترکہ انطباق کرنا پھر اس کا بھی وہی حکم ظاہر کرنا جو منصوص کا ہے۔یعنی کسی نئے مسئلے (غیر منصوص واقعہ) کا حکم منصوص مسئلے میں پائی جانے والی علت کی مماثلت اور اشتراک کی بنیاد پر اس علت میں فکر و تدبر کے ذریعہ ادراک کر کے حکم قائم کرنا قیاس کہلاتا ہے۔قیاس بھی شرعی احکام کے استنباط کا معتبر ذریعہ ہے۔

اسلافِ امت کا قرآن کریم کی تلاوت سے گہرا شغف اور کثرتِ تلاوت کا معمول

چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت کرنا تو بہت سے صالحین امت کا معمول رہا ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ رمضان المبارک کے دوران ایک مرتبہ دن کو اور ایک مرتبہ رات کو مکمل قرآن پاک پڑھتے تھے۔امام بخاری رحمہ اللہ، یحییٰ بن معین رحمہ اللہ اور یحییٰ بن سعید قطعان رحمہ اللہ بھی ایسا ہی کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دن رات میں دو مرتبہ قرآن پاک ختم کرتے تھے امام محمد رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ آپ ہر روز دس پارے تلاوت فرماتے تھے مولانا شاہ اشرف علی

تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ بھی دس پارے تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ہمارے استاد اور شیخ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ بہت مصروف آدمی تھے، مگر سات پارے روزانہ آپ بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ وتر کی ایک رکعت میں پورا قرآن پاک پڑھ جاتے تھے۔ ترمذی شریف میں موجود ہے کہ حضرت سعید بن جبیر تابعی رحمہ اللہ بھی ایک رکعت میں پورا قرآن تلاوت کرتے تھے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ دو رکعت میں پورا قرآن اور مزید چار پارے پڑھتے تھے حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ عصر اور مغرب کے درمیان پورا قرآن تلاوت کر لیتے یا پھر آپ صبح کی نماز کے بعد بیٹھتے اور طلوع شمس تک قرآن پاک پڑھ جاتے۔ یہ لوگ صاحب کرامت تھے۔ ہر آدمی کے بس کی یہ بات نہیں ہے۔ عام لوگوں کے لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین دن سے کم عرصہ میں تلاوت قرآن مکمل نہ کی جائے ایسا کرو گے تو سمجھ نہیں سکو گے، مگر خاص لوگوں کا معاملہ اور ہے، وہ الفاظ اور مضامین کی تفہیم کے ساتھ کم سے کم عرصہ میں قرآن کریم کی تلاوت مکمل کر لیتے تھے۔

امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

اجماع کے متعلق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہ ہے کہ جس مسئلہ پر امت کا پہلا طبقہ خصوصاً صحابہ کرام علیہم الرضوان متفق ہوں، اس کو ماننا ضروری ہے اور اس کے خلاف چلنا گمراہی۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے کہ ہمارے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ آپ سب سے پہلے اللہ کی کتاب قرآن پاک کو لیتے ہیں، اس کے بعد نبی (علیہ السلام) کی سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں پھر اجماع صحابہ علیہم الرضوان میں سے متفق علیہ مسئلہ پر عمل کرتے ہیں۔ اور اگر صحابہ میں اختلاف پایا جائے۔ وہاں امام صاحب کسی قوم کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اس کے بعد جب تابعین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو فرماتے ہیں۔ نَحْنُ رِجَالٌ وَھُمْ رِجَالٌ یعنی وہ تحقیق کے شاہسوار ہیں، ہم بھی تحقیق کرتے ہیں اور جو بات ہمیں کتاب و سنت اور اجماع کے مطابق معلوم ہوگی، اس کو اختیار کریں گے۔ آپ صحابہ علیہم الرضوان کے اجماع تک ہر

فیصلہ شدہ مسئلہ کو تسلیم کرتے ہیں، اگر وہاں تک کوئی حکم معلوم نہ ہو تو پھر اجتہاد کرتے ہیں۔

مسلکِ حنفی کی بنیاد اور اصول

خلاصہ یہ ہے کہ مسلکِ حنفی کی بنیاد اور اصول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اور منہاجِ استنباط درج ذیل بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔ قرآن کریم: احکامِ شریعت کے استنباط میں سب سے پہلا اور بنیادی ماخذ اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ سنتِ نبوی اور آثار: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار پر اعتماد۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ: "جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ اجماعِ امت: صحابہ اور تابعین کے اجماع کو شریعت میں حجت تسلیم کرنا۔ قیاس اور اجتہاد: جہاں واضح نص (آیت یا حدیث) موجود نہ ہو، وہاں شریعت کے عمومی مقاصد اور اصولوں کی روشنی میں قیاس اور عقلِ صحیح کا استعمال کرنا۔ آپ کو فقہ میں قیاس اور اجتہاد کی بہترین مہارت کی وجہ سے امت میں بلند مقام حاصل ہے۔ قیاس کے مقابلے میں ایسے متبادل حکم کو اپنانا جو زیادہ سہولت اور انصاف پر مبنی ہو۔ اس لئے حنفی مسلک دنیا میں سب سے زیادہ مانا اور پیروی کیا جانے والا فقہی مسلک ہے، جو جنوبی و وسطی ایشیا، ترکی، بلقان اور دنیا کے دیگر کئی خطوں میں رائج ہے۔ امام صاحب کے ارشادات اور فقہی آراء کو مدون کرنے میں آپ کے نامور شاگردوں، خصوصاً امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہما اللہ نے بنیادی کردار ادا کیا۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا فقہی و اجتہادی مسلک

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی معرکۃ الاراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ قوانین اسلام کی تشریح ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں حدیث کی شرح بیان کی گئی ہے اور دوسرے میں کلی قوانین بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں اسلام کا مکمل نظام پیش کیا گیا ہے۔ گزشتہ بارہ سو سال میں ایسی بلند پایہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ آپ بارہویں صدی کے مجدد، محدث مفسر اور صاحب طریقت بزرگ ہوئے ہیں۔ چار پانچ پشتوں تک آپ کا سارا خاندان اسی پایہ کا ہوا ہے۔ آپ کے والد، بیٹے اور پوتے دین کے شیدائی ہوئے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی خاطر پوری قوتیں صرف کر دیں اور پوری دنیا خصوصاً برصغیر میں

دین کی بے پایاں خدمت انجام دی۔آپ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اگر ہماری تحریر کتاب اللہ کے خلاف ہو یا سنت رسول کے خلاف ہو، یا اجماع قرون مشہود لہا بالخیر کے خلاف ہو (اجماعِ قرونِ مشہود لہا بالخیر" سے مراد اسلام کی تاریخ کے ابتدائی تین زمانوں (دورِ صحابہ، دورِ تابعین، اور دورِ تبع تابعین) کے اہل علم اور فقہاء کا کسی شرعی مسئلے پر بلا اختلاف متفق ہونا ہے۔) فَإِنَّهُ خَطَاءٌ تو سمجھ لینا کہ یہ غلطی ہے رَحِمَ اللهُ مَنْ أَيْقَظَنَا مِنْ سِنَتِنَا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو ہمیں ہماری غلطی سے آگاہ کرے گا۔قرون مشہود لہا بخیر سے آپ کی مراد وہ زمانہ ہے جس کی بہتری کی گواہی دی گئی ہے حضور ﷺ کا ارشاد خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ یعنی بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں اور پھر جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں۔غرضیکہ آپ بھی اجماع صحابہ علیہم الرضوان کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔اور فرماتے ہیں کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ پھر اجماع اور پھر اجتہاد۔اگر ہمارے اجتہاد میں کوئی غلطی ہو جائے تو وہ ہمارا مذہب نہیں ہوگا۔بلکہ یہ ایک تحقیقی بات ہوگی۔اس سے روشنی تو حاصل ہوتی رہے گی۔مگر اسے بطور عقیدہ اور عمل نہیں اپنایا جاسکتا۔

دین اور معاشرے میں فرقہ بندی کی بنیادی اور اہم وجوہات

فرماتے ہیں کہ اجماع امت کا ماننا اس لیے ضروری ہے کہ یہ مومنین کا راستہ ہے۔وہ مومنین جو اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے رسول کا اتباع کرتے ہیں۔جو شخص ان کے راستے کو چھوڑ دے گا وہ یقیناً گمراہ ہو جائے گا۔تمام فرقے اسی لیے وجود میں آئے ہیں کہ یہ قرآن وسنت کے مرکز سے ہٹ گئے۔اگر یہ لوگ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مرکز پر قائم رہتے تو گمراہ نہ ہوتے،فکری عملی اور اخلاقی گمراہی مرکز سے ہٹنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔مرزا قادیانی اسی مرکز سے ہٹ کر گمراہ ہوا۔سرسید نے من مانی تاویلیں کیں،معجزات کا انکار کیا تو گمراہ ہوا۔علامہ مشرقی نے بھی یہیں سے ٹھوکر کھائی۔پرویز نے قرآن پاک کے نئے نئے معانی بنائے اور اسی وجہ سے گمراہ ہوا۔غرض یہ کہ جتنے بھی فرقے ہیں وہ سب اسی نقطے پر آکر بھٹکتے ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں بہت سی باتیں آتی ہیں مگر جہاں عقیدے کا معاملہ آتا ہے، میں کہتا ہوں کہ ان کو نہیں مانوں گا۔ میں تو وہی بات مانوں گا جو جمہور نے تسلیم کی ہے اور جس پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا اتفاق ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں بڑے بڑے نکات آتے ہیں، مگر جب تک کتاب وسنت کے دو گواہ موجود نہ ہوں، میں کسی چیز کو نہیں مانوں گا۔ غرضیکہ اصول دین کے اتباع کو چھوڑ کر اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق یا شیطانی مکر وتلبیس میں مبتلا ہو کر دین میں کچھ نئی چیزیں بڑھا دے یا بعض چیزوں کو چھوڑ دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مشکلات اور مبہمات کی تفسیر اور اپنی سنت کی تفصیلات اپنے بلا واسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام علیہم الرضوان کو اپنے قول وعمل کے ذریعہ سکھلائیں، اس لیے جمہور صحابہ علیہم الرضوان کا عمل پوری شریعت الٰہیہ کا بیان وتفسیر ہے؛ اس لیے مسلمان کی سعادت اسی میں ہے کہ ہر کام میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے، اور جس آیت یا حدیث کی مراد میں اشتباہ ہو اس میں اس کو اختیار کرے جس کو جمہور صحابہ کرام علیہم الرضوان نے اختیار فرمایا ہو۔ اس مقدس اصول کو نظر انداز کر دینے سے اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے کہ تعامل صحابہ اور تفسیرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے جو جی میں آیا اس کو قرآن وسنت کا مفہوم قرار دے دیا، یہی وہ گمراہی کے راستے ہیں جن سے قرآن کریم نے بار بار روکا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا، اور اس کے خلاف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ حاصل یہ ہے کہ: اصول دین میں اختلاف اور جمہور صحابہ کرام کے منہج سے ہٹنا اختلاف دین اور فرقہ بندی کا سبب ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے، باقی فروعات میں اختلاف مذموم نہیں۔ بہر حال دلائل شرعیہ میں تیسرا نمبر اجماع امت کا ہے اس میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کا اجماع اول درجہ میں ہے جس معاملہ میں ان کا اتفاق ہو، اس کے خلاف چلنا گمراہی ہے۔ فرمایا جو اللہ کے رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے کی پیروی کرے گا نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى تو ہم پھیر دیں گے

اس کو اسی طرف جس طرف اس نے رخ کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیک و بد کام کے لیے توفیق دینا خدا تعالیٰ کا کام ہے جب کوئی شخص برائی کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تمہاری توفیق سلب نہیں کرتے اگر اسی راستے پر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ اس معاملہ میں تم اپنے فعل میں مختار ہو۔ نیک کام کرنا چاہو تو اس کی توفیق بھی دیتے ہیں اور کفر شرک میں مبتلا ہونا چاہو تو اس سے بھی ہم روکتے نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ ہم قیامت کے دن اس کا حساب کتاب تم لے سے لیں گے۔ اس وقت جدھر جانا چاہو ہم اسی طرف پھیر دیں گے۔

فرد اور اجتماعیت

زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے (یعنی اپنا کام کر رہی ہے)، زمین اپنی اس گردش کے دوران سورج کے گرد بھی گھومتی ہے۔ زمین اپنی اس انفرادی حیثیت کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی نظام "نظامِ شمسی" کا بھی حصہ ہے اور وہ پورا نظامِ شمسی بھی (اپنے سیاروں اور چاندوں سمیت) رواں دواں ہے، پھر وہ بھی اپنے سے بڑی ایک اور اجتماعیت "کہکشاں" کا حصہ ہے، پھر یہ کہکشائیں بھی اپنے سے بڑی ایک اور اجتماعیت "گلیکسی" کا حصہ ہیں۔ الغرض ہر کرہ حرکت میں بھی ہے اور کسی اجتماعیت کا حصہ بھی ہے۔ اسی طرح دنیا کی ہر چیز اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ ساتھ کسی اجتماعیت کا حصہ بھی ہے، چاہے وہ درخت ہوں یا پھل پھول، پودے، درند، چرند، پرند ہوں یا خشکی تری کے جاندار، وغیرہ، ہر کوئی کسی نا کسی اجتماعیت کا حصہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کائنات کا مزاج اجتماعیت والا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ یعنی جماعت کو لازم پکڑو۔ جماعت سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔ اس فرمانِ نبوی کا مقصد مسلمانوں کو اتفاقِ امت کے ساتھ رہنے اور تفرقہ بازی یا گروہ بندی سے بچنے کی تلقین کرنا ہے۔ کیونکہ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں جا پڑا۔ یہ حصہ اس حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے جو امت کے اتحاد اور بڑی جماعت (سوادِ اعظم) کے ساتھ جڑے رہنے کی تاکید کرتی ہے۔ امتِ مسلمہ کے اتفاق سے کٹنے اور انفرادی راہ اختیار کرنے کی مذمت میں یہ جملہ ارشاد ہوا

ہے۔فرمایا جب تک کوئی شخص جماعت کے ساتھ منسلک رہے گا شیطان کے حملہ سے محفوظ رہے گا جو بکری ریوڑ کے اندر رہتی ہے وہ بھیڑیے کے حملے سے بچ جاتی ہے اور جو ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے وہ درندوں کا شکار ہو جاتی ہے۔اسی طرح شیطان بھی اس شخص پر مسلط ہوتا ہے جو جماعت سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔غرض یہ کہ مسلمانوں کی اجماعیت کے خلاف چلنے والا آدمی شیطان کا شکار ہو کر گمراہ ہو جائے گا۔افسوس کا مقام ہے کہ اہل اسلام کی اجتماعیت ایک زمانہ سے بگڑ چکی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے عقیدے اور عمل بگڑ چکے ہیں۔فرمایا ہم ایسے شخص کو اس کی خواہش کے مطابق پھیر دیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ آخر کار ہم اسے جہنم میں داخل کرینگے کیونکہ ہدایت کے واضح ہونے کے بعد جماعت کے راستہ سے الگ ہو گیا اس نے اللہ کے رسول کی مخالفت کی۔اور جو شخص جہنم میں پہنچ گیا وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ وہ تو لوٹ کر جانے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔ایسا شخص ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گیا۔اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذمت کے ساتھ ساتھ اجماع امت کا مسئلہ بھی سمجھا دیا کہ ہمیشہ جماعت کو لازم پکڑو،سلف صالحین کے مسلک پر قائم رہو،اس کے خلاف چلنے والا گمراہ ہو کر جہنم میں داخل ہوگا۔

☆☆☆

گناہ ومعصیت کا ظاہری اثر/توبہ اور اس کی شرائط

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۭ وَمَنْ یُّشْرِكْ
بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا
شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَہُ اللّٰہُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾

کن گناہوں کی معافی نہیں ہے؟

اِنَّ اللّٰہَ	یقیناً اللہ	لَا یَغْفِرُ	نہیں بخشے گا
اَنْ یُّشْرَكَ	یہ کہ شرک کیا جائے	بِہٖ	اس کے ساتھ
وَیَغْفِرُ	اور وہ بخش دے گا	مَا دُوْنَ ذٰلِكَ	جو اس کے علاوہ ہے
لِمَنْ یَّشَآءُ	جس کے لیے وہ چاہے گا	وَمَنْ	اور جو شخص
یُّشْرِكْ بِاللّٰہِ	شریک ٹھہرائے اللہ کے ساتھ	فَقَدْ ضَلَّ	تو تحقیق وہ گمراہ ہوگیا
ضَلٰلًۢا	گمراہ ہونا	بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾	دور کا

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے شرک اللہ تعالیٰ کے حق میں بغاوت ہے۔ اگر مرنے سے پہلے پہلے اس دنیا میں تائب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ یقینا معاف فرما دے گا۔ ورنہ موت کے بعد شرک کی معافی

کا کوئی قانون نہیں وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ اور اس سے کمتر ہر گناہ کی جس کے لیے چاہتا ہے بخشش کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی معاف کر دے۔ مگر توبہ کرنے پر تو وہ بخش ہی دیتا ہے۔ مگر شرک کی معافی کا کوئی امکان نہیں۔ عام طور پر مشرک زندگی میں توبہ نہیں کرتا، لہٰذا اس کی معافی بھی معدوم ہوتی ہے۔ فرمایا وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا خواہ یہ ذات میں ہو، صفات میں ہو، نذر و نیاز میں ہو یا عبادت میں ہو، کسی طرح کا بھی شرک کیا فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾ تو ایسا شخص گمراہ ہو کر دور جا پڑا۔ اس کی معافی کا کوئی قانون نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ قادر مطلق، سلطان محبت اور ودود ہے۔ وہ تو مخلوق سے محبت کرتا ہے، مگر مخلوق ہی بگڑی ہوئی ہے، جو اللہ تعالیٰ سے بیزار ہو کر شرک کا ارتکاب کرتی ہے اور محبت کے مقام وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ مومن کی شان تو یہ ہے یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ کو اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں، مگر لوگ محبت کے تقاضے کو پورا نہیں کرتے، مولانا فرماتے ہیں کہ سلطان محبت سے امید ہے کہ وہ ہر جرم کو معاف کر دے، مگر اس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون موجود نہیں، جب کوئی شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے، تو اس کا دل تقسیم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖ میں نے کسی سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ عقیدہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا شرک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ یہ قبیح بیماری ہے۔

اس آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں: 1۔ شرک ناقابل معافی جرم ہے جسے اللہ کسی صورت میں بھی معاف نہیں کرے گا۔ 2۔ کیسے گناہوں کی معافی کی توقع ہو سکتی ہے:۔ دوسرے گناہوں کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معاف ہو جائیں گے۔ اللہ جس کو چاہے اور جونسا گناہ چاہے معاف کر دینے کا اختیار رکھتا ہے اور چاہے تو ان پر مواخذہ بھی کر سکتا ہے۔ گناہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں یا ایک ہی گناہ میں دو قسم کے حقوق ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کا حق، دوسرے بندوں کا حق، اللہ جسے

چاہے اپنا حق معاف کر دے اور جسے چاہے نہ کرے مگر بندوں کے حقوق کی ادائیگی لازمی ہے تب ہی اللہ اپنا حق بھی معاف کرے گا۔ بندوں کا حق خواہ اس دنیا میں ادا کر دیا جائے یا ان سے معاف کرالیا جائے یا اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے حقدار کو بدلہ اپنی طرف سے ادا کر دے۔ بہرحال بندوں کے حقوق کی معافی کے بعد اللہ کے حق کی معافی کی توقع ہوسکتی ہے۔ 3۔ اور تیسری بات یہ کہ شرک ہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔ شرک کو ہی ایک دوسرے مقام پر ظلم عظیم کہا گیا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ گناہ کے تین دفتر ہیں۔ پہلا دفتر کفر و شرک کا ہے جس کی معافی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرا دفتر باقی کبائر کا ہے، جن کی معافی ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ معاف کرنا چاہے تو بڑے سے بڑا گناہ ماسوائے شرک کے معاف کر دے۔ اور گناہ کا تیسرا دفتر وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ یہ حقوق العباد ہیں جس شخص نے کسی دوسرے کا حق تلف کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کا حق ضرور دلائیں گے اور جب تک بندہ اپنا حق معاف نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ بھی معافی نہیں دیں گے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شرک صرف بتوں کی پوجا کا نام نہیں بلکہ اللہ کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حکم مان لینا یا کسی دوسرے دوسرے دین کو تسلیم کر لینا بھی شرک میں داخل ہے۔ بشر منافق نے یہی کیا تھا کہ اللہ کا حکم ماننے کی بجائے مشرکین کی بات کو تسلیم کیا۔ یہ اللہ کے حکم میں شرک ہے چنانچہ حضرت مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب منافق رسول کے حکم کے خلاف کر کے مشرکین سے جا ملا تو اس کی مغفرت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ یہاں شرک سے مراد شرک فی الحکم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر چیز سے وسیع ہے

جب سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وجود بخشا ہے تب ہی سے اس سے غلطیاں سرزد ہونے کا بھی آغاز ہوگیا۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر خاص رحمت ہے کہ اس نے غلطی اور گناہ کرنے والے کو فوراً اس کی سزا نہیں دی بلکہ گناہ کے بعد توبہ کر لینے اور معافی مانگ لینے والے کے لیے اس کی غلطیوں کو نیکیوں میں بدلنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہر مؤمن مکلف پر گناہ سے توبہ کرنا فرض و لازم ہے اور اس میں تین

باتیں ضروری ہیں: 1 گناہ پر ندامت وشرمساری اس حیثیت سے نہیں کہ اس کو بدنی یا مالی نقصان ہوا ہے، بلکہ اس حیثیت سے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی ہے۔ 2 بلا تاخیر اور سُستی کے پہلی ممکنہ فرصت میں گناہ کو چھوڑنا۔ 3 کبھی بھی اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ عزم اور ارادہ رکھنا اور اللہ نہ کرے پھر وہ گناہ ہو جائے تو از سرِ نو اس عزم وارادہ کی تجدید کرنا۔ نہایت عاجزی وانکساری سے گناہ کا اعتراف واقرار کرنا۔ 2- اس پر استغفار کرنا، اس غلطی وگناہ پر اللہ تعالیٰ کے حضور میں نہایت عاجزی وتضرع سے معافی مانگنا۔ کثرت سے نیکیاں کر کے پچھلی بُرائیوں کو مِٹانا۔ کفر اور شرک کے علاوہ جتنے کبیرہ گناہ ہیں، وہ سب توبہ سے معاف ہو سکتے ہیں بشرطیکہ توبہ سچی توبہ ہو، سچی توبہ کا مطلب یہ ہے کہ دل سے پشیمانی ہو، اس گناہ کو فوراً ترک کر دیا جائے اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہو، اور اگر اس گناہ کی وجہ سے کسی کی حق تلفی ہوئی ہو تو اس کی ادائیگی یا تلافی کی کوشش شروع کر دی جائے۔ یعنی اگر حقوق اللہ (نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ) ذمہ پر ہیں، تو انہیں ادا کرنا شروع کر دے۔ اور اگر حقوق العباد میں کوتاہی کی ہو تو صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کرے یا اس سے معاف کروالے، بندے کا حق اس کے معاف کیے بغیر معاف نہیں ہو سکتا، حقوق العباد سے متعلق گناہوں سے توبہ کی تکمیل کے لیے یہ ضروری شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر چیز سے وسیع ہے، وہ کسی کو بے شمار گناہوں کے باوجود بھی معاف کر کے جنت میں داخل کر سکتا ہے، اور اس میں وہ حق بجانب ہوگا، تاہم یہ بھی ملحوظ رہے کہ رحمت اور معافی کی امید پر گناہوں میں مبتلا ہونا عقل مندی نہیں، حماقت ہے، حدیث پاک میں ایسے شخص کو بے وقوف کہا گیا ہے جو خواہش نفس کی پیروی کرے اور اللہ تعالیٰ سے امیدیں اور آرزو لگائے رکھے کہ وہ کریم ہے معاف کر دے گا، جب کہ عقل مند اس شخص کو قرار دیا گیا ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور آخرت کی تیاری کرے۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ جس کام سے اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ نے ناراضی کا اظہار فرما دیا، اس کام کے قریب بھی نہ جائے۔

توبہ کے بنیادی طور پر تین اہم مراتب

اس آیت سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں: 1۔ شرک ناقابل معافی جرم ہے جسے اللہ کسی صورت

میں بھی معاف نہیں کرے گا۔ 2۔ کیسے گناہوں کی معافی کی توقع ہوسکتی ہے:۔ دوسرے گناہوں کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ معاف ہوجائیں گے۔ اللہ جس کو چاہے اور جونسا گناہ چاہے معاف کردینے کا اختیار رکھتا ہے اور چاہے تو ان پر مواخذہ بھی کرسکتا ہے۔ گناہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں یا ایک ہی گناہ میں دو قسم کے حقوق ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کا حق، دوسرے بندوں کا حق، اللہ جسے چاہے اپنا حق معاف کردے اور جسے چاہے نہ کرے مگر بندوں کے حقوق کی ادائیگی لازمی ہے تب ہی اللہ اپنا حق بھی معاف کرے گا۔ بندوں کا حق خواہ اس دنیا میں ادا کردیا جائے یا ان سے معاف کرالیا جائے یا اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے حقدار کو بدلہ اپنی طرف سے ادا کردے۔ بہرحال بندوں کے حقوق کی معافی کے بعد اللہ کے حق کی معافی کی توقع ہوسکتی ہے۔ 3۔ اور تیسری بات یہ کہ شرک ہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔ شرک کو ہی ایک دوسرے مقام پر ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ الحاصل! توبہ کے مراتب پہلا درجہ (ترکِ کفر و قبولِ ایمان): یہ توبہ کا سب سے بڑا اور بنیادی درجہ ہے، جس میں انسان کفر یا شرک کو چھوڑ کر اسلام اور ایمان کی طرف آتا ہے۔ دوسرا درجہ (کبائر سے توبہ) اس سے مراد بڑے گناہوں (کبائر) سے سچی توبہ کرنا ہے، یعنی انسان بڑے گناہ ترک کرکے اللہ کے حضور ندامت کا اظہار کرے۔ تیسرا درجہ (صغائر سے توبہ): یہ نیک اور متقی لوگوں کا درجہ ہے جو چھوٹے گناہوں (صغائر) یا لغزشوں سے بھی توبہ کرتے ہیں اور ہر وقت اللہ کی طرف رجوع میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے تمام گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہوئے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عورتوں کے نام کی دیویاں قرآنی اور تاریخی تناظر

اِنْ یَّدْعُوْنَ	نہیں وہ پکارتے	مِنْ دُوْنِہٖٓ	اس (اللہ) کے سوا
اِلَّآ اِنٰثًا	مگر عورتوں کو	وَاِنْ یَّدْعُوْنَ	اور نہیں وہ پکارتے
اِلَّا شَیْطٰنًا	مگر شیطان	مَّرِیْدًا ﴿۱۱۷﴾	سرکش کو

فرمایا اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا "اناثا" یہ "اُنْثٰی" کی جمع ہے، یعنی مونث۔ ان سے مراد یا تو بت ہیں جن کے اکثر نام (لات، مناۃ، عزیٰ وغیرہ) مؤنث تھے۔ یونانیوں اور ہندوؤں

نے بھی عبادت کے لیے دیویاں بنا رکھی ہیں۔ یہ لوگ نہیں پکارتے مگر عورتوں کو عرب کے مشرکلات، منات اور عزیٰ کی پرستش کرتے تھے، جو سب عورتوں کے نام ہیں۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کے زمانہ میں سواخ نامی بت تھا۔ یہ بھی عورت کی شکل کا تھا اور اس کا معنی استقرار یا انتظام کی دیوی ہے، جس طرح گھر کا انتظام عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسی طرح کائنات کے نظام کے لیے ہندوؤں نے وشنو دیوی بنا رکھی ہے ان کی اور بھی بہت سی دیویاں ہیں۔ ایک درگا دیوی ہے، ایک کالی ماتا کلکتے والی دیوی ہے جو آفتوں اور مصیبتوں کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے سامنے بچوں کو ذبح کیا جاتا ہے تا کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو۔ ان کے ہاں ایک سرسوتی دیوی ہے۔ اسی نام کی بہار میں ایک ندی بھی ہے۔ یہ طوفان اور سیلابوں کی دیوی ہے۔ لکشمی دیوی دھن دولت کی دیوی۔ مال و دولت میں اضافہ کے لیے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ یونانیوں کے ہاں زہرہ دیوی کے مندر تھے وہاں نیازیں دی جاتی تھیں۔ اس دیوی کی چوکھٹ پر دو قارورے یعنی شیشے کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک خیر کے لیے اور دوسری شر کی طرف منسوب تھی۔ مشرکانہ نفسیات میں سے یہ ہے کہ اکثر مشرک مذاہب میں مؤنث اور مادہ کی پوجا کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، یہ سب ان کے عقیدہ کے مطابق عورتیں تھیں، ہندوستان میں سرسوتی، درگا اور سیتا وغیرہ کی پوجا اب تک ہوتی ہے، گائے کی پرستش مصر و یونان میں ہوا کرتی تھی اور ہندوستان میں اب تک ہوتی ہے؛ بلکہ ہندوؤں کے بعض فرقوں میں اور بعض علاقوں میں نسوانی اعضاء کی بھی پوجا کی جاتی ہے، یہ ایک متضاد فکر ہے کہ عورتوں کو کمزور بھی سمجھا جائے اور انھیں خدا کا درجہ بھی دیا جائے؛ اسی لئے قرآن نے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ اصل میں شیطان کی پرستش ہے؛ کیوں کہ اسی کے حسبِ منشاء یہ حرکت کی جاتی ہے۔

عربوں میں نائلہ نامی عورت کے نام کا بت تھا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اساف اور نائلہ مرد اور عورت تھے جنہوں نے کعبہ میں زنا کا ارتکاب کیا تو اللہ نے انہیں مسخ کر کے پتھر بنا دیا، لوگوں نے عبرت کے لیے انہیں بیت اللہ کے سامنے رکھ دیا، پھر آہستہ آہستہ ان کی پوجا شروع ہوگئی، فتح مکہ کے موقع پر نبی (علیہ السلام) نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مامور کیا کہ طائف والے جس عزیٰ دیوی کی پوجا

کرتے ہیں۔اس کو مٹادو۔آپ گئے اور دیکھا کہ وہاں پر کچھ درخت ہیں جو آپ نے کاٹ دیئے،ایک کو ٹھاتھا جسے آپ نے گرادیا۔وہاں کچھ مجاور بیٹھے تھے جو بھاگ گئے۔واپس آکر آپ نے اس کارروائی کی رپورٹ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا،وہاں دیوی تو ابھی زندہ ہے۔ دوبارہ جا کر اسے ختم کرو۔چناچہ آپ دوبارہ وہاں گئے۔تلاش کرنے پر تہہ خانے سے ایک عورت برآمد ہوئی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر دہشت ڈالنے کے لیے ان پر حملہ آور بھی ہوئی مگر آپ نے اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔واپس آکر حضور ﷺ کو صورت حال سے آگاہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا،یہ عزیٰ تھی جس کی لوگ پرستش کرتے تھے،اب آج کے بعد اس کی پوجا نہیں ہوگی۔غرض یہ کہ عورتوں کے نام پر اس قسم کی دیویاں دنیا بھر میں موجود تھیں۔

ابلیس کا انسانوں کو گمراہ کرنے کا دعویٰ

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَاِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا وہ نہیں پوجا کرتے مگر شیطان کی، انسان کے وہم پر شیطان غالب آکر اسے غیر اللہ کی پرستش کروانے لگتا ہے۔وہ انسان کے ذہن میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جس سے وہ نذرونیاز دینے لگتا ہے،کہیں ندا کرتا ہے یا علی مدد یا پیر دستگیر وغیرہ گاڑیوں پر اس قسم کے کلمات لکھ رہے ہیں۔"المدد یا غوث" گویا اب گاڑی کی حفاظت غوث کے ذمے واجب ہوگئی حالانکہ لکھیں یا نہ لکھیں،مدد تو ہر حالت میں اللہ ہی کرتا ہے بعض موحد لوگ یا اللہ مدد بھی لکھتے ہیں۔مدد تو کسی غیر کے اختیار میں نہیں ہے۔غرض یہ کہ شیطان انسان کے وہم پر چھا کر اس سے شرکیہ افعال کراتا ہے۔اسی لیے حضور ﷺ نے دعا میں سکھایا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِی وَمِنْ شَرِّ كُلِّ شَیْطٰنٍ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنے ہی نفس کے شر سے اور شیطان کے شر سے بھی۔ بہرحال یہ شرکیہ رسومات شیطان ہی سکھاتا ہے کہ چادر چڑھانا،اس میں یہ فائدہ ہے بکرے چڑھاؤ،سجدہ کرو،غیر اللہ کی دہائی دو،وغیرہ وغیرہ بعض مجسموں پر سرخ رنگ کی چادر چڑھاتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ عورت کا مجسمہ ہے اور اسے سرخ رنگ پسند ہے۔فرمایا نہیں پکارتے مگر شیطان کو جو مَّرِیْدًا ﴿۱۱۷﴾ سرکش ہے جو شخص غیر اللہ کی پوجا کرتے ہیں،

شرک جیسے قبیح فعل کا ارتکاب کرتا ہے وہ دراصل شیطان ہی کی پوجا کرتا ہے۔اسی کے کہنے پر چلتا ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔جس کے نتیجہ میں فرمایا لَّعَنَهُ اللّٰهُ اللہ نے اس پر لعنت بھیجی ہے۔شیطان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔شیطان کو پکارنا اس لحاظ سے ہے کہ انسان کو شرک کی جتنی راہیں سجھائی ہیں سب شیطان ہی نے سجھائی ہیں۔گویا ایسا عقیدہ رکھ کر خواہ کسی کو بھی پکارا جائے وہ پکار بھی شیطانی ہے اور شیطان ہی کو پکارنے کے مترادف ہے اگرچہ سب لوگ شیطان کو اللہ کا باغی اور سرکش سمجھ کر ظاہری طور پر گالیاں ہی دیتے ہیں۔یہ مقررہ حصہ وہ لوگ ہیں جو شیطان کے فریب میں آ کر اللہ کے ساتھ شرک کریں گے اور گمراہ ہو جائیں گے۔مقررشدہ حصہ سے، مراد وہ نذرونیاز بھی ہو سکتی ہے جو مشرکین اپنے بتوں اور قبروں میں مدفون اشخاص کے نام نکالتے ہیں اور جہنمیوں کا وہ کوٹہ بھی ہو سکتا ہے جنہیں شیطان گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جائے گا۔

شیطان کی دشمنی اور بچاؤ کے سلیقے

لَّعَنَهُ اللّٰهُ	اللہ نے اس پر لعنت کی	وَقَالَ	اور اس (شیطان) نے کہا
لَاَتَّخِذَنَّ	البتہ میں ضرور لوں گا	مِنْ عِبَادِكَ	تیرے بندوں میں سے
نَصِيْبًا	ایک حصہ	مَّفْرُوْضًا ⑱	مقرر

جس کے نتیجہ میں فرمایا لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ⑱ جس پر اللہ نے پھٹکار ڈال رکھی ہے، اور اس نے (اللہ سے) یہ کہہ رکھا ہے کہ: میں تیرے بندوں سے ایک طے شدہ حصہ لے کر رہوں گا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اصل عزائم، اس کے تکبر اور انسانوں کو گمراہ کرنے کے اس کے پکے ارادے کو بے نقاب کیا ہے۔اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں: 1. اللہ کی لعنت (پھٹکار) شیطان کو بارگاہِ الٰہی سے ہمیشہ کے لیے مردود کر دیا گیا۔لعنت کا مطلب اللہ کی رحمت سے مستقل محرومی ہے۔یہ محرومی اس کے تکبر اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی۔2. شیطان کا چیلنج اور دعویٰ لعنت زدہ ہونے کے بعد شیطان نے توبہ کرنے کے بجائے سرکشی اختیار کی۔اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ وہ بنی آدم کو

صراطِ مستقیم سے بھٹکائے گا۔اس کا یہ کہنا کہ" میں ایک طے شدہ حصہ لے کر رہوں گا" اس کے پختہ ارادے کو ظاہر کرتا ہے۔3." طے شدہ حصہ" (نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا) وہ لوگ جو رحمان کے بجائے شیطان کی پیروی کریں گے،وہ شیطان کا حصہ بنیں گے۔شرک،بدعت،حرام خوری،اور نافرمانی کے کاموں میں انسانوں کو مبتلا کرنا۔وقت اور صلاحیت کا ضیاع:انسانوں کی توانائیوں کو تعمیری کاموں کے بجائے تخریبی کاموں میں لگانا۔حاصل کلام ہشیاری کی ضرورت کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے جو ہر وقت گھات لگائے بیٹھا ہے۔شیطان صرف ان لوگوں پر قابو پا سکتا ہے جو اللہ کے ذکر سے غافل ہوتے ہیں۔اس سے حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ استغفار،نماز کی پابندی اور" اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ " پڑھ کر ہم شیطان کے اس حصے (گروہ) میں شامل ہونے سے بچ سکتے ہیں۔اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں چھوٹے بڑے گناہوں سے سچی توبہ کی توفیق دے اور قرآن پڑھنے اس کو سمجھنے اور اس کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے آمین

☆☆☆

خواہشات نفس کی پیروی/شیطانی ہتھکنڈے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَّلَاُضِلَّنَّھُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّھُمْ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ ط وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا ⑲ یَعِدُھُمْ وَیُمَنِّیْھِمْ ط وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ⑳

اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ز وَلَا یَجِدُوْنَ عَنْھَا مَحِیْصًا ㉑

لمبی امید رکھنے کی مذمت

وَّلَاُضِلَّنَّھُمْ	اور البتہ میں ضرور ان کو گمراہ کروں گا	فَلَیُبَتِّکُنَّ	تو وہ ضرور چیریں گے
اٰذَانَ	کان	الْاَنْعَامِ	چوپایوں کے
وَلَاُمَنِّیَنَّھُمْ	اور میں ضرور ان کو امیدیں دلاؤں گا	وَلَاٰمُرَنَّھُمْ	اور میں ضرور ان کو حکم دوں گا
وَلَاٰمُرَنَّھُمْ	اور یقیناً میں ان کو حکم دوں گا	فَلَیُغَیِّرُنَّ	تو وہ ضرور تبدیل کریں گے
خَلْقَ اللّٰہِ	اللہ کی (بناوٹ) صورتیں	وَمَنْ	اور جو کوئی
یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ	بناتا ہے شیطان کو	وَلِیًّا	دوست
مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ	سوائے اللہ کے	فَقَدْ خَسِرَ	تو تحقیق اس نے خسارہ اُٹھایا
خُسْرَانًا	خسارہ	مُّبِیْنًا ⑲	صریح (ظاہر)

فرمایا: وَّلَاُضِلَّنَّھُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّھُمْ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ اور میں انہیں راہ راست سے بھٹکا کر رہوں گا، اور انہیں خوب آرزوئیں دلاؤں گا، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ چوپایوں کے کان چیر ڈالیں گے، یہ شیطان کا کہنا تھا کہ میں ضرور لوگوں کو طرح طرح کی چیزوں کی، کبھی لمبی عمر کی، کبھی لذّات دنیا کی، کبھی باطل خواہشات اور کبھی اور قسم کی امیدیں دلاؤں گا اور وہ ان امیدوں کی دنیا میں پھرتے رہیں گے اور اللہ عَزَّ وَجَلَّ سے غافل رہیں گے۔ شیطان مردود کا بڑا مقصد لوگوں کو بہکانا اور عملی اعتبار سے ایسا کر دینا ہے کہ نجات و مغفرت کا کوئی راستہ باقی نہ رہے، اس کے لئے وہ مختلف طریقے اپناتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ لمبے عرصے تک زندہ رہنے کی سوچ انسان کے دل، دماغ میں بٹھا کر موت سے غافل رکھتا ہے، حتّٰی کہ اسی آس امید پر جیتے جیتے اچانک وہ وقت آجاتا ہے کہ موت اپنے دردناک شکنجے میں کَس لیتی ہے پھر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، ناچار اپنے کئے اعمال کے انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فی زمانہ لوگوں کی اکثریت موت کو بھول کر دنیا کی لمبی امیدوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ امام غزالی رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں ”لمبی زندگی کی امید دل میں باندھ لینا جہالت اور نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے یا پھر دنیا کی محبت کی وجہ سے۔ جہالت اور نادانی تو یہ ہے کہ آدمی اپنی جوانی پر بھروسہ کر بیٹھے اور بڑھاپے سے پہلے مرنے کا خیال ہی دل سے نکال دے، اسی طرح آدمی کی ایک نادانی یہ ہے کہ تندرستی کی حالت میں ناگہانی موت کو ناممکن سمجھے۔ لہٰذا ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ ان باتوں میں غور کرے ”کیا لاکھوں بچے جوانی کی دہلیز پر پہنچنے سے پہلے ہی راہی عدم نہ ہوئے؟ کیا ہزاروں انسان چڑھتی جوانی میں موت سے ہم آغوش نہ ہوئے؟ کیا سینکڑوں نوجوان بھری جوانی میں لقمۂ اَجَل نہ بنے؟ کیا دَسیوں نوجوان بیماریوں کا شکار نہ ہوئے؟ ان باتوں میں غور و فکر کے ساتھ ایک اور بات دل میں بٹھالے کہ موت اس کے اختیار میں نہیں کہ جب یہ چاہے گا تو اسی وقت آئے گی، اس طرح جوانی یا کسی اور چیز پر بھروسہ کرنا خود ہی ایک نادانی نظر آئے گی۔ لمبی زندگی کی امید کی دوسری وجہ دنیا کی محبت ہے، انسان اپنے دل کو تسلّی دیتا رہتا ہے کہ ابھی تو زمانہ پڑا ہے، ابھی کس نے مرنا ہے؟ میں پہلے یہ مکان بنالوں، فلاں کاروبار

شروع کرلوں، اچھی گاڑی خریدلوں، سہولیات سے اپنی زندگی بھرلوں جب بڑھاپا آئے گا تو اللہ اللہ کرنے لگ جائیں گے اس طرح ہر کام سے دس کام نکالتا چلا جاتا ہے حتّٰی کے ایک دن پیغامِ اجل آپہنچتا ہے اب پچھتانے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ اس میں مبتلا شخص کو چاہئے کہ دنیا کی بے ثباتی اور اس کی حقیقت کے بارے میں معلومات حاصل کرے کیونکہ جس پر دنیا کی حقیقت آشکار ہو جائے کہ دنیا کی لذت چند روزہ ہے اور موت کے ہاتھوں اسے ایک دن ختم ہونا ہی ہے وہ اسے عزیز نہیں رکھ سکتا۔ (کیمیائے سعادت، رکن چہارم: منجیات، اصل دہم، اسباب طول امل، ۲/ ۹۹۵-۹۹۶، ملخصاً) یہ شیطان کا قول ہے کہ اس نے کہا میں لوگوں کو حکم دوں گا کہ وہ بتوں کے نام پر جانوروں کے کان چیریں یا اس طرح کی دوسری حرکتیں کریں۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا کہ اونٹنی جب پانچ مرتبہ بچہ جن دیتی تو وہ اس کو چھوڑ دیتے اور اس سے نفع اٹھانا اپنے اوپر حرام کرلیتے اور اس کا دودھ بتوں کے لئے وقف کردیتے اور اس کو بَحِیرہ کہتے تھے۔ شیطان نے اُن کے دِل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ایسا کرنا عبادت ہے۔ گمراہی دو راستوں سے آتی ہے، فکر و عقیدہ کی غلطی سے اور خواہشات نفس کی پیروی سے، 'میں انھیں گمراہ کروں گا' میں فکر و عقیدہ کی راہ سے بھٹکانے کی طرف اشارہ ہے، اور 'آرزوئیں دلاؤں گا' سے خواہشات نفس کی پیروی کی طرف۔

خدائی تخلیق میں تبدیلی، عذابِ الٰہی کا سبب!

فرمایا وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کریں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کی شکل وصورت تبدیل کریں گے اور ان کے حلال وحرام ہونے کے احکام بھی بدل دیں گے۔ اس میں رہبانیت (دنیا میں اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرکے جنگل میں جا رہنا)، قوم لوط کا عمل، مردوں کا خصی ہو کر ہیجڑا بن جانا، عورتوں کو بانجھ بنانا، برتھ کنٹرول کے نام پر مردوں کی نس بندی اور عورتوں کے آپریشن کرکے بچے پیدا ہونے میں رکاوٹیں ڈالنا، عورتوں کو گھروں سے نکال کر ان کے فطری فرائض سے سبکدوش کرکے مردوں کی صف

میں کھڑا کر دینا، عورتوں کو مملکت کی سربراہ بنا دینا، خوب صورتی کے لیے ابروؤں کے بال اکھاڑنا، جلد میں نیل وغیرہ بھر کر نقش ونگار بنانا، دانت باریک کروانا، سر پر مصنوعی بال لگوانا، مردوں کا داڑھی منڈوانا، عورتوں کا لباس کم از کم کر کے انھیں ننگا کرنے کی کوشش کرنا، اسی طرح شیطان گناہوں کو خوبصورت اور پُرکشش بنا کر پیش کرتا ہے اور اس کے عقلی و اخلاقی جواز کی دلیلیں ذہن میں ڈالتا ہے، مثلاً یہ کہ سود معیشت کے لئے ایک ضروری چیز ہے اور مروجہ سود میں غریبوں کا استحصال نہیں، پردہ آنکھوں کا ہے، جسم کے پردہ کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے ترقی رک جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال یہ سب شیطانی کام ہیں اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کا موجب ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے لعنت کی گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر، (جلد میں نیل یا سرمہ بھر کر نقش بنوانے والیوں) اور چہرے کے بال صاف کرنے والیوں اور کروانے والیوں پر، حسن کے لیے دانتوں میں فاصلہ کروانے والیوں پر جو اللہ عزوجل کی خلق (پیدائش) کو بدلتی ہیں۔" پھر فرمایا: "میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی اور وہ اللہ کی کتاب میں بھی ہے" اور یہ آیت پڑھی: (وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا) [الحشر: 7] "جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو، جس سے منع کر دے اس سے باز آجاؤ۔" (بخاری)

اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تبدیلی کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور واشیاء کو حلال سمجھے اور اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ امور واشیاء کو حرام خیال کرے، جس نے ایسا کیا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی کی۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں خلافِ شرع (بغیر کسی شرعی عذر یا ضرورت کے) تبدیلیاں کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، بلا ضرورت جسم کی ساخت میں ایسی تبدیلی کرنا جو مستقل ہو، مثلاً حسن کے لیے چہرے کی پلاسٹک سرجری، جسم پر گودنا (Tattooing)، دانتوں کو باریک کروانا یا مرد کا عورت کی اور عورت کا مرد کی مشابہت اختیار کرنا۔ جانوروں کے کان یا ناک بغیر کسی معقول فائدے کے کاٹنا یا ان کی تخلیق میں خلافِ شرع ردوبدل کرنا۔

جائز یا مستحسن تبدیلیاں

(علاج یا ضرورت کے تحت) اگر کسی بیماری، پیدائشی نقص (جیسے کٹا ہوا ہونٹ)، یا حادثے کے باعث چہرے یا جسم کی ساخت خراب ہو جائے تو اسے ٹھیک کرنا یا اصلی حالت پر لانا جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اور ایسی عارضی تبدیلیاں جو مستقل تخلیق کو نہ بدلیں اور دھوکے پر مبنی نہ ہوں، جیسے مہندی لگانا، سرمہ لگانا، یا عام زیب و زینت کے مباح طریقے اختیار کرنا۔ آگے فرمایا وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ جس نے اللہ کے علاوہ شیطان کو دوست بنالیا فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ⑲ بے شک وہ صریح خسارے میں جا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی عاقبت خراب ہوگئی۔ وہ ابدالآباد تک جہنم میں رہے گا اور وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

شیطان کے ہتھکنڈے (وعدے اور امیدیں)

يَعِدُهُمْ	وہ (شیطان) ان کو وعدہ دیتا ہے	وَيُمَنِّيْهِمْ	اور انہیں امیدیں دلاتا ہے
وَمَا يَعِدُهُمُ	اور نہیں وعدہ دیتا انہیں	الشَّيْطٰنُ	شیطان
اِلَّا	مگر	غُرُوْرًا ⑳	دھوکے کا۔

فرمایا يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ شیطان انہیں جھوٹے وعدے اور جھوٹی آرزوئیں دلاتا ہے۔ وہ گناہ کو مزین کر کے دکھاتا ہے کہ اس میں بڑا فائدہ ہے راستے اختیار کرلو۔ کفر، شرک، بدعات اور غلط رسومات کی ترغیب دے کر انہیں اپنا دوست بناتا ہے۔ فرمایا وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ⑳ شیطان تو انہیں محض دھوکے اور فریب کا وعدہ دیتا ہے وہ جو کچھ لوگوں کو دکھاتا ہے، سب سراب ہوتا ہے، جب انسان آخرت میں پہنچے گا، تو پتہ چلے گا کہ اس کے اعمال میں کچھ بھی نہیں۔ وہ جو کچھ کرتا رہا، شیطان کے بہکاوے میں آ کر کرتا رہا اور اللہ کے پاس ایسے اعمال کا کچھ اجر نہیں اس دھوکے کا نتیجہ یہ ہوگا۔ شیطان کے تمام وعدے سراب (دھوکے) کی طرح ہیں، جو دور سے پانی نظر آتا ہے مگر قریب جانے پر کچھ نہیں ہوتا۔ قیامت کے دن شیطان خود اپنے پیروکاروں سے صاف مکر جائے گا اور کہے گا کہ میرا تم پر کوئی زور نہیں تھا، تم نے خود میری بات مانی۔ حاصل کلام (عملی

سبق) انسان کو شیطان کے وسوسوں اور دنیا کی عارضی چمک دمک سے بچنا چاہیے۔ سچے وعدے صرف اللہ کے ہیں، اس لیے اسی کی ذات پر بھروسا کرنا چاہیے کیونکہ شیطان کا انجام اور اس کا راستہ سراسر خسارہ (نقصان) ہے۔

فرار کی کوئی راہ نہیں

اُولٰٓئِكَ	یہی لوگ ہیں	مَاْوٰىهُمْ	ان کا ٹھکانا
جَهَنَّمُ	جہنم ہے	وَلَا يَجِدُوْنَ	اور نہیں وہ پائیں گے
عَنْهَا	اس (جہنم) سے	مَحِيْصًا ⑫١	کوئی بھاگنے کی جگہ۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ⑫١ پھر جہنم سے خلاصی کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔ لفظ "مَحِیص" کے معنی ہیں: بھاگنے کی جگہ، پناہ گاہ، یا چھٹکارا پانے کا راستہ۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ جب یہ گنہگار اور مشرک لوگ جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، تو وہ وہاں سے نکلنے، بھاگنے یا کسی محفوظ جگہ چھپنے کی کوئی راہ نہیں پا سکیں گے۔ عذاب انہیں ہر طرف سے گھیر لے گا۔ شیطان کی دوستی کرنے والوں کے لیے جہنم سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ انسان ناسمجھی میں خواہشات نفس کی پیروی کرتا رہتا ہے اور اسے اس بات کا اندازہ تک نہیں ہوتا کہ وہ کتنا بڑا گناہ کر رہا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرا لیا اور اللہ نے اسے باوصف علم کے گمراہ کیا اور اس کے کان اور دل پر مُہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈالا تو اللہ کے بعد اسے کون راہ دکھائے تو کیا تم دھیان نہیں کرتے"۔ آیت مبارکہ میں خواہشات نفس کو خدا بنا لینے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی اس حد تک کرنے لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھول جائے اور جو کام کرنے کو دل کرے اسے کر ڈالے بیشک اس کام کو اللہ نے حرام ہی کیوں نہ کہا ہو۔ اور جس کام کو اس کا دل نہ چاہتا ہو اس کو نہ کرے بیشک اللہ تعالیٰ نے اس کام کو فرض قرار دیا ہو۔ جب انسان خواہش نفس کا اس حد تک فرمانبردار بن

جاتا ہے کہ جدھر اس کا نفس کہے اس طرف چل پڑے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسے علم رکھنے کے باوجود گمراہی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے جاتے ہیں اور اللہ کے سوا کوئی بھی انہیں ہدایت نہیں دے سکتا۔ لہٰذا ہمیں اس بات پر غور و فکر کرنا چاہیے کہ انسان کے لیے اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے نفس کی پیروی کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت سے محروم کر دیتا ہے اور ان کے دلوں سے عرفان صداقت ختم کر دیتا ہے اور نور حق دیکھنے والی بینائی ختم کر دی جاتی ہے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ زیر آسمان دنیا میں جتنے معبودوں کی عبادت کی گئی ہے ان میں سب سے زیادہ مبغوض اللہ کے نزدیک ہوا ہے یعنی خواہش نفس۔ (طبرانی) یہ آیت انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ شیطان کے جھوٹے وعدوں اور فریب میں نہ آئیں، کیونکہ شیطان کا انجام بھی جہنم ہے اور جو اس کے نقشِ قدم پر چلے گا، وہ بھی سخت ترین اور ابدی عذاب کا شکار ہوگا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔

☆☆☆

بدعت سنت کو مٹا دیتی ہے/ الٰہی قانونِ مکافاتِ عمل

مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ
خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ
وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ ۙ وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا
وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ
یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ
وَھُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰہِ مَا فِی
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴿۱۲۶﴾

جماعتِ حقہ کیلئے آخرت کے انعامات

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اور جو لوگ ایمان لائے	وَعَمِلُوا	اور انہوں نے عمل کیے
الصّٰلِحٰتِ	نیک	سَنُدْخِلُھُمْ	عنقریب ہم انکو داخل کریں گے
جَنّٰتٍ	(ایسے) باغات میں	تَجْرِیْ	(کہ) بہتی ہیں
مِنْ تَحْتِھَا	ان کے نیچے	الْاَنْھٰرُ	نہریں

خٰلِدِیْنَ	وہ ہمیشہ رہیں گے	فِیْھَآ	ان میں
اَبَدًا	ابد تک	وَعْدَ اللّٰہِ	اللہ کا وعدہ ہے
حَقًّا	سچا	وَمَنْ اَصْدَقُ	اور کون زیادہ سچا ہے
مِنَ اللّٰہِ	اللہ سے	قِیْلًا ﴿۱۲۲﴾	قول (وقرار) میں

شیطانی گروہ کے بالمقابل اللہ تعالیٰ نے جماعت حقہ کا ذکر بھی فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اس کے رسولوں، کتابوں، ملائکہ، جنت، دوزخ اور اس کی نازل کردہ شریعت پر ایمان لائے اور ساتھ ساتھ اچھے اعمال منجملہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ، خیرات، جہاد، انسانی ہمدردی وغیرہ بھی انجام دیئے۔ فرمایا یہی جماعت حقہ ہے سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ ہم انہیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہونگی خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا اور ان باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے۔ فرمایا وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا یہ اللہ تعالیٰ کا پکا سچا وعدہ ہے کہ نیک اعمال کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے والا جنت میں داخل ہوگا۔ اور کفر وشرک کا مرتکب جہنم میں جائے گا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ﴿۱۲۲﴾ اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے وہ احکم الحاکمین ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اللہ کے وعدے پر یقین کرتے ہوئے ایمان، توحید اور نیکی کو اختیار کرے تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے فلاح حاصل ہوجائے۔ اور اللہ نے جن باتوں سے منع کیا ہے انہیں نقصان کا باعث کہا ہے ان سے باز آجائے۔ اور اللہ کے سچے وعدے کے مطابق اپنا ٹھکانا بہشت میں بنالے۔ اس آیت میں مومنین اور نیک لوگوں کو جو اللہ و رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں ان کو خوشخبری دی جارہی ہے کہ ان کو جنت میں جگہ ملے گی۔ جنت کے بارے میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کہ جنت نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہے نہ کسی کان نے سنی ہے، حتیٰ کہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال تک نہیں آیا۔ (صحیح بخاری) اس آیت میں اہل ایمان اور جنت کا ذکر اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مطابق لایا گیا ہے کہ جہاں ترہیب کا ذکر ہورہا ہو تو ساتھ ہی ترغیب کا اور جہاں ترغیب کا ذکر ہورہا ہو تو ساتھ ہی ترہیب کا ذکر عموماً قرآن کریم میں آیا کرتا ہے۔ پچھلی آیات

میں شیطان کے پیروکاروں کا ذکر تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ شیطان کے وعدے اور امیدیں دلانا سب کچھ مکروفریب ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایمان والوں سے اللہ نے جس جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ وہ بالکل سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر سچا ہو بھی کون سکتا ہے؟ لوگوں کے اعمال کے اچھے اور برے نتائج اس نے جو اطلاع دی ہے اور جنت اور دوزخ کے جو حالات بتائے ہیں وہ سب اس کی نظروں کے سامنے ہیں۔ زمان ومکان کی رکاوٹیں تو ہمارے لئے ہیں اور جنت اور دوزخ ہمارے لئے تو غیب ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے سب باتیں شہود ہی شہود ہی ہیں۔ اس کے لئے زمان ومکان بھی کوئی چیز نہیں۔

قانون جزاء وسزاء کی دفعات

لَيْسَ	نہیں ہے	بِاَمَانِيِّكُمْ	(مدار) تمہاری خواہشات پر
وَلَآ	اور نہ	اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ	اہلِ کتاب کی خواہشات پر

مَنْ يَّعْمَلْ	(بلکہ) جو کوئی عمل کرے	سُوْٓءًا	برا
يُّجْزَ	(تو) وہ بدلہ دیا جائے گا	بِهٖ	اسکے ساتھ
وَلَا يَجِدْ لَهٗ	اور نہیں وہ پائے گا اپنے لیے	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کے سوا
وَلِيًّا	کوئی دوست	وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾	اور نہ کوئی مددگار

تفاسیر (جیسے تفسیر بغوی اور ابن کثیر) کے مطابق، یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں اور اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے درمیان اپنے اپنے دین کی فضیلت پر گفتگو ہو رہی تھی ارشاد ہوتا ہے لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ اے اہل ایمان! کامیابی کا دارومدار تمہاری آرزوں پر نہیں ہے۔ تمہاری خواہش کا پورا ہونا ضروری نہیں ہے وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر نیکی یا بدی کا انحصار ہے کہ جیسا وہ آرزو کرتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جزا وسزا کا مدار اچھے اور برے کام پر ہے مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا جو کوئی برا عمل کرے گا يُّجْزَ بِهٖ اسے اس کا بدلہ ضرور ملے گا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کوئی شخص اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا بلکہ اسے برائی کا صلہ ضرور

ملے گا۔ وَلَا يَجِدُ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ پھر وہ اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی کار ساز اور مدد گار نہیں پائے گا۔ لہٰذا قانون یہی ہے کہ جب تک حقیقت میں موجود ہو محض خالی نسبت قطعاً مفید نہیں ہو سکتی۔ خوش فہمیاں اور خام خیالیاں سزا کو دفع نہیں کر سکتیں، سزا ضرور ملے گی، خواہ دنیا میں ملے یا آخرت میں، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کی وجہ سے، یا کسی نیک عمل کی وجہ سے، یا دنیا میں آنے والی مصیبتوں کی وجہ سے، معاف فرما دے۔ ہر انسان کو صرف وہی کچھ ملے گا جو اس نے خود کمایا ہو، برے عمل کا بدلہ برا ہو گا اور اچھے عمل کا اچھا۔ (2) جزا و سزا کے لحاظ سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں (3) اگر کسی نے چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی کی ہو گی تو بھی اس کا اسے ضرور بدلہ ملے گا اللہ کسی کی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی نظر انداز نہیں فرمائے گا۔ کسی کی ذرہ برابر بھی حق تلفی نہیں ہو گی۔ (4) قیامت کے دن کوئی بھی شخص خواہ وہ اس کا پیر ہو یا کوئی قریبی رشتہ دار ہو دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (5) یہ ناممکن ہے کہ زید کے گناہ کا بار بکر کے سر ڈال دیا جائے (6) شفاعت کے مستحق صرف گناہگار موحدین ہوں گے وہ بھی ان شرائط کے ساتھ کہ اللہ جس کے حق میں خود سفارش چاہے گا اسی کے حق میں کی جا سکے گی اور جس شخص کو سفارش کرنے کی اجازت دے گا صرف وہی سفارش کر سکے گا۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ قرآن پاک کے حاشیے میں ایک فقرہ لکھا ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نسبت کی بنا پر خوش فہمی میں مبتلا ہیں اسی طرح اکثر مسلمان بھی اسی زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم افضل الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت ہیں۔ لہٰذا ہم کچھ بھی کریں حضور ﷺ ہماری سفارش کر کے ہمیں جنت میں لے جائیں گے اور پھر مسلمانوں میں جو چھوٹے چھوٹے فرقے اور گروہ ہیں، ان میں سے ہر ایک محض اس لیے جنت کا دعویدار ہے کہ فلاں فرقے یا گروہ کا رکن ہے۔ شیعہ حضرات کا ایمان یہ ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نسبت ہی مدار فلاح ہے۔ محرم میں ماتمی لباس پہن لیا، تعزیہ نکال دیا مجلس کرا دی، ماتم کر لیا تو بس نجات حاصل ہو گئی۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے فرقے بھی اسی قسم کا دعویٰ کرتے ہیں اس کے بعد جو چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں جیسے چشتی، قادری، دیوبندی، اہل حدیث بھی

محض اپنے اپنے فرقہ سے منسلک ہونے کی بنا پر جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک فرقہ اپنے سوا کسی دوسرے کی نجات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اصول کے طور پر بات سمجھادی کہ محض نسبت سے کبھی فائدہ نہیں ہوگا جب تک کہ ایمان اور نیکی کی حقیقت موجود نہ ہو ایک شخص چشتی کہلاتا ہے، اپنے نام کے ساتھ بڑے بڑے القاب لکھتا ہے۔مگر مشائخ اہل چشت کا اتباع نہیں کرتا تو اسے خالی نسبت کیا فائدہ دیگی۔نقشبندی حضرات بھی بڑے کاملین بزرگ تھے مگر ان کے نام لیوا ان کے رستہ پر کہاں تک چل رہے ہیں اب گور پرستی، عرس بازی، قوالی اور رسومات باطلہ کا نام قادریت رکھ دیا گیا ہے، جب تک شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے طریقے پر نہیں چلیں گے، محض نام قادری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔اسی طرح شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کے طریقے پر چلنا کامل درجے کا اخلاص اور اتباع شریعت وسنت ہے۔مگر ان کے نام لیوا اپنے دعویٰ میں کہاں تک سچے ہیں۔غرض یہ کہ عمل کے بغیر خالی نسبت محض خام خیالی ہے۔موقوف حدیث میں ہے کہ جب کوئی قوم بدعت ایجاد کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اس جیسی سنت چھین لیتا ہے جسے قیامت تک نہیں لوٹاتا۔(سنن دارمی) بدعت اختلاف وانشقاق کا دروازہ کھولتی ہے جبکہ اسلام میں اختلاف وافتراق سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔بدعت کا ایجاد کرنے والا رسول اکرم ﷺ پر خیانت کا الزام لگاتا ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے دین میں بدعت ایجاد کی تو گویا اس نے اللہ کے رسول ﷺ پر تبلیغ رسالت میں خیانت کا الزام لگایا۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میری تعریف میں حد سے آگے نہ بڑھ جانا جس طرح نصاریٰ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے بارے میں حد سے آگے بڑھ گئے تھے۔میں اللہ کا بندہ ہوں اور مجھے تم اللہ کا بندہ کہو۔خیر کی زیادتی ہمہ وقت خیر نہیں ہوتی بلکہ شر سے بدل جاتی ہے۔کوئی بھی جب حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اپنے ضد کی طرف لوٹ جاتا ہے۔اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے دین میں غلو سے روکا ہے۔(سنن نسائی) بدعتی کا عمل مقبول نہیں اور نہ ہی اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے جب تک وہ

بدعت نہ چھوڑ دے۔ بدعتی حوض کوثر پر نہ جاسکے گا اور نہ ہی اسے اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت نصیب ہوگی۔ بدعتی سے توبہ کی امید بہت کم ہوتی ہے کیونکہ وہ بدعت کے عمل کو کارِ ثواب سمجھ کر کرتا ہے اسی لئے شیطان معصیت سے زیادہ بدعت پر خوش ہوتا ہے۔ان بدعات سے بچنے کے لئے سب سے افضل ضرورت علم کی ہے۔ ہر گھر کے تمام بچوں کو سب سے پہلے دینی تعلیم دینی ضروری ہے۔گھر کے بالغ افراد بھی علم حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہیں تاکہ دینی معلومات سے خبردار رہیں۔ نبی ﷺ نے حجت الوداع کے خطبے میں فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک قرآن اور دوسری میری سنت۔اگر تم ان دونوں پر قائم رہو تو فلاح پاؤ گے۔لہٰذا ہمیں آپ ﷺ کے فرمان کی تعمیل کرنی چاہئے اور رسول ﷺ کی اتباع کرنی چاہئے۔

شریعت کا تصورِ مساوات

وَمَنْ يَّعْمَلْ	اور جو کوئی عمل کرے	مِنَ الصّٰلِحٰتِ	نیک
مِنْ ذَكَرٍ	مرد ہو	اَوْ اُنْثٰى	یا عورت
وَهُوَ مُؤْمِنٌ	جبکہ وہ مومن ہو	فَاُولٰٓئِكَ	تو یہ لوگ
يَدْخُلُوْنَ	داخل ہوں گے	الْجَنَّةَ	جنت میں
وَلَا يُظْلَمُوْنَ	اور نہ وہ ظلم کیے جائیں گے	نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾	تل برابر (بھی)

فرمایا: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ اور جو کوئی اچھا عمل کرے گا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى خواہ وہ مرد ہو یا عورت وَهُوَ مُؤْمِنٌ بشرطیکہ وہ مومن ہو، کیونکہ ایمان ہی اصل الاصول ہے۔نیکیوں کی جڑ اور بنیاد ایمان ہے۔اگر نیکی کے ساتھ اعمال صالحہ انجام دیتا ہے فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ اور ان کے ساتھ ایک تل کے برابر بھی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ بات وہی ہے کہ نجات کا مدار نیکی، ایمان اور عمل پر ہے۔اس آیت کریمہ میں جزائے عمل کے سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کو یکساں حیثیت دی گئی ہے۔شریعت کے احکام محض مردوں کے لیے نہیں بلکہ عورتوں پر اسی طرح لازم ہیں، لہٰذا شریعت اور قانون سب

کے لیے یکساں ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ البتہ مرد و زن کے دائرہ کار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرق رکھا ہے۔ عورتیں اپنے فرائض گھر کے اندر انجام دینے کی پابند ہیں جب کہ مرد باہر کے امور سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔ باقی فرائض، واجبات وغیرہ جس طرح مرد پر لاگو ہیں اسی طرح عورت پر بھی ان کی مکلف ہے۔ اسلام اور شریعتِ محمدی میں تمام انسان قانونِ الٰہی کے سامنے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ ذات، پات، رنگ، نسل یا اونچ نیچ کی بنیاد پر شریعت کے احکام میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ جدید قانونی نظام بھی اس اصول پر قائم ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور جرم کی پاداش میں ہر شخص کے لیے ایک جیسا قانون لاگو ہوتا ہے۔ شریعت اور قانون دونوں کا بنیادی مقصد معاشرے میں عدل کا قیام اور کمزور کی حق تلفی کو روک کر سب کو یکساں انصاف فراہم کرنا ہے۔

اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السّلام

وَمَنْ اَحْسَنُ	اور کون زیادہ اچھا ہے	دِیْنًا	دین میں
مِّمَّنْ	اس شخص سے جس نے	اَسْلَمَ	جھکا دیا
وَجْهَهٗ	اپنا چہرہ	لِلّٰهِ	اللہ کے لیے
وَهُوَ	اور وہ	مُحْسِنٌ	نیکی کرنے والا (بھی) ہو
وَّاتَّبَعَ	اور وہ پیروی کرے	مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ	ملت ابراہیم کی
حَنِيْفًا	جو صرف حق کا پرستار تھا	وَاتَّخَذَ اللّٰهُ	اور اللہ نے بنالیا
اِبْرٰهِيْمَ	ابراہیم کو	خَلِيْلًا ⑫⑤	خاص دوست

فرمایا وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ اس شخص سے اچھا دین کس کا ہو سکتا ہے، جس نے اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا۔ چہرہ آئینہ ہے انسان کے باطن کا۔ دل کی بات، دل کا حال چہرے پر ضرور "نمایاں" ہوتا ہے۔ "محتاج کا چہرہ اور ہے اور سخی کا اور" بعض اوقات چہرہ انسان کی اصلیت کو چھپاتا ہے لیکن "دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔" چہرہ چونکہ انسانی جسم میں

معزز ترین حصہ ہوتا ہے اس لیے چہرہ کا نام لیا گیا ہے۔ تاہم اس سے مراد پورا جسم انسانی ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر اللہ کے رضا کے تابع ہو جائے اور اپنے آپ کو ہمہ تن خدا تعالیٰ کی طرف جھکا دے۔ چہرے کو تابع کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان میں غایت درجے کا اخلاص پایا جائے۔ اور اخلاص کا معنی یہ ہے کہ بندہ ہر کام خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے انجام دے اور رضائے الٰہی سے مراد یہ ہے کہ اس کا عقیدہ پاک ہو۔ خدا کی وحدانیت پر صحیح ایمان ہوگا تو اخلاص بھی پیدا ہوگا۔ فرمایا بہترین دین کی ایک صفت تو اخلاص ہے اور دوسری وَھُوَ مُحْسِنٌ انسان نیکی کرنے والا ہو اور محسن کا مطلب یہ بھی ہے کہ عامل کا طریق کار درست ہو۔ جب تک عمل حضور ﷺ کی سنت اور شریعت کے مطابق نہیں ہوگا مقبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ ارشاد مبارک ہے مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَیْسَ عَلَیْہِ أَمْرُنَا فَھُوَ رَدٌّ یعنی جو عمل ہمارے طریقے کے مطابق نہیں وہ مردود ہے۔ فرمایا بہترین دین دار وہ ہے جس میں اخلاص پایا جائے اور اس کا عمل سنت نبوی کے مطابق ہو۔

دین ابراہیم کی صفات

اور تیسری چیز یہ کہ وَّاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وہ ملت ابراہیم کا پیروکار ہو۔ اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی صفت یہ ہے کہ وہ حنیف یعنی وہر طرف سے کٹ کر ایک طرف لگنے والے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دین کی قابل ذکر صفات دو ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے مقابلہ میں انہوں نے تمام طاغوتی طاقتوں سے ٹکر لی۔ تقلید آباء کا انکار کیا، بت پرستی اور نجوم پرستی سے ٹکر لی۔ نمرود کی خدائی کا انکار کیا اور چونکہ انہوں نے اپنے وقت کی تمام طاغوتی طاقتوں سے ٹکر لی اور ان کا مقابلہ کرتے ہوئے صرف ایک اللہ کے دامن میں پناہ لی۔ لہٰذا وہ حنیف کہلائے اور حنیف کا یہی معنیٰ ہے اور دوسری صفت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے تمام تر احکام کے سامنے برضا و رغبت اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ یہ نہیں کیا کہ جو بات آسان یا نفس کو مرغوب تھی اسے تو قبول کر لیا اور جو مشکل یا ناپسند تھی اسے چھوڑ دیا، یا اس کی حسب پسند تاویل کر کے اسی کے مطابق عمل کر لیا۔ یہی دو صفات تھیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مختلف تجربوں اور آزمائشوں سے گزارنے کے بعد اپنا دوست بنا

لیا تھا۔اب جو شخص ملت ابراہیم کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے اسے انہی دو صفات کو کسوٹی بنا کر دیکھ لینا چاہیے کہ وہ اپنے دعویٰ میں کس حد تک سچا ہے، اس سے غرض نہیں کہ وہ یہودی ہو یا عیسائی ہو یا مسلمان ہو یا کوئی اور ہو۔سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دین ہی وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سب دینوں سے بہتر قرار دیا ہے اور اسی دین کا نام اسلام ہے جو سب انبیاء علیہم السلام کا شیوہ رہا ہے۔اور اس دین کے اہم اجزاء دو ہیں (1) اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا (2) اچھے اعمال بجا لانا اور ان دو اجزاء کا مفہوم اس قدر وسیع ہے جس میں پوری کی پوری شریعت سما جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی حنیفیت کا ثمرہ یہ دیا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ⑫⑤ کہ انہیں اپنا خلیل بنالیا اور خلیل کا معنی دوست ہے۔اور فلاح اس کو نصیب ہوگی جو یا تو خود خلیل ہو۔ جیسے ابراہیم (علیہ السلام) یا پھر خلیل کے طریقے پر ہو۔اسی لیے ملت ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا۔حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرح حضور خاتم النبیین ﷺ بھی اللہ کے خلیل ہیں۔آپ نے فرمایا کہ اگر میں کسی انسان کو اپنا خلیل بناتا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بناتا، مگر تمہارے صاحب کو اللہ نے اپنا خلیل بنالیا ہے۔اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کا خانہ خاص صرف خدا تعالیٰ کے لیے ہے۔اور حبیب کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضور نبی کریم ﷺ سے خصوصی محبت ہے جس کی وجہ سے آپ حبیب اللہ بھی ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ جو خلیل کے راستے پر ہوگا، وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوگا۔ابراہیم (علیہ السلام) خلیل اللہ ہیں۔ان کی ملت حقیقت میں ملت اسلامیہ ہے یا ملت محمدیہ ہے، معنی ایک ہی ہے لہٰذا اللہ کے نزدیک دین اس شخص کا پسندیدہ ہوگا جس میں اخلاص پایا جائے اور اس کا عمل شریعت کے مطابق ہو، ایسا شخص ملت ابراہیمی کا پیروکار سمجھا جائے گا۔

اللہ کا تصرف اور احاطہ کائنات کی ہر چیز پر مکمل اور دائمی

وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کے لیے ہے	مَا	جو کچھ ہے
فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں	وَمَا	اور جو کچھ ہے
فِي الْاَرْضِ	زمین میں	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز کو	مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾	گھیرنے والا

فرمایا یاد رکھو وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ اور اللہ ہر چیز کا محیط یعنی احاطہ کرنے والا ہے۔ اللہ کی ان دو صفات میں اکثر لوگ بہک جاتے ہیں۔ ایک تصرف یہ ہے کہ جب زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک خدا ہے تو پھر کائنات میں تصرف بھی اسی کا ہے مگر اکثر لوگ اللہ کی صفت تصرف میں شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور تصرف میں قبر والوں، فرشتوں یا جنوں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ حالانکہ متصرف فی الامور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ کی دوسری صفت یہاں پر محیط بیان کی گئی ہے یعنی ہر چیز کا احاطہ کرنا اور انہیں قابو میں رکھنا، اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے۔ احاطہ علم کے ساتھ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ " بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہے۔ ذرے ذرے کا علم اسی کے پاس ہے اور قدرت کے اعتبار سے بھی ہر چیز پر قبضہ اللہ ہی کا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا محیط بھی وہی ہے۔ اور متصرف بھی وہی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر چہ اللہ تعالیٰ نے سبب اور مسبب کو قائم رکھا ہے اور عام طور پر اس اصول نہیں توڑتا، مگر جب چاہے اس کو توڑ بھی دیتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے مگر بعض اوقات نہیں جلاتی، پانی پیاس نہیں بجھاتا، تلوار نہیں کاٹتی، گولی اپنا اثر نہیں دکھاتی وغیرہ وغیرہ تو معلوم ہوا کہ تصرف اللہ کے قبضے میں ہے اور وہی احاطہ کرنے والا ہے۔ چونکہ اکثر لوگ انہی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ نے آخر میں انہی دو صفات کا ذکر کر کے لوگوں کو توحید کا درس یاد کرایا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومن ہی قرآن کا عملی نمونہ ہوسکتا ہے۔ ایسا ہی مومن بندہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بندہ ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پسندیدہ اور مقبول ترین بندوں میں شامل کرے۔ آمین

☆☆☆

حق مہر کے احکامات اور شرعی حیثیت/سماج کے دَبے کچلے طبقات کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیسا ہونا چاہئے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَیَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْكُمْ فِیْھِنَّ ۙ وَمَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَھُنَّ مَا كُتِبَ لَھُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْھُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ كَانَ بِہٖ عَلِیْمًا ﴿۱۲۷﴾

نکاح میں مہر کی حکمت و مصلحت

وَیَسْتَفْتُوْنَكَ	اور وہ فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے	فِی النِّسَآءِ	عورتوں کے بارے میں
قُلِ اللّٰہُ	کہہ دیجیے اللہ	یُفْتِیْكُمْ	تمہیں فتویٰ دیتا ہے
فِیْھِنَّ	ان کی بابت	وَمَا	اور وہ (بھی) جو
یُتْلٰی	پڑھا جاتا ہے	عَلَیْكُمْ	تم پر
فِی الْكِتٰبِ	کتاب میں	فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ	(ان) یتیم عورتوں کے متعلق
الّٰتِیْ	وہ کہ	لَا تُؤْتُوْنَھُنَّ	نہیں تم انہیں دیتے

مَا كُتِبَ	جومقرر کیا گیا ہے	لَهُنَّ	ان کے لیے
وَتَرْغَبُوْنَ	اورتم رغبت کرتے ہو	اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ	یہ کہ تم ان سے نکاح کرو
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ	اورکمزوروں (کے بارے) میں	مِنَ الْوِلْدَانِ	بچوں سے
وَاَنْ تَقُوْمُوْا	اور یہ کہ تم قائم رہو	لِلْيَتٰمٰى	یتیموں کے لیے
بِالْقِسْطِ	اِنصاف پر	وَمَا تَفْعَلُوْا	اور جوتم کرو
مِنْ خَيْرٍ	کوئی اچھائی	فَاِنَّ اللّٰهَ	تو تحقیق اللہ
كَانَ بِهٖ	ہے اس کو	عَلِيْمًا ⑫⑦	خوب جاننے والا

ارشاد ہوتا ہے وَيَسْتَفْتُوْنَكَ اے پیغمبر (علیہ السلام)! لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ استفتاء کسی معاملے میں حکم طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ کسی معاملہ میں جو فتویٰ دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے قوت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اسے استفتاء کا نام دیا گیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ،لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں فِي النِّسَآءِ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ آپ فرما دیجئے عورتوں کے بارے میں اللہ تم کو فتویٰ دیتا ہے اور اس کے علاوہ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اور اس ضمن میں کتاب یعنی قرآن پاک کی وہ آیات بھی تمہاری رہنمائی کرتی ہیں، جو تم پر پڑھی جاتی ہیں۔ اور وہ اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور بہت سی آیات اس کے بعد بھی حسب ضرورت نازل ہوں گی، لہٰذا اپنے معاملات ان احکام کی روشنی میں طے کیا کرو۔ اور خاص طور پر فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ ان یتیم عورتوں کے معاملات کو جنہیں تم وہ چیز ادا نہیں کرتے جو ان کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ سوال کی نوعیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مجملاً یہ جواب ارشاد فرمایا کہ یتیم بچیوں کے متعلق تو ابتدائے سورہ میں یہ احکام دیئے جا چکے ہیں۔ کہ اگر ان سے نکاح کرو تو ان کا حق مہر پورا ادا کرو۔ اور اگر تم انصاف کے تقاضے پورے نہ کر سکو تو ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کرو۔ زمانہ

جاہلیت میں یتیم بچیوں سے دو طرح کی زیادتی ہوتی تھی۔لڑکیوں کے یتیم ہو جانے کی صورت میں ان کے سرپرست کے تقرر کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا،اور عام طور پر سرپرست چچا یا بھائی مقرر ہوتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی موجود نہ ہو تو عصبہ کی صورت میں بعض اوقات چچازاد بھائی بھی وارث بن جاتے تھے اور لڑکی کے ساتھ اس کا مال بھی سرپرست کی تحویل میں چلا جاتا تھا۔چونکہ چچازاد کے ساتھ نکاح جائز ہے اس لیے اگر لڑکی خوبصورت ہوتی تو سرپرست خود اس سے نکاح کر لیتا مگر دستور کے مطابق اسے حق مہر پورا ادا نہ کرتا۔ کیونکہ اس سلسلے میں اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا،اور اگر لڑکی شکل وصورت کے لحاظ سے سرپرست کو ناپسند ہوتی،تو نہ وہ خود نکاح کرتا اور نہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت دیتا۔وہ جانتا تھا کہ لڑکی کے ساتھ اس کے حصے کا مال بھی جائے گا اور وہ خود اس سے محروم ہو جائے گا۔اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ان ہی زیادتیوں کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ اس ضمن میں جو احکام نازل ہو چکے ہیں،وہی تمہارے لیے کافی ہیں۔لہٰذا ان کے مطابق عمل کرو۔اور بعض حضرات ان بے انصافیوں سے بچنے کی خاطر ایسی یتیم لڑکیوں کے سرپرستوں نے یہ محتاط رویہ اختیار کیا کہ ان سے نکاح کرنا ہی چھوڑ دیا تھا تاکہ ان سے ان یتیم لڑکیوں کے حق میں کوئی بے انصافی کی بات سرزد نہ ہو جائے۔لیکن اس طرح بھی بعض دفعہ نقصان کی صورت پیش آجاتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس قدر اخوت اور بہتر سلوک انہیں سرپرستوں سے نکاح کرنے میں میسر آسکتا تھا،غیروں کے ساتھ نکاح کرنے سے وہ میسر آہی نہ سکتا تھا اور بعض دفعہ ان کی زندگی تلخ ہو جاتی۔اس آیت کے ذریعہ اولیاء کو ان کے زیرکفالت یتیم لڑکیوں سے نکاح کی اجازت دے دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ ایک تو ان کے حق مہر میں کمی نہ کرو اور دوسرے جو کچھ تم طے کرو وہ ادا ضرور کر دو اور ان کے جو دوسرے حقوق وراثت وغیرہ ہوں،بھی انہیں ادا کر دو۔اور بعض مفسرین نے اس آیت سے یتیم بچیوں کا وراثت میں حصہ مراد لیا ہے جس کے احکام پہلے اسی سورہ کی آیت نمبر 11

میں گزر چکے ہیں۔ دور جاہلیت کا دستور یہ تھا کہ وہ نہ میت کی بیوی کو وراثت سے کچھ حصہ دیتے تھے اور نہ یتیم لڑکیوں کو۔ بلکہ وراثت کے حقدار صرف وہ لڑکے سمجھے جاتے تھے جو لڑائی کرنے اور انتقام لینے کے قابل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت میراث کی رو سے بیواؤں، یتیم لڑکیوں کے علاوہ چھوٹے بچوں کو بھی وراثت میں حقدار بنا دیا اور اس آیت میں مَا کُتِبَ لَھُنَّ کے الفاظ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی ایسے یتیم بچے جو ان کے ولی کے زیر کفالت ہیں ان کے حقوق بھی انہیں پورے پورے ادا کرو۔ اور کسی طرح سے بھی ان سے ناانصافی نہ کرو۔

لفظ تَرْغَبُوْنَ کی وضاحت

فرمایا وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اگر تم ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو تو پھر ان کا مہر پورا پورا ادا کرو تَرْغَبُوْنَ کا لفظ رغبت سے ہے: 'رغبت' عربی زبان میں دو متضاد معنوں کے لئے آتا ہے، چاہنا اور نہ چاہنا، عربی گرامر کی رو سے اگر اس کے بعد 'فی' آئے تو چاہنے اور راغب ہونے کے معنی ہیں اور 'عَنْ' آئے تو رغبت نہ ہونے اور نہ چاہنے کے معنی ہیں، یہاں یہ لفظ 'فِیْ' اور 'عن' کے بغیر آیا ہے، اس لئے دونوں معنوں کی گنجائش ہے، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہم نے چاہنے کے معنی لئے ہیں، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ تم لڑکیوں کا حق تو ادا نہیں کرتے؛ لیکن نکاح صرف اس لئے کرنا چاہتے ہو کہ ان کی جائداد اپنے قبضہ میں رہے، مولانا تھانوی اور مولانا دریابادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما نے دوسرے معنی کی رعایت کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے، ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کا کسی سے نکاح نہیں کرتے؛ تاکہ دولت ہاتھ سے نہ جائے اور خود شکل وصورت کی وجہ سے ان سے اپنا نکاح کرنا نہیں چاہتے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حصہ آیت میں ترغبون کے بعد بھی عن یا فی محذوف ہے۔ اور ان کے داخل ہونے پر دو متضاد معنی نکلتے ہیں۔ اگر ترغبون عن پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ تم نکاح سے اعراض کرتے ہو۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں آتا ہے وَ

مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰھٖمَ اورکون ہے جوملت ابراہیمی سے اعراض کرتا ہے مگر جو بیوقوف ہے۔اوراگرترغبون فی پڑھا جائے تو مطلب ہوگا کہ تم نکاح میں رغبت رکھتے ہو۔تو ہر دوصورتوں میں مطلب یہ ہوگا کہ تم شکل وصورت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے نکاح سے اعراض کرتے ہو،تو پھران یتیم لڑکیوں کو دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت دو۔اوراگروہ تمہارے لیے قبول صورت ہیں تو پھران سے نکاح کرکے ان کے مہروغیرہ کے حقوق بھی پوررے کرو۔یتیم لڑکیوں سے کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق انہی عورتوں میں یتیم لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا۔عورتوں کے ساتھ مذکورہ زیادتی کے علاوہ دیگر کمزورطبقات کے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات اورکمزورطبقات

ارشاد ہوتا ہے وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ کمزوراوریتیم بچوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ان کی پرورش نیک نیتی سے کرواوران کے مال کی حفاظت کرو،جیسا کہ ابتدائے سورہ میں مفصل احکام نازل کیے جاچکے ہیں۔لہٰذا اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی سختی سے پابندی کرو،یتیموں کو وراثت میں حصہ دواوران کے مال کی حفاظت بھی کرو۔نیز یہ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ یتیموں کے بارے میں انصاف کے ساتھ قائم رہو،ان آیات کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ کمزورطبقات کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔عورتیں،چھوٹے بچے یتیم لڑکے اورلڑکیاں سب ضعفاء میں شمار ہوتے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔لہٰذا یہ حکم مسلمانوں کے ہر صاحب اقتدارطبقہ کے لیے ہے خواہ وہ خاندان یا قبیلے کا سربراہ ہو یا وقت کا حاکم، جو بھی کسی معاملہ میں صاحب اختیار ہے،اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کمزورطبقات کے معاملات میں انصاف کی بالادستی کو قائم رکھے۔ظاہر ہے کہ اگران طبقوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں گے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی انصاف بطریق اولیٰ ہوگا۔اوراگرکمزورطبقے ظلم کی چکی میں پس گئے تو دوسروں کے ساتھ بھی انصاف کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔لہٰذا کمزورطبقات کے ساتھ

انصاف کرنے کی بطور خاص تاکید کی گئی ہے۔عدل وانصاف کا قیام تقویٰ کی علامت ہے اور تقویٰ کا خلاصہ اور لب لباب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ (سورۃ نحل) بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا۔اور قرابت داروں کے حق ادا کرنے کا،اور منع کرتا ہے بے حیائی اور سرکشی سے فرماتے ہیں،تقویٰ کا لب لباب اور مرکزی نقطہ عدل ہے۔جس قوم میں عدل نہیں وہ فاسق قوم ہے،جس سوسائٹی میں خلاف شرع اور خلاف عقل باتیں رائج ہیں وہ گندی سوسائٹی ہے۔اسی لیے فرمایا کہ یتیموں کے ساتھ عدل قائم کرو،ان کا مال تلف نہ کرو،ان کے حقوق ادا کرو۔ عدل،طہارت،خشوع وخضوع،اخبات اور فیاضی مسلمان کا ورثہ ہیں،(لفظ اخبات عربی زبان کا لفظ ہے جس کا بنیادی مطلب عاجزی،انکساری،اور اللہ کے حضور گڑگڑانا ہے،اصطلاح میں اخبات سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے پوری طرح جھک جاتا ہے۔) انہیں کوئی مسلمان ضائع نہیں کرتا۔

اسلام کمزوروں کا محافظ

اسلام ایسا کامل واکمل دین ہے جو طاقتور کو کمزوروں کی ذمہ داری سونپتا اور کمزور کو محفوظ بناتا ہے۔ قرآن وسنت بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ معاشرے کے طاقتور لوگ کمزور طبقوں کا خیال رکھیں۔ اسلام کی تعلیمات میں اللہ پاک نے وہ اعتدال تناسب اور توازن رکھا ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان،یا کسی بھی مخلوقِ خدا پر ظلم وزیادتی نہیں کرسکتا،اسلامی تعلیمات میں ایسا ہرگز نہیں ہے کہ طاقت ور اپنی طاقت،قوت،عہدے،منصب،روپے پیسے اور بینک بیلنس کے نشہ میں بدمست دندناتا پھرے،جسے چاہے قتل کردے،جس سے چاہے اس کی جمع پونجی چھین لے،جس کو چاہے زدوکوب کرے،جس کی چاہے عزت تارتار کرے یہ سب اور ایسا بہت کچھ زمانہ جاہلیت میں تو ضرور ہوتا تھا لیکن اسلام نے اس طرح کی ہر اخلاق باختہ حرکت پر نہ صرف پابندی عائد کی بلکہ ایسے لوگوں کی دنیوی حدود وتعزیر اور اخروی سزا کو بھی بیان فرمایا۔اسلام میں کمزوروں کے حقوق کو بہت اہمیت دی گئی

ہے۔عام طور پر معاشرے کے پسے ہوئے افراد جن میں ملازم وخادم،ضعیف وناتواں،پسماندہ، خواتین،معذور ویتیم،مسکین،بیمار،غریب اور دیگر کمزور طبقات کے لوگ شامل ہیں نہ صرف انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔اسلام میں ایسا باقاعدہ نظام موجود ہے جو کمزوروں کی حفاظت کرتا،ان کی عزت بڑھاتا،ان کی مدد کرنے کی ترغیب دِلاتا اور ان کے ساتھ حسنِ سُلوک کو ایمان کا حصہ قرار دیتا ہے۔اللہ کریم اور اس کے پیارے حبیب صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم نے بار بار کمزوروں کے حقوق کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے ساتھ ظلم کو سخت گناہ قرار دیا ہے۔ایک سرسری نگاہ اسلام سے پہلے کے زمانے پر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ دور کمزوروں کے ساتھ ظلم،زیادتی اور مادّی طاقت کی بالادستی کا دور تھا۔غلاموں پر ظلم وستم کی وہ داستانیں ملتی ہیں جنہیں پڑھ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔کمزور و بے بس اور معذور افراد کو بوجھ سمجھا جاتا تھا۔اسلام نے معاشرے کے ایسے تمام پسے ہوئے افراد کو تحفظ فراہم کیا،ان کی خدمت کو عبادت،ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو ثواب اور ان کے کام آنے کو رزق اور فتح ملنے کا ذریعہ اور سبب قرار دیا تاکہ کوئی انہیں بوجھ نہ سمجھے بلکہ اپنی دنیا و آخرت کی خیر خواہی اور بھلائی جان کر ان کی خدمت کرے جیسا کہ ہمارے پیارے نبی صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم نے فرمایا:هَلْ تُنْصَرُونَ وَتُرْزَقُونَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ یعنی تمہارے کمزور لوگوں کی وجہ سے ہی تمہاری مدد کی جاتی اور تمہیں رِزق دیا جاتا ہے۔:حدیث پاک کا حاصل یہ ہے کہ اے لوگو!دشمنوں کے مقابلے میں تمہاری جو مدد کی جاتی ہے اور مالِ غنیمت وغیرہ کی صورت میں تمہیں جو رزق دیا جاتا ہے وہ ان غریبوں اور فقیروں کی برکت سے دیا جاتا ہے جو تمہارے درمیان موجود ہیں،لہٰذا تم اِن کی تعظیم کیا کرو اور اُن پر فخر و بڑائی کا اظہار نہ کیا کرو۔اسلام کی بے مثال تعلیمات پر ہماری جان قربان! کیسے پیارے انداز سے کمزوروں کی مدد کرنے کی ترغیب ارشاد فرمائی جارہی ہے تاکہ کمزور و بے آسرا لوگوں کی مدد بوجھ سمجھ کر نہیں بلکہ اپنی آخرت کی بھلائی اور دنیا کی ترقی سمجھ کر کی جائے۔اسلام کمزوروں کا کیسا محافظ ہے اس بات کا اندازہ اس حدیثِ پاک سے بھی لگایا جاسکتا ہے:حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولُ اللہ صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم نے فرمایا:اِنَّمَا يَنْصُرُ اللّٰهُ هٰذِهِ

اَلْاُمَّۃَ بِضَعِیفِھَا بِدَعْوَتِھِمْ وَصَلَاتِھِمْ وَاِخْلَاصِھِمْ یعنی اللہ کریم اِس امت کے کمزور اور بے بس لوگوں کی دعا، اِن کی نماز اور ان کے اِخلاص کی وجہ سے اِس اُمّت کی مدد فرماتا ہے۔ یہ روایت بھی کمزوروں کی خیر خواہی کا درس دے رہی ہے، کمزور لوگوں کی دعا ان کی نماز، ان کی عبادت کی اس لیے اہمیت ہے کہ ان کی عبادت اور دعا میں بہت زیادہ اخلاص اور خشوع ہوتا ہے، اس لیے کہ ان کے دل دنیا کی چمک دمک اور زینت سے خالی ہوتے ہیں، اور ان کے باطن ہر اس چیز سے پاک ہوتے ہیں جو انہیں اللہ کریم سے دور کرتی ہے۔ یوں انہوں نے اپنا ایک ہی مقصد بنایا ہوتا ہے (یعنی صرف اللہ کی رضا)۔ چنانچہ ان کے اعمال پاکیزہ اور ان کی دعائیں قبول ہوگئیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو کمزوروں کی حفاظت، ان کی خدمت کی کیسی ترغیب دیتا ہے اس واقعہ سے خوب سمجھا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے پیارے نبی صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم کے مبارک زمانے میں دو بھائی تھے، ایک رسولُ اللہ صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم کی بارگاہ میں حاضر رہتا اور دوسرا کام کاج کرتا تھا۔ کام کرنے والے نے نبیِّ اکرم نورِ مجسّم صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم سے اپنے بھائی (کے کام نہ کرنے) کی شکایت کی تو آپ صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم نے ارشاد فرمایا لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهٖ یعنی شاید تجھے اس کی برکت سے ہی رزق دیا جا رہا ہو۔ خیال رہے! حضورِ انور صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم کا "لَعَلَّ" یعنی شاید" فرمانا "شک" کے لیے نہیں۔ کریموں کی "شاید" بھی یقینی بلکہ حَقُّ الْیَقِیْنِ ہوتی ہے واقعہ یہ کہ ان دو بھائیوں میں سے ایک رسولُ اللہ صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم کے پاس علم وحکمت کی باتیں سیکھنے آتا اور دوسرا کام کاج کرتا تھا اور ان کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا۔ کام کرنے والے نے رسولُ اللہ صلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلَّم کی بارگاہ میں اپنے بھائی کی شکایت کی کہ نہ یہ خود کماتا ہے، نہ میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میرا گمان ہے کہ تیری کمائی سے اسے رزق نہیں مل رہا بلکہ تجھے اس کی وجہ سے رزق مل رہا ہے۔ لہٰذا تو اس پر اپنی کمائی کا احسان مت جتا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃُ اللہ علیہ لکھتے ہیں: یہ حدیث اس بات پر واضح دلیل ہے کہ فقراء بالخصوص اپنے قریبی رشتہ داروں کی کفالت کرنا رزق میں برکت کا بہترین ذریعہ ہے۔ حضرت ابو درداء عویمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلَّی اللہ علیہ

والہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: تم مجھے کمزور اور بے کس لوگوں میں تلاش کرو کیونکہ تمہارے کمزور لوگوں کی وجہ سے تمہیں روزی دی جاتی اور تمہاری مدد کی جاتی ہے۔ الغرض اسلام وہ دین کامل ہے کہ جو طاقت کو ظلم کا ذریعہ نہیں بلکہ اسے خدائی امانت بناتا ہے۔ اسلام کمزوری کو حقارت نہیں بلکہ حفاظت کا مستحق قرار دیتا ہے۔ آج اگر ہم اجتماعی طور پر اسلامی تعلیمات کی روح کو تر و تازہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کمزوروں کی ڈھال، یتیموں کا سہارا، محتاجوں کی امید اور مظلوموں کا دادرس بننا ہوگا۔ یاد رکھیے! جس معاشرے میں کمزور محفوظ ہوں، وہ معاشرہ اللہ پاک کی نصرت، برکت اور رحمت کا مستحق بنتا ہے۔ آئیے! عہد کریں کہ اپنی طاقت، عہدہ، منصب، وسائل اور اثر و رسوخ کو کمزوروں کی مدد، ان کے حقوق کے تحفظ اور ان کی عزتِ نفس کی بحالی کے لیے استعمال کریں گے۔ اس لئے کہ معاشرے کا امن کمزوروں کا محافظ بننے میں پوشیدہ ہے۔ فرمایا وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِہٖ عَلِیْمًا ﴿۱۲۷﴾ اگر تم بھلائی کا ارادہ رکھتے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم خود نیک نیتی کے ساتھ نکاح پر آمادہ ہو تو ایسا کرلو اور ان کے حقوق کا خیال رکھو۔ اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یتیم لڑکی کا فائدہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنے میں ہے۔ تو پھر وہاں نکاح کر دو۔ اس کو بلاوجہ نکاح سے نہ روکو اور نہ ہی اس کے مال میں ناجائز تصرف کرو۔ فرمایا تم اس معاملہ میں جو بھی فیصلہ کرو نیک نیتی کے ساتھ کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری نیت اور ارادے سے بھی واقف ہے۔ اس کا علم ذرے ذرے پر محیط ہے۔ اگر تمہارا ارادہ بھلائی کا ہے تو عنداللہ ماجور ہو گے اور اگر نیت میں فتور ہے، تو پھر انصاف نہیں ہوسکتا اور اللہ تعالیٰ ناانصافی کی سزا ضرور دے گا۔

☆☆☆

زوجین کے درمیان باہمی اختلافات کا حل
اور باہمی محبت کے لیے وظیفہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِھَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یُّصْلِحَا
بَیْنَھُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَیْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا
وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ⑫⑧

میاں بیوی میں صلح وخیر کا قرآنی اصول/ نُشُوْزًا کا معنی ومفہوم

وَاِنِ امْرَاَۃٌ	اور اگر کوئی عورت	خَافَتْ	اندیشہ کرے
مِنْۢ بَعْلِھَا	اپنے خاوند سے	نُشُوْزًا	ظلم وزیادتی کا
اَوْ اِعْرَاضًا	یا اعراض کا	فَلَا جُنَاحَ	تو نہیں کوئی گناہ
عَلَیْھِمَآ	ان دونوں پر	اَنْ یُّصْلِحَا	یہ کہ وہ دونوں صلح کریں
بَیْنَھُمَا	آپس میں	صُلْحًا	(کسی طرح) صلح کرنا
وَالصُّلْحُ خَیْرٌ	اور صلح بہت بہتر ہے	وَاُحْضِرَتِ	اور حاضر کیے گئے ہیں
الْاَنْفُسُ	نفس	الشُّحَّ	بخل کو

وَاِنْ تُحْسِنُوْا	اور اگر تم نیکی کرو	وَتَتَّقُوْا	اور تقوی اختیار کرو
فَاِنَّ اللّٰهَ	تو بلاشبہ اللہ	كَانَ بِمَا	ہے ساتھ اس کے جو
تَعْمَلُوْنَ	تم کرتے ہو	خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾	خوب خبردار

ایک گھر میں رہتے ہوئے اور قریب ترین تعلقات یعنی زوجین کے درمیان مخاصمت کا پیدا ہوجانا بعید از قیاس نہیں کسی ایسی صورت حال کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا اور اگر عورت خوف کھاتی ہے اپنے شوہر کی طرف سے اختلاف کا یا اعراض کا۔ دراصل نشوز کا لغوی معنی ابھار ہوتا ہے، شرعی اصطلاح میں نشوز سے مراد میاں بیوی کا ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی سے انکار کرنا، روگردانی کرنا یا نافرمانی وسرکشی کرنا ہے۔ تو اس نشوز کے لفظ میں لڑائی جھگڑا۔ اختلاف رائے، نفرت، ایذا رسانی، تحقیر وغیرہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی کا ڈر ہو دونوں کے مزاجوں میں موافقت موجود نہیں یا خاوند اعراض کرتا ہے، بیوی کی طرف پوری توجہ نہیں دیتا، تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کرلیں، کیونکہ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ صلح بہرصورت بہتر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب نکاح ہو ہی گیا ہے۔ تو اب کوشش یہی کریں کہ یہ رشتہ ازدواج قائم رہے اور علیحدگی کی نوبت نہ آئے تو بہتر ہے۔ میاں، بیوی کے تعلقات آپس میں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، بلکہ بیوی کی ذمہ داریاں میاں کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ اگر بیوی میں کچھ خامیاں ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ بیوی میں بہت سے خوبیاں بھی ہیں جو شوہر کو بہت بھاتی ہیں اور جن سے شوہر کو قلبی سکون اور اطمینان میسر ہوتا ہے۔ اس لئے بیوی کے ایک پہلو کی کمزوری کو سامنے رکھ کر اس کو مطعون نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی کا یہی وہ لائق احساس سرمایہ ہے جو مرد کو عورت کی آغوش میں مل سکتا ہے۔ بیوی کی آغوش وہ شبستان ہے جہاں معاش کی فکر میں سرگرداں، جان توڑ محنت پر دن بھر کی جاں گسل محنت کے بعد شوہر سکھ، چین کی گھڑیاں گزارتا ہے اور پھر سے تازہ دم ہوجاتا ہے۔ شوہر کی تمام تر

خواہش یہ ہوتی ہے کہ زندگی کی یہ ہم سفر جب بھی اسے ملے اس کا چہرہ تر و تازہ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ اور ہشاش بشاش ہو۔ اس کے کان گوش بر آواز ہوں۔ دل محبت سے سرشار ہو۔ بات کرے تو نرمی اور شیرینی سے۔ گویا اس طرح ہم کلام ہو جس سے تمام غم غلط ہوں اور ساری تھکن جاتی رہے۔ معلوم ہوا کہ بیوی راحت و سکون کا گہوارہ ہے جہاں اس کے شوہر کو سکون نصیب ہوتا ہے، اس کی ہمدردی اور پاکیزہ محبت کی چھاؤں میں شوہر کو قلبی تسکین ملتی ہے۔ وہ حرام کاری سے بچتا ہے۔ ظاہر ہے مرد اور عورت کی آفرینش اور ان میں محبت و رحمت کے یہ تعلقات (اللہ تعالیٰ کی کبریائی کی یہ صرف ایک دلیل نہیں، بلکہ اس میں بے شمار دلیلیں دی گئی ہیں، جتنا کوئی سوچے گا اتنی ہی اسے معرفت نصیب ہوتی جائے گی۔ بہرصورت خاندانی نظام کو اسلامی معاشرہ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے زوجین خاندانی نظام کے مرکزی کردار ہیں، شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد مرد و عورت پر ایک دوسرے کے حقوق عائد ہو جاتے ہیں بہتر زندگی اور پرسکون ماحول کے لیے ضروری ہے کہ ان حقوق کا پاس رکھا جائے۔

زوج کا معنیٰ و مفہوم

زوجین خاندان کے دو اہم اور بنیادی ستون ہیں۔ کیونکہ خاندان زوجین کے عائلی روابط سے ہی وجود میں آتا ہے۔ استحکام خاندان کا انحصار انہی کے باہمی تعلقات پر ہوتا ہے۔ زوجین تثنیہ کا صیغہ ہے جس کا واحد زوج ہے۔ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر یہ لفظ جوڑے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے: ھُمْ اَزْوَاجُھُمْ وہ اور ان کے جوڑے۔ اسی طرح سے سورہ یٰسین میں بھی یہ لفظ جوڑے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ " سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ۔ وہ ذات پاک ہے جس نے زمین سے اگنے والی چیزوں کو گوناگوں (جوڑوں کی شکل میں) بنایا، اور خود ان (انسانوں) میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جنہیں وہ نہیں جانتے۔ لفظ زوج کا اطلاق شوہر پر بھی ہوتا ہے اور بیوی پر بھی کیونکہ زوج کا معنی ہے "جوڑا" اور دونوں ایک دوسرے کے لیے جوڑا ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ میاں، بیوی کے لیے

بھی استعمال ہوا ہے۔" اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَھُمْ۔ "[4] انہیں جمع کر دو جنہوں نے ظلم کیا اور ان کی بیویوں کو۔ اسی طرح سے یہ لفظ ساتھی اور رفقاء کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ زَوَّجْنَاھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ ہم انہیں حورعین کا ساتھی بنا دیں گے۔ اس آیت میں زَوَّجْنَا کے معنیٰ باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا کے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں ہے:" وَلَھُمْ فِیْھَآ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ ان کے لیے طبیعت میں ہم آہنگ پاکیزہ سیرت کے حامل ہم سفر ساتھی ہوں گے۔

لہٰذا زوج سے مراد ایسا رفیق یا ساتھی ہے جن کے ساتھ ملے بغیر اپنی تکمیل نہ ہو سکے۔ جو ایک دوسرے کے لیے لازم ہوں۔ complimentary to each other جیسے گاڑی کے دو پہیے ایک دوسرے کے زوج ہوتے ہیں اگر گاڑی کا ایک پہیہ نہ ہو یا خراب ہو تو دوسرا پہیہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکتا بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے زوجین ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ دونوں مل کر خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں۔ دونوں کا ساتھ اور تعاون خاندان کے وجود کو استحکام بخشتا ہے۔ کسی ایک کی عدم توجہی یا لا پروائی خاندان کو منتشر اور غیر مستحکم کر دیتی ہے۔

صلح وسیع تر مفہوم میں

مفسرین کرام اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیت بنیادی طور پر تو میاں بیوی کے درمیان مخاصمت اور پھر اس کی اصلاح کے متعلق ہے مگر اپنے وسیع تر مفہوم کے پیش نظر یہ آیت بڑی بڑی پارٹیوں، گروہوں اور ملکوں کے درمیان تنازعات اور ان کے تصفیہ کے لیے بھی راہنمائی کرتی ہے۔ جھگڑا دو افراد کے درمیان ہو یا دو خاندانوں کے درمیان دو پارٹیاں ہوں یا دو سلطنتیں اختلافات ہر جگہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرما دیا ہے کہ اگر کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو فریقین کو آپس میں صلح کر لینی چاہیے اور نتائج کے اعتبار سے ہر متعلقہ فریق کے لیے صلح ہی بہتر ہے۔ یہی بات سورہ حجرات میں اس طرح بیان کی گئی ہے وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا اگر مومنوں کے دو گروہوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو ان میں صلح کرا دیا کرو۔ اور جو پارٹی سرکشی اختیار کرے، اس پر دباؤ ڈال کر صلح پر مجبور کرنا چاہیے کہ اسی میں ان کی بہتری

ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ہماری ملت کی مشکلات کی وجہ احکام الٰہی سے روگردانی ہے۔ آج ملت اسلامیہ کے کتنے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قوانین پر عمل پیرا ہیں۔ اگر فریقین قرآنی احکام پر عمل کرتے تو اتنا جانی اور مالی نقصان نہ اٹھاتے اس ضمن میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ہے جو ترمذی شریف اور دیگر کتب میں موجود ہے کہ اہل اسلام کے درمیان ہر صلح جائز ہے إِلَّا صُلْحاً أَحَلَّ حَرَاماً أَوْ حَرَّمَ حَلَالاً سوائے اس صلح کے جس کی بنیاد حرام کو حلال یا حلال کو حرام بنانا ہو۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی صلح جائز اور باعث برکت ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ صلح کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اقرار، دوسری سکوت اور تیسری انکار ہے۔ پہلی قسم کے متعلق فرمایا کہ اگر کوئی فریق دعویٰ کرے اور دوسرا فریق اس کو تسلیم کرلے، اپنی غلطی کا اقرار کرلے تو صلح کرانا آسان ہو جاتا ہے دوسری صورت میں اگر کوئی فریق اپنے خلاف لگائے گئے الزام کی نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ تکذیب بلکہ سکوت اختیار کرتا ہے۔ تو بھی مصالحت کی بنیاد موجود ہوتی ہے اور اسے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ باقی رہی تیسری قسم جس میں فریق ثانی دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اس معاملہ میں جب صلح کے لیے گفت وشنید ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ فریقین کو اپنے اپنے موقف میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔ اور اس کی صورت یہی ہوتی ہے کہ ہر فریق اپنے حق میں کمی کرکے دوسرے کے حق کو تسلیم کرلے اور اس طرح کچھ لے کر اور کچھ دے کر معاملہ کو ختم کیا جاسکتا ہے میاں بیوی کا معاملہ اس آیت کا اصل موضوع ہے۔ تو یہاں پر بھی اگر عورت سمجھتی ہے کہ خاوند کا دل اس سے بھر گیا یا وہ اس سے خوش نہیں ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ خاوند کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنے موقف میں لچک پیدا کرے، اپنے کسی حق میں کمی کردے، مثلاً اگر پہلے پانچ ہزار روپے خرچہ مقرر ہے تو اسے کم کرکے تین ہزار روپے کردے۔ یا مہر کا کچھ حصہ معاف کردے۔ یا کوئی دیگر مالی فائدہ پہنچائے جس سے خاوند کو بیوی کی وفاداری کا یقین دلایا جاسکے تو یہی چیز صلح کی بنیاد بن سکتی ہے اور فریقین کے درمیان جھگڑے کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اگر خدانخواستہ میاں، بیوی میں کسی طرح کے اختلافات پیدا ہو جائیں تو شوہر کو مایوس اور جذباتی نہیں ہونا چاہئے۔ علیحدگی کا بھی دل میں خیال نہیں لانا چاہئے، بلکہ صبر اور حوصلہ کے ساتھ

دانائی اور ہوشمندی سے اختلافات دور کر لینے چاہیں، جو کام پیار اور محبت سے کیا جائے اسی میں انجام بہتر ہوگا۔ اگر شوہر یا اس کے والدین وغیرہ کی طرف سے زیادتی ہو تو معذرت کر لینی چاہیئے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح جان لے کہ انسان احسان کا اسیر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صلح کی بنیاد عموماً مالی حقوق میں کمی یا دستبرداری ہوتی ہے مگر وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ حاضر کی گئی ہے نفسوں کے پاس حرص اور بخل، یعنی انسان فطری طور پر حریص اور بخیل واقع ہوا ہے۔ یہ مال سے محبت کرتا ہے لہٰذا اپنے حق میں کمی یا اس سے دست برداری کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ مال سے اس قدر محبت نہ کرو کہ صلح کی بنیاد ہی ختم ہو جائے اگر ضرورت ہو تو مالی قربانی سے بھی دریغ نہ کرو کیونکہ مال آنی جانی چیز ہے اور اس کے مقابلے میں صلح اور حسن معاشرت بیش قیمت ہے۔ لہٰذا اپنے حقوق کی قربانی دے کر بھی اگر صلح کرنی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرو۔ تاہم وَاِنْ تُحْسِنُوْا اگر تم نیکی کرو وَتَتَّقُوْا اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو کسی قسم کی زیادتی نہ کرو دوسرے فریق پر ناجائز دباؤ نہ ڈالو اور جس قدر ممکن ہو، عورت کو سہولت بہم پہنچاؤ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ تو اللہ تعالیٰ تمہارے امور سے باخبر ہے۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ تمہاری صلح و مخاصمت نیکی اور پرہیزگاری اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے وہ تمہارے کوائف سے بھی واقف ہے اور تمہاری ضرورتوں کو بھی جانتا ہے۔ اگر تم اپنی طرف سے دوسرے فریق کو رعایت دو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے بہت کچھ عطا کر دے گا اور پھر آخرت میں اس کا اجر تو بہت وسیع ہے۔ لہٰذا دوسرے کے ساتھ حتی الامکان حسن سلوک کی کوشش کیا کرو۔ اسی لیے فرمایا کہ خود نقصان اٹھا کر بھی اگر دوسرے کے ساتھ نیکی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو گے، تو اللہ تعالیٰ سے بہتر اجر پاؤ گے۔ اسی مناسبت سے اس آیت میں میاں بیوی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جا رہی ہے کہ اپنے اختلافات اور جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے ارشاد ربانی کو قبول کرنا ہی وہ تیر بہدف علاج اور منفرد تدبیر ہے، جس کے سہارے ازدواجی زندگی استوار اور برقرار رہ سکتی ہے۔ نیز اس کے اندر خود ان کا اور ان کی اولاد

اور دیگر سب متعلقین کا مفاد مضمر ہے۔ مزید برآں کسی خلفشار اور انتشار کے بغیر یہ طریقہء درگزر تمام مشکلات کا مداوا بنتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت مجرم اپنے گناہ اور قصور کا اعتراف کرتا ہے۔ حدیث شریف ہے کہ کسی خاندان کو اُجاڑ کر اس کی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر شیطان جتنا خوش ہوتا ہے، کسی دوسرے جرم پر اتنا خوش نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ شیطان کی تابع داری سے بچوں کا مستقبل تباہ ہوتا ہے۔ الغرض میاں، بیوی کا یہ شعار ہونا چاہئے جو ارشاد نبوی کے مطابق ہو، یعنی ایک مومن شوہر اپنی بیوی سے بُغض، عداوت اور نفرت نہ رکھے، کیونکہ بیوی کی اگر ایک عادت اسے ناپسند ہوتی ہے تو کسی دوسری عادت سے اسے خوشی بھی ضرور ہوتی ہے۔

استحکام خاندان میں عورت کا کردار

ہمارے معاشرے میں یہ مقولہ زبان زد عام ہے کہ گھر عورتیں بناتی ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ گھر تنہا بن ہی نہیں سکتا جب تک زوجین مل کر اس کی تعمیر وتزئین نہ کریں اور اسے اپنے خون سے نہ سینچیں۔ میاں اور بیوی دونوں کا اپنا اپنا دائرہ عمل ہوتا ہے اپنے اپنے فرائض ہوتے ہیں جن کی احسن انداز سے ادائیگی خاندان کو استحکام بخشتی ہے۔ گھر کو گھر بنانے کے لیے مادی وسائل جہاں مرد مہیا کرتا ہے وہیں اپنی ذمہ داریوں کی بطریق احسن ادائیگی سے اسے پائیداری بھی عطا فرماتا ہے۔ جبکہ عورت کا وجود اس گھر میں تزئین وآرائش کا سامان مہیا کرتا ہے۔ مرد اگر خاندان کے لیے معاشی اور معاشرتی تحفظ فراہم کرتا ہے، عورت کی چھت اور چار دیواری مہیا کرتا ہے تو عورت اس مکان کو اپنے وجود سے اپنی توجہ، لگن، محبت، خلوص، ایثار، وفاشعاری، جانثاری اور محنت سے گھر بناتی ہے۔ وہ اپنی فہم وفراست اور حکمت سے خاندان کی اکائیوں کو آپس میں جوڑے رکھتی ہے۔ انہیں محبت کے دھاگے میں پروئے رکھتی ہے۔ انہیں منتشر نہیں ہونے دیتی۔ عورت کا وجود خاندان کو باطنی استحکام فراہم کرتا ہے۔

خاندانی نظام کے استحکام میں عورت کا یہ مرکزی کردار ہی ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے رکھ دی۔ اور بحیثیت ماں اسے مرد جو کہ باپ ہے اس پر تین گنا فضیلت اور درجات عطا کیے عورت کا رویہ اپنی اولاد کے ساتھ حقوق وفرائض سے بڑھ کر احسان کا ہوتا ہے۔ اس کی تربیت ہی کی بدولت صالح،

نونہلان امت اور معمار قوم پیدا ہوتے ہیں اسی لیے اسے عورت کے جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مرد خاندان کے لیے ایک مضبوط اور مہربان سائبان کی مانند ہوتا ہے لیکن عورت ایک ایسا رفیق حیات ثابت ہوتی ہے جو اس سائبان کے لیے سہارے کا کام دیتی ہے اسے نامساعد حالات میں کمزور نہیں پڑنے دیتی اس کی ہمت بندھاتی ہے اور مسائل اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اسے ہمت، طاقت، اعتماد اور حوصلہ دیتی ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ گھر کا شعبہ انسانی زندگی کی بقاء، کامیابی اور سکون کا بہت بڑا اور سب سے پہلا شعبہ ہے۔ اس میں امن، سکون، محبت، آرام و آسائش اور نظم و ضبط بے حد ضروری ہے۔ اسی لیے اللہ رب العزت نے زندگی کے باقی معاملات کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کے لیے بھی ضابطے اور طریقے بیان کر دیئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بتایا کہ اگر کسی وجہ سے بیوی محسوس کرے کہ میاں اس سے کچھ زیادہ خوش نہیں تو بیوی کو چاہیے اس کو خوش کرنے اور محبت بڑھانے کے لیے جائز طریقے استعمال کرے۔ یعنی ہر قسم کے جھگڑے کو آپس میں فراخ دلی سے کام لے کر طے کر لینا چاہیے۔ ایک دوسرے سے ضد، ہٹ دھرمی اور ظلم کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ آپس میں صلح صفائی اور احسان کا رویہ اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوا نہیں۔ ان نیک اور بہترین اوصاف کا بدلہ اللہ تعالیٰ ضرور دے گا یہ اس کا وعدہ ہے۔ دوسری بات جو پہلے بھی بیان ہو چکی ہے وہ ہے بیویوں کی تعداد، جاہلیت کے زمانے میں بیشمار بیویاں رکھنے کا رواج تھا۔ جس کو اسلام نے بیک وقت چار کی تعداد تک لازم کر دیا دو شرطوں کے ساتھ کہ اگر ان کے حقوق پورے کر سکو اور اگر ان کے ساتھ ہر طرح سے عدل و انصاف کر سکو۔ اب اس میں کچھ مسائل کھڑے ہوئے تو ان کا حل بھی اللہ رب رحیم نے بتا دیا۔ اگر کوئی بیوی ہمیشہ کی بیمار ہے، بانجھ ہے یا میاں کے حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں (کسی بھی وجہ سے) اس صورت میں دوسری شادی کے بعد میاں دونوں کے ساتھ ایک جیسی رغبت ایک جیسا سلوک کیسے کر سکتا ہے؟ تو اگر وہ پہلی کو طلاق دینا چاہے اور پہلی بیوی طلاق نہ لینا چاہے اس کے بدلہ میں اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائے اور ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ اللہ رب العزت نے اس کا حل بیان فرما دیا کہ مرد کو چاہیے کہ عقل، احسان اور نیکی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلی بیوی کو بھی ساتھ ضرور رکھ

لے۔شریعتِ مطہرہ میں میاں بیوی کے ایک دوسرے پر بہت سے حقوق ہیں، جن کی ادائیگی جانبین کے ذمے ہے،شوہر اگر معمولی باتوں پر ناراض ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض نہ ہوا کرے،میاں بیوی نماز اور شرعی احکام کا اہتمام کریں، نیز آپس کے اتفاق کے لیے تقوی اور خوفِ خدا بنیاد ہے،ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی فکر کی جائے،باہمی معاملات میں صبر وتحمل سے کام لیا جائے۔قرآنِ کریم کی اس آیتِ مبارکہ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ کا ہر فرض نماز کے بعد 11 بار ورد کر کے صدقِ دل سے دعا کریں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دلوں کو جوڑ دیں گے۔شوہر کو اسلام میں بیان کردہ بیوی کے حقوق سے بھی آگاہ کیا جائے، قرآنِ کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿[النساء:19] اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کرو، اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔(از بیان القرآن) حدیث مبارک میں ہے: رسول کریم ﷺ نے فرمایا: مؤمنین میں سے کامل ترین ایمان اس شخص کا ہے جو ان میں سے بہت زیادہ خوش اخلاق ہو، اور تم میں بہتر وہ شخص ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہے۔(مظاہر حق، 3/370،ط: دارالاشاعت) ایک اور حدیث مبارک میں ہے: رسول کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل (بیوی، بچوں، اقرباء اور خدمت گزاروں) کے حق میں بہترین ہو، اور میں اپنے اہل کے حق میں تم میں بہترین ہوں۔(مظاہر حق،3/365،ط: دارالاشاعت)

خلاصہ یہ ہے کہ بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے سے بالاتر سمجھے،اس کی وفادار اور فرماں بردار رہے،اس کی خیر خواہی اور رضا جوئی میں کمی نہ کرے،اپنی دنیا اور آخرت کی بھلائی اس کی خوشی سے وابستہ سمجھے، اور شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت سمجھے، اس کی قدر اور اس سے محبت کرے،اگر اس سے غلطی ہو جائے تو چشم پوشی سے کام لے،صبر وتحمل اور دانش مندی

سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے، اپنی استطاعت کی حد تک اس کی ضروریات اچھی طرح پوری کرے، اس کی راحت رسانی اور دل جوئی کی کوشش کرے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہر شوہر کو بیوی کے لیے اور ہر بیوی کو شوہر کے لیے باعث سکون و راحت بنائے اور دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

مرد کا حق طلاق اور عورت کا حق خلع

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْھَا کَالْمُعَلَّقَۃِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ⑫⑨ وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِہٖ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیْمًا ⑬⑩

کسی ایک بیوی کی طرف میلان طبع کی وجوہ

وَلَنْ	اور ہرگز نہیں	تَسْتَطِیْعُوْٓا	تم طاقت رکھو گے
اَنْ تَعْدِلُوْا	یہ کہ تم عدل کر سکو	بَیْنَ النِّسَآءِ	عورتوں کے درمیان
وَلَوْ حَرَصْتُمْ	اگر چہ تم حرص کرو	فَلَا تَمِیْلُوْا	پس نہ جھک پڑو
کُلَّ الْمَیْلِ	مکمل جھک جانا (ایک کی طرف)	فَتَذَرُوْھَا	کہ چھوڑ دو تم اس (دوسری) کو
کَالْمُعَلَّقَۃِ	مانند (درمیان میں) لٹکی ہوئی کے	وَاِنْ تُصْلِحُوْا	اور اگر تم صلح کرو
وَتَتَّقُوْا	اور تقویٰ اختیار کرو	فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ	تو بیشک اللہ ہے
غَفُوْرًا	بہت بخشنے والا	رَّحِیْمًا ⑫⑨	نہایت رحم کرنے والا

متعدد ازواج میں سے کسی ایک طرف زیادہ میلان بھی فطری امر ہے اور عام طور پر انسان خواہش کے باوجود اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو بھی دہرایا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں کے درمیان پورے طریقے سے انصاف کرسکو، اگرچہ تم کتنی ہی حرص کرو۔ چاہنے کے باوجود عورتوں کے درمیان مکمل انصاف بڑا مشکل کام ہے۔ وہ اس لیے کہ مثلاً ایک بیوی جوان ہے، دوسری بوڑھی ہے، ایک خوبصورت ہے دوسری قبول صورت یا بدصورت ہے، ایک کنواری ہے دوسری شوہر دیدہ ہے، ایک خوش مزاج ہے دوسری تلخ مزاج ہے ایک ذہین وفطین ہے تو دوسری غبی اور کند ذہن ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ ایسی صفات ہیں جن میں اگرچہ عورت کا اپنا کچھ عمل دخل نہیں تاہم یہ خاوند کے لیے میلان یا عدم میلان طبع کا باعث ضرور بن جاتی ہیں اور یہ فطری امر ہے۔ اس قسم کے میلان وعدم میلان پر انسان کا چونکہ اپنا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا لہٰذا ایسے امور پر اللہ کی طرف سے گرفت اور مواخذہ نہیں۔ مواخذہ تو صرف ان باتوں پر ہوگا جو انسان کے اپنے اختیار میں ہوں مثلاً نان ونفقہ اور دیگر ضروریات زندگی کا خیال رکھنا عورتوں کی باری مقرر کرنا وغیرہ۔ اب جو باتیں انسان کے بس میں نہیں ان کے متعلق ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم کما حقہ عدل نہ کرسکو گے۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ خدا تعالیٰ کے قانون کے مطابق ظاہری طور پر اپنی بیویوں کی رہائش، کھانے، لباس اور لین دین میں برابری کی کوشش کرو۔ حضور ﷺ خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں مگر ساتھ یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے کہ اے مولا کریم! میں یہ کام اپنی طاقت کے مطابق انجام دے رہا ہوں، اور جس معاملہ میں استطاعت نہیں رکھتا یعنی جو چیز میرے بس میں نہیں ہے اس میں میرا مؤاخذہ نہ کرنا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ طبعی میلان کسی ایک طرف ہو جسے میں تقسیم نہ کرسکوں۔ اسی لیے فرمایا کہ تم خواہش کے باوجود عورتوں کے درمیان مکمل انصاف نہ کرسکو گے۔ مگر یاد رکھو! خدا تعالیٰ کا قانون یہ ہے فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ کسی ایک طرف مکمل طور پر نہ جھک جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو، فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ کہ دوسری بیوی کو درمیان میں لٹکتا چھوڑ دو۔ نہیں، بلکہ اس کے ساتھ تعلقات کو قائم رکھو اور اس کا حق بھی ادا کرو۔ ایک طرف بہت زیادہ رغبت ہو اور دوسری طرف بالکل نہ ہو۔ یہ عدل کے خلاف ہے، اگر تھوڑا بہت فرق ہوگا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیگا۔ حضور

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کی دو بیویاں ہوں۔ اور اس نے ایک کے ساتھ التفات کیا اور دوسری کو نظر انداز کر دیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حالت میں پیش ہوگا کہ اس کا آدھا جسم فالج زدہ ہوگا۔ وہ گھسٹتا ہوا اللہ کی عدالت میں پیش ہوگا۔ کیونکہ اس نے بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کیا۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی دو بیویاں تھیں مگر اولاد سے محروم رہے۔ تاہم آپ بیویوں کے ساتھ سلوک میں نہایت محتاط تھے۔ جب کوئی چیز باہر سے آتی تو آپ ترازو سے تول کر برابر برابر تقسیم کرتے کہ کسی کے حصے میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔ فرمایا عورتوں کے درمیان حتی الامکان عدل قائم کرنے کی کوشش کر وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا پھر اگر تم صلح کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ چھوٹی موٹی غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ تم بہر حال اصلاح کی پوری پوری کوشش کرو۔

بیویوں کے درمیان عدل کی حقیقت

قلبی محبت اور طبعی مَیلان جو تمہارے اختیار میں نہیں ہے اس میں برابری کرنے کا تمہیں حکم نہیں دیا گیا تو یہ تو نہ کرو کہ ایک ہی بیوی کی طرف پورے پورے جھک جاؤ اور دوسری بیوی کے لازمی حقوق بھی ادا نہ کرو بلکہ تم پر لازم ہے کہ جہاں تک تمہیں قدرت و اختیار ہے وہاں تک یکساں برتاؤ کرو، محبت اختیاری شے نہیں تو بات چیت، حسنِ اخلاق، کھانے، پہننے، پاس رکھنے اور ایسے امور جن میں برابری کرنا اختیار میں ہے ان امور میں دونوں کے ساتھ ضرور یکساں سلوک کرو۔ یعنی جن باتوں میں انسان انصاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے ان کا ضرور لحاظ رکھا کرو۔ اس سے خود بخود ہی یہ نتیجہ پیدا ہو جائے گا کہ نہ تو تم ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح جھکو گے اور نہ کسی دوسری سے بالکل بے تعلق رہ سکو گے۔

علیحدگی کی صورت

وَاِنْ	اور اگر	يَّتَفَرَّقَا	دونوں الگ ہو جائیں
يُغْنِ اللّٰهُ	(تو) بے نیاز کر دے گا اللہ	كُلًّا	ہر ایک کو

مِّنْ سَعَتِهٖ	اپنے فضل سے	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
وَاسِعًا	بڑی وسعت والا	حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾	خوب حکمت والا

فرمایا اگر مصالحت کے تمام راستے مسدود ہو جائیں اور اکٹھا رہنے میں حدود اللہ کی خلاف ورزی کا احتمال ہو، تو پھر علیحدگی بہتر ہے وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا اگر میاں بیوی جدا ہو جائیں، طلاق کی نوبت آجائے تو شریعت محمدی میں یہ بھی روا ہے۔ طلاق کو اس قدر انا کا مسئلہ نہ بنالیا جائے کہ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاؤ، بلکہ اسے بھی اللہ کی مشیت سمجھ کر قبول کرلو۔ اللہ تعالیٰ اس میں بھی بہتری پیدا کر دیں گے فرمایا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ اللہ تعالیٰ فریقین کو اپنی وسعت سے مستغنی کر دیگا اگر علیحدگی نیک نیتی اور اصلاح کے ارادے سے ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ ہر دو کے لیے کوئی دوسرا راستہ پیدا فرمادے گا جس سے ان دونوں کی زندگی بہتر طور پر بسر ہو سکے۔ لہٰذا علیحدگی کی صورت میں بالکل بددل نہیں ہو جانا چاہئے۔ بلکہ اپنی اصلاح کرنی چاہئے اور آئندہ زندگی کے لیے بہتر لائحہ عمل تجویز کرنا چاہئے وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا حکمت والا ہے۔ وہ مسب الاسباب ہے۔ تمام اسباب اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ تمہارے لیے کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔ آخری ایک صورت طلاق کی ہے تو اس کے لیے حکم ہے کہ اگرچہ طلاق کی اجازت اسلام میں دی گئی ہے۔ شریعت میں مرد کا طلاق دینا اور عورت کا خلع طلب کرنا دونوں ہی نہایت ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن جب ایک دوسرے کے ساتھ نباہ ممکن نہ رہے تو مجبوری میں دونوں ہی کو اجازت ہے، اسی سلسلہ میں یہاں دو بنیادی ہدایات دی گئی ہیں، اولاً یہ کہ جب شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے توجہی پائی جائے تو میاں بیوی کو آپس میں کوئی بات طے کر لینی چاہئے اور صلح کی صورت نکالنی چاہئے، یا تو عورت اپنا کوئی حق چھوڑ دے، یا مرد طلاق دے دے، یا مرد اپنے رویہ کو بہتر کرے۔ یہاں پر عورت کے ساتھ نباہ کے دو اہم اُصول بیان کیے گئے ہیں: 1 اس میں جو خوبیاں ہیں، ان پر نظر رکھو اور کوتاہیوں کو نظر انداز کر دو۔ 2 مرد کے مقابلے میں عورت جسمانی لحاظ سے بھی کمزور ہے اور عقلی و ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی فروتر۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت کی

کوتاہیوں پر صبر وضبط اور حوصلہ وتحمل کا مظاہرہ کرے۔ مردانگی وفرزانگی کا زعم اور نفقہ ورہائش نیز اس کی دیگر ضروریات کی تکمیل کا واہمہ اسے عورت کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت تو سیدھی نہیں ہو سکے گی البتہ گھر کے اُجڑنے تک نوبت پہنچ جائے گی جو چیز بھی اس معاہدے کے دوام اور بقا میں رکاوٹ بن سکتی ہے، اس کے لیے عادلانہ نظام اور فطرت سے ہم آہنگ سسٹم کی طرح ڈالی گئی ہے۔

خلع اور طلاق کے اہم اسباب

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو دو اجنبی رشتۂ نکاح میں مربوط ہوئے ہیں، وہ الگ الگ دل ودماغ رکھتے ہیں، سوچنے اور غور وفکر کے ان کے الگ الگ طریقے ہیں۔ دونوں کے فکر وعمل اور طرز زندگی مختلف ہو سکتے ہیں، اس لیے دونوں کا ہر معاملہ میں مکمل طور پر ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں۔ ان ہی دشواریوں کی وجہ سے یہ رشتہ بجائے راحت وسکون کے دردسری اور ایک مصیبت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی حق تلفی کرنے لگتے ہیں، ایسی ناگفتہ بہ صورتِ حال سے خلاصی کے لیے شریعت نے طلاق کی راہ ہموار کر رکھی ہے۔ کیونکہ شریعت کا ضابطہ ہے لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ''نہ تم ظلم کروگے اور نہ ہی ظلم سہوگے''[البقرہ:۲۷۹] لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ ''نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ گے اور نہ ہی تمہیں کوئی نقصان پہنچایا جائے گا''[صحیح ابن ماجۃ للالبانی:۱۹۰۹] یہی وجہ ہے کہ شیطان لعین کا سب سے بہترین مشغلہ اس خوش گوار زندگی کو برباد کرنا ہے جس کے پیچھے مختلف اسباب وعوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً دینی تعلیم سے دوری، عدم برداشت، خواتین کا ملازمت کرنا، فلموں ڈراما سیریز کا منفی کردار، کفو دیکھ کر رشتہ نہ کرنا، بیجا مطالبات، والدین کی غلط تربیت، لو میریج، لڑکی کو میراث میں حصہ نہ دینا، جوائنٹ فیملی، جہیز کا نہ ملنا یا کم ملنا، موبائل اور سوشل میڈیا کا کردار، بدگمانی اور شک کا گزر، احترام کا فقدان، خاندانوں کی بیجا دخل اندازی، برے دوست واحباب کی صحبت، سحر وجادوگری اور بانجھ پن وغیرہ مختلف زمان ومکان اور احوال وکوائف کی رو سے مختلف اسباب وعوامل کارفرما ہو سکتے ہیں۔

طلاق دینے کا بہتر طریقہ

اگر طلاق دینا ناگزیر ہو تو اس کا سب سے افضل طریقہ یہ ہے کہ بیوی کی پاکی کے ایام میں جس میں ہم بستری نہ کی ہو ایک طلاقِ رجعی دے دیں، یعنی یوں کہہ دیں" میں نے ایک طلاق دی" اور پھر تین ماہواریاں پوری ہونے تک رجوع نہ کریں، تین ماہواریاں پوری ہوتے ہی نکاح ختم ہو جائے گا، اس صورت میں عدت کے دوران رجوع اور عدت کے بعد تجدیدِ نکاح کی گنجائش رہے گی اور اگر تین طلاقیں دینی ہوں تو اس کا افضل طریقہ یہ ہے کہ الگ الگ تین طہروں (پاکی کے اَیام) میں ایک ایک طلاقِ رجعی دے دیں، اس صورت میں تیسری طلاق دینے سے پہلے پہلے عدت کے دوران رجوع کی گنجائش رہے گی، لیکن تیسری طلاق دیتے ہی رجوع یا تجدیدِ نکاح کی گنجائش ختم ہو جائے گی، نیز مذکورہ صورت میں بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اگر اولاد ہے تو بہر صورت مطلقہ کی عدت اور بچے کا خرچہ شوہر پر لازم ہوگا، نیز طلاق کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے خاندان کے بڑوں کو بیچ میں ڈال کر افہام وتفہیم سے معاملہ حل کرنے کی کوشش کریں۔

خلع لینے کا صحیح طریقہ

اگر زوجین میں نبھاؤ کی کوئی شکل نہ رہے اور شوہر بلا عوض طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو عورت کے لیے یہ راستہ تجویز کیا گیا ہے کہ وہ خلع کی پیش کش کر کے اپنے کو آزاد کرالے۔ اِسی بات کو قرآنِ کریم کی اِس آیت میں اِرشاد فرمایا گیا: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (البقرۃ:۲۲۹) اور تم کو یہ روا نہیں ہے کہ عورتوں کو دیا ہوا کچھ بھی مال اُن سے واپس لو، مگر یہ کہ جب میاں بیوی اِس بات سے ڈریں کہ اللہ کے اَحکام پر قائم نہ رہ سکیں گے پس اگر تم لوگ اِس بات سے ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود پر قائم نہ رہیں گے تو اُن دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے اِس میں کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جائے، یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، سو اُن سے

آگے نہ بڑھو، اور جو کوئی اللہ کی حدود سے آگے بڑھے گا سو وہی لوگ ظالم ہیں۔

نیز روایات میں وارد ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میں ثابت کے اخلاق اور اُن کی دین داری کے بارے میں تو کوئی عیب نہیں لگاتی؛ لیکن مجھے اُن کی ناقدری کا خطرہ ہے (اِس لیے میں اُن سے علیحدگی چاہتی ہوں) تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اُنہوں نے جو باغ تمہیں مہر میں دیا ہے وہ تم اُنہیں لوٹا دوگی؟'' تو اہلیہ نے اِس پر رضامندی ظاہر کی، تو پیغمبر علیہ السلام نے حضرت ثابت کو بلا کر فرمایا: ''اپنا باغ واپس لے لو اور انہیں طلاق دے دو''۔ (ابوداوٗد شریف/ باب الخلع ۱/ ۳۰۳، تفسیر ابن کثیر مکمل ۱۸۳-۱۸۵، ریاض)

واضح رہے کہ شرعاً خلع صحیح ہونے کے لیے شوہر کا اسے قبول کرنا ضروری ہے۔ نیز چوں کہ خلع طلاقِ بائن کے حکم میں ہے؛ اس لیے خلع واقع ہونے کے بعد عدت گزارنا ضروری ہوگا، جو حمل نہ ہونے کی صورت میں تین ماہواریاں ہوگی۔

☆☆☆

مقاصدِ شریعت اور انسانی مصلحتیں

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

اللہ کی بے نیازی

وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کا ہے	مَا فِي السَّمٰوٰتِ	جو کچھ ہے آسمانوں میں
وَمَا	اور جو کچھ ہے	فِي الْاَرْضِ	زمین میں
وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	وَصَّيْنَا	ہم نے حکم دیا
الَّذِيْنَ	ان لوگوں کو جو	اُوْتُوا الْكِتٰبَ	دیے گئے کتاب
مِنْ قَبْلِكُمْ	تم سے پہلے	وَاِيَّاكُمْ	اور خود تمہیں بھی
اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ	یہ کہ تم اللہ سے ڈرو	وَاِنْ تَكْفُرُوْا	اور اگر تم کفر کرو گے

فَاِنَّ لِلّٰهِ	تو تحقیق اللہ ہی کے لیے ہے	مَا	جو کچھ ہے
فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں	وَمَا	اور جو کچھ ہے
فِي الْاَرْضِ	زمین میں	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
غَنِيًّا	خوب بے پروا	حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾	نہایت قابل تعریف

فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ درحقیقت تمام چیزوں کا مالک اور متصرف اللہ تعالیٰ ہے ارض وسما کی ہر چیز اسی کی پیدا کردہ ہے لہٰذا یاد رکھو وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ہم نے تاکیدی طور پر حکم دیا تھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب دی گئی مِنْ قَبْلِكُمْ تم سے پہلے یعنی یہود و نصاریٰ۔ ان کو بھی یہی حکم تھا وَاِيَّاكُمْ اور تمہیں بھی حکم دیا جا رہا ہے اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اگر تم میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے گا تو اس مالک الملک کے احکام کی خلاف ورزی نہیں ہوگی، تم کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکو گے، کسی کا حق تلف نہیں کرو گے اور کسی پر زیادتی نہیں کرو گے۔ تقویٰ سے مراد خوفِ خدا ہے اور جب یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے تو انسان کفر، شرک، الحاد اور دیگر تمام گندے عقیدوں سے متنفر ہو کر معاصی سے بچ جاتا ہے کامل تقویٰ کا حامل انسان کبائر کے علاوہ صغائر اور مشتبہ چیزوں سے بھی بچتا رہتا ہے۔ حرام سے بچنا تو بہرصورت لازم ہے ورنہ تقویٰ حاصل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر معاملہ میں شرعی حدود قائم کر دیئے ہیں جو شخص ان حدود کی حفاظت کرے گا، وہی منصب تقویٰ پر فائز ہوگا۔ آخرت میں اچھے ثمرات کا انحصار تقویٰ پر ہے۔ اگر انسان متقی ہے تو اس کا اخلاق، نیک اعمال اور اعلیٰ اطوار اسے دنیا میں بھی سرخرو کریں گے اور آخرت میں تو اس کے لیے اجر عظیم ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا ہم نے اہل کتاب اور اہل ایمان سب کو حکم دیا کہ تقویٰ کی راہ اختیار کریں اور ساتھ یہ بھی فرما دیا وَاِنْ تَكْفُرُوْا اگر تم انکار کرو گے، کفر کے راستے پر چل نکلو گے تو سن لو فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ پس بیشک اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

اور جو کچھ زمین میں ہے۔ ہر چیز کا خالق، مالک اور متصرف وہی ہے وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ اللہ تعالیٰ بے پروا ہے اور ہر حالت میں تعریفوں والا ہے۔

بے نیازی کا مفہوم

اس کائنات اور اس عالم دنیا سے اللہ کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، انسان اور جن سب کے سب، سب سے زیادہ متقی آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ اور اگر تمہارے اگلے پچھلے انسان اور جن سب کے سب، سب سے فاجر آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوگی۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے انسان اور جن سب کے سب ایک میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کی مطلوبہ چیز دے دوں تو جو کچھ میرے پاس ہے اس میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ (مسلم، کتاب البر والصلۃ) اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب اور محتاجی سے پاک ہے۔ اسے زندہ رہنے، کائنات چلانے یا کسی کام کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام مخلوقات اپنی پیدائش، رزق اور بقا کے لیے صرف اللہ پر بھروسہ کرتی ہیں۔ اگر دنیا کے تمام انسان اور جنات اللہ کی عبادت کریں، تو اس سے اللہ کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر سب لوگ اللہ کے نافرمان بن جائیں، تو اس سے اللہ کی کبریائی یا بادشاہی کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچتا۔ اللہ اتنا بے نیاز ہے کہ اگر وہ چاہے تو موجودہ انسانوں کو مٹا کر ان کی جگہ بالکل نئی مخلوق پیدا کر سکتا ہے۔

شرعی احکام انسانوں کی مصالح پر مبنی ہیں

وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کے لیے ہے	مَا فِي السَّمٰوٰتِ	جو کچھ ہے آسمانوں میں
وَمَا	اور جو کچھ ہے	فِي الْاَرْضِ	زمین میں
وَكَفٰى بِاللّٰهِ	اور کافی ہے اللہ	وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾	نہایت کارساز

پھر تاکیداً فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، جو کچھ

آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَ کِیْلًا ﴿۱۳۲﴾ اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز ان آیات 130 تا 132 میں تین بار یہ جملہ دہرایا گیا ہے (وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَ کَفٰی باللّٰہِ وَ کِیْلًا اور تینوں دفعہ اس کا استعمال الگ الگ مقصد کے لیے ہوا ہے۔ پہلی بار سے کشائش اور وسعت مقصود ہے یعنی اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کی ایک ایک چیز اسی کی ملکیت ہے، اگر کسی جوڑے میں حالات کی ناسازگاری کی بنا پر جدائی ہوگئی ہے تو اللہ ان دونوں کے لیے بہتر حالات پیدا کرسکتا ہے کیونکہ ہر طرح کے اسباب و وسائل پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔ دوسری بار یہ جملہ ایک دوسرے مدلول کی دلیل کے طور پر آیا ہے جو یہ ہے کہ یہ اللہ کی خاص مہربانی اور فضل ہے کہ اس نے تم سے پہلے لوگوں کو بھی اور خاص تمہیں بھی شریعت نازل فرما کر ان احکام پر عمل کرنے اور اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا اور شریعت کے یہ تمام احکام تمہارے ہی دینی اور دنیوی مصالح پر مبنی ہوتے ہیں، جن میں تمہارا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ واجب کر دیئے جاتے ہیں اور جن کاموں میں تمہارا نقصان ہوتا ہے وہ حرام کر دیئے جاتے ہیں اب اگر تم ان احکام پر عمل کرو گے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے اور اگر نہ کرو گے تو اس میں تمہیں ہی نقصان پہنچے گا۔ اللہ کا نہ تمہاری اطاعت سے کچھ سنورتا ہے اور نہ تمہاری نافرمانی سے کچھ بگڑ سکتا ہے اس لیے کہ پوری کائنات کا مالک تو وہ پہلے ہی ہے۔ لہٰذا وہ تمہاری فرمانبرداری یا نافرمانی سے بے نیاز ہے اور اس کے کارنامے ایسے ہیں جو خود اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس کائنات کا خالق مالک اور منتظم فی الواقع مستحق حمد ہے، تمہارے اس کی حمد کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یعنی پہلی بار نازل ہونیوالے اس کلمہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفت وسعت کے ساتھ ہے۔ اس سے گزشتہ آیت کے آخری الفاظ تھے وَکَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیْمًا ﴿۱۳۰﴾ تو اسی صفتِ وسعت کے ساتھ ہی آج کی پہلی آیت کی ابتدا وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ سے ہوئی ہے فرمایا چونکہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا کائنات جیسی وسیع تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی صفت وسعت ہی کارفرما ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کے اگلے حصے میں مذکورہ جملے کا تعلق تَکْفُرُوْا کے ساتھ کہ اس سے فوراً پہلے یہی لفظ آیا ہے اور

اس سے مقصود یہ یاد دلانا ہے کہ دیکھو! دنیا جہاں کی ہر چیز پر تصرف فقط اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تو ان حالات میں تم اس کا کفر یعنی انکار کر کے کہاں جا سکتے ہو، بادشاہی تو اسی کی ہے، اس کی سلطنت سے بھاگ کر کہاں جائے پناہ تلاش کرو گے، لہٰذا کفر کر کے تم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ اللہ ہر چیز سے مستغنی ہے کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے، وہ بہر حال سب تعریفوں کا مالک ہے۔ اس جملے کی تیسری آیت کے متعلق شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفت کارسازی سے ہے جیسا اس آیت میں پھر آیا ہے وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ چنانچہ اس آیت میں یہ جملہ دہرانے کے بعد فرمایا وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ مقصد یہ ہے کہ پوری کائنات یعنی زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، سیارے غرضیکہ ہر چیز کا مالک وہی مالک الملک ہے اور اس میں بسنے والے ہر انسان، جن، فرشتے، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے وغیرہ کا کام بنانے والا بھی وہی ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے کام دنیا میں بھی ٹھیک بنا دیگا اور آخرت میں بھی اسے بیشمار انعامات سے نواز دے گا، کیونکہ کارساز وہی ہے۔ اسی لیے سورہ مزمل میں اسی کو کارساز پکڑنے کا حکم ہے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا کارساز بھی اسی کو سمجھو اور اسی پر بھروسہ رکھو، کام بنانیوالا صرف وہی ہے۔ حالانکہ اس آیت سے صاف سمجھ آ رہی ہے کہ جب زمین و آسمان کی ہر چیز اسی کی ملکیت ہے تو پھر سوالوں کو پورا کرنے والا بھی وہی ہے اس کے علاوہ نہ کوئی حاجت روا ہے اور نہ مشکل کشا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفات کا تذکرہ فرما کر معبودان باطلہ کی نفی کر دی ہے جب مالک و مختار، قادر مطلق، کارساز اور علیم کل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تو پھر اس کے علاوہ معبود بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر سب کچھ جاننے کے باوجود غیر اللہ کی پوجا کرنے والے لوگ موجود ہیں کوئی زمین کی پرستش کر رہا ہے کوئی آسمانی کروں چاند سورج کا پرستار ہے اور کوئی حقیر سے حقیر چیز کا پجاری بنا بیٹھا ہے۔

کائنات کی تبدیلی اور نسلوں کو بدلنا

اِنْ يَّشَاْ	اگر وہ چاہے	يُذْهِبْكُمْ	تو تمہیں لے جائے

اَيُّهَا النَّاسُ	اے لوگو!	وَيَاْتِ	اور وہ لے آئے
بِاٰخَرِيْنَ	دوسروں کو	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
عَلٰى ذٰلِكَ	اس پر	قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾	خوب قدرت رکھنے والا

اللہ تعالیٰ نے اپنی مذکورہ صفات کے اظہار کے بعد فرمایا کہ جو ذات خالق، مالک اور مختار کل ہے اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ اگر وہ چاہے تو انہیں لے جائے، اٹھالے، اس دنیا سے نیست و نابود کر دے وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ اور دوسروں کو لے آئے۔ اگر سب لوگ اس وحدہ لاشریک ہستی کا انکار کرنے لگیں تو اس کو اختیار حاصل ہے کہ اس مخلوق کو صفحہ ہستی سے مٹا کر کوئی دوسری مخلوق لے آئے یا کسی خاص علاقے کے منکرین کی جگہ متبعین کو کھڑا کر دے۔ چنانچہ جب عربوں نے نبی آخر الزمان ﷺ کا انکار کیا تو اللہ نے ان کی جگہ عجمی ایمان والوں کو لا کھڑا کیا۔ اور جب مشرکین مکہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ کو آپ ﷺ پر ایمان لانے والے بنا دیا۔ جب عباسیوں نے انکار کیا تو اللہ نے ان کی جگہ مغلوں کو کھڑا کر دیا کہ دین کے پاسبان تم بن جاؤ۔ اگر ہم دین پر عمل پیرا نہیں ہوں گے تو خدا تعالیٰ کسی دوسری مخلوق کو لے آئے گا اور موقع ملنے کے باوجود اور وسائل کے ہوتے ہوئے دین سے اعراض کی وجہ سے یہ لوگ لعنت کے مستحق بن جائیں گے۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ اور خدا تعالیٰ ایسا کرنے پر قدرت رکھتا ہے وہ قادر مطلق ہے، جو چاہے سو کرے، اس کی مشیت کے سامنے سب عاجز ہیں۔ یعنی اگر تم تقویٰ اختیار نہ کرو تو مت بھولو کہ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو یہاں بسا دے، جیسا کہ فرمایا: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا [محمد:38] "اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ تمہارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔" انسان کو یہ تکبر نہیں ہونا چاہیے کہ زمین کا نظام اسی کے دم سے چل رہا ہے۔ اللہ جب چاہے کسی بھی سرکش یا نافرمان قوم کو سیکنڈوں میں ختم کر کے اس کی جگہ نئی، فرماں بردار اور بہتر قوم کو لا سکتا ہے، جیسا کہ تاریخ میں پہلی کئی قوموں (جیسے قومِ عاد اور ثمود) کے ساتھ ہو چکا

ہے۔آیت کے آخری حصے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔وہ ہر چیز پر قادر ہے، کائنات کی تبدیلی اور نسلوں کو بدلنا اس کے ایک حکم (" کُن ") کا محتاج ہے۔یہ آیت انسان کو عاجزی اختیار کرنے، نافرمانی سے بچنے اور اللہ کی قدرت سے ڈرتے رہنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ وہ اپنے اندر سے تکبر کو ختم کرے۔

دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا مطالبہ

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ	جو کوئی ہے ارادہ کرتا	ثَوَابَ الدُّنْيَا	دنیا کے ثواب کا
فَعِنْدَ اللّٰهِ	تو اللہ ہی کے ہاں ہے	ثَوَابُ الدُّنْيَا	ثواب دنیا کا
وَالْاٰخِرَةِ	اور آخرت کا	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
سَمِيْعًا	خوب سننے والا	بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾	خوب دیکھنے والا

اس دنیا کی زندگی محدود ہے اور اصل دائمی زندگی آخرت کی زندگی ہے، لہٰذا اس دنیا کی بجائے آخرت کی بہتری کے لیے کوشش اور محنت کرنی چاہیئے۔ارشاد ہوتا ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا جو لوگ دنیا کی زندگی پسند کرتے ہیں اور اس عارضی زندگی کی نعمتوں تک ہی محدود رہنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، وہ دنیا کی ہر نعمت عطا کرنے پر قادر ہے۔مگر یاد رکھو! فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اللہ کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں جگہ کی نعمتیں موجود ہیں۔ہر طالب کو اس کی مطلوبہ چیز ہی ملتی ہے۔سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں " رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا " اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس دنیا میں ہی عطا کر دے۔اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہوگا۔اللہ کے احکام پر عمل کرو گے تو دنیا بھی تمہاری اور آخرت بھی، صرف دنیا کی طلب تو خسارا ہی خسارا ہے۔پھر دوسرے گروہ کا تذکرہ فرمایا جو کہتے ہیں " رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ " اے مولا کریم! ہمیں اس دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کا حصہ ان کی طلب کے مطابق ہی

ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں تو سب کچھ موجود ہے۔ اب یہ ہر انسان کا اپنا اپنا ظرف ہے۔ اگر وہ دنیا کے فائدے ہی چاہتا ہے اور دنیا میں ہی مگن ہوگیا ہے تو اسے دنیا کے فائدے حاصل ہو جائیں گے اور جو آخرت کی بھلائی بھی چاہتا ہے اسے یقینا آخرت میں اجر وثواب ملے گا۔ اور اس کے علاوہ دنیا کے فائدوں میں سے بھی جو کچھ اس کے مقدر ہو چکا ہے وہ اسے مل کر رہے گا، لہٰذا عقلمند اور صاحب ظرف انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر توجہ آخرت کے اجر وثواب پر مبذول کرے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ دہر میں فرمایا کہ انسان جلد باز ہے، وہ اسی دنیا میں سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے "اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا" اور قیامت کے بھاری دن کو پیچھے چھوڑ دیتے یعنی اس کی کچھ فکر نہیں کرتے جو لوگ اس دنیا کے مال واسباب، عیش وراحت کے طلبگار ہوتے ہیں وہ اگلی دنیا میں کچھ حصہ نہیں پاتے۔ اور جو لوگ دنیا اور آخرت دونوں جگہ بہتری چاہتے ہیں۔ انہیں دونوں جگہوں کے انعامات سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یقینا ان کی سعی کا بدلہ ملیگا۔ دنیا اور عاقبت کے لیے دو مختلف قانون ہیں۔ یہاں پر صرف اتنی بات سمجھا دی ہے کہ اللہ کے پاس دنیا کی زندگی کا بدلہ بھی ہے اور آخرت کی زندگی کا بھی۔ لہٰذا صرف دنیا کے مال و اسباب میں الجھ کر نہ رہ جاؤ بلکہ آخرت کی دائمی زندگی کا بھی سامان پیدا کرو۔ ظاہر ہے کہ ایمان، تقویٰ اور نیکی کا اصل ثمرہ اور محل آخرت ہے لہٰذا دائمی چیز کو چھوڑ کر عارضی چیز کے پیچھے نہ پڑو یہ عقلمندی کی بات نہیں۔ یہ ترغیب بھی ہوگئی اور ترہیب بھی۔ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ اور بیشک اللہ تعالیٰ ہر دعا کو سنتا ہے اور تمہاری حرکات وسکنات کو دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا تقویٰ کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ کفر، شرک اور معاصی سے بچنا چاہئے اور اسی سے امید وابستہ رکھنی چاہئے۔ اللہ ہمیں قرآن کا فہم عطا فرمائیں اور اس کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے آمین

☆☆☆

اسلام میں گواہی کی اہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ
الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا
الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۱۳۵

انصاف کی گواہی کا تاکیدی حکم

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو!
کُوْنُوْا	تم ہو جاؤ	قَوّٰمِیْنَ	قائم رہنے والے
بِالْقِسْطِ	انصاف پر	شُھَدَآءَ	گواہی دینے والے
لِلّٰہِ	اللہ کیلیے	وَلَوْ	اگرچہ
عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ	(وہ) تمہاری اپنی جانوں کے خلاف ہو	اَوِ الْوَالِدَیْنِ	یا والدین کے
وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ	یا قرابت داروں کے	اِنْ یَّکُنْ	اگر وہ (شخص) ہو
غَنِیًّا	مالدار	اَوْ فَقِیْرًا	یا فقیر
فَاللّٰہُ	تو اللہ	اَوْلٰی	زیادہ حقدار ہے
بِھِمَا	ان دونوں کا	فَلَا تَتَّبِعُوا	چنانچہ نہ تم پیروی کرو

الْهَوٰٓى	خواہش کی	اَنْ تَعْدِلُوْا	یہ کہ نہ تم انصاف کرو
وَاِنْ تَلْوٗٓا	اور اگر تم موڑو زبان کو	اَوْ تُعْرِضُوْا	یا تم اعراض کرو
فَاِنَّ اللّٰهَ	تو تحقیق اللہ	كَانَ بِمَا	ہے اس کیساتھ جو
تَعْمَلُوْنَ	تم کرتے ہو	خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾	خوب خبردار

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو انسان سے باہمی ربط دے کر ایک دوسرے کی ضرورت بنایا ہے، بعض دینی اور دنیاوی معاملات میں بسا اوقات ایسی صورتیں بھی سامنے آتی ہیں کہ صاحب معاملہ کسی پر کسی چیز کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ میرا حق ہے لیکن تنہا اُس کے اقرار یا دعوے یا بیان کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ناقابل اعتبار ہے بل کہ اس لیے کہ اگر محض دعوے اور بیان کی رو سے کسی کی کسی بھی چیز پر حق، ثابت ہو جایا کرے تو دنیا سے امان اُٹھ جائے اور لوگوں کا جینا دوبھر ہو جائے۔ ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ ہو جاؤ قائم رہنے والے انصاف پر۔ قوامین قوام کی جمع ہے جس کا معنی قائم رہنے والا، نگرانی کرنیوالا یا حفاظت کرنے والا ہوتا ہے، قسط اور عدل دونوں انصاف کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انصاف کے قانون کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور انصاف کا زیادہ تر دارو مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا شُهَدَآءَ لِلّٰهِ اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ۔ مالک الملک، قادر مطلق، علیم کل اور معبود برحق چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے لہٰذا اس کی رضا جوئی کے لیے سچی اور ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔ اور اس معاملے میں کسی اپنے یا بیگانے کی رورعایت نہ رکھو۔ گواہی صحیح وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اگرچہ یہ تمہارے نفسوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، یعنی ایسا کرنے میں تمہارا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو اَوِ الْوَالِدَيْنِ یا تمہارے والدین کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وَالْاَقْرَبِيْنَ یا تمہارے قرابتداروں اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو گواہی بہرحال سچی دو اور حق و انصاف کے دامن کو نہ چھوڑو اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا وہ خواہ غنی ہے، صاحب حیثیت ہے یا فقیر اور محتاج، گواہی کے معاملہ میں کسی قسم کی رعایت کی اجازت نہیں فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا

تمہاری نسبت خدا ان دونوں فریقین کے ساتھ زیادہ مہربان ہے۔ وہ کسی کو جائز حق سے محروم نہیں رکھتا۔ اگر ان میں سے کسی فریق کی امداد کی ضرورت ہوگی تو اللہ تعالیٰ خود اس کے اسباب پیدا فرما دیگا۔ تم ان کی ہمدردی کی وجہ سے گواہی میں کمی بیشی نہ کرو۔ اسلام میں قانونِ شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی پر فیصلے کا دارومدار ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" گواہی کو مت چھپاؤ۔ شہادت کو چھپانے والا سخت گنہگار ہے۔ کسی شخص پر ظلم ہوتا دیکھ کر دوسرا شخص خاموش رہے تو وہ خود مجرم بن جائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا بہترین گواہ وہ ہے جو بغیر مطالبہ کے ٹھیک گواہی دے دے، اور بدترین گواہ وہ ہے جس سے شہادت دینے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ جھوٹی گواہی دے دے۔ اسی لیے سچی شہادت دینے کی ترغیب دی گئی ہے اور جھوٹی گواہی کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ بہرحال حق و انصاف کے تقاضا کے پیش نظر فرمایا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا انصاف کے مقابلہ میں اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو بلکہ ہمیشہ انصاف کو ملحوظِ خاطر رکھو تاکہ کسی فریق کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے۔ فیصلے کا مدار شہادت پر ہے۔ اگر شہادت درست ہوگی تو فیصلہ بھی درست ہوگا اور اور اگر گواہی ہی غلط اور جھوٹی ہوگی، تو معاشرے میں انصاف کیسے قائم کیا جاسکتا ہے۔ انصاف کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ قانون پر عملدرآمد کا فقدان ہے قانون تو بنتے رہتے ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی قانون دیکھ رہے ہیں کئی قسم کی پولیس بھی موجود ہے کہیں سول پولیس ہے۔ کہیں ملٹری پولیس، کہیں سیکورٹی پولیس ہے اور کہیں خفیہ پولیس، مگر قانون پر عمل درآمد کہاں تک ہو رہا ہے ہر طرف رشوت اور اقربا پروری کا دور دورہ ہے، انصاف کہاں نصیب ہوگا اور دنیا کو چین کب حاصل ہوگا۔ صریح قتل ہو رہے ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، چوری کی وارداتیں ہیں مگر مجرموں کو کیفر کردار تک کیوں نہیں پہنچایا جا رہا۔ لاکھ دو لاکھ روپے رشوت دیکر قاتل کو چھڑا لو۔ چور کو بری کرا لو۔ عدالتوں میں صحیح شہادت پیش نہیں ہوتی اور جج صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے۔ اور اگر کوئی مقدمہ پایہ تکمیل تک پہنچ ہی جاتا ہے تو اس پر عمل درآمد کہاں تک ہوتا ہے یہ سب ناانصافی کی باتیں ہیں ایک عدالت کا فیصلہ دوسری عدالت بدل

دیتی ہے اور دوسری کا فیصلہ تیسری عدالت میں منسوخ ہو جاتا ہے تو مظلوم کو انصاف کہاں ملے گا، اس کی مشکلات کا حل کہاں سے میسر ہوگا اور دنیا امن کا گہوارہ کیسے بنے گی؟ فرمایا شہادت کے معاملہ میں نہایت احتیاط سے کام لو وَاِنْ تَلْوٗۤا اگر تم زبان کو موڑو گے اَوْ تُعْرِضُوْا یا اعراض کرو گے، مطلب یہ کہ شہادت کو توڑنے موڑنے کے لیے اپنی زبان کو اس طرح مت حرکت دو کہ اس سے معانی تبدیل ہونے کا احتمال ہو اور شہادت ہی غلط ہو جائے نیز یہ کہ شہادت کی ادائیگی سے گریز بھی نہ کرو۔ اگر شہادت مکمل نہیں ہوگی جج کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم شہادت کے معاملہ میں زبان کو پھیرو گے یا اعراض کرو گے۔ اور گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی واقعہ کی گواہی دے جس کے تئیں اسے مکمل آگاہی اور معرفت ہو۔ ایسے امور سے متعلق گواہی نہ دے جس کے بابت اسے خبر ہی نہ ہو۔ مطلب یہ کہ جس واقعہ سے متعلق درست معلومات یا عینی رویت ہو اسی واقعہ سے متعلق گواہی پیش کی جائے ورنہ خاموش رہا جائے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام سے باخبر ہے اگر تم گواہی دیتے وقت کج زبان استعمال کرو گے یا جان بوجھ کر شہادت کو چھپاؤ گے، یا گواہی دینے سے اعراض کرو گے تو خود مجرم بن جاؤ گے۔ سچی گواہی نہ دینا بذات خود ظلم کی حمایت کرنا ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو خدا تعالیٰ تو بہر حال تمہاری نیتوں اور ارادوں تک کو جانتا ہے۔ وہ خود تم سے نمٹ لے گا۔

تو ظاہر ہوا کہ مدعی اپنے دعوے کے ثبوت، یا اپنے کسی حق کو ثابت کرنے کے لیے حاکم اسلام کی مجلس میں ایسے اشخاص کو پیش کرے جو اس کے دعوے کی تصدیق کریں۔ لفظ شہادت کے ساتھ کسی کی تصدیق کرنے یا سچی خبر دینے کو شہادت یا گواہی کہتے ہیں۔ پھر چوں کہ شہادت بھی شرعاً ایک خاص اعزاز و منصب ہے۔ اس لیے ہر کس و ناکس نہ اس شہادت کا اہل ہے اور نہ ہی کوئی ایرا غیرا گواہی کے لیے موزوں۔ اس کے اہل وہی ہیں جن کی سیرت و کردار پر معاشرے کو اطمینان ہو اور جو اپنے اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابل اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔ جن کی بات پر اعتبار کیا جاتا ہو اور جن کی دیانت کم از کم عام طور پر مشتبہ نہ ہو۔ قرآن کریم میں

ارشاد ہوا: ایسے گواہ جن کو پسند کرو اور ظاہر ہے کہ ایک مسلمان، ایسوں ہی کو گواہ بنانا اور اس کی گواہی کو قبول کرنا پسند کرے گا جو اُس کے نزدیک متقی، عادل اور قابل اعتبار ہوں اور جن کے صالح ہونے پر اُسے اعتماد ہو، اور جو عاقل، بالغ، آزاد اور دین دار ہوں۔ اسلام نے مسلمان عورتوں کو بھی یہ حق دیا اور عورت کی گواہی کو مشروط قابل قبول مانا۔ شریعتِ مطہرہ کے مطابق جب مدعی گواہوں کو طلب کرے تو انہیں گواہی چھپانا جائز نہیں۔ مدعی کے طلب کرنے پر گواہی دینا لازم ہے۔ بل کہ اگر گواہ کو اندیشہ ہو کہ اگر میں نے گواہی نہ دی تو صاحبِ حق کا حق تلف ہو جائے گا یعنی اُسے معلوم ہی نہیں ہے کہ فلاں شخص معاملے کو جانتا ہے تو اُسے گواہی کے لیے کیسے طلب کرے گا۔ اس صورت میں بغیر طلب بھی گواہی دینا لازم ہے۔ البتہ حدود میں یعنی حدود کی گواہی میں دو پہلو ہیں ایک ازالہ مُنکر یعنی بُرائی کا ازالہ اور رفع فساد کہ معاشرہ میں فساد برپا نہ ہو اور دوسرا مسلمان کی پردہ پوشی۔ اس لیے حدود کی گواہی میں گواہ کو اظہار و اخفاء کا اختیار ہے کہ پہلی صورت اختیار کرے اور گواہی دے تا کہ مجرم اپنی سزا کو پہنچے یا پھر دوسری صورت زیادہ بہتر ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا جو مسلمان کی پردہ پوشی کرے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا و آخرت میں اُس کی ستاری کرے گا۔ (اور اُس کے جرم پر پردہ ڈال دے گا)

ہاں جس پر جُرم ثابت ہو چکا وہ بے باک و بدلحاظ ہو، حدود شرعیہ کی محافظت نہ کرتا ہو اور مسلمان اس کے کرتوتوں سے نالاں ہوں اور اس کی غلط روی سے دوسروں کے اخلاق و عادات اور کردار کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلی صورت اختیار کرے تا کہ لوگ اس کی شرارتوں اور بد کرداریوں سے محفوظ رہیں۔ ایسے ہی چوری میں مال لینے کی شہادت دینا واجب ہے تا کہ جس کا مال چوری ہو گیا ہے اُس کا حق تلف نہ ہو۔ اتنی احتیاط کر سکتا ہے کہ چوری کا لفظ نہ کہے۔ اتنا کہنے پر اکتفاء کرے کہ اُس نے فلاں شخص کا مال لیا یہ نہ کہے کہ چوری کی۔ اس طرح احیاءِ حق بھی ہو جاتا ہے اور پردہ پوشی بھی۔ (درمختار، ردالمحتار وغیرہ)

جھوٹی گواہی کا وبال

حدیث پاک میں ہے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: جھوٹی گواہی بُت پُوجنے کے برابر

کی گئی۔ جھوٹی گواہی بُت پرستی کے برابر کی گئی۔ جھوٹی گواہی، شرک کے برابر کر دی گئی۔ تین بار یہ فرما کر حضور اکرم ﷺ نے یہ آیت اُس کی سند میں پڑھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹی بات سے بچو۔ اللہ تعالیٰ کے لیے باطل سے حق کی طرف مائل ہو جاؤ۔ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ (ترمذی، ابن ماجہ وغیرہما) حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جھوٹے گواہ کے پاؤں جگہ سے ہٹنے نہ پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم واجب کر دے گا۔ (ابن ماجہ) اور بیہقی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ فرمایا: جو شخص لوگوں کے ساتھ یہ ظاہر کرتے ہوئے چلا کہ یہ بھی گواہ ہے، حالاں کہ یہ گواہ نہیں۔ وہ بھی جھوٹے گواہ کے حکم میں ہے اور جو بغیر جانے ہوئے کسی کے مقدمے کی پیروی کرے، وہ اللہ کی ناخوشی میں ہے۔ جب تک اُس سے جدا نہ ہو جائے۔ اور ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو گواہی کے لیے بلایا گیا اور اُس نے گواہی چھپائی یعنی ادا کرنے سے گریز کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا جھوٹی گواہی دینے والا۔ (طبرانی)

جن افراد کی گواہی شرعاً مقبول و معتبر نہیں

البتہ اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ مندرجہ ذیل افراد کی گواہی شرعاً مقبول و معتبر نہیں۔ ☆ کافر کی گواہی مسلم کے خلاف اور مرتد کی گواہی اصلاً مقبول نہیں۔ ☆ دو لوگوں میں دنیاوی عداوت ہو تو ایک کی گواہی دوسرے کے خلاف۔ ☆ جو شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب یا صغیرہ پر اصرار کرتا ہو کہ وہ اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ☆ بچے کی گواہی اور ایسے لوگوں کی گواہی جو دنیاوی باتوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ ☆ جس پر حد قذف قائم کی گئی ہے۔ ☆ جس کا جھوٹا ہونا مشہور ہے یا جھوٹی گواہی دے چکا ہے۔ ☆ زوج و زوجہ میں سے ایک کی گواہی دوسرے کے حق میں اور اگر ایک دوسرے کے خلاف ہوں تو مقبول ہو جائے گی۔ ☆ اولاد کی گواہی ماں باپ، دادا دادی کے حق میں اور اُن کی گواہی اولاد کے حق میں۔ ☆ کسی کاری گر کے پاس کام سیکھنے اور اس کی کفالت میں رہنے والوں کی گواہی، اُستاد کے حق میں۔ ☆ گویّے، گانے والی یا بطور پیشہ نوحہ کرنے والی عورت۔ ☆ جو کثرت سے قسم کھاتا یا اپنے بچوں کو یا دوسروں کو گالی دینے کا عادی ہو۔ ☆ جس کا

پیشہ دلالی ہو کہ کثرت سے جھوٹ بولتا ہے۔☆ تھانے کچہری کا پیشہ کرنے والے جو خود جھوٹ بولتے اور دوسروں کو تلقین کرتے ہیں، کی گواہی بھی قابل قبول نہیں۔☆ مُرغ بازی، کبوتر بازی اور دوسرے ایسے ہی کھیل کود میں وقت گنوانے والے۔☆ جو شخص گناہ و حرام کی مجلس میں بیٹھتا ہے اگرچہ وہ خود اس حرام کا مرتکب نہیں۔☆ سود خور، جواری، علی الاعلان شطرنج کھیلنے والا۔☆ بغیر عذر شرعی نماز روزہ قضا کرنے والا یا جماعت ترک کرنے والا۔ جب کہ کوئی عذر شرعی نہ ہو۔☆ حقیر و ذلیل افعال میں گرفتار و مشغول رہنے والا۔ مثلاً راستے میں پیشاب کرنا۔ راستے یا بازاروں میں کوئی چیز لوگوں کے سامنے کھانا، صرف پاجامہ یا تہ بند پہن کر، بغیر کرتا پہنے یا بغیر چادر اوڑھے عام گزرگاہ پر چلنا۔ لوگوں کے سامنے پاؤں دراز کر کے بیٹھنا، ننگے سر ہو جانا جہاں اس کو خفیف الحرکتی، بے ادبی و بدشرمی تصور کیا جاتا ہو، وغیرہا۔☆ جو شخص بزرگان دین، پیشوایانِ اسلام مثلاً صحابہ و تابعین، وائمہ اہل بیت اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین، خصوصاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کرب و بلا اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم کو بُرے الفاظ سے علانیہ یاد کرتا ہو، اس کی گواہی بھی مقبول نہیں۔ ان ہی بزرگان دین سلف صالحین میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ (درمختار۔ ردالمحتار، عالمگیری) اللہ تعالیٰ ہمیں سچی گواہی دینے والا مسلمان بنائے۔ آمین

☆☆☆

ضروریات دین پر ایمان لانا ضروری ہے
اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا کی تحقیق وتشریح

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ
وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۳۶﴾

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مفہوم اور اس کی حقیقت

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْٓا	ایمان لائے ہو!
اٰمِنُوْا	تم ایمان لاؤ	بِاللّٰہِ	اللہ کے ساتھ
وَرَسُوْلِہٖ	اور اس کے رسول کے ساتھ	وَالْکِتٰبِ	اور اس کتاب کے (ساتھ)
الَّذِیْ نَزَّلَ	جو اس نے نازل کی	عَلٰی رَسُوْلِہٖ	اپنے رسول پر
وَالْکِتٰبِ	اور اس کتاب کے (ساتھ)	الَّذِیْٓ اَنْزَلَ	جو اس نے نازل کی
مِنْ قَبْلُ	پہلے (اس سے)	وَمَنْ یَّکْفُرْ	اور جو کوئی کفر کرے
بِاللّٰہِ	اللہ کے ساتھ	وَمَلٰٓئِکَتِہٖ	اور اس کے فرشتوں (کے ساتھ)
وَکُتُبِہٖ	اور اس کی کتابوں (کے ساتھ)	وَرُسُلِہٖ	اور اس کے رسولوں (کے ساتھ)

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اور یوم آخرت (کے ساتھ)	فَقَدْ ضَلَّ	تو تحقیق وہ گمراہ ہوگیا
ضَلٰلًا	گمراہ ہونا	بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾	دور کا

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ اے ایمان والو اللہ پر ایمان لاؤ۔ یہاں پر اٰمَنُوْٓا اور اٰمِنُوْا دو لفظ اکٹھے ہیں اور یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان والوں کو خطاب کر کے پھر انہی سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اٰمَنُوْٓا سے عام مومنین مراد ہیں، خواہ وہ مخلص ہوں یا غیر مخلص اور اٰمِنُوْا کا حکم صرف غیر مخلص مومنوں سے ہے جو ابھی تک اپنے ایمان میں خلوص پیدا نہیں کر سکے بلکہ ڈانوں ڈول ہیں۔ کبھی ایمان کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف۔ منافقین جو محض زبان سے ایمان کے دعویدار ہیں اور دل میں ایمان کیخلاف بغاوت ہے اور جس کے نتیجے میں اسلام کے خلاف ظاہری اور باطنی تدبیریں کرتے رہتے ہیں، وہ بھی اس خطاب کے مخاطبین ہیں اور انہیں حکم دیا جارہا ہے کہ گومگو کی کیفیت کو چھوڑ کر ایمان کو مکمل طور پر اختیار کرلو۔ تاہم عام مفسرین کا خیال یہ ہے کہ اس خطاب کے مخاطبین میں تمام اہل ایمان شامل ہیں اور اٰمَنُوْٓا کا مطلب یہ ہے کہ اے لوگو جو ایمان لاچکے ہو، اس ایمان پر مداومت اختیار کر۔ اور اس میں کسی قسم کا خلل نہ آنے دو۔ ظاہر ہے کہ ایمان لانے کے بعد جب کوئی شخص، کفر، شرک، نفاق یا الحاد کی کوئی بات کرتا ہے تو اس کے ایمان میں خلل آتا ہے۔ اسی خلل کو دور کرنے کے سلسلہ میں حضور ﷺ کا امت کے نام فرمان ہے جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی کلمہ طیبہ کا اعادہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کرلیا کرو۔ اسی کلمہ کو حضور ﷺ نے افضل الذکر بھی فرمایا ہے کہ یہ تجدید ایمان کا ذریعہ ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص غیر اللہ کے نام کی قسم اٹھائے فَلْیَقُلْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اسے فوراً لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ کر اپنی غلطی کا تدارک اور ایمان کی تجدید کر لینی چاہئے۔ ایمان میں اکثر خرابی آتی رہتی ہے کافر، مشرک تو ویسے ہی ایمان سے خالی ہیں، مگر ایمان کے دعویداروں میں سے بھی ایک قلیل تعداد ایسی ہے جو ایمان کے ساتھ صحیح طور پر متصف ہے، وگرنہ اکثریت کے ایمان میں خلل موجود ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے

تاکیداً فرمایا کہ اے ایمان والو، ایمان لاؤ یعنی اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرو اس سے خلل کو دور کرو اور اس پر مداومت اختیار کرو۔

فرمایا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ ایمان پر ایمان لاؤ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لاؤ۔ اور ذات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی ہیں۔ صفات پر ایمان لانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ذات پر ایمان لانا چنانچہ ایمان کے متعلق بچوں بڑوں سب کو پڑھایا جاتا ہے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَآئِہٖ وَصِفَاتِہٖ یعنی میں ایمان لایا اللہ کے ساتھ جیسا کہ اس کے اسمائے پاک ہیں اور جن صفات کے ساتھ وہ متصف ہے، میں ان سب پر ایمان لایا۔ اسی لیے حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جب شیطان تمہارے دل میں وسوسہ اندازی کرے اور تمہارے ایمان میں خلل اندازی کا خطرہ ہو تو فوراً کہہ دیا کرو اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ یعنی میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ اللہ تعالیٰ کمال صفات کا مالک ہے، وہ تمام صفات حسنہ کے ساتھ متصف ہے۔ اللہ کا ذاتی نام تو ایک ہی ہے اور رحمان، رحیم کریم، قدوس، جبار، وہاب وغیرہ اس کے صفاتی نام ہیں جو اس کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ہر صفت کسی نہ کسی تجلی کی مظہر ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح اس کی صفات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ الحاصل! دلی سکون صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے میسر ہوتا ہے، اور ایمان نہ رکھنے والا دل سدا ڈر و خوف میں مبتلا رہتا ہے، کمزوری اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے، اور کبھی اس کو قرار نہیں ملتا ہے۔ وہ ایمان جس سے انسان کو نجات ملتی ہے وہ اللہ کی ذات پر یقین ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ سچے دل کے ساتھ یہ یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پروردگار ہے، وہی اس کا مالک و خالق ہے، وہی تنہا اس بات کا مستحق ہے کہ اسی کے لئے نماز و روزہ رکھا جائے، دعاء و دواء کے لئے اسی کو پکارا جائے، امید و بیم اور خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کی جائے۔ وہی ساری باکمال صفات سے متصف ہے، اور ہر کمی و عیب سے پاک ہے۔

ایمان بالرسول کا مفہوم

فرمایا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ ایمان بالرسول سے

مراد اللہ تعالیٰ کے تمام برگزیدہ انبیاء علیہم السلام اور رسولوں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ان پر دل سے اس بات کا یقین کرنا ہے کہ انہوں نے اللہ کا پیغام انسانوں تک بالکل سچائی کے ساتھ پہنچایا، تمام انبیاء علیہم السلام پر مجموعی طور پر ایمان لانا اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو بالخصوص اور کامل طور پر تسلیم کرنا اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ آپ ﷺ کو آخری نبی اور رسول ماننا اس عقیدے کا لازمی حصہ ہے۔ رسول وہ انسان ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ شریعت کے احکام پہنچانے کے لیے لوگوں کی طرف مبعوث کرتا ہے۔ رسول کی خصوصیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ نبی کے مقابلہ میں خاص ہوتا ہے۔ ہر انسان جس پر اللہ کی جانب سے وحی نازل ہوتی ہے، وہ نبی ہوتا ہے اور معصوم ہوتا ہے۔ البتہ رسول وہ ہوتا ہے جس پر وحی تو بہر حال نازل ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ اسے کتاب یا مستقل شریعت بھی دی جاتی ہے۔ اور سب سے آخری نبی اور رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں جن کے متعلق فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی آپ اللہ کے رسول اور سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول دنیا میں آئے، جن میں سے تین سو پندرہ رسول اور باقی سب نبی تھے۔ اور نبی کے لیے مستقل شریعت کا ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ پہلے سے نازل شدہ شریعت کی ہی تبلیغ کرتا ہے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہزاروں ایسے گزرے ہیں جو صرف تورات کی تبلیغ کرتے رہے، وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے۔ جسے نئی شریعت کتاب یا صحیفہ ملتا ہے، وہ رسول کہلاتا ہے۔

ایمان بالکتب سے مراد

فرمایا وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ اور اس کتاب پر بھی ایمان لاؤ جسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا۔ الکتب سے مراد جنس کتاب ہے اور مقصد یہ ہے کہ جتنی بھی کتابیں نازل ہوئی ہیں سب پر ایمان لاؤ۔ مفسرین کرام امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے جن میں سے چار عظیم کتابیں تورات، زبور، انجیل اور قرآن ہیں اور باقی صحیفے ہیں، ان میں سے اتنالیس صحیفے موجودہ بائبل میں شامل ہیں۔ بہر حال صحائف میں

حضرت یونس (علیہ السلام) حضرت سلیمان (علیہ السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) وغیرہم کے صحیفے ہیں۔ جن میں کچھ صحیح اور کچھ غلط ہیں کیونکہ اہل کتاب کہلانے والوں نے ان میں تغیر وتبدل کر دیا ہے۔ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ سے مراد قرآن پاک سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتب اور صحائف ہیں۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض پر کتابیں اور بعض پر صحائف اتارے، ان تمام صحیفوں اور کتابوں (یعنی ان کے منزل من اللہ ہونے) پر ایمان لانا ایمان بالکتب ہے۔ اس بات پر بھی یقین رکھنا کہ تورات، زبور اور انجیل اپنی اصل شکل میں اللہ کی طرف سے حق تھیں، مگر وقت کے ساتھ ان کے اندر انسانی تحریف (تبدیلی) ہو چکی ہے یہ اسلام کے بنیادی عقائد اور ارکانِ ایمان میں سے تیسرا اہم رکن ہے۔

ایمان بالملائکہ کا مفہوم

ملائکہ "مَلَك" سے مشتق ہے، اس کی جمع ملائکہ اور ملائک ہے، اس کے لغوی اور لفظی معانی مالک ہونا، فرشتہ، ملکیت اور اقتدار ہیں، اس کے علاوہ اس میں تصرف، قدرت اور امر کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ لفظ ملائکہ آسمانی ارواح کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی امر یا کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے، اس وجہ سے ان کو ملائکہ کہتے ہیں۔ ایمان بالملائکہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر پختہ یقین رکھنا ہے، جو کہ اسلام کے بنیادی عقائد (ایمانیات) میں سے دوسرا اہم ترین عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ انسان زبان اور دل سے اس بات کا اقرار کرے کہ فرشتے اللہ کی ایک نورانی مخلوق ہیں، جو ہر وقت اس کی عبادت اور احکامات کی تعمیل میں مصروف رہتی ہے۔ فرشتے نہ مرد ہیں اور نہ عورت، انہیں نہ بھوک لگتی ہے اور نہ پیاس۔ وہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہیں۔ وہ اللہ کے احکامات کی نافرمانی نہیں کر سکتے اور وہی کام کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف فرشتوں کے ذمے کائنات کے الگ الگ نظام اور ڈیوٹیاں لگائی ہیں۔ چار مشہور فرشتے اور ان کے فرائض: حضرت جبرائیل علیہ السلام: انبیاء کرام تک اللہ کا

پیغام (وحی) پہنچانا حضرت میکائیل علیہ السلام: بارش برسانا اور مخلوق تک رزق پہنچانا۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام: قیامت کے دن سور (پھونک) مارنا۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام: مخلوقات کی روح قبض کرنا (ملک الموت)۔ بہرکیف! فرشتے اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے مقبول بندوں تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ وہ لطیف اور نورانی مخلوق ہیں اور عام انسان انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ بعض کم فہم لوگ فرشتوں کے خارجی وجود کا انکار کرتے ہیں اور ان قرآنی آیات کی تلاوت جن میں فرشتوں کا ذکر ہے مجرد قوتوں کے طور پر کرتے ہیں۔ یہ سب تصورات گمراہی پر مبنی ہیں۔ فرشتے احکام الٰہی کی تعمیل کرنے والی معزز مخلوق ہے۔ ان کے وجود اور ان سے متعلقہ تفصیلات کو ماننا ایمان بالملائکہ کہلاتا ہے۔ فرمایا وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور یوم آخرت کا انکار کرے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات حد درجہ بلند و بالا ہے اس نے اپنا فیض انسانوں تک پہنچانے کے لیے فرشتوں کو مقرر کیا ہے۔ اللہ کا پیغام فرشتے ہی بنی نوع انسان تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ جو شخص فرشتوں کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ وہ بھی ایماندار نہیں۔ پرویز اور مشرقی وغیرہ منکرین ملائکہ میں سے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان کی اچھی صفت کا نام ملائکہ اور غضبی قوت کا نام شیطان ہے۔ اس قسم کی ملحدانہ تاویلیں انکار ملائکہ پر مبنی ہیں اور ایسے شخص کے کفر پر دلالت کرتی ہیں۔ فرشتے اللہ کی لطیف مخلوق ہیں، ان کے اجسام ہیں جن میں روحیں ہیں، ان میں ادراک کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اور ان کو بالفعل کمال حاصل ہے۔ اسی طرح شیطان کا بھی وجود ہے ان میں سے ہر ایک کا جسم اور روح ہے، وہ بھی ادراک و شعور رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر قرآن پاک میں صراحتاً موجود ہے۔ لہٰذا ان کے انکار پر مبنی تاویلیں کرنے والا ملحد اور کافر شمار ہوگا۔

ایمان بالآخرت کا مفہوم و مطلب

فرمایا وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جس نے آخرت کے دن یعنی قیامت کا انکار کیا، وہ بھی منکرین کے گروہ میں شامل ہوگیا آخرت پر ایمان لانا بھی جزو ایمان ہے۔ اس کے بغیر انسان مومن نہیں ہوسکتا

بلکہ کافر ہی رہے گا اگر چہ وہ باقی چیزوں پر ایمان لے آئے۔ قیامت کا دن جزائے عمل کا دن ہے۔ اس دنیا میں کیے گئے ہر کام کی جزا یا سزا کے لیے ایک دن مقرر ہے۔ اگر اس کا انکار کر دیا جائے تو دین کی ساری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ جزا و سزا کا تصور ہی انسان کو احکام الٰہی پر عمل کی ترغیب دیتا ہے جب اسی پر ایمان ختم ہو گیا تو اوامر و نواہی کا تمام تصور ختم ہو گیا، لہٰذا قیامت پر ایمان لانا بھی ضروری ٹھہرا۔ یعنی ہر شخص کو موت کے بعد قیامت کے دن زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے جس کے نتیجے میں وہ جہنم یا جنت (کی صورت میں سزا و جزا) سے ہمکنار ہو گا۔ اس زندگی کا نام اخروی زندگی ہے اور اس زندگی پر ایمان لانے کا نام ایمان بالآخرت ہے۔

اس آیت میں ایمان کا لفظ دو معنوں میں یا ایمان کے دو مختلف درجوں میں استعمال ہوا ہے اٰمَنُوْٓا کا مطلب یہ ہے، لوگو جو تم مومنوں کی جماعت میں شامل ہو چکے ہو۔ اور اٰمِنُوْا کا مطلب یہ ہے کہ خلوص نیت سچے دل اور پختہ عزم اور سنجیدگی کے ساتھ ایمان لاؤ اور اپنی سوچ، اپنے عمل، اپنے رویہ، اپنے نظریات، اپنے مذاق، اپنے کردار، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی اغراض، اپنی جدوجہد غرض ہر چیز کو اس عقیدے کے مطابق بناؤ جس پر تم ایمان لائے ہو۔ تب ہی تم میں انصاف پر قائم رہنے کی صفت پیدا ہو سکے گی۔ قرآن سے پہلے کی نازل شدہ کتاب یا کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ فی الواقع وہ کتاب بھی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ مواد ان میں آج کل پایا جاتا ہے وہ سب کچھ منزل من اللہ ہے۔ الغرض! یہاں پر تمام اجزائے ایمان کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا جس نے کفر کیا اللہ کے ساتھ، اس کے فرشتوں کے ساتھ اس کی کتابوں اور رسولوں کے ساتھ اور جس نے قیامت کے دن کا انکار فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ وہ شخص گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں دور جا پڑا۔ مطلب یہ کہ ایمانیات کا انکار کرنے والے کا صلہ یہ نکلا کہ وہ اصل راستے سے بھٹک کر دور چلا گیا۔ اس آیت میں اور اسی طرح دیگر متعدد آیات میں ایمان بالغیب کے پانچ اجزا کا ذکر آیا ہے جو یہ ہیں اللہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، اس کے فرشتوں پر اور آخرت کے دن پر بن دیکھے ایمان لایا جائے۔ یعنی ان پر پختہ یقین رکھا جائے۔ ایمان بالغیب کا

چھٹا جزو تقدیر پر ایمان ہے یعنی ہر طرح کی بھلائی اور برائی اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ عقیدہ بھی قرآن ہی کی متعدد آیات سے مستنبط ہے۔ اگرچہ اس آیت میں مذکور نہیں۔

ضروریاتِ دین پر ایمان ان تمام چیزوں کو جو نبی کریم اسے قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں، ضروریات دین کہا جاتا ہے۔ مومن کے لئے ان تمام ضروریات دین پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کے انکار سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ضروریاتِ دین بہت ساری ہیں، مثلاً: اللہ کی توحید اور اس کی صفات پر ایمان لانا، فرشتوں، آسمانی کتابوں، اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں، قیامت، تقدیر، موت کے بعد زندہ اٹھائے جانے پر ایمان لانا، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد وغیرہ ارکان اسلام کی فرضیت کا قائل ہونا، سود، زنا، جھوٹ اور فرائض اسلام کی عدم ادائیگی کی حرمت کا قائل ہونا وغیرہ۔ ضروریاتِ دین بعض تفصیل کے ساتھ بتلائی گئی ہیں اور بعض اجمالاً۔ جو ضروریاتِ دین تفصیلاً بتلائی گئی ہیں ان پر تفصیلاً ایمان لانا ضروری ہے، مثلاً نماز پر اس کے متعلق بتلائی گئی ہیئت وکیفیت سمیت ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت کا تو قائل ہے، لیکن اس تفصیل کے ساتھ قائل نہیں جو بتلائی گئی ہے تو وہ مومن نہیں۔ اور جو ضروریات اجمالاً بتلائی گئی ہیں، مثلاً: فرشتوں پر ایمان لانا، سابقہ آسمانی کتابوں پر ایمان لانا وغیرہ تو ان پر اجمالاً ایمان لانا کافی ہے۔ حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ جو مسلمان ہے وہ مومن بھی ہے اور جو مؤمن ہے وہ مسلمان بھی ہے۔ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: تصدیق قلبی جب پھوٹ کر جوارح پر نمودار ہو جائے تو اس کا نام اسلام ہے اور اسلام جب دل میں اتر جائے تو ایمان کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ (فیض الباری، ج:۱،ص:۶۹) ایمان کا تعلق ان چیزوں سے ہے جن کی تصدیق کی جاتی ہے، یعنی اعتقادات سے۔ اسلام کا تعلق ان چیزوں سے ہے جنہیں عملی طور پر بجالایا جاتا ہے، یعنی اعمال ظاہرہ: نماز، روزہ، وغیرہ سے۔ لیکن قرآن وحدیث میں ان کا آپس میں ایک دوسرے پر اطلاق بھی کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً دونوں کا مصداق تقریباً ایک ہی ہے یا دونوں ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل یا غیر معتبر ہے۔ اہل

سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ایمان اسلام سے الگ نہیں ہے، اور اسلام ایمان میں سے ہے، جو مؤمن ہوگا وہ مسلمان بھی ہوگا اور جو مسلمان ہوگا وہ مومن بھی ہوگا، اگر چہ لغۃً ایمان اسلام کا غیر ہے، جیسے پیٹ پیٹھ کے بغیر متصور نہیں ہے، اور پیٹھ پیٹ کے بغیر متصور نہیں ہے، اگر چہ وہ دونوں ایک دوسرے کے غیر ہیں۔ پس ایمان تصدیق کا نام ہے اور اسلام اتباع کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکی تصدیق کرنے والا ہے وہ مسلم ہے اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکا تابع دار ہے وہ مومن ہے۔ اور معتزلہ اور روافض کے نزدیک یہ دونوں الگ الگ ہیں''۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے اور ہر طرح کے فتنوں سے بچائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔

☆☆☆

نفاق اعتقادی کے دو اسباب اور نفاق عملی کے تین اسباب اور ان کا علاج

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ
اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ عَذَابًا
اَلِیْمَا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ط اَیَبْتَغُوْنَ
عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ﴿۱۳۹﴾

ایمان اور فکر کی بار بار تبدیلی

اِنَّ الَّذِیْنَ	بیشک وہ لوگ جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے
ثُمَّ کَفَرُوْا	پھر اُنہوں نے کفر کیا	ثُمَّ اٰمَنُوْا	پھر وہ ایمان لائے
ثُمَّ کَفَرُوْا	پھر انہوں نے کفر کیا	ثُمَّ ازْدَادُوْا	پھر وہ زیادہ ہو گئے
کُفْرًا	کفر میں	لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ	نہیں ہے اللہ
لِیَغْفِرَ لَھُمْ	کہ بخش دے ان کو	وَلَا	اور نہیں ہے
لِیَھْدِیَھُمْ	کہ ہدایت دے انکو	سَبِیْلًا ﴿۱۳۷﴾	راست کی۔

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے ثُمَّ کَفَرُوْا پھر انہوں

نے کفر کا راستہ اختیار کیا، جیسا کہ منافقین یا اہل کتاب کا شیوہ ہے۔ اہل کتاب حضرات عیسیٰ اور موسیٰ (علیہم السلام) ایمان لائے مگر جب حضور خاتم النبیین (علیہ السلام) کا زمانہ پایا تو صاف انکار کر گئے۔ یہ لوگ کافر ہی رہیں گے فرمایا ثُمَّ اٰمَنُوْا پھر ایمان لائے ثُمَّ کَفَرُوْا پھر انکار کر گئے یعنی ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد کسی نے کفر کیا مگر پھر ایمان لے آیا تو اس کی توبہ قبول ہے لیکن جو مستقل طور پر مرتد ہو گیا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ وہ خذلان کا شکار ہو گئے۔ (خذلان کا لغوی معنی کسی کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا، مدد اور اعانت سے ہاتھ کھینچ لینا، یا تنہا تنہا کر دینا ہے۔ اصطلاح میں خذلان کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو اس کے حال پر چھوڑ دینا تاکہ اسے نیکی اور اطاعت کی توفیق نہ ملے۔ توفیق الٰہی کا محروم رہ جانا خذلان کہلاتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان گناہوں کی طرف مائل ہوتا اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے) ایسے لوگ ایمان سے کھیلتے رہتے ہیں اور آخر کار ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں ایمان کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے اسی طرح اس آیت میں کفر کا لفظ بھی دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک یہ کہ سرے سے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہی نہ ہو اور ان سب امور مذکورہ کا انکار کر دے۔ دوسرے یہ کہ ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے مسلمانوں میں شامل تو ہو جائے لیکن جو اثرات اس عقیدہ کے اس کی طبیعت پر مرتب ہونا چاہیے تھے وہ نہ ہوں۔ نہ ہی وہ اپنے طریق زندگی کو شرعی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔ ایسا ایمان بھی کچھ فائدہ نہ دے گا اور یہ سراسر گمراہی ہے۔ ان سے مراد منافقین اور مرتدین کا گروہ ہے جو ہر وقت مذبذب ہی رہتے کہ جس طرف کا پلہ بھاری نظر آئے اس میں شامل ہو جائیں۔ ایسے لوگ ہوا کا رخ دیکھتے، حالات کا جائزہ لے کر اپنی خواہش نفس کے پیروکار ہوتے ہیں اور جتنی دفعہ بھی ہوا کا رخ بدلے اتنی دفعہ ہی ان کا ایمان اور کفر بدلتا رہتا ہے۔ ایسے ایمان کا چونکہ کچھ فائدہ نہیں ہوتا لہٰذا ان پر کفر ہی کی چھاپ مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف نہیں فرماتا کیونکہ وہ کفر پر پختہ ہو جاتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ

سچی تو بہت نزع کی حالت سے پہلے پہلے قبول ہے، اور معاف فرما دیتا ہے۔ مگر جو لوگ کفر میں اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا، ان کے متعلق فرمایا کہ ان کی معافی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿۱۶۸﴾ اور نہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے وہ ہدایت کے طالب ہی نہیں ہوتے۔ وہ کسی خود غرضی یا کسی کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے ایمان لاتے ہیں مگر جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر کفر کا راستہ پکڑ لیتے ہیں اور اس طرح دائمی محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لفظ بشارت کا طنزیہ استعمال

بَشِّرِ	خوشخبری دے دیجئے	الْمُنٰفِقِيْنَ	منافقوں کو
بِاَنَّ	اس بات کی کہ بیشک	لَهُمْ	ان کے لیے ہے
عَذَابًا	عذاب	اَلِيْمَا ﴿۱۳۸﴾	بہت دردناک عذاب۔

ارشاد ہوتا ہے بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ منافقوں کو بشارت سنا دیجئے، بشارت کا معنی عام طور پر خوشخبری ہوتا ہے اور یہ خوشی کے موقع پر دی جاتی ہے۔ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا کہ ان کے لیے ایک دکھ دینے والا عذاب تیار ہے۔ مگر یہاں پر تو عذاب الیم کی خبر دی جا رہی ہے۔ بشارت کا لفظ یہاں خاص طور پر منافقوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ منافق بدترین قسم کے لوگ ہوتے ہیں انہیں استہزاء کی شکل میں خطاب کیا گیا ہے۔ کہ ذرا انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ منافقوں کو اس امر کی خبر پہنچا دو کہ ان کے لئے دردناک عذاب یقینی ہے۔ عربی زبان میں جب کسی کو اس کے برے کرتوتوں پر سخت سزا سنانی ہو، تو کبھی کبھی طنز و تعریض کے طور پر خوشخبری کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں منافقین کے غرور اور ان کی خوش فہمیوں کو توڑنے کے لیے فرمایا گیا کہ تمہارے لیے ہمارے پاس جو تحفہ ہے، وہ دردناک عذاب ہے۔ نفاقِ اعتقادی کفر کا سب سے بڑا درجہ ہے، منافق اعتقادی کو کل بروزِ قیامت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ڈالا جائے گا جبکہ نفاق عملی گناہِ کبیرہ، حرام اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے۔

نفاقِ اعتقادی کے دو اسباب اور ان کا علاج

(1).....نفاقِ اعتقادی کا پہلا سبب جہالت ہے۔ جب بندہ صحیح طریقے سے عقائد، فرائض واجبات کا علم حاصل نہیں کرتا تو شیطان دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے تو بندہ نفاقِ اعتقادی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ عقائد، فرائض و واجبات کا تفصیلی علم حاصل کرے۔ (2).....نفاقِ اعتقادی کا دوسرا سبب بدعقیدہ لوگوں کی صحبت ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ بدعقیدہ لوگوں کی صحبت سے دور بھاگے اور یہ ذہن بنائے کہ اگر مجھے کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ یہ شخص چور ہے اور اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے میرا مال چوری ہونے کا اندیشہ ہے تو یقیناً میں ایسے شخص کے ساتھ کبھی بھی بیٹھنا گوارا نہ کروں گا یا بہت احتیاط کروں گا، لیکن بدعقیدہ لوگ تو ایسے چور ہیں جو میرا سب سے قیمتی خزانہ یعنی ایمان چرا سکتے ہیں تو میں ان لوگوں کی صحبت کیسے گوارا کروں؟ خبردار! ایمان سب سے بڑی دولت ہے اگر خدانخواستہ ایمان برباد ہو گیا تو کہیں کے نہیں رہیں گے۔ بدعقیدہ شخص کے سائے سے بھی دور بھاگیں، اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھیں، یقیناً انبیائے کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام، خصوصاً امام الانبیاء، حضور سید الاصفیاء صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی گستاخی کرنے والے، آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی پاکیزہ اور مبارک ذات میں عیوب تلاش کرنے والے، صحابہ کرام عَلَیْہِمُ الرِّضْوَان پر تبرا و بہتان تراشی کرنے والے، اہل بیت عظام کی شان میں زبان دراز کرنے والے، کسی بھی طرح مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے، ایسے لوگوں کی صحبت سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھیے، شیطانِ لعین کی اتباع کرنے والے ایسے لوگوں سے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی پناہ مانگئے۔ ایسے لوگوں کی صحبت اِختیار کیجئے جو انبیائے کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام، صحابہ کرام عَلَیْہِمُ الرِّضْوَان، اہل بیت کرام، اولیائے عظام رَحِمَہُمُ اللہُ السَّلَام سے محبت کرنے والے ہوں، ان کی شان بیان کرنے والے ہوں، بغض و عناد کے بجائے عشق و محبت کی باتیں کرنے والے ہوں۔ اِنْ شَآءَ اللہ عَزَّوَجَلَّ ان کی صحبت اختیار کرنے کی برکت سے ایمان کی حفاظت ہو گی۔

غیر مسلموں کے ساتھ ظاہری اور دلی تعلق کا حکم

الَّذِیْنَ	جولوگ	یَتَّخِذُوْنَ	بناتے ہیں
الْکٰفِرِیْنَ	کافروں کو	اَوْلِیَآءَ	دوست
مِنْ دُوْنِ	سوائے	الْمُؤْمِنِیْنَ	مومنوں کے
اَیَبْتَغُوْنَ	کیاوہ تلاش کرتے ہیں؟	عِنْدَھُمُ	ان کے پاس
الْعِزَّۃَ	عزت	فَاِنَّ الْعِزَّۃَ	چنانچہ بیشک عزت (تو)
لِلّٰہِ	اللہ ہی کے لیے ہے	جَمِیْعًا ⑬⑨	ساری (کی ساری۔

فرمایا منافقین وہ لوگ ہیں الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ جو مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں منافقوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ کبھی ادھر ساز باز کی کبھی ادھر، کبھی ایک رخ اختیار کیا کبھی دوسرا رخ، اُدھر کی بات اِدھر چلادی، ان کی کارگزاری ایسی ہی ہے۔ حالانکہ دوستی تو ہمیشہ مومنوں کے ساتھ ہونی چاہئے۔ ایک مومن کی دوستی کافر اور منافق کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ دونوں کا نصب العین مختلف ہے ان کی منزل مقصود جدا جدا ہے۔ اس مسئلے کو اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اہل ایمان منافقوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور رواداری سے تو پیش آسکتے ہیں مگر ان کے ساتھ دلی دوستی نہیں کرسکتے۔ اگر ایسا کریں گے تو ان کے اپنے ایمان میں خلل واقع ہونے کا خدشہ ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ مومنوں کے علاوہ منافقوں کو دوست نہ بناؤ۔ فرمایا اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ اے گروہ منافقین! کیا تم کفار کے پاس عزت کی تلاش میں جاتے ہو، عزت کا معنیٰ قوت اور غلبہ ہوتا ہے۔ عزیز اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جس کا معنیٰ قوت والا اور کمال قدرت کا مالک ہے۔ منافقوں کو فرمایا کیا تم کافروں کے ہاں عزت چاہتے ہو، بلکہ حقیقت حال یہ ہے فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ⑬⑨ ساری کی ساری عزت تو اللہ کے پاس ہے۔ العزیز تو خدا تعالیٰ ہے۔ تم عزت کی تلاش میں کہاں مارے مارے پھرتے ہو، اللہ تعالیٰ خود بندے کی زبان سے کہلاتے ہیں وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ اے مولا

کریم! تو ہی جسے چاہے عزت دے دے اور جسے چاہے ذلیل وخوار کر دے۔ اَلْمُعِزّ وَالْمُذِلّ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ وہ جسے چاہے غلبہ عطا کر دے اور جسے چاہے مغلوب کر کے رسوا کر دے۔ تو فرمایا عزت حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے لئے اس کے رسول کے لئے اور پھر اہل ایمان کے لئے ہے۔ عزت ایمان اور نیکی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے مگر منافق اس کی تلاش میں کافروں سے دوستی کرتے ہیں، انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کافروں کو دوست بنانے سے مراد ایسی دوستی ہے کہ مسلمان ان کی فکر اور تہذیب سے متاثر ہونے لگیں، جس میں ان کی وضع قطع اور طور وطریق کا اختیار کرنا بھی شامل ہے، حسنِ سلوک اور بہتر اخلاق کی حد تک غیر مسلموں سے دوستی میں کوئی حرج نہیں یعنی غیر مسلموں کے ساتھ حُسنِ اخلاق ونیک برتاؤ اور ظاہری خوش خُلقی سے پیش آنا درست ہے۔ اور اسلامی اخلاق سے متاثر کر کے غیر مسلم کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے اس کی اجازت ہے لیکن قلبی تعلق اور دلی دوستی کسی غیر مسلم کے ساتھ رکھنا جائز نہیں ہے اس برتاؤ کا حکم تو شریعت نے ہر انسان؛ بلکہ دوسری مخلوقات کے ساتھ بھی دیا ہے، اس آیت میں اشارہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے سہارے کبھی عزت و وقار حاصل نہیں ہوسکتا، جیسا کہ آج کل مسلم ممالک مغربی طاقتوں کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کافروں سے محبت اور دوستی رکھنا منافقوں کی علامت ہے خصوصاً مسلمانوں کے مقابلہ میں۔ ایسے سب لوگوں کے متعلق فرمایا جارہا ہے کہ کیا یہ لوگوں کے پاس جا کر عزت تلاش کرتے ہیں حالانکہ تمام عزتوں کا مالک اللہ عَزَّ وَجَلَّ ہے تو وہی خداوند کریم ہی عزت والا ہے اور اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی عطا سے وہ عزت والے جنہیں اللہ عَزَّ وَجَلَّ عزت دے جیسے انبیاء علیہم الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور مؤمنین۔ کیونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ سب ایک ہیں" اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ" کفر ایک ملت ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو کافروں کی دوستی سے بچنے کا حکم دینے کے ساتھ نہایت سخت وعید بیان فرمائی کہ جو ان سے دوستی کرے وہ انہی میں سے ہے، اس بیان میں بہت شدت اور تاکید ہے کہ مسلمانوں پر یہود ونصاریٰ اور دین اسلام کے ہر مخالف سے علیحدگی اور جدا رہنا واجب ہے۔ اور جو کافروں سے دوستی کرتے ہیں وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے

ہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت میں کفار کو کلیدی آسامیاں نہ دی جائیں۔ یہ آیتِ مبارکہ مسلمانوں کی ہزاروں معاملات میں رہنمائی کرتی ہے اور اس کی حقانیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ پوری دنیا کے حالات پر نظر دوڑائیں تو سمجھ آئے گا کہ مسلمانوں کی ذلت و بربادی کا آغاز تبھی سے ہوا جب آپس میں نفرت و دشمنی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر غیر مسلموں کو اپنا خیر خواہ اور ہمدرد سمجھ کر ان سے دوستیاں لگائیں اور انہیں اپنوں پر ترجیح دی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقلِ سلیم عطا فرمائے۔"

منافقوں کے مذکورہ بالا طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر آج دنیا کے حالات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ مرض آج کل بکثرت پایا جارہا ہے، اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں سے دوستیاں، مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے پیار، باہمی اتحاد سے عزت حاصل کرنے کی بجائے کفار کے قدموں میں بیٹھ کر عزت حاصل کرنے کی کوشش کرنا مسلمان قوم میں کس طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔

☆☆☆

شعائرِ دین کا مذاق ایک سنگین جرم
اور ہمارے معاشرے میں اس کی مروّجہ صورتیں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَاُ بِھَا
فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖٓ ۚ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ
جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَھَنَّمَ جَمِیْعَا ۙ﴿۱۴۰﴾ الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ ۚ فَاِنْ
کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ ۖ وَاِنْ کَانَ لِلْکٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ
قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ فَاللّٰہُ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ﴿۱۴۱﴾

شعائرِ دین کا مذاق اڑانا ایک سنگین جرم

وَقَدْ نَزَّلَ	اور تحقیق اُس نے نازل کیا	عَلَیْکُمْ	تم پر
فِی الْکِتٰبِ	کتاب میں	اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ	یہ کہ جب تم سنو
اٰیٰتِ اللّٰہِ	اللہ کی آیتیں	یُکْفَرُ	(کہ) کفر کیا جارہا ہو
بِھَا	اُن کے ساتھ	وَیُسْتَھْزَاُ	مذاق اڑایا جارہا ہو

بِهَا	اُن کے ساتھ	فَلَا تَقْعُدُوْا	تو نہ تم بیٹھو
مَعَهُمْ	ان کے ساتھ	حَتّٰى	یہاں تک کہ
يَخُوْضُوْا	وہ مشغول ہو جائیں	فِيْ حَدِيْثٍ	کسی اور بات میں
غَيْرِهٖٓ	اس کے علاوہ	اِنَّكُمْ	(ورنہ) بلاشبہ تم
اِذًا	اس وقت	مِّثْلُهُمْ	ان جیسے ہی ہو گے
اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ	جَامِعُ	جمع کرنے والا
الْمُنٰفِقِيْنَ	منافقوں کو	وَالْكٰفِرِيْنَ	اور کافروں کو
فِيْ جَهَنَّمَ	جہنم میں	جَمِيْعًا	سب کو۔

اس آیت میں غیرت دینی کا سبق دیا گیا ہے اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ تم پر یہ حکم نازل کیا وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ کہ اس نے کتاب یعنی قرآن پاک میں تمہارے لئے یہ حکم نازل فرمایا ہے اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا کہ جب تم اللہ کی آیات کے ساتھ کفر اور استہزا کو سنو فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں، ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ مقصد یہ ہے کہ جب کفار کی مجلس میں آیات الٰہی اور شعائر دین کا انکار کیا جا رہا ہو اور ان کے ساتھ ٹھٹا کیا جا رہا ہو تو ایسی مجلس میں ہرگز نہ بیٹھو کہ یہ غیرت اسلامی کے خلاف ہے اور اگر وہاں دین پر طعن و تشنیع کرنے کی بجائے کوئی دوسری بات ہو رہی ہو تو پھر تمہیں وہاں بیٹھنے کی اجازت ہے۔ فرمایا، یاد رکھو! اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾ یقین رکھو کہ اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے۔ اعتقادی منافقوں کا ٹھکانا لازماً جہنم ہے۔ ان کے دل ایمان سے خالی ہیں اور ان کا گٹھ جوڑ کفار کے ساتھ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر طعنہ زنی کرنا، اس کا تمسخر اڑانا، اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعنہ زنی اور ان کا تمسخر اڑانا، یا دین وشعائر دین پر طعنہ زنی وعیب جوئی کرنا اس کا تمسخر اڑانا استہزاء کہلاتا ہے۔'' اللہ

تعالیٰ ہم سب کو اس رذالت سے محفوظ فرمائے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سخریہ واستہزاء سے مراد تضحیک، استخفاف اور تحقیر ہے۔ نیز عیب ونقائص اس انداز سے بیان کرنا کہ جس سے مذاق اڑے، ہنسا جائے، یہ تضحیک وتحقیر کبھی قول وفعل کی شکل میں ہوتی ہے۔ اور کبھی اشارہ وکنایہ کی صورت میں بھی۔ افسوسناک امر یہ ہے جو کام یہودیوں اور منافقوں کا ہوا کرتا تھا اور ہے وہی کام خود کو مسلمان کہلانے والوں میں آتے جارہے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، فرشتے، جنت، حوریں، دوزخ، اللہ کے عذاب، قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ، دینی کتابوں، دینی شعائر، عمامہ، داڑھی، مسجد، مدرسے، دیندار آدمی، دینی لباس، دینی جملے، مقدس کلمات الغرض وہ کونسی مذہبی چیز ہے کہ جس کا اِس زمانے میں کھلے عام فلموں، ڈراموں، خصوصاً مزاحیہ ڈراموں، عام بول چال، دوستوں کی مجلسوں، دنیاوی تقریروں، ہنسی مذاق کی نشستوں اور باہمی گپ شپ میں مذاق نہیں اُڑایا جاتا؟۔ اور یہ مذاق اڑانے والے کوئی غیر نہیں بلکہ خود مسلمان ہیں۔ خود کو مسلمان کہنے والے داڑھی، عمامہ، ٹخنوں سے اونچی شلوار رکھنے اور مذہبی حُلیے سے نفرت کرتے ہیں، اور اسے کراہت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور کئی مقامات اور دفاتر میں تو یہاں تک مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہاں السلام علیکم کہنا بھی لوگوں کو انتہائی ناگوار گزرتا ہے، آذان سن کر تکلیف ہوتی ہے۔ قرآن وحدیث کی باتیں انہیں پرانی باتیں لگتی ہیں۔ یقیناً یہ انتہائی قبیح اور برا فعل ہے۔ اِسلام کی بُنیادی عبادات کے متعلق ایسا گُستاخانہ تصور اور طرزِ تکلّم بہت بڑی جسارت کے زُمرے میں آتا ہے، جو ہمارے دین کے ان دو ارکان کا مذاق اُڑانے کے مترادف ہے۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اہل باطل کی مجلس میں جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر ایسی مجلس میں احکام الٰہی اور آیات اللہ کے ساتھ مذاق کیا جارہا ہو اور وہاں بیٹھنے والا اس کو پسند کررہا ہے تو وہ بھی کافر ہوگیا اور اگر وہ شخص دین کی توہین کو دل سے تو پسند نہیں کرتا مگر وہاں پر بلاوجہ بیٹھا بھی رہتا ہے تو وہ فاسق ہے۔ البتہ اگر وہ کسی مقصد کی خاطر وہاں بیٹھا ہے۔ مجبور ہے، مگر دل سے توہین آمیز باتوں کو برا سمجھتا ہے تو ایسی صورت میں اس کا بیٹھنا مباح ہے

اور چوتھی صورت یہ ہے کہ بیٹھنے والا شخص اس نیت سے ایسی مجلس میں بیٹھا ہے کہ دین کے حق میں تبلیغ کرے تو پھر اس کا بیٹھنا عبادت میں شمار ہوگا۔ بہر حال فرمایا کہ کافروں کے پاس بلا وجہ مت بیٹھو، کیونکہ اگر ایسا کرو گے اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ تو تم بھی انہی کی طرح ہو جاؤ گے۔ وہ قرآن پاک اور اللہ کے نبی کا استہزا کرتے ہیں اور تم ان کی مجلس میں شریک ہوتے ہو تو تم بھی ان کی طرح سخت گنہگار ہو گے، حالانکہ مومن کیلئے حضور ﷺ کا فرمان ہے "مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَجْلِسْ عَلَى مَائِدَةٍ يُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ" جو شخص اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے ایسی جگہ بیٹھنا درست نہیں جہاں شراب کا دور چل رہا ہے اگر چہ یہ خود نہیں پیتا مگر شرابیوں کی مجلس میں بیٹھنے سے بھی منع فرما دیا۔ مقصد یہ کہ جہاں برائی کا کام ہو رہا ہو، اس کے قریب نہیں جانا چاہئے۔ اس لئے اہل باطل کی مجالس میں بلا وجہ جانے کا حکم نہیں ہے۔ باطل قوتیں اسلام کے ساتھ استہزاء کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ جہاں اللہ کی آیتوں کے ساتھ ٹھٹا ہو رہا ہو، مومن کی شان نہیں ہے کہ وہاں جائے مگر اب تو ایسی مجلسوں میں جانا فیشن بن چکا ہے۔ کفار خصوصاً یہود، ہنود اور نصاریٰ نے اسلام کی تذلیل کے لئے کئی طریقے نکالے ہیں۔ خاص طور پر یہودی اس معاملہ میں بہت آگے ہیں۔ اس آیت سے وہ لوگ سبق حاصل کریں جو فلموں، ڈراموں، گانوں تھیٹروں، دوستوں کی گپوں اور بدمذہبوں کی صحبتوں میں دین کا مذاق اڑتا ہوا دیکھتے ہیں اور پھر بھی وہاں بیٹھتے رہتے ہیں بلکہ مَعَاذَاللہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہوتے ہیں۔ بری صحبت کے بارے میں احادیث بکثرت ہیں۔ رسولُ اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''برے ساتھی سے بچ کہ تو اسی کے ساتھ پہچانا جائے گا (یعنی جیسے لوگوں کے پاس آدمی کی نشست و برخاست ہوتی ہے لوگ اسے ویسا ہی جانتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، رسولُ اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا فرمانِ عالیشان ہے: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ وہ دیکھے کس سے دوستی کر رہا ہے۔ (ترمذی، کتاب الزہد، ۴۵-باب، ۴/ ۱۶۷، الحدیث: ۲۳۸۵)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ اس دعوت میں شریک نہ ہو جس میں شراب کے دور چلے۔ (مسند احمد جلد 1 ص 20، جلد 3 ص 339) اس سے معلوم ہوا کہ ایسی مجلسوں اور اجتماعات میں شریک ہونا، جن میں اللہ و رسول (ﷺ) کے احکام کا قولاً یا عملاً مذاق اڑایا جاتا ہو، جیسے آج کل امرا، فیشن ایبل اور مغرب زدہ حلقوں میں بالعموم ایسا ہوتا ہے یا شادی بیاہ اور سالگرہ وغیرہ کی تقریبات میں کیا جاتا ہے، سخت گناہ ہے »إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ« کی وعید قرآنی اہل ایمان کے اندر کپکپی طاری کر دینے کے لئے کافی ہے بشرطیکہ دل کے اندر ایمان ہو۔

منافقین کی نفسیات، ان کی دوغلی پالیسی اور موقع پرستی

الَّذِيْنَ	(وہ منافق) جو	يَتَرَبَّصُوْنَ	انتظار کرتے ہیں
بِكُمْ	تمہاری بابت	فَاِنْ كَانَ	پھر اگر ہو
لَكُمْ فَتْحٌ	تمہارے لئے فتح	مِّنَ اللّٰهِ	اللہ (کی طرف) سے
قَالُوْٓا	(تو) کہتے ہیں	اَلَمْ نَكُنْ	کیا نہ تھے ہم؟
مَّعَكُمْ	تمہارے ساتھ	وَاِنْ كَانَ	اور اگر ہو
لِلْكٰفِرِيْنَ	کافروں کے لیے	نَصِيْبٌ	کچھ حصہ (غلبہ)

قَالُوْٓا	(تو) کہتے ہیں	اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ	کیا نہ ہم غالب آنے لگے تھے
عَلَيْكُمْ	تم پر	وَنَمْنَعْكُمْ	اور (کیا نہ) بچایا تھا ہم نے تمہیں

مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں سے	فَاللّٰهُ	چنانچہ اللہ
يَحْكُمُ	فیصلہ کرے گا	بَيْنَكُمْ	تمہارے درمیان
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	وَلَنْ	اور ہرگز نہیں
يَّجْعَلَ اللّٰهُ	کرے گا اللہ	لِلْكٰفِرِيْنَ	کافروں کیلئے
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں پر	سَبِيْلًا	کوئی راہ (غلبے کی)

ان منافقین کی خباثتوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ یہ لوگ

تمہارے بارے میں گردشوں کا انتظار کرتے ہیں فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ اگر تمہیں فتح حاصل ہو جائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو فوراً بول اٹھتے ہیں، کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ یعنی ہم تو تمہاری ہی پارٹی کے آدمی ہیں وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے، ان کو کہیں غلبہ حاصل ہو جائے۔ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہیں آ گئے تھے؟ کافروں سے کہتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر تمہیں زیر کر لیا تھا پھر ہم نے چکر چلایا وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور مسلمانوں سے بچایا ورنہ تمہیں سخت نقصان پہنچتا۔ دیکھو! ہم نے تمہارے اوپر احسان کیا کہ مسلمانوں سے تمہاری جان چھڑائی۔ اس طرح وہ کافروں کی ہمدردی حاصل کرتے ہیں۔ فرمایا منافقوں کی یہ سازشیں ادھر ہی رہ جائینگی فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ اس دن پتہ چلے گا کہ منافقین کیسی کیسی سازشیں کرتے تھے اور اہل ایمان کا طرز عمل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اصول کے طور پر سمجھا دیا وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے مومنوں پر کوئی راستہ نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں اور کفار انہیں زک نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ وہ خود ہی ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے اور اسلام ہی غالب رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ منافقین کسی کے سچے دوست نہیں ہوتے۔ ان کا اصل مقصد صرف اپنا ذاتی مفاد، مالِ دولت اور دنیاوی فائدہ ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے سامنے وفاداری کا دم بھرتے ہیں اور کافروں کے پاس جا کر اسلام دشمنی کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ آیت قیامت تک آنے والے ہر اس گروہ یا شخص پر صادق آتی ہے جو نظریاتی طور پر کمزور ہو اور صرف اپنے فائدے کے لیے پلے بدلتا ہو۔ منافقین کا طبقہ دورِ نبوی میں بھی موجود تھا اور ہر دور میں موجود رہتا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ ان میں ایمان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ ان کا ایمان صرف مفاد کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور اصول، جھوٹ اور مکر و فریب ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بس ہوا کا رخ دیکھتے رہتے ہیں۔ جدھر سے مفاد حاصل ہونے کی توقع ہو فوراً باتیں بنا

کرادھر لڑھک جاتے ہیں۔اس آیت میں دورِنبوی کے منافقوں کا حال بیان کیا گیا ہے

اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوتو مال غنیمت میں سے حصہ لینے کی غرض سے کہتے ہیں کہ آخر ہم بھی تو مسلمان اور تمہارے ساتھی ہیں لہٰذا ہمیں بھی حصہ ملنا چاہیے۔اور کافروں کو فتح ہوتو ان سے جاملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تمہارے ساتھ ہماری ہمدردیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ تمہیں فتح حاصل ہوگئی۔ورنہ اگر ہم دل جمعی سے مسلمانوں کا ساتھ دیتے تو فتح پانا تو درکنار مسلمان تمہارا کچومر نکال دیتے لہٰذا ہمیں تم کیسے نظر انداز کرسکتے ہو۔اس طرح وہ دونوں طرف سے مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اور آج کل ہمارے یہاں مفاد پرستوں کی ایک کثیر جماعت دو سیاسی پارٹیوں کے درمیان پھرتی رہتی ہے۔ہوا کا رخ دیکھتے ہی فوراً اپنی پارٹی بدل کر ایسی پارٹی میں جاشامل ہوتے ہیں جو برسر اقتدار ہو یا اس کے برسر اقتدار آنے کی توقع ہو۔ایسے لوگوں کے لیے لوٹا کی سیاسی اصطلاح وضع کی گئی ہے جو بے پیندا لوٹا کے محاورہ کا اختصار ہے جو ہر طرف لڑھکتا رہتا ہے۔ان لوگوں کا دین وایمان صرف پیسہ اور دوسرے مفادات ہوتے ہیں، جدھر سے زیادہ مل جائیں ادھر چلے جاتے ہیں۔اسی مضمون کو متعدد آیات میں دوسرے الفاظ سے دہرایا گیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ یہ کافر اور منافق اللہ کے نور کو بجھانے کی جتنی بھی سرتوڑ کوششیں کرسکتے ہیں، کرکے دیکھ لیں، اللہ اپنے اس ہدایت کے نور کو پورا کرکے رہے گا۔بالآخر تمام ادیان پر اللہ کا دین ہی غالب ہوکر رہے گا۔ایسی صورت ناممکن ہے کہ کافر مسلمانوں پر غالب آجائیں۔یعنی دنیا چوں کہ امتحان کی جگہ ہے؛ اس لئے کبھی مسلمانوں کو اور کبھی ان کے مخالفین کو ظاہری غلبہ حاصل ہوتا رہے گا؛ لیکن آخرت میں چوں کہ قطعی فیصلہ ہونا ہے، اور وہاں دلیل وحجت کام آئے گی نہ کہ زور آوری، تو وہاں کافروں کو مسلمانوں پر حجت کے اعتبار سے غلبہ حاصل نہ ہوسکے گا۔مطلب یہ ہے کہ افرادی طاقت، اسلحہ اور بہترین منصوبہ بندی (جنگ میں) ایک طرف ہو، جبکہ یقین محکم، اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان اور نصب العین کی صداقت دوسری طرف ہوتو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے سچے بندوں کی مدد کرتا ہے اور یہ بیشمار جنگوں میں ثابت بھی ہوچکا ہے۔اللہ تعالیٰ سب کو دین حنیف کی سمجھ عطا فرمائے۔آمین

☆☆☆

منافقین سے دوستی کی ممانعت/ منافقوں کی علامات/ شکر کی حقیقت، اہمیت اور ثمرات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا
کُسَالٰی ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ ۫
لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا ﴿۱۴۳﴾ یٰٓاَیُّھَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ
تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ
النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ
وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ
اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ
شَاکِرًا عَلِیْمًا ﴿۱۴۷﴾

خَادِعُھُمْ کا معنی ومفہوم

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ	بلاشبہ منافق	یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ	دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو

وَھُوَ	اور وہ (بھی)	خَادِعُھُمْ	انہیں دھوکہ دے گا
وَاِذَا	اور جب	قَامُوْٓا	(وہ) کھڑے ہوتے ہیں
اِلَی الصَّلٰوۃِ	نماز کے لئے	قَامُوْا	(تو) کھڑے ہوتے ہیں
کُسَالٰی	سستی سے	یُرَآءُوْنَ	وہ دکھاتے ہیں
النَّاسَ	لوگوں کو	وَلَا	اور نہیں
یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ	وہ یاد کرتے اللہ کو	اِلَّا قَلِیْلًا	مگر بہت تھوڑا

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ اللہ بیشک منافق لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کیسے دھوکہ دیا جاسکتا ہے جب کہ وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ دھوکہ تو ناواقف آدمی کھاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی ذات تو اعلیٰ وارفع اور ان چیزوں سے پاک ہے، پھر اللہ کو دھوکہ دہی کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جیسا کہ کوئی دھوکے باز کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ہیرا پھیری کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بظاہر اسلام ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں کلمہ پڑھتے ہیں، نمازیں ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں مگر دل میں کفر بھرا ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس دوغلی پالیسی سے وہ اہل ایمان اور خود اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں مگر وہ فرماتا ہے وَھُوَ خَادِعُھُمْ کہ اللہ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے جیسا وہ اللہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس مقام پر خَادِعُھُمْ مشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (مشاکلت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کا بدلہ یا اس کا ذکر کرنے کے لیے وہی لفظ استعمال کرنا جو سامنے والے نے استعمال کیا ہو، خواہ دونوں کا اصل مطلب الگ ہوتا کہ بات میں خوبصورتی اور یکسانیت پیدا ہو۔ منافقین اور کفار اللہ اور ایمان والوں کے ساتھ مکر، فریب اور دھوکہ دہی (خداع) کی چالیں چلتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حرکت کا جواب دیا، تو ان کے لفظ "خداع" (دھوکہ) کے بدلے میں اپنے لیے بھی خَادِعُھُمْ (وہ انہیں دھوکہ دینے والا ہے) کا لفظ استعمال فرمایا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے خادع ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اللہ نعوذ باللہ کسی کو

دھوکہ دیتا ہے کیونکہ دھوکہ دینا عیب ہے اور اللہ کی ذات عیب سے پاک ہے۔کہ جس طرح وہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی ان کو ویسا ہی بدلہ دیتا ہے اور یہ اس صورت میں ہے کہ منافقوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نفاق کو ظاہر فرما دیتا ہے اور وہ خود بھی اپنے اعمال سے اس کا ثبوت پیش کر دیتے ہیں۔مگر ان کے ساتھ کفار کا سا سلوک کرنے کا حکم نہیں۔کفار کے ساتھ ہمیشہ حالت جنگ کا معاملہ ہوتا ہے،مگر منافقوں کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک ہی کیا جاتا ہے۔جس طرح مخلص مسلمانوں کی مال، جان، عزت، آبرو محفوظ ہوتی ہے، اسی طرح منافقوں کو بھی امان حاصل ہوتی ہے تو ان کو ان کے نفاق کے حال پر ہی چھوڑ دینا ان کے ساتھ دھوکہ ہے کہ وہ اس خیال میں رہتے ہیں کہ مسلمان ان کے اصل حال سے واقف نہیں اور وہ کفار کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ناکام و نامراد ہیں اور یہی ان کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہے جسے وہ سمجھنے سے عاری ہیں۔

نماز میں سستی کرنا منافقوں کی علامت ہے

آگے منافقوں کی کچھ غلط کارگزاری بیان ہو رہی ہے۔ارشاد ہوتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بددلی اور سستی کے ساتھ۔وجہ ظاہر ہے کہ نہ ان کا ایمان پختہ ہے اور نہ انہیں نماز کی افادیت پر یقین ہے وہ تو محض مسلمانوں کو دکھانے کے لئے مسجد میں آجاتے ہیں، تاکہ ان کا نفاق نہ ظاہر ہونے پائے۔ ایک مخلص مومن کے لئے نماز اہم ترین عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ سے مناجات کی جاتی ہے، یہ گناہوں کو مٹانے والی چیز ہے مگر منافق اپنی بدعقیدگی کی وجہ سے اسے ضائع کر دیتا ہے۔حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں جن منافقین کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اعتقادی منافق ہیں اور نماز میں سستی کرتے ہیں۔وگرنہ سستی تو بعض اوقات مخلص مومن سے بھی ہو جاتی ہے کوئی بیمار ہو یا بھاری جسم والا آدمی ہو تو اسے اٹھنے بیٹھنے میں دقت پیش آتی ہے، فرمایا یہاں پر ایسا شخص مراد نہیں بلکہ وہ اعتقادی منافق مراد ہے جو دیدہ

دانستہ نماز میں سستی کا اظہار کرتا ہے۔ فرمایا منافق کی نماز محض یہ ہے کہ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وہ لوگوں کے سامنے دکھلاوا کرتے ہیں کہ دیکھو لو ہم نمازی ہیں لہٰذا ہمارے ایمان پر شبہ نہ کیا جائے۔ حالانکہ نماز جیسی عظیم عبادت پر تو ان کا اعتقاد ہی نہیں ہے یہ تو ان پر بوجھ ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ریاکاری کی مذمت بھی بیان فرمادی اور ساتھ یہ بھی اشارہ رفرمادیا کہ ایک مومن کے لئے ذکر الٰہی کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو مگر منافقین کا حال یہ ہے وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾ اور نہیں ذکر کرتے اللہ کا مگر بہت تھوڑا، برائے نام، بات وہی ہے کہ محض ریاکاری کے لئے نماز پڑھتے ہیں تاکہ لوگ انہیں مومن سمجھیں اور ان کی مال و جان مسلمانوں کے ہاتھوں محفوظ رہے۔ بہرحال فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کو یاد بھی کرتے ہیں تو برائے نام، ان میں خلوص و محبت کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا۔

منافقین کی مُّذَبْذَبِیْنَ والی کیفیت

مُّذَبْذَبِیْنَ	متردد ہیں	بَیْنَ ذٰلِكَ	درمیان اس (کفر و ایمان کے)
لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ	نہ ان کی طرف	وَلَآ	اور نہ
اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ	اُن کی طرف	وَمَنْ	اور جس کو
یُّضْلِلِ اللّٰہُ	گمراہ کرے اللہ	فَلَنْ تَجِدَ	تو ہرگز نہیں آپ پائیں گے
لَہٗ	اس کے لیے	سَبِیْلًا	کوئی راہ۔

فرمایا ان منافقین کا حال یہ ہے مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ اس کے درمیان متردد ہیں۔ کبھی ان کا جھکاؤ مومنوں کی طرف ہوتا ہے اور کبھی کافروں کی طرف، جونسا پلہ بھاری نظر آتا ہے فوراً ادھر ہو جاتے فرمایا وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا ﴿۱۴۳﴾ جس کو خدا تعالیٰ گمراہ کردے تم اس کے لئے ہرگز کوئی راہ نہیں پاؤ گے۔ جب کوئی شخص کفر کا راستہ یا نفاق کا راستہ اختیار کرلیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اسے اسی راستہ پر قائم رہنے کی توفیق دے دیتا ہے۔ جیسے پہلے گزر چکا ہے نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی ہم اسے ادھر ہی پھیر دیتے ہیں جس طرف وہ جانا

چاہتا ہے۔ جب کفر پر جم گیا تو اللہ نے کہا، اچھا ایسا ہی کرتے رہو۔ تو فرمایا جسے اللہ گمراہ کر دے پھر کون اسے راہ راست پر لا سکتا ہے اور اللہ کے گمراہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی کو بلا وجہ گمراہی کے لئے راستہ پر چلنے کی توفیق دیتا ہے بلکہ وہ تو علیم کل ہے۔ ہر ایک کی باطنی کیفیت سے واقف ہے وہ ہر شخص کی صلاحیت اور فساد کو بھی جانتا ہے اس لئے وہ ہر شخص کی اصلیت کے مطابق اس کا اپنے پسندیدہ راستہ پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبراً گمراہی کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ وہ خود اس طرف رخ کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اسے غلط راستہ پر پختہ ہونے کی توفیق عطا کرتا ہے۔

کافروں سے دلی دوستی کی ممانعت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو
لَا تَتَّخِذُوا	نہ تم بناؤ	الْكٰفِرِيْنَ	کافروں کو
اَوْلِيَآءَ	دوست	مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	سوائے مومنوں کے
اَتُرِيْدُوْنَ	کیا تم چاہتے ہو	اَنْ تَجْعَلُوْا	یہ کہ تم (ثابت) کرو
لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	عَلَيْكُمْ	تم پر (اپنے خلاف)
سُلْطٰنًا	حجت	مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾	ظاہر۔

منافقین کی مذمت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنالیں۔ فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ، منافق تو مفاد حاصل کرنے کے لئے کفار سے دوستی کرتے ہیں تاکہ انہیں عزت حاصل ہو سکے مگر تم ان کے ساتھ بالکل دوستی نہ کرو۔ کافروں کے ساتھ دوستی سے تمہارا کیا مقصد ہے اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ کیا تم خود پر اللہ کا صریح الزام ثابت کرنا چاہتے ہو اگر تم بھی منافقوں کی طرح کافروں کو دوست بناؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر حجت قائم ہو جائے گی اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کے مجرم ٹھہرو گے لہٰذا کافروں کے ساتھ دلی دوستانہ ہرگز نہ رکھو۔ یہ حکم نہایت جامع قسم

کا ہے جس کا تعلق افراد سے بھی ہے اور حکومت سے بھی۔ اس دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ یعنی جس طرح ایک شخص کو کسی غیر مسلم یا منافق سے دوستی لگانے میں نقصان ہی کا احتمال ہے، اسی طرح اگر کوئی اسلامی یا مسلمان حکومت بھی غیر مسلموں سے دوستی کے روابط قائم کرے گی تو نقصان ہی اٹھائے گی۔ اور اس کا تجربہ بارہا ہو بھی چکا ہے اور بسا اوقات منافقوں اور غداروں نے ہی جو حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب پر فائز تھے، مسلمانوں کی حکومتوں کو ڈبویا ہے۔ آیت میں لفظ" اولیاء" استعمال ہوا ہے، جو" ولی" کی جمع ہے۔ اس سے مراد ایسے گہرے دوست، سرپرست یا راز دار ہیں جن پر بھروسہ کر کے مسلمانوں کے اجتماعی یا انفرادی راز ان کے سامنے کھول دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کو حکم دے رہا ہے کہ اپنے سچے بھائیوں (مسلمانوں) کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کو اپنا قریبی دوست یا پشت پناہ نہ بناؤ جو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

صریح حجت (سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا)

آیت کے دوسرے حصے میں ایک سخت تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اگر تم مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے گہری دوستیاں کرو گے، تو تم خود اللہ کو اپنے خلاف ایک واضح دلیل (حجت) فراہم کر دو گے کہ تمہارا ایمان سچا نہیں ہے۔ یہ عمل اس بات کی کھلی دلیل بن جائے گا کہ تم دل سے مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہو، جس کی سزا دنیا اور آخرت میں رسوائی ہے۔ ایک اہم وضاحت اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک، کاروبار، یا انسانی ہمدردی کا معاملہ نہ کیا جائے۔ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ انصاف، اچھے اخلاق اور پرامن معاہدات کی اجازت دیتا ہے۔ ممانعت صرف اس" دلی دوستی"، "راز دارانہ تعلقات" اور" سرپرستی" سے ہے جو مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچائے یا ایمان کمزور کرنے کا باعث بنے۔

الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ (سب سے نچلا درجہ)

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ	بلاشبہ منافقین	فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ	سب سے نچلے درجے میں ہوں گے
مِنَ النَّارِ	آگ کے	وَلَنْ تَجِدَ	اور ہرگز نہیں آپ پائیں گے

لَهُمْ	ان کے لیے	نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾	کوئی مددگار۔

آگے پھر اللہ تعالیٰ نے منافقین کی سزا کا ذکر کیا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ بیشک اعتقادی منافق دوزخ کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے، جہنم کے الگ الگ درجات اور طبقے ہیں، جنہیں درکات کہا جاتا ہے۔ گناہ اور جرم کی سنگینی کے حساب سے عذاب کا تعین ہوتا ہے۔ منافقین کو جہنم کے سب سے نچلے اور بدترین حصے میں ڈالا جائے گا جہاں عذاب کی شدت سب سے زیادہ ہوگی۔ جہنم کے سات طبقات میں سے سب سے نچلا گڑھا اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ یہ لوگ کفار سے بھی زیادہ خطرناک ہیں جو خفیہ طور پر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سزا بھی سخت مقرر کی ہے اور پھر ان کا قید خانہ بھی ایسا ہے وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ تو ان کے لئے ہرگز کوئی مددگار نہیں پائیگا۔ دنیا میں منافقین اپنی چالاکیوں، جھوٹی قسموں اور جتھوں کے بل بوتے پر بچ نکلتے ہیں، لیکن آخرت میں اللہ کے عذاب سے انہیں بچانے والا، ان کی سفارش کرنے والا یا ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ وہاں سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہوگی جس قدر ان کا جرم بڑا ہے ان کے لئے سزا بھی سخت ہے۔ یہ آیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اللہ کے ہاں ظاہر سے زیادہ باطن (دل کی حالت) کی اہمیت ہے۔ زبان سے دین کا دعویٰ کرنا اور عمل یا دل میں اس کی نفی کرنا بدترین جرم ہے، جس کی سزا جہنم کا سب سے نچلا گڑھا ہے۔

عمل صالح اختیار کرنے والے مومنین کیلئے بشارت

اِلَّا الَّذِيْنَ	سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے	تَابُوْا	توبہ کی
وَاَصْلَحُوْا	اور اصلاح کرلی	وَاعْتَصَمُوْا	اور مضبوطی سے پکڑا
بِاللّٰهِ	اللہ (کے دین) کو	وَاَخْلَصُوْا	اور خالص کرلیا
دِيْنَهُمْ	اپنا دین	لِلّٰهِ	اللہ کے لیے
فَاُولٰٓئِكَ	تو ایسے لوگ	مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں کے ساتھ ہوں گے

وَسَوْفَ	اورعنقریب	يُؤْتِ اللّٰهُ	دے گا اللہ
الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں کو	اَجْرًا عَظِيْمًا	بہت بڑا

فرمایا اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کرلی۔نفاق کو چھوڑ کر ایمان اختیار کرلیا وَاَصْلَحُوْا اور پھر اپنی اصلاح بھی کرلی، ریاکاری سے باز آگئے کافروں کی دوستی کو ترک کردیا۔ وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا یعنی اللہ کی کتاب اور شریعت پر جم گئے اعتصام باللہ کا معنی ہے کہ جو لوگ ایمان اور توحید پر ثابت قدم ہو گئے وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ اور انہوں نے اللہ کے لئے اپنے دین کو خالص بنالیا۔کفر، شرک، نفاق اور ریاکاری سے پاک ہو کر اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لے آئے۔اخلاصِ نیت سب سے اہم شرط ہے۔منافقین کے تمام اعمال دکھاوے اور دنیاوی مفادات کے لیے ہوتے تھے۔اب انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ جو بھی نیک عمل (نماز، روزہ، جہاد وغیرہ) کریں، اس میں صرف اور صرف اللہ کی رضا شامل ہو، کوئی دنیاوی لالچ یا سستی شہرت کا مقصد نہ ہو۔حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بھی ہے أَخْلِصْ دِينَكَ، يَكْفِكَ الْقَلِيلُ مِنَ الْعَمَلِ دین میں اخلاص پیدا کرلو تو تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائیگا، اخلاص اتنی اچھی چیز ہے۔بہرحال فرمایا کہ جنہوں نے توبہ کرلی، پھر اصلاح کی، اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لیا اور پھر محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر دین میں اخلاص پیدا کرلیا تو فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے مطلب یہ ہے کہ جب نفاق سے تائب ہو کر اللہ کے دین پر خلوص نیت سے ثابت قدم ہو گئے تو پھر ان کا حشر مخلص مومنوں کے ساتھ ہوگا۔انہیں کامل الایمان مومنین کی رفاقت نصیب ہو جائیگی، جو منافقین ان چار شرائط کے ساتھ سچی توبہ کرلیں، اللہ تعالیٰ ان کے ماضی کے نفاق کو مٹا دیتا ہے۔وہ منافقوں کی فہرست سے نکل کر حقیقی مومنین کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور مومنوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ⑯ اللہ تعالیٰ انہیں بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔یہ آیت اللہ کی وسیع رحمت اور توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہنے کی بہترین دلیل ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان وہ گا کہ کسی کو مومنین کی

معیت نصیب ہو جائے۔ ایسا شخص یقیناً مقبول خدا اور عظیم اجر کا مستحق ہوگا۔

اللہ کی صفت شاکر (قدر دان) اور علیم (سب کچھ جاننے والا)

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ	کیا کرے گا اللہ	بِعَذَابِكُمْ	تمہیں عذاب دے کر
اِنْ شَكَرْتُمْ	اگر تم شکر کرو	وَاٰمَنْتُمْ	اور تم ایمان لے آؤ؟
وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ	شَاكِرًا	نہایت قدر دان
عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾		خوب جاننے والا	

آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی شخص کو جو سزا ملتی ہے وہ اس کی اپنی بدعملی کی وجہ سے ملتی ہے اگر انسان ایمان اور توحید پر قائم ہو اعمال صالحہ انجام دیتا ہو تو اللہ تعالیٰ کسی کو بلا وجہ عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ ارشاد ہے۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ اگر تم نے اللہ کے انعامات کا شکر ادا کیا اور اس پر خلوص نیت سے ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر کیا کریگا۔ اپنے بندوں کو عذاب میں مبتلا کر کے اللہ کو خوشی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔ اگر بندے اس کی بغاوت نہ کریں تو وہ ان کے ساتھ نہایت ہی مہربان اور بخشنے والا ہے وہ جو بھی تمہیں سزا دیتا ہے وہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فرمایا اگر تم شکر گزاری کرو گے اور ایمان لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ یقیناً اچھا بدلہ دیگا وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ اللہ تعالیٰ شکر گزاری کرنیوالا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور شکر گزاری کی بھی بڑی قدر فرماتا ہے اور اس کا بہترین اجر دیتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں کے حال اور تمہارے اعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون سچے دل سے شکر گزار اور مومن ہے، اور کون صرف دکھاوا کر رہا ہے۔ شکر گزاری کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس کا معنی قدر دانی ہوتا ہے اور اگر اس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو معنی یہ ہوگا کہ انسان اللہ کے احسان کو یاد کر کے دل میں اس کی قدر کرتا ہے اور زبان سے اس کی تعریف کرتا ہے وہ اپنے اعضاء اور جوارح سے ایسا عمل بجالاتا ہے جس سے اس کا منعم راضی ہو جائے۔ پھر

جب بندہ اپنے آپ کو خالصتا اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اس کا ہر حکم بجالاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اس پر راضی ہوتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے۔ قرآن میں آتا ہے وَ لَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ اور کافروں سے راضی نہیں ہوتا وَاِنْ تَشْکُرُوْا یَرْضَہُ لَکُمْ اگر تم ایمان لاؤ گے تو خدا راضی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ غنی ہے۔ وہ ہر حالت میں تعریفوں کا مستحق ہے۔ اگر تم اس کا شکر کرو گے اور ایمان لاؤ گے تو وہ قدر دان ہے وہ اور زیادہ انعام عطا فرمائے گا۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ہر شخص کی نیکی اور برائی اور ان کے درجات تک سے واقف ہے اور اس کے مطابق جزا یا سزا کا سلوک کرتا ہے۔

عذاب سے بچنے کے دو پکے راستے

اگر انسان اپنی زندگی میں دو صفات پیدا کر لے، تو وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے شکر گزاری: اللہ کی دی ہوئی نعمتوں (صحت، مال، عقل، زندگی) کا اعتراف کرنا، زبان سے اس کی تعریف کرنا اور ان نعمتوں کو اللہ کی نافرمانی کے بجائے اس کی اطاعت میں استعمال کرنا۔ ایمان: اللہ کی توحید، اس کے رسولوں، کتابوں اور آخرت پر سچے دل سے یقین رکھنا اور اس یقین کے مطابق زندگی گزارنا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شکر کا ذکر ایمان سے پہلے کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان اپنے ارد گرد اللہ کی نعمتوں پر غور کرتا ہے، تو اس کا دل قدرتی طور پر اپنے پیدا کرنے والے کے لیے شکر کے جذبے سے بھر جاتا ہے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ انسان کو ایمان لانے اور اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ 1 شکر کا معنیٰ اعتراف نعمت ہے اور اس کے تین مدارج ہیں (1) قلبی۔ یعنی انسان دل سے اللہ کے یا کسی کے حسانات کا اعتراف کرے۔ (2) قولی۔ تحدیث نعمت کے طور پر زبان سے بھی اس کا اقرار کرے اور اللہ کے احسانات کا دوسروں کے سامنے تذکرہ کرے (3) عملی۔ یعنی اس شکر کے اثرات اس کے اعضاء و جوارح سے بھی ظاہر ہوں۔ اور یہ تینوں درجات دراصل لازم و ملزوم ہیں۔ اور بالترتیب وجود میں آتے ہیں۔ انسان جب اللہ کے احسانات کا خیال کرتا ہے تو اس کا دل اللہ کی محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز

ہو جاتا ہے۔ شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف جاتی ہے، خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے اور ان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔ شکر کی ضد کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں ''کفرانِ نعمت'' کا لفظ رائج ہے اور عام طور پر استعمال میں ہے۔ یہی (کفر) وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں۔ اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا، یہ کفر ہے جس کے مرتکب کا نام کافر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے۔ قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل آئے ہیں۔ ''اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم پر (نعمتوں میں) ضرور اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔'' (ابراہیم: ۷) بہرحال یہ آیت انسان کو مایوسی سے نکال کر امید دلاتی ہے کہ اللہ کا اصل نظام رحمت اور کرم کا ہے۔ اگر بندہ کفر اور نافرمانی کا راستہ چھوڑ کر ایمان اور شکر گزاری کا راستہ اختیار کر لے، تو اللہ کی رحمت اسے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور وہ عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے شکر گزار بندوں میں شامل فرما اور ناشکری و نافرمانی کے کاموں سے بچا اور خاتمہ بالخیر نصیب فرما۔ آمین یارب العالمین

☆☆☆☆

ہماری دیگر مطبوعات



www.umarlibrary.org